مارچ 2024
www.Pklibrary.com
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
نگران اعلیٰ
معراج رسول
سالگرہ نمبر
www.Pklibrary.com

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS — CPNE
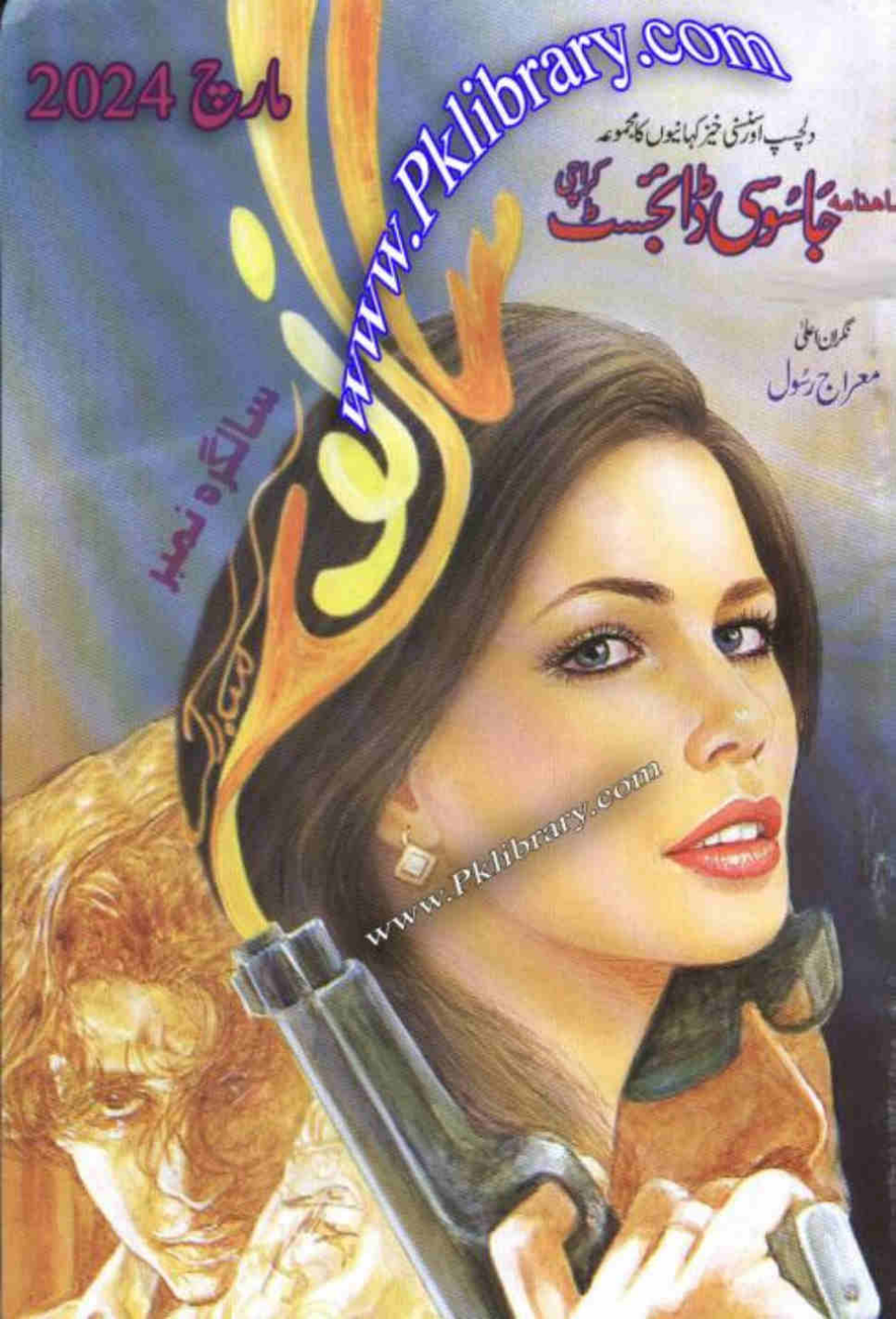
مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لیلیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

مارکیٹنگ و سرکولیشن مینجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

تماشا
عمران قریشی
113
اس صداقت و حقیقت کا انکشاف جو لبوں سے کوسوں دور تھی
دہر
126
حسام بٹ
چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش رُبا حیلہ سازیاں
سگنل والی
جمال دستی
154
محبت کی شاہراہ پر سگنل پر کھڑے ایک شخص کی ویرانی...... پامالی وسادگی
سرخ دھبا
165
انور ظہیر رہبر
ذہانت کے ذریعے کی جانے والی خیانت کے خطرناک مضمرات
بلائے جاں
ابراہیم عبدالہادی
168
بلائے جاں کی طرح چمٹ جانے والے لذت وکیف کے پُرآزار سانحات ظلمات
آخری قفل
199
اسجل بھٹی
حصولِ جستجو میں تمام حدیں پار کر لینے والی نیکی اور بدی کی خوفناک معرکہ آرائی

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کے صفحات پر بہت جلد
ایک نئے سلسلے کا آغاز
جنگل کا قانون نافذ کرنے والے انسانی تذلیل
کے مرتکب درندوں سے
ٹکرا جانے والوں کی خونی داستان
جنگل
امجد جاوید کے قلم سے

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

مارچ کا شمارہ حاضر ہے۔ جب تک شمارہ آپ کے ہاتھوں کی زینت بنے گا، رمضان المبارک کی بابرکت ساعتیں کچھ ہی دوری پر ہوں گی۔ ہماری جانب سے تمام عالمِ اسلام کو ماہِ رمضان بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کے دعاگو ہیں کہ اللہ پاک اپنی خاص رحمت نازل فرمائے اور تمام ناگہانی آفات، بیماریوں اور نقصانات سے ہمیں محفوظ رکھے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ربِ کریم رمضان المبارک کی روح پرور اور بابرکت ساعتوں میں ہم سب کی جملہ مشکلات کو ''کن'' سے حل فرمائے، آمین یا ربّ العالمین۔ بالآخر وطنِ عزیز میں انتخابات ہو گئے۔ ذرائع ابلاغ پر ہر طرف شور بپا تھا اور بہت سے لوگ ہلڑ مچا کر اس انتخابی اونٹ کو مختلف سمتوں میں دوڑا رہے تھے۔ دیکھیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ بھلا کیسا انتخاب...... فقط وہ لوگ نہیں بلبلا رہے جو سانجھے کی اس انتخابی ہنڈیا میں مل بانٹ کر حکومت بنا رہے ہیں۔ بس یہی لوگ ہیں جو اس قسم کے انتخابات پر بے حد خوش ہیں۔ ورنہ تو تجزیہ نگاروں کے مطابق ان کے اندیشے، دعوے درست ثابت ہو رہے ہیں کہ عام انتخابات کے بعد ملک میں سیاسی استحکام آتے آتے آئے گا۔ فی الحال تو مختلف پارٹیاں مل کے حکومت سازی کی تگ و دو میں مصروفِ عمل ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ پر پوری طرح انتخابات کی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ گزشتہ سال شروع ہونے والی نہتے فلسطینیوں پر گولا بارود کی یلغار اسی طرح جاری ہے...... ہوتا یہی ہے کہ ذرائع ابلاغ کے پلیٹ فارم پر نئی خبر کے سامنے آتے ہی پرانی خبر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں قومیں بنتی اور مٹتی رہی ہیں...... بڑی بڑی تہذیبیں ختم ہو گئیں۔ تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ کچھ ہی ماہ کی بات ہے کہ فلسطین میں فلسطینی نہیں رہیں گے۔ اسرائیل چند ماہ میں ہزاروں فلسطینیوں کا قتلِ عام کر چکا ہے۔ امریکی ایوانوں میں اسے مذہبی جنگ قرار دیا جا چکا ہے اور دنیا کا کوئی ملک اس کو روکنے کی عملی کوشش بھی نہیں کر رہا۔ بات صرف قراردادوں تک محدود ہے اور وہ بھی ویٹو کر دی جاتی ہے۔ مسلم ممالک نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس سے قبل اسپین میں بھی مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ بوسنیا کے واقعات تو ہم نے اپنی آنکھوں سے براہ راست دیکھے۔ ایسی اور مثالیں موجود ہیں۔ حماس کی قیادت نے کس پر بھروسا کر کے بھیانک غلطی کرتے ہوئے پوری فلسطینی قوم کو مقتل میں لا کھڑا کیا۔ بین الاقوامی سطح پر ایسی کوئی صورتِ حال بنتی نظر نہیں آ رہی جو فلسطین کے مسلمانوں کو اسرائیل کے خونی پنجوں سے بچا سکے۔ قیام و طعام کے مراکز تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں بچے، عورتیں اور بوڑھے شہید ہو چکے ہیں اور جو سانسیں لے رہے ہیں وہ بھوکے اور بے سائباں ہیں...... ہر جگہ فلسطینیوں کے حق میں احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں...... مگر جو بااختیار ممالک ہیں۔ وہ ابھی تک اسرائیل کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی نسل کشی ان کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ وہ تو دنیا کے ہر خطے سے مسلمانوں کا خاتمہ چاہتے ہیں اور یہ موقع ہم انہیں خود دے رہے ہیں۔ حالیہ پی ایس ایل کے میچز بائیکاٹ کر دینے والی مصنوعات کے بینر تلے منعقد ہو رہے ہیں اور ہم بڑی فخریہ شان و شوکت سے اس کا حصہ بن رہے ہیں۔ دوسروں کے لیے خود کو مٹی کر دینے والے ذہن و دل اور جسم اب ناپید ہو چکے ہیں......

کھل جائے مجھ پہ بابِ عنایات اے خدا ...... دیکھوں دیارِ نور کے دن رات اے خدا

اسلام آباد سے **فاطمہ راجپوت** کے فرمودات ''لکھنے چھاپنے اور تمام پڑھنے والوں پر سلامتی ہو۔ دسمبر 2023ء اور جنوری، فروری 2024ء کے شماروں پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ امید ہے قبولیت اور شمولیت کا شرف حاصل کر پائے گا۔ دو تین ماہ سے مسلسل تبصرہ بھجوانا چاہ رہے ہیں لیکن ہماری طرف رسالہ آتا ہی بہت لیٹ ہے تو نتیجتاً تین ماہ کے شماروں پر تبصرہ حاضر ہے۔ تو جناب ہمارے خیال میں سردی کو ظاہر کرتا دسمبر 2023ء کا ٹائٹل سوائے حسینہ کے اچھا تھا۔ سب سے پہلے نجمہ مودودی کی زہریلی شناسائی پڑھی مزے دار کہانی تھی طوالت کے باوجود بور نہیں ہونے دیا۔ تراب حیدر کی ادھورا شاہکار کافی حد تک شاہکار جبکہ فاطمہ حسام کی حجامت مناسب تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی پھندا بھی اچھی تھی۔ ہائے ری قسمت از عمران قریشی آخر میں بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی راجو اور جیدی کی قسمت پر جو وضاحت شروع میں کی تھی تو انتظار تھا کہ اختتام پر کیا کرتی ہے قسمت۔ زویا اعجاز کی جواز بے جواز لگی۔ آمنہ اور عمر کی پہلی چیٹ سے ہی ظاہر ہو رہا تھا معاملہ وہ نہیں جو دکھایا گیا ہے اور چار چھ میسج پڑھ کر ہی قتل کرنے چل دیا ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ (بات جلدی کی نہیں جذبات، عقل کو ایسے ہی ضبط کر دیتے ہیں) ارتھوں میں پسِ نقاب از علی عباس بہتر اور فتنہ زرا ز مرزا عمران بیگ مناسب تھیں۔ جنوری 2024ء کا ٹائٹل اچھا تھا اور عرصے بعد

ٹائٹل گرل جاسوسی کے ٹائٹل کے عین مطابق لگی۔ سب سے پہلے کیس نمبر 313 از نوریہ مدثر پڑھی خاصی پُراسرار تھی لیکن ٹائٹل پر کہانی کا نام کیس نمبر 313 لکھا تھا اور کہانی کے اندر کیس نمبر 312 کا ذکر تھا؟ پھر ہیپی نیو ائیر از عکس فاطمہ کی طرف آئے۔ اچھی تحریر تھی آخر میں اداس کر گئی لوگ کیسے کیسے حالات میں رو رہے ہوتے ہیں اور ہم اپنے گھروں میں ہو کر زندگی کی نعمتوں سے حظ اٹھاتے ہوئے بھی مالک کی ناشکری میں مگن رہتے ہیں، بے ساختہ دعا کی اللہ سب بے گھروں کو کرائے کے بجائے اپنا گھر عطا فرمائے۔ گھاؤ از عمران قریشی اور سر پھرے از علی عباس بہتر تھیں ویسے کہانی کا نام سر پھرے کے بجائے کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ نجات شب از غلام قادر ویسے تو اچھی تھی لیکن غلام قادر صاحب آپ ماشاء اللہ سمجھدار ہیں اور سمجھدار کو اشارہ کافی۔ ایڈیٹرز بھی توجہ کیا کیجیے۔ (جی بہت بہتر) شمارے کی سب سے بہترین تحریر عائشہ نصیر کی اعتراف تھی اوہ بیچارہ بلی...... رنگوں میں اسما قادری کی بزدل مجرم میں واقعی مجرم بزدل تھے۔ عثمان اور صوفی کے ساتھ ہمارے لیے بھی سبق آموز تحریر تھی ویسے سمجھ نہیں آتی سوشل میڈیا پر لوگ کسی پر اعتبار کیسے کر لیتے ہیں؟ اسما قادری صاحبہ کو خواتین کے رسالوں میں بھی پڑھا ہے مگر جاسوسی کے لیے لکھنے کا فیصلہ بھی اچھا ہے۔ معیار کے عین مطابق لکھتی ہیں۔ گمنام مسیحائی از زویا اعجاز پرانا موضوع منفرد انداز میں لکھا گیا تھا۔ فروری کا ٹائٹل دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیے کہ مسلسل بڑھتی شکایات کے بعد یقیناً مدیرہ صاحبہ نے آرٹسٹ کے کان کھینچے ہیں بہرحال ٹائٹل اس ماہ بھی بہتر تھا۔ فہرست اچھی تھی اور یعقوب بھٹی صاحب کا نام موجود تھا۔ اداریہ پڑھا بیشک ملکی حالات نے عوام کو بے حال کر رکھا ہے اور الیکشن اس کا منہ بولتا ثبوت ثابت ہوئے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی یہ کیا چل رہا ہے۔ رونقِ رنگ چمن میں بانی ادارہ جاسوسی پبلیکیشنز کے بارے میں پڑھنے کو ملا شروع میں جو قطعہ تھا بہت اچھا تھا یعنی جن کے جانے سے جان جاتی تھی ان کا جانا بھی ہم نے دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ معراج صاحب کی مغفرت فرمائے۔ اُن کے جانے سے یقیناً جاسوسی کی دنیا میں بھی ایک خلا آیا ہوگا لیکن ان کی اصل کمی ان کے اہلِ خانہ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اللہ کرے عذرا صاحبہ ادارے کا معیار جیسا معراج صاحب کی موجودگی میں تھا ویسا ہی برقرار رکھ پائیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امید کا مینار پڑھی زبردست لیکن اختتام اداس کر گیا، شروع سے ہی لگ رہا تھا لڑکی کا کچھ ایسا ہی سین ہوگا۔ عکسِ فاطمہ مردہ کے ساتھ چند زندہ گندے انڈوں کا ذکر کر رہی تھیں تحریر کا نام دیکھ کر ایک شعر یاد آ گیا۔ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے۔ جہاں اے۔ آر۔ راجپوت نے مہارت سے قاتل کو انجام تک پہنچایا وہیں جمال دستی کے انسپکٹر جلال نے مفرور مجرم کو گھما کر رکھ دیا۔ ہمدم اور مرگ مفاجات بس ٹھیک تھیں۔ مرگ مفاجات میں مغرب کی ذہنی و اخلاقی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ امجد اقبال نے کالی کوکھ کے ذریعے معاشرے کے ایک تلخ پہلو کا احاطہ کیا حقیقت تلخ ہے لیکن جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ کہیں نا کہیں رشید بریانی والا جیسے لوگ موجود ہوتے ہی ہیں وہیں لاکھوں میں کوئی ایک صابر بھی ہوتا ہے۔ بہت اچھے امجد صاحب۔ امجد رئیس کی آبی قیامت شروع میں تو کچھ سمجھ ہی نہیں آئی ہر سین میں نئے کردار لیکن پھر جب کہانی کچھ واضح ہوئی تو اچھی لگی۔ رنگوں میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے اس بار یقیناً بہت محنت سے ناول لکھا تھا خاصا پسند آیا اس لیے ڈاکٹر صاحب مبارکباد کے حق دار ہیں۔ محمد فاروق انجم کا مقتول وفا مناسب تھا۔ اب بات ہو جائے سلسلہ وار تحاریر کی تو دہر کی چند اقساط پڑھی ہیں اور ہر اگلی قسط پچھلی سے بڑھ کر ہوتی ہے اب حسام بٹ صاحب کھل کر لکھ رہے ہیں۔ ناول میں بٹ صاحب سلور کو ٹین کے بڈھے گھاگ کھوسٹ یہودی ساتھوں کی جو لفظی درگت بناتے ہیں، خوب مزے دار ہوتی ہے۔ یہ دسمبر اور جنوری کی اقساط پڑھ کر کہیں کہیں بے ساختہ عمران سیریز کا علی عمران ذہن میں آتا رہا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، اور طاہر جاوید مغل صاحب کی قاتل مسیحا کی پہلی قسط سنسنی خیز اور بھرپور تھی جبکہ دوسری قسط نسبتاً ہلکی رہی اور جب ناول سنسنی خیز ہوا تو قسط ختم۔ بیشک پانچ اور بارہ بولنے کے لیے منا ایک ہی طرح کھاتا ہے۔ لیکن کیا ڈیرن اور یوزوکی اردو میں گفت و شنید فرما رہے تھے۔ شاید مغل صاحب حسام کو مارنے کے چکر میں ہیں اسی لیے وہ بھی انڈیا پہنچ گیا ہے۔ تیسری قسط پڑھ کر یہ بات کچھ سچ ہوتی لگ رہی ہے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اور یہ کیا بے ہودگی ہے انڈینز کی دو تین شوہروں والی لعنت ہے من گھڑت مذہب کا یہی ہوتا ہے جو مرضی ایجاد کرتے رہو، کوئی پابندی نہیں۔ بہرحال یہ قسط بھی شاندار تھی۔ قاتل مسیحا کا پہلی قسط کا خاکہ بھی زبردست تھا۔ دوسری قسط کا بھی اچھا تھا۔ دیگر میں کیس نمبر تین سو تیرہ، زہریلی شناسائی، پھندا اور آبی قیامت کے خاکوں پر محنت کی گئی تھی۔ اور ابھی ہم کہنا چاہ ہی رہے تھے کہ دیسی کہانیوں کے خاکوں پر بھی توجہ دی جائے کیونکہ ہم ٹائٹل کے ساتھ اس پر بھی غور کرتے ہیں بلکہ میں تو کہانی کے خاکے کو ضرور نوٹس کرتی ہوں اور کہے بغیر ہی فروری کے سارے ہی خاکے زبردست تھے۔ (دیسی، بدیسی دونوں کے اسکیچز بنوائے جاتے ہیں) گزارش ہے بغل بچہ اور بے بکرا کی طرح مزاحیہ کہانیاں بھی شائع کیجیے۔"

کراچی سے محمد اقبال کی بھاگ دوڑ" ماہ جنوری کی طرح ماہ فروری کا ٹائٹل بھی خوب صورت لگا۔ دونوں میں ایک حسینہ اور ایک مرد موجود ہیں۔ فروری کے ٹائٹل پر موجود حسینہ بے چارگی سے پڑے مرد کو دیکھ رہی ہے۔ مرد نجانے کس کو دیکھ رہا ہے، شاید ایمبولینس کا انتظار کر رہا ہے۔ فہرست عمدہ لگی۔ اداریہ خوش امیدی پر مشتمل ہے۔ مابدولت پہلے نمبر پر موجود ہیں مبارک ہو جی مجھے۔ محمد حسنین اپنے بھرپور تبصرے اور جنید اپنی مصروفیت کے باعث مختصر تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ محفل میں تین خواتین ماورا عالمگیر، حمیرا رفیق اور آسیہ بتول کی موجودگی پر خوشی ہوئی۔ پچھلے دو ماہ سے میری نصف بہتر کے پتّے کے درد نے میرا پتّا پانی کر دیا تھا۔ بہرحال آپریشن ہو چکا ہے تمام دوستوں

سے دعائے صحت کی درخواست ہے۔ (اللہ تعالیٰ انہیں جلد کامل صحت یابی عطا کرے) کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی آبی قیامت پڑھی۔ تہلکہ خیز رہی۔ کائی تناکا، راشیل کی باہمت کوششوں نے حیران کردیا۔ دونوں کی احساس ذمے داری نے دل موہ لیا۔ بالآخر راشیل دوسروں کی جانیں بچانے کی کوششیں کرتے کرتے اپنی جان سے گئی اور ذہن پر اپنی اعلیٰ ظرفی کے انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔ بہترین کہانی ترجمہ کی امجد رئیس نے، ویلڈن جی۔ دوسرے نمبر پر طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا شروع کی۔ جس زہر کی تلاش میں جادورامے تھا بالآخر وہ اس مقام تک پہنچ گیا۔ تابش کے کارنامے کو اپنے سر باندھنے کی جو غلطی جادورامے نے کی ہے، اب اس کا خمیازہ اسے بھگتنا ہوگا۔ اس قبیلے کے رسم و رواج اور مقامی موسم کے بارے میں مغل صاحب نے جس انداز میں لکھا ہے، اس نے آخر تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھا۔ حسام بٹ کی دہر کی یہ قسط مناسب رہی۔ جاسم کے نئے مددگار سامنے آرہے ہیں۔ لازمی بات ہے جاسم کے یہودی دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اس کے مددگار بھی پاورفل ہونے چاہئیں۔ لینا، ابوریان جاسم کی بھرپور مدد کریں گے۔ ابوریان کی شخصیت بھی اعلیٰ دکھائی گئی ہے۔ ابوریان اور جاسم کی گفتگو اچھی لگی۔ لیلیٰ حسینی اور فیضی نے ڈیوڈ کا آلہ کار بن کر نشا کو اغوا کرلیا مگر منہ کی کھائی۔ فیضی بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ کامل کے ایکشن کا انداز جاسم سے ملتا جلتا ہے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کامل ایکشن میں ہے یا جاسم۔ بہرحال اچھی چل رہی ہے کہانی۔ علی امجد کی کالی کوکھ مختصر تحریر مگر پُراثر انداز میں پیش کی گئی۔ صابر بابو کی پُرتجسس طبیعت نے ایک معما حل کرلیا۔ یعقوب بھٹی کی تحریر امید کا مینار بہت خوب صورت، نازک سے جذبے سے بھرپور تحریر تھی، سردیوں کی راتوں میں لحاف میں گھس کر ڈائجسٹ پڑھنے کا مزہ ہی الگ ہے مگر اس طرح کی تحریر اس مزے کو دوبالا کردیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی تحاریر بہت مزہ دیتی ہیں۔ میر تاج کے جذبات سائرہ کے لیے بہت خوب صورت لگے۔ ویلڈن یعقوب بھٹی۔ عبدالرب بھٹی کی قتلِ دل وجاں ایک اچھی کہانی تھی۔ قصہ وہی دولت کے گرد گھوم رہا تھا بھٹی صاحب نے اچھی طرح کہانی کے تانے بانے بُنے۔ سبین کی بے وفائی آخر تک قائم رہی۔ اسے صرف دولت سے ہی غرض تھی۔ یاسر کو نازیہ کی صورت دوسری کہانی مل گئی۔ بہرام کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ وجہ سبین ہی تھی اس کی خاطر اس نے کیا کیا جتن کر کے دولت کمائی مگر اسے حاصل موت ہی ہوئی۔ مجموعی طور پر اچھی تھی کہانی۔ باقی ڈائجسٹ مصروفیت کے باعث نہیں پڑھ سکا اس لیے تبصرے میں اس کا ذکر نہیں انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرہ کرنے کی کوشش کروں گا۔'' (یقیناً، ہمیں انتظار رہے گا)

کوٹری سے حمیرا رفیق کی کاوش ''فروری کے شمارے کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کاشف بھائی نے بغیر کہے لاکر دے دیا۔ ٹائٹل پر موجود لڑکی کو دیکھ کر اپنی ایک پرانی دوست یاد آگئی۔ آج کل وہ دبئی میں ہوتی ہے۔ ٹائٹل پر مرد حضرات کبھی فائر کررہے ہوتے ہیں تو کبھی زخمی نظر آتے ہیں۔ فہرست اچھی لگی۔ اداریے میں آپ کی نیک تمناؤں پر آمین کہتی ہوں۔ محفل میں محمد اقبال صاحب سرفہرست ہیں، مبارک باد۔ محمد حسنین کا تبصرہ بھی بہت پسند آیا۔ ماورا عالمگیر اور آسیہ بتول کی مختصر آمد اچھی لگی۔ خواتین کی آمد سے محفل میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ (ہاں جی آپ تو یہی کہیں گی) جنید علی کا مختصر تبصرہ کچھ جچا نہیں۔ کہانیوں میں امجد رئیس کی آبی قیامت کی سنسنی خیزی آخری لمحات تک برقرار رہی، بہت کمال کی کہانیاں ترجمہ کرتے ہیں۔ اللہ پاک انہیں صحت کے ساتھ زندگی عطا فرمائے اور وہ ہمارے لیے اسی طرح عمدہ تحریریں پیش کرتے رہیں۔ دوسرے نمبر پر طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا پڑھی۔ بلاشبہ ان کا اندازِ تحریر بھی آخر تک اپنے شکنجے میں جکڑے رکھتا ہے۔ ساتھ ہی عمران کی شرارتیں بہت مزہ دیتی ہیں۔ اس قسط میں ماہین نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر عمران کی جان بچائی۔ اس بار حشام کی ٹھیک ٹھاک مٹی پلید ہوگئی ہے۔ ماہین پر بلاوجہ اپنا رعب ڈالتا رہتا ہے۔ قبائلی روایات کی آڑ میں مایارانی نے حشام کی محبت کا بھرم توڑ دیا، اور عمران سرخرو ہوگیا۔ دوسری طرف رامے اور مائرہ کی کہانی بھی اب اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ گندھارا کا کردار بھی بہت عمدہ ہے۔ اس نے رامے اور مائرہ کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے، شدت سے انتظار ہے۔ حسام بٹ کی دہر بھی مناسب چل رہی ہے۔ نئے کرداروں کا اضافہ ہورہا ہے۔ لینا اور ابوریان کہانی میں شامل ہوگئے ہیں۔ جاسم کی مدد کررہے ہیں۔ نشا کا اغوا اور رہائی کا ایکشن بھی اچھا تھا۔ آخر میں طلال حسنی کو ٹیلی فون کال نے پریشان کردیا ہے اور کامل کی آزادی کو جاسم سے مشروط کردیا گیا ہے۔ کالی کوکھ چھوٹی سی مگر اچھی کہانی لگی۔ امید کا مینار بہت عمدہ لگی، ڈائجسٹ کی دوسری تحریروں سے ہٹ کر رہی۔ بہت خوب یعقوب بھٹی صاحب۔ قتلِ دل و جاں عبدالرب بھٹی کی ایک پُراثر تحریر تھی۔ سبین کے چکر میں بہرام نے کیا کیا پاپڑ بیلے ملا کیا کچھ بھی نہیں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

ملتان سے محمد حسنین کی گستاخیاں ''فروری کا جاسوسی ابتدائی تاریخوں میں ہی مل گیا۔ سرورق بہت ہی سادہ تھا۔ برا نہیں تھا لیکن آرٹسٹ صاحب نے ایسا لگا کہ جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ بس جلدی جلدی ایک کیوٹ سی لڑکی پینٹ کی۔ ایک لاش کو لٹایا اور ٹائٹل آپ کے حوالے کردیا۔ بیک گراؤنڈ خالی خالی سا محسوس ہوا۔ آگے بڑھنے پر ایک خوشگوار سرپرائز جنگل کے اشتہار کی صورت میں ملا۔ توقع اور خواہش تو یہی تھی کہ طاہر جاوید مغل کا ناول ہو لیکن امجد جاوید بھی بہت اچھے رائٹر ہیں تو امید ہے کہ ان کا یہ سلسلہ ان کے پچھلے ناول انا گیر سے بھی دو ہاتھ آگے ہی ہوگا۔ (انشاء اللہ) فلسطین کے حوالے سے آپ کی باتیں پڑھیں۔ سوال ذہن میں یہی آیا کہ امت اور قوم کا درد

صاحبِ اقتدار آخر کیوں محسوس نہیں کرتے؟ ٹاپ پوزیشن اس بار اقبال صاحب کے حصے میں آئی۔ انہوں نے دل کو چھو لینے والے انداز میں اپنے دل کی باتیں کیں جو پسند آئیں۔ دوسری پوزیشن پر خود کو دیکھا اور خوشی ہوئی۔ ماورا عالمگیر عرصے بعد تشریف لائیں اور دبے دبے الفاظ میں شکایت ہی کر گئیں کہ تبصرہ نگار خود کون سا افلاطون ہیں جو رائٹرز کی کہانیوں میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اچھا انداز تھا۔ کوٹری کی حمیرا رفیق بھی اب مستقل ہو چکی ہیں۔ آن کا گھریلو اسٹائل بھی اچھا لگا۔ احتشام الحق نے بھی اچھا لکھا۔ آسیہ بتول اس بار کافی معقول دکھائی دیں۔ شکر ہے انہوں نے اپنی پسند مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے جنید کا مختصر نامہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی۔ ارے بھائی مصروفیات سے نکلو اور پھر سے ویسا لمبا چوڑا تبصرہ بھیجو جس کے لیے تم مشہور ہو۔ رونق رنگ چمن میں بانی ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ معراج رسول کا احوال پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے بہترین الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا اور ساتھ میں عذرا رسول کی کوششوں کے بارے میں بھی آگاہ کیا۔ ان کی ہمت کی وجہ سے ہی آج ہم جاسوسی جیسا زبردست ڈائجسٹ ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ امجد رئیس نے اس بار ابتدائی صفحات پر آبی قیامت کا دوسرا اور آخری حصہ پیش کیا۔ تیز رفتار کہانی، بدلتے واقعات اور سنسنی خیز ایکشن کہانی کو ایک ہی سانس میں ختم کرنے پر مجبور کر گیا۔ ویلڈن امجد رئیس۔ اگر جاسوسی کے صفحات کم نہ ہو گئے ہوتے تو میں آپ سے یہ فرمائش کرتا کہ ایسی کہانیاں مکمل شائع کیا کریں۔ پھر بھی بہت مزہ آیا۔ چھوٹی کہانیوں کی ابتدا اس بار نیو رائٹرز سے کی۔ اکثر نئے لکھاری کچھ مختلف اور کچھ اچھا ہی لے کر آتے ہیں لیکن اس بار ثمرین، شمیم کی ہمدم اور امجد اقبال کی کالی کوکھ دونوں ہی مایوس کن رہیں۔ ثمرین شمیم نے تو کہانی میں انگلش فلموں کے ناموں کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ حشر کیا کہ کہانی کا ابتدائی حصہ سر درد ہی بن گیا۔ اختتام البتہ بہتر تھا۔ کالی کوکھ میں لفاظی بہت تھی اور کہانی بہت کم اور کہانی بھی ایسی تھی جو جاسوسی کے معیار کے بجائے سرگزشت کی کسی سچ بیانی جیسا تاثر لیے ہوئے تھی۔ بہرکیف دونوں رائٹرز کو جاسوسی میں خوش آمدید۔ امید ہے اگلی بار وہ اپنی کمی کوتاہیوں پر قابو پاتے ہوئے کچھ بہتر پیش کریں گے۔ عکس فاطمہ کی گندے انڈے بہترین رہی۔ عائشہ نصیر نے بھی اچھا ترجمہ پیش کیا۔ اے آر راجپوت نے دیسی اسٹائل میں انگریزی کہانی کو پیش کرنے کی مہارت دکھائی۔ اچھی کہانی تھی لیکن انجام بہت ہی جلدی جلدی کیا اور آخری چند جملے تو زبردستی کے لگے۔ امید کا مینار اور مغرور نسبتاً بہتر کہانیاں تھیں۔ بات کریں سلسلے وار کہانیوں کی تو جاسوسی کی اکلوتی سلسلے وار حسام بٹ کی دہر سامنے آجاتی ہے۔ کہانی بہترین ہے لیکن مجھے اس سے وہی شکایت ابھی بھی ہے جو پچھلے ماہ تھی کہ بٹ صاحب کہانی کے ہیرو کو لے کر چلنے کے بجائے ضمنی کرداروں پر وقت ضائع کر رہے ہیں۔ طلال حسنی، نشا صباحی اور کامل اس حصے میں بھی چھائے رہے اور جاسم کو بہت کم صفحات پر نمودار ہونے کا موقع ملا۔ یہی بات سب سے زیادہ بور کرتی ہے کہ دو قسطوں سے ہیرو نے سونے جاگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ طاہر جاوید مغل نے عمران جونیئر کو سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا ہے۔ لگتا ہے کہ قاتل مسیحا جلد ہی اب کسی پار لگنے والی ہے۔ ان کا مخصوص انداز بہت پیارا ہے اور قاری کو فوراً ہی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ امید ہے کہ وہ کچھ طویل سلسلہ لکھنے پر بھی جلد ہی کام شروع کریں گے۔ (اچھا آپ کی خوش گمانی پر ہم بھی خوش ہیں) سرورق کی پہلی کہانی قتلِ دل و جاں لکھی عبدالرب بھٹی صاحب نے۔ کہانی پڑھتے پڑھتے مجھے بڑی زبردست قسم کی نیند آئی اور میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اگلا دن شروع ہو چکا تھا۔ (واہ آپ کو تو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ایسی خوب صورت میٹھی نیندیں یوں ہی نہیں آجاتی) دوسری رات سرورق کی دوسری کہانی مقتول وفا پڑھنی شروع کی۔ فاروق انجم کے مخصوص دلچسپ انداز میں کہانی شروع ہوئی اور پھر ایسے اتفاقات کا سلسلہ شروع ہوا کہ مجھے پھر نیند آ گئی۔ ابھی نیند سے جاگا ہوں تو آپ کو لیٹر بھیج رہا۔ امید ہے کہ جگہ مل جائے گی۔ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت ہوگی۔" (اگر نیند پوری ہو گئی......)

ملتان سے جنید علی کی تعلیمی سرگرمیوں کا احوال "چینی نکتہ چینی کے باسیو کیسا حال چال ہیں؟ امید ہے فروری کے شمارے کی سنسنی خیز تحریروں سے آپ بھی میری طرح لطف اندوز ہو چکے ہوں گے۔ شمارہ وقت پر ہی ملا ہے مگر اس بار بھی ایجوکیشنل اور سوشل ایکٹیویٹیز کی وجہ سے مختصر تبصرے پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ سرورق جس کا کلر کومبینیشن بہت منفرد ہے۔ اس کی حسینہ پڑھنے والوں کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہے وہیں ایک صاحب شاید دنیا کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ خطوط کی محفل میں اقبال صاحب کافی چابکدستی سے محفل کا دروازہ کھول رہے ہیں۔ ملتان کے حسنین بھائی ذرہ نوازی ہے آپ کی کہ تبصرہ پسند کرتے ہیں پھر آپ ہی سے سیکھا ہے کہ ہم سے سینئر جو ٹھہرے۔ ارسلان صاحب اگر ہر ماہ شرکت کریں تو محفل کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ حمیرا رفیق کی جاسوسی کے لیے اتنی محبت و اپنائیت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ قارئین اتنا پسند کرتے ہیں۔ آسیہ بتول کے منفرد تبصرے بھی خوب ہوتے ہیں۔ وادی کشمیر سے احتشام الحق کی باتیں دلچسپ تھیں۔ انور یوسف زئی، عاتکہ کامران، سہانا شیخ اور آفاق احمد بھائی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ماورا عالمگیر پھر سے لوٹ آئیں، بہت خوب۔ ویسے نومبر کے خط میں پرانے ساتھیوں کے ساتھ ان کو بھی آواز دی تھی کہ واپس جاسوسی میں لوٹ آئیں۔ عکس فاطمہ کی تحریر میں ہر بار کی طرح خیر و شر کی کارروائی تھی، ایک معیاری تحریر رہی۔ ٹامی فرڈینینڈ خود کو بہت ہوشیار سمجھ رہا تھا مگر رے بین اور اس کی شاطر اسسٹنٹ نینا اس سے دو ہاتھ آگے تھے جن کا پلان کامیاب ہوتا تھا۔ یعقوب بھٹی اس بار ہلکے پھلکے انداز میں شمارے میں شامل تھے۔ میر تاج کی قسمت میں شاید دائمی جدائی ہی تھی جو سائرہ ایک مسیحا بن کر آئی اور واپس چلی گئی اور اپنی یادیں چھوڑ گئی اور یعقوب صاحب کی معمول سے ہٹ کر یہ......

تحریر پسند آئی۔ ثمرین شمیم جاسوسی میں اچھا اضافہ ہیں۔ لیوک اور اس کا بھائی جو ''ہمدم'' تھے، ان کی الجھن سلجھن پر مبنی عملی کارروائیاں دلچسپی کا باعث تھیں۔ حسبِ روایت کہانیوں کی سائڈ پر کباب میں ہڈی بن کر مزاحیہ خاکوں اور لطائف نے ہنسانے کی بہتر کوشش کی۔ (شکر ہے اپنی کوشش کچھ کامیاب رہی) اے آر راجپوت کی تحریر میں رستم کی مہارت نے اعظم کو دن میں کافی اچھے سے تارے دکھائے جو ہمیں پسند آئے۔ (کیا تارے؟) جاسوسی کی ایک اور دیرینہ ساتھی عائشہ نصیر مرگِ مفاجات میں مسز پن فیلڈ نے رنگت کو تعصب و حقارت کی بنا پر اپنی بیٹی میلینی کے ہونے والے شریکِ سفر کو صفحۂ ہستی سے کافی چالاکی سے مٹا دیا مگر انجانے میں خود ہی آخر میں اعتراف کر گئیں۔ امجد اقبال کی تحریر بس ٹھیک تھی۔ صاعقہ کے چچا نے خونی رشتے کو پامال کیا مگر اس کا جرم زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکا۔ جمال دستی کی تحریر مغرور بھی بہترین رہی جس میں انسپکٹر جلال نے کافی سمجھداری اور موقع کی مناسبت سے سندر کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ آبی قیامت، سرورق کے تیکھے رنگوں اور قسط وار تحریروں پر اگلے ماہ تفصیلی گفت وشنید کریں گے تب تک کے لیے خدا حافظ۔ ملتے ہیں اگلے ماہ۔''

کوٹری سے آفاق احمد کا ڈر و خوف ''پچھلے دو ماہ سے غیر حاضر رہنے پر ساتھیوں سے معذرت۔ وجہ وہی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات رہیں۔ سال 2024ء کے جنوری اور فروری کے شمارے آہستہ آہستہ پڑھتے رہے اور خط لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بالآخر ہمت کی اور خط لکھنے بیٹھ گیا۔ جنوری کا ٹائٹل بھی بہت عمدہ تھا اور کہانیاں بھی۔ ساتھ ہی فروری کا ٹائٹل بھی سمپل مگر پُرکشش ہے۔ کہانیاں اس میں بھی اچھی لگ رہی ہیں۔ شروعات امجد رئیس کی آبی قیامت سے کی۔ جس نے ڈائجسٹ کا حق ادا کر دیا۔ بہترین تخلیق کی امجد رئیس صاحب نے۔ آخر تک کہانی کے سحر میں جکڑے رکھا۔ فوراً ہی دوسرا حصہ شروع کیا، ہائے ہائے کیا سنسنی سے بھرپور تحریر پڑھنے کو ملی۔ حساس طبیعت کے مالک کرداروں نے اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی جانیں بچائیں اور اپنی جانوں کی پروا نہیں کی۔ اپنے شہر کو مکمل تباہی سے بچانے میں کامیاب رہے، مزہ دوبالا کر دیا امجد رئیس صاحب نے۔ سونے پر سہاگا تو کیا طاہر جاوید مغل صاحب نے جن کی قاتل مسیحا ابھی جاری ہے۔ تابش کی ٹیم کا مقابلہ ہو رہا ہے بدصورت رامے کی ٹیم کے ساتھ۔ بالکل ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کا مزہ آرہا ہے۔ دونوں ٹیمیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں ہیں۔ دونوں ٹیموں کو سیکیورٹی رسک کا مسئلہ درپیش تھا اس لیے طاہر جاوید مغل نے انہیں تھرڈ گراؤنڈ میں پہنچا دیا ہے جہاں کی سردی نے دونوں ٹیموں کی قلفی جما دی ہے۔ رامے اور مایا رانی کے گٹھ جوڑ نے تابش کی ٹیم کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ چنے تو ماہین اور حسام بھی خوب چبوا رہے ہیں تابش صاحب کو۔ مایا رانی نے ایک گیم کھیل کر حسام، ماہین اور عمران کی محبت کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ جس میں حسام بالکل ناک آؤٹ ہو گیا۔ ماہین کی محبت بھی آشکار ہو رہی ہے۔ عمران کی محبت کے تو کیا کہنے۔ بہت کچھ لکھنے کو دل کر رہا ہے مگر قینچی سے ڈر لگتا ہے۔ (سہی سوچا) حسام بٹ کی دہر بھی تیزی سے آگے بڑھ رہی۔ جاسم کے ساتھ ساتھ کامل کو بھی ایکشن میں دکھایا گیا جو اچھا لگا۔ جاسم کی شرارتیں نشا، ایشار کے ساتھ اچھی لگتی ہیں۔ جاسم نے ڈیوڈ کی ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے اور اب وہ ڈیوڈ کی میڈم کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

حیدرآباد سے عاتکہ کامران کی پسندیدگی ''فروری کا جاسوسی ڈائجسٹ وقت پر مل گیا۔ گھر میں نند کی بیٹی کی شادی کی مصروفیات کے باعث محفل میں غیر حاضری رہی، اب دوبارہ محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ ٹائٹل دیکھ کر خوش گوار سا احساس ہوا پیاری سی حسینہ کو دیکھ کر۔ صنفِ کرخت کو دیکھ کر خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ فہرست بہت عمدہ لگی۔ فہرست میں اسما قادری کی کمی محسوس ہوئی۔ (کیوں جی جنوری میں تو اسما قادری براجمان تھیں) جاسوسی میں دہر کی صورت فقط ایک ہی سلسلہ وار کہانی چل رہی ہے۔ اس کی کمی کو امجد رئیس کی آبی قیامت اور طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا سے پورا کیا جا رہا ہے۔ التماس ہے کہ نئی سلسلے وار کہانی طاہر جاوید مغل صاحب کی ہی شائع کی جائے تو عین نوازش ہوگی۔ امجد رئیس کی آبی قیامت کے نام سے ہی تھرتھلی سی محسوس ہوئی جسم میں۔ اور دونوں قسطیں پڑھ کر واقعی یہ تھرتھلی آخری لمحے تک جاری رہی۔ بہت ہی شاندار کہانی قارئین کے لیے امجد رئیس نے تحریر کی ویلڈن جی۔ طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا بھی اپنے نام کی طرح بہترین کہانی ہے جو ابھی جاری ہے شاید اگلی قسط آخری ہو۔ عمران نے ماہین سے اپنی محبت ثابت کر دی ہے۔ حسام ذلیل ہو گیا ہے۔ ماہین شش و پنج میں گرفتار ہے کہ محبت کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ تابش، رامے کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی رہے گا۔ باقی سارے کردار اپنی، اپنی جگہ بہترین پرفارمنس دے رہے ہیں۔ دہر حسام بٹ کی اچھی چل رہی ہے۔ نئے کرداروں کی بھرمار ہو رہی ہے لیکن حسام بٹ نے اچھا بیلنس رکھا ہوا ہے جاسم اور کامل کی پرفارمنس عمدہ ہے۔ ڈیوڈ اور ان کی کوئین صاحبہ کو دیکھتے ہیں جاسم کس طرح پار لگاتا ہے۔ یعقوب بھٹی کی امید کا مینار منفرد سی کہانی رہی۔ یعقوب بھٹی کا شمار بھی میرے فیورٹ رائٹرز میں شامل ہو گیا ہے۔ عائشہ نصیر کی مرگِ مفاجات بھی پسند آئی۔ امجد اقبال کی کالی کوکھ بھی بہتر لگی۔ جمال دستی کی مغرور اور عکس فاطمہ کی گندے انڈے بھی پسند آئیں۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

شاہدہ مختار، کراچی۔ سرمد خان، پشاور۔ جمشید احمد، کوٹری۔ فہمیدہ ملک، لاہور۔

# صفِ شکن

## ایچ اقبال

دیوانہ وار محبت کرنے کا جذبہ نوجوانی کی علامت ہے... عمر کی ایک سرحد وہ ہوتی ہے جس کو عبور کرتے ہی دل و دماغ یا جسم میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوتی ہے... نئی خواہشات اور مطالبات جنم لیتے ہیں... یہ وہ تپش ہے جو زندگی کو گرما سکتی ہے... محبت کرنے کی، دنیا کو بدل دینے کی خواہش نوجوانی کے دور میں بیدار ہوتی ہے اور اسے زندہ رکھنے کی شعوری کوشش ہماری زندگی کو سنوار سکتی ہے۔ نوجوانی کی عمر سے ان دونوں کے بھی یہی خواب تھے... یہی تمنّا و خواہش تھی... مگر ہمارے معاشرے و ماحول میں محبت کرنا اور رزقِ حلال کمانا دشوار رہا ہے۔ ہر معاشرے میں کام کرنے اور محنت کرنے کا الگ الگ نظریہ ہوتا ہے... انتہائی محنت سے کام کرنے کی روایت ہمارے یہاں کافی کمزور ہے۔ ہر منصب پر کام کرنے کی دو بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اہلیت اور ایمانداری... اس کا منصب چھوٹا تھا مگر وہ قابلیت کے ساتھ باہمت... بہادر اور سب سے اہم ایمان دار تھا... اس کے لیے کڑی آزمائش شروع ہوگئی تھی۔ ایک طرف محبت... دوسری طرف احساس ذمّے داری اور تیسری ایمانداری۔ تینوں عجیب و غریب دوراہے تھے جو اسے مسلسل دوڑا رہے تھے...

دوستوں کے بھیس میں چھپے دشمنوں کے خلاف صف شکن جانبازوں کی لڑائی

بابو میاں کا گھر غریب تو نہیں لیکن کسی حد تک خوش حال تھا۔ اُن کی بیوی کچھ بیمار رہتی تھیں۔ دو جوان بیٹے تھے۔ بہت سنجیدہ رہنے والے بیٹے کا نام شجاعت تھا۔ دوسرا بیٹا جوہر کھلنڈرا تھا جسے حصولِ تعلیم سے زیادہ کرکٹ سے دلچسپی تھی۔ دونوں بھائیوں کی عمر میں صرف ایک سال کا فرق تھا اس لیے چھوٹا بھائی جوہر اپنے بڑے بھائی کو نام سے ہی پکارتا تھا۔ دونوں میٹرک کر چکے تھے۔ جوہر کھلنڈرا تھا اس لیے ایک سال فیل بھی ہو چکا تھا۔ اب وہ دونوں ہی فرسٹ ایئر میں تھے۔ شجاعت سنجیدگی سے ملازمت کی تلاش میں تھا۔ ملازمت مل جانے کے بعد وہ نائٹ کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی لیکن ملازمت ملنے سے پہلے وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جوہر کو کالج میں ایک لڑکی رضیہ پسند آگئی تھی اور وہ جوہر کو چاہنے لگی تھی۔ اُن دونوں کا رومانس خوب چل رہا تھا۔ جوہر کو ملازمت کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔

شجاعت ایک دن بہت خوش خوش گھر میں داخل ہوا۔ اسے پولیس میں کانسٹیبل کی ملازمت مل گئی تھی۔ بابو میاں اور ان کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ جوہر نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

شام کے پانچ بجے تھے جب جوہر برآمدے میں بیٹھا کرکٹ کے جوتے پہن رہا تھا۔ قریب ہی اس کا بیٹ رکھا ہوا تھا۔

شجاعت نے برآمدے میں آکر جوہر کی طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری ہونے والی بھابی کو اپنی ملازمت کی خوش خبری دینا چاہتا ہوں۔ تم یہ خط اس کے گھر پہنچا دو۔''

لڑکی کے گھر میں دونوں ہی بھائیوں کا آنا جانا رہا کرتا تھا لیکن منگنی کے بعد شجاعت کا اس گھر میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔

''میں اس وقت نہیں جا سکتا شجو!'' جوہر نے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ کرکٹ کھیلنے جا رہا ہوں۔ بیس اوور کا میچ ہے تم خود پہنچاؤ خط بھابی کو۔''

''میں اب اس کے گھر نہیں جاتا ہوں۔''

''لیکن میں اس وقت نہیں جا سکتا۔ کہا تو کہ پہلے ہی کچھ دیر ہو چکی ہے۔''

''پلیز جوہر!''

جوہر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ بابو میاں برآمدے میں آئے اور ایک نسخہ جوہر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''اپنی ماں کے لیے جلدی سے یہ دوا لا دو۔''

نسخے کے ساتھ ایک نوٹ بھی تھا جو انہوں نے بڑی عجلت میں جوہر کو دیا اور گھر میں واپس چلے گئے۔

''یہ دوا تم لا دو شجو!'' جوہر نے نسخہ اور نوٹ شجاعت کو دے دیا۔

''ارے یہ خط جلدی پہنچانا ہے۔''

''کل پہنچا دوں گا۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں۔'' جوہر کھڑا ہو گیا۔

''پلیز جوہر......! میں یہ خوش خبری اسے آج ہی پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''دوا لا کر دے دو، پھر چلے جانا۔'' جوہر نے برآمدے سے اترتے ہوئے کہا اور اپنی سائیکل سنبھالنے لگا۔

شجاعت نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ نہیں رکا اور چلا گیا۔

شجاعت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دوا لینے چلا گیا۔ میڈیکل اسٹور میل بھر دور ایک بڑی سڑک پر تھا۔ شجاعت نے وہاں سے دوا خریدی اور باہر نکلا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکے نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دھماکے کا سبب بھی دیکھ لیا۔ وہ ایک کار تھی جو دھماکے سے اُڑی تھی۔ اس کے کئی ٹکڑے اُدھر گئے جہاں چند کاریں کھڑی تھیں۔ ان جلتے ہوئے ٹکڑوں میں سے ایک کسی کار کے پیٹرول کے حصے پر گرا۔ وہ کار بھی دھماکے سے اُڑی اور پھر دوسری کئی کاریں بھی زد میں آ گئیں۔ پے در پے کئی دھماکے ہو گئے۔ ان جلتے ہوئے ٹکڑوں نے کئی راہ گیروں کو بھی زد میں لے لیا۔ ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ کئی دکانیں بھی اس کی زد میں آ گئیں۔ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ ہاہا کار مچ گئی۔ شجاعت نے دیکھا کہ ایک عورت رو رو کر اپنے بچے کے کپڑوں کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شجاعت مدد کے لیے اس کی طرف دوڑا۔

ہر طرف دھواں پھیل رہا تھا۔ چیخ پکار میں کسی کو کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جو لوگ آگ سے محفوظ رہے تھے، وہ بے تحاشا وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ عورت کی چیخ پکار پر شجاعت کے سوا کسی نے دھیان نہیں دیا۔

شجاعت نے کسی طرح بچے کے کپڑوں میں لگی ہوئی آگ بجھا دی لیکن بچہ بری طرح زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

''اسے فوراً اسپتال پہنچانا ضروری ہے۔'' شجاعت نے کہا۔

ایک کار والا کسی طرح اس آتش زدہ علاقے سے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شجاعت نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن کار والا نہیں رکا۔ شجاعت نے آوازیں بھی دی تھیں کہ اس بچے کو اسپتال پہنچانا ہے لیکن کار والے نے اس کی آواز نہیں سنی اور کار تیزی سے نکال کر لے گیا۔

شجاعت کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل کی طرف جھپٹا۔ وہ موٹر سائیکل کسی کی بھی ہو، شجاعت اس وقت اسی کی مدد سے عورت اور اس بچے کو وہاں سے نکال کر لے جانا چاہتا تھا۔

موٹر سائیکل ایک دکان کے سامنے کھڑی تھی۔ آگ دکان میں بھی لگی تھی۔ شجاعت موٹر سائیکل کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دکان کا ایک چوڑا تختہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اس طرح گرا کہ شجاعت اس میں دب کر زخمی ہو گیا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے خود کو تختے سے نکالنے کی کوشش کی لیکن ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ پھر ایک جلتا ہوا ٹکڑا بھی اس تختے پر آ گرا۔ اس کا دھکا شجاعت کے سر پر لگا تھا۔ اس چوٹ نے اسے بے ہوش کر دیا۔

☆☆☆

کرکٹ میدان میں جوہر کے چھکا لگانے پر تالیاں بج ہی رہی تھیں کہ گراؤنڈ کے باہر موجود ٹیم کے بارھویں کھلاڑی نے چیخ کر ٹیم کے ایک کھلاڑی کو بتایا کہ اس علاقے میں بڑے زور کی آگ لگی ہے جہاں اس کے بھائی کا میڈیکل اسٹور ہے۔ اس خبر سے جوہر کے پیروں تلے سے بھی زمین نکل گئی۔ وہ اور اس کا بھائی شجاعت اسی اسٹور سے دوائیں لیتے تھے۔

جوہر اور دوسرا لڑکا فوراً میدان سے بھاگ نکلے۔ میچ درہم برہم ہوگیا۔ جوہر کو اپنے بھائی کا خیال آیا تھا کہ وہ میڈیکل اسٹور سے واپس نکل چکا ہوگا یا نہیں......؟ اس نے سائیکل پوری قوت سے دوڑا دی۔ میڈیکل اسٹور سے پہلے اس کا گھر پڑتا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے وہاں رکا کہ شجاعت واپس آگیا یا نہیں......

بابو میاں نے اسے دیکھتے ہی گھبرا کر کہا۔ ''سننے میں آرہا ہے کہ میڈیکل اسٹور کے قریب بہت خوفناک آگ لگی ہے۔''

''میں نے دوا لینے کے لیے شجاعت کو بھیج دیا تھا۔'' جوہر نے کہا۔ ''وہ واپس آگیا یا نہیں؟''

''نہیں، وہ تو ابھی نہیں لوٹا۔''

''میں دیکھتا ہوں جا کر۔'' جوہر نے پھر سائیکل دوڑا دی۔

سائیکل پر میڈیکل اسٹور تک پہنچنے میں وقت نہیں لگا۔ وہاں قیامت کا منظر تھا۔ ساری فضا دھوئیں کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی پہنچ گئی تھیں اور پانی کی موٹی دھاریں آگ کے شعلوں پر گر رہی تھیں۔

''شجو!'' جوہر چیختا ہوا متاثرہ علاقے میں داخل ہو گیا۔ اسے دو پولیس والوں نے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

ایک ویلفیئر ادارے کی ایمبولینسز بھی وہاں موجود تھیں۔ اس کے کارکن بڑی تیزی سے مصروفِ کار تھے۔ مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

اتفاق سے جوہر نے وہ اسٹریچر دیکھ لیا جس پر اس کے بھائی کو لے جایا جا رہا تھا جو اب ہوش میں تھا لیکن شدید زخمی تھا۔

''شجو!'' جوہر چیختا ہوا اسٹریچر کے قریب پہنچ کر اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔

''جوہر!'' شجاعت کی آواز بہت مدھم تھی۔

''یہ تمہارا بھائی ہے یا دوست؟'' اسٹریچر لے جانے والے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے جوہر سے پوچھا۔

''ہم بھائی ہیں۔'' جوہر نے جذبات سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت اس کا کھلنڈرا پن کافور ہو چکا تھا۔

شجاعت کی آنکھیں اس وقت بہت کم کھلی ہوئی تھیں..... وہ بولا تو اس کی آواز مدھم ہی تھی۔ ''اب تمہیں سنجیدہ ہو جانا چاہیے...... جوہر...... ذمے دار بنو...... ماں باپ کا بہت خیال رکھنا۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا بھیّا!'' جوہر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''آج پہلی بار تم نے مجھے بھیّا کہا۔'' شجاعت کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ ابھری۔ ''اب اپنے بھیّا کی نصیحت کی لاج رکھنا۔''

''کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔'' جوہر چیخ پڑا۔

اس وقت اسٹریچر ایمبولینس میں چڑھایا جانے لگا۔ جوہر بھی اسی ایمبولینس میں چڑھ گیا جس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ وہ دونوں بھائی تھے۔

''ابو...... امی کو...... میرا سلام......'' اس مرتبہ شجاعت بڑی مشکل سے بول سکا۔ ''ذمے داری اور ایمان داری سے کوئی...... کام...... کرنا...... ہمیشہ......'' اس کی آخری بات ادھوری رہ گئی۔

ایمبولینس اسٹارٹ ہوئی تو شجاعت دم توڑ چکا تھا۔

''بھیّا!'' جوہر چیخ کر بھائی سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

بابو میاں کے گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ ماں تو بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ پاس پڑوس کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ عورتیں شجاعت کی ماں کو ہوش میں لانے کے لیے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھیں۔ مرد حضرات بابو میاں کو سنبھال رہے تھے۔ دو بزرگ جوہر کو سنبھال بھی رہے تھے اور اسے نصیحت بھی کرتے جا رہے تھے کہ اب اس کو اپنے بوڑھے ماں باپ کا سہارا بننا ہے اس لیے بھائی کا غم مردانگی سے برداشت کرنا ہوگا۔

بڑے سے بڑا غم انسان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

شجاعت کی تدفین کے بعد جوہر نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب اسے کیا کام کرنا چاہیے۔ یہ شاید اس گھر کی خوش قسمتی تھی کہ جوہر کو بھائی کی جگہ پولیس میں کانسٹیبل کے طور پر بھرتی کر لیا گیا۔

جب پہلی بار جوہر نے پولیس کی وردی پہنی تو آئینے کے سامنے اپنے عکس سے کہا۔ ''تجھے اپنے بھائی کی لاج رکھنا ہوگی جوہر...... پوری ایمان داری سے کام کرنا ہوگا۔''

لیکن پولیس میں رہ کر ایمان داری سے کام کرنا اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا۔ قدم قدم پر مشکلات اس کے سامنے آتی رہیں۔ وہ جس پولیس اسٹیشن میں تعینات کیا گیا تھا، اس کے انچارج سب انسپکٹر کا نام کچھ اور تھا لیکن وہ راجا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک دھاکڑ پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ رشوت خور بھی تھا۔ وہ جوہر سے خوش نہیں رہ سکا۔ دوسرے کانسٹیبلوں کی طرح جوہر اس کے لیے ''شکار'' تلاش نہیں کرتا تھا۔ تھانے میں اس کا کوئی بہی خواہ تھا تو صرف ہیڈ کانسٹیبل عباس جو جوہر کی ایمان داری سے خوش تھا لیکن دوسروں کے سامنے اپنی اس خوشی کو چھپاتا تھا ورنہ اسے بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

جوہر جیسے تیسے کام کرتا رہا۔ ان دنوں میں اس نے رضیہ سے بھی ملنا جلنا کم کر دیا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔

''مجھے جلد از جلد ترقی کرنے کے لیے اپنے کام پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے رضیہ...... مناسب وقت آئے گا جب ہم شادی کر لیں گے۔''

رضیہ اُس کے جذبات سمجھتی تھی اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کسی آسودہ گھر کی لڑکی نہیں تھی اس لیے اس نے کار ڈرائیونگ سیکھ کر اس کا کورس بھی کر لیا تھا۔ اسے ایک ڈرائیونگ اسکول میں ٹرینر کی ملازمت بھی مل گئی۔ کالج کے بعد ڈرائیونگ اسکول میں وہ خواتین کو ڈرائیونگ سکھایا کرتی تھی۔

وہ ڈرائیونگ اسکول گھر کے قریب بھی تھا۔ جس کا مالک جاوید اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش بھی کرتا رہتا تھا۔ رضیہ بڑی ذہانت سے اس کو بے قابو ہونے سے روکے رکھتی تھی اور یہ کوشش بھی کر رہی تھی کہ کسی دوسری جگہ ملازمت مل جائے۔

کبھی کبھی وہ کسی عورت کو ڈرائیونگ سکھاتے ہوئے اس پولیس اسٹیشن کے قریب سے گزرتی تھی جہاں جوہر تعینات تھا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتی تھی اور موبائل پر جوہر سے رابطہ کر کے دو چار باتیں کر لیا کرتی تھی۔

وہ پولیس اسٹیشن اس علاقے میں تھا جہاں سے چیف منسٹر ثانیہ کی کار اکثر گزرا کرتی تھی۔ چیف منسٹر ہاؤس جانے کا راستہ ہی وہ تھا۔ اسی لیے جب چیف منسٹر کی گاڑی کو وہاں سے گزرنا ہوتا تھا تو جوہر کی ڈیوٹی بھی وہاں لگائی جاتی تھی۔

دھماکے میں مرنے والوں کے متعلقین کے لیے چیف منسٹر نے خاصی بڑی رقم بھی دی تھی جس سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تھا۔ لوگوں کو اس کے وہاں سے گزرنے کا وقت معلوم ہو جاتا تھا تو وہ سڑک کے دونوں کناروں پر جمع ہو کر ''چیف منسٹر ثانیہ، زندہ باد'' کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ وہاں مامور کانسٹیبلوں کا فرض تھا کہ کسی کو چیف منسٹر کی کار کے قریب نہ جانے دیں۔

ایک موقع پر جب چیف منسٹر ثانیہ کی کار وہاں سے گزری تو اس نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار ایمبولینس بھی آ رہی تھی۔

اس ایمبولینس کو دیکھ کر جوہر نے جلدی سے بڑے بڑے بیریئر لگا کر اس طرح راستہ روکا کہ چیف منسٹر کے قافلے کو رکنا پڑتا اور پھر... ایمبولینس کے لیے راستہ کھول دیتا۔

تین کانسٹیبل چیخے کہ یہ کیا کر رہے ہو لیکن جوہر نے ایک نہ سنی۔ چیف منسٹر کے قافلے کو رکنا پڑا۔ ایمبولینس اس سے ذرا پیچھے تھی۔

''ایمبولینس!'' جوہر پوری طاقت سے چیخا۔ ''جلدی نکلو۔''

ایمبولینس نے رفتار بہت تیز کر دی۔ اس کے سائرن کی آواز تیز ہوتی چلی گئی اور پھر جوہر نے راستہ کھول دیا۔ ایمبولینس نکل گئی۔ اس کے بعد چیف منسٹر کے قافلے کو بھی آگے بڑھنا چاہیے تھا لیکن قافلے کی کسی کار نے بھی حرکت نہیں کی۔ اس کا سبب جوہر کی سمجھ میں آ گیا۔ چیف منسٹر اپنی کار سے اتر آئی تھی۔ وہ باوقار انداز میں چلتی ہوئی جوہر کی طرف بڑھی۔ اس کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ نقش و نگار بھی اچھے تھے۔ اس نے بہت کم عمری میں سیاست کے میدان میں قدم جمایا تھا اور سال بھر پہلے دوسری بار چیف منسٹر بنی تھی۔

جوہر اٹینشن ہو گیا۔ اُس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ اندازہ ہی نہیں لگا سکتا تھا کہ چیف منسٹر کا اس سے کیا رویہ ہوگا لیکن

وہ مطمئن تھا کہ اس نے جو کچھ کیا، غلط نہیں تھا۔ بڑے سرکاری قافلوں کی وجہ سے کئی ایمبولینس اپنے مریضوں کی زندگیاں کھو چکی تھیں۔ جوہر ایسی خبریں اخباروں میں پڑھتا رہا تھا۔

چیف منسٹر سے پہلے سب انسپکٹر راجا جوہر کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جوہر پر گرجنا شروع کیا ہی تھا کہ چیف منسٹر قریب آگئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب انسپکٹر کو خاموش کیا اور سنجیدہ لہجے میں جوہر سے بولی۔

''جو کچھ تم نے کیا، وہ غلط تھا یا صحیح؟''

جوہر فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا۔

''ٹھیک کیا تم نے!'' چیف منسٹر مسکرائی۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے بھی غریب عوام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

جوہر کی جان میں جان آگئی۔ ''شکریہ میڈم!'' اس کے منہ سے نکلا۔

''تمہارا نام جوہر ہے۔'' چیف منسٹر بولی۔ پھر سب انسپکٹر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''ابھی انہوں نے تمہیں اسی نام سے مخاطب کیا تھا۔''

''جی ہاں میڈم!'' جوہر نے کہا۔

''تم نے اپنے نام کی لاج رکھ لی۔'' چیف منسٹر نے جوہر کا شانہ تھپکا۔ ''ہمیشہ اپنا فرض اسی طرح ادا کرنا۔ چیف منسٹر ہو یا پرائم منسٹر، کوئی بھی عوام کے سامنے اہمیت نہیں رکھتا۔ خوش رہو۔'' وہ پلٹ کر اپنے قافلے کی طرف جانے لگی۔

لوگوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا تو چیف منسٹر کا نام لے کر ''زندہ باد'' کے نعرے لگانے لگے۔ چیف منسٹر ان کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی کار میں جا بیٹھی۔ قافلہ فوراً چل پڑا۔

سب انسپکٹر غرایا۔ ''ہیرو بنتے ہو تم!''

''صاحب!'' جوہر نے دبی زبان سے کہا۔ ''وہ خود میری تعریف کر گئی ہیں!''

''یہی تو سیاست ہے۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''لوگوں کے ہجوم کے سامنے وہ تمہارے ساتھ سخت برتاؤ کرتیں تو عوامی سطح پر اس کا شدید ردِعمل ہوتا۔ اب دیکھنا کہ میری شامت آجائے گی۔ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ایسے غیر ذمّے دار شخص کو چیف منسٹر کے جلوس کے موقع پر ذمّے داری کیوں سونپی گئی تھی۔''

جوہر چپ رہا۔

☆☆☆

سب انسپکٹر راجا کے منہ سے نکلی بات صحیح ثابت ہوئی۔ دوسرے دن کے اخباروں نے یہ خبر اس طرح چھاپی کہ جوہر ہیرو بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی چیف منسٹر کے رویے کو بھی بہت سراہا گیا۔

اس دن راجا نے جوہر کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور میز پر رکھے اخبار پر گھونسا مار کر بولا۔ ''بن گئے ہیرو؟''

جوہر اس کی جھاڑ پھٹکار پر عموماً خاموش ہی رہتا تھا۔

''اب میری شامت آگئی ہے۔'' سب انسپکٹر پھر بولا۔ ''فون پر فون آرہے ہیں کہ اس کانسٹیبل کے خلاف کوئی ایکشن لیا جائے۔''

اس موقع پر جوہر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''وہ فون چیف منسٹر کے خوشامدیوں کے ہوں گے۔''

''بکواس مت کرو۔'' سب انسپکٹر غصے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کمرے کے باہر موجود پولیس والوں نے بھی سنی۔

''میں تمہارے الاؤنسز کٹوا دوں گا۔'' راجا نے کہا۔

اسی وقت ہیڈ کانسٹیبل عباس کمرے میں آگیا۔

''الاؤنس تو کیا۔'' جوہر بولا۔ ''آپ میری تنخواہ رکوا دیجیے گا۔ میں اپنے فرض سے غداری نہیں کر سکتا۔''

''زبان درازی بھی کرو گے۔'' سب انسپکٹر اس طرح آگے بڑھا جیسے جوہر کو مار بیٹھے گا۔

''کیا بات ہے، کیا بات ہے صاحب؟'' ہیڈ کانسٹیبل ان دونوں کے بیچ آگیا۔

''خر دماغ ہو گیا ہے یہ۔'' سب انسپکٹر نے جھٹکے سے اپنی انگلی جوہر کی طرف اٹھائی۔

''چھوڑیے صاحب!'' عباس نے کہا۔ ''نیا نیا آیا ہے۔ آپ کے مزاج کو نہیں سمجھتا۔''

''نیا نہیں ہوں میں۔'' جوہر بولا۔

''چل چل!'' عباس نے سب انسپکٹر کو دکھانے کے لیے جوہر کو دروازے کی طرف دھکا دیا، پھر پلٹ کر سب انسپکٹر سے کہا۔ ''میں سمجھاتا ہوں اِسے۔''

کمرے سے باہر نکل کر عباس نے نرم لہجے میں جوہر سے کہا۔ ''تو ہمیشہ خاموش رہتا تھا اس کے سامنے، آج کیا ہو گیا تجھے...... ارے وہ آفیسر ہے...... تجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''نقصان کی پروا نہیں۔'' جوہر نے کہا۔ ''میں اپنے

فرض سے غفلت نہیں برت سکتا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے فون پر جھاڑ پھٹکار سننا پڑ رہی ہے۔ اگر یہ سچ بھی ہے تو وہ فون چیف منسٹر کے خوشامدی افسروں کے ہوں گے۔''

''جو حقیقت... ہے، جلد سامنے آجائے گی۔ تو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ......''

اور حقیقت اس طرح سامنے آئی کہ دوسرے ہی دن اوپر سے آرڈر آگئے کہ جوہر کو ہیڈ کانسٹیبل بنا دیا جائے۔

عباس نے خوشی سے جوہر کو مبارک باد دی لیکن سب انسپکٹر راجا کے دل میں تو آگ بھڑک اٹھی ہوگی۔

''یہ ضرور چیف منسٹر صاحبہ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' جوہر نے خیال ظاہر کیا۔

''تم پر اس کی مہربانیاں بڑھتی ہی رہیں گی۔'' عباس نے کہا۔

''لیکن راجا تو مجھ سے اور خار کھانے لگا ہوگا۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''وہ اب بھی ہے تو بڑا آفیسر...... میرے ساتھ زیادتیاں کرسکتا ہے۔''

''برداشت کرتے رہو۔ چیف منسٹر کی مہربانیاں اور بڑھ سکتی ہیں۔''

جوہر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال رضیہ کی تھی۔ جوہر مسکرا دیا۔

''آہا!'' عباس ہنسا۔ ''تمہاری مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ کال رضیہ کی ہوگی۔ وہ تمہیں مبارک باد دینا چاہتی ہو گی۔''

''اسے ابھی کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔ خبر باہر تو نہیں نکلی ہوگی۔''

''مجھے خیال آیا تھا کہ تم نے اسے خوش خبری کا میسج دے دیا ہوگا۔''

''نہیں۔''

''اچھا کال تو ریسیو کرو۔''

جوہر نے عباس کو رضیہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

جوہر نے کال ریسیو کی۔

''اتنی دیر سے کال ریسیو کی ہے؟'' دوسری طرف سے رضیہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سوری!'' جوہر نے کہا۔ ''کچھ ضروری بات ہو رہی تھی۔''

''جہنم میں گئی تمہاری ضروری بات۔'' رضیہ نے کہا۔ ''مجھے ابھی ملنا ہے تم سے۔''

''میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں رضیہ۔''

''کوئی بہانہ کر کے باہر آؤ۔ میں تھانے سے ذرا ہی آگے تمہاری منتظر ہوں۔''

''اچھا دیکھتا ہوں۔''

''دیکھتا ہوں نہیں، باہر آؤ...... نہیں آؤ گے تو میں تھانے آجاؤں گی۔''

''اچھا آتا ہوں۔'' جوہر نے فون بند کیا اور عباس کو بتایا کہ رضیہ اسے تھانے کے باہر بلا رہی ہے۔

''تو جاؤ جلدی سے۔'' عباس نے کہا۔

''راجا صاحب نے یاد فرما لیا تو؟''

''میں کہہ دوں گا کہ تم چائے پینے گئے ہو، کچھ بھی بہانہ کردوں گا۔''

''جاتا ہوں۔''

جوہر تھانے سے نکلا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کچھ ہی فاصلے پر اس ڈرائیونگ اسکول کی کار دکھائی دے گئی جہاں رضیہ ملازم تھی۔ وہیں رضیہ بھی دکھائی دے گئی۔ جوہر تیزی سے اس کے قریب گیا۔

''خالی کار لیے کھڑی ہو؟'' وہ بولا۔

''جسے آج سکھا رہی ہوں، اسے ابھی اس کے گھر پر چھوڑا ہے۔ قریب ہی ہے اُس کا گھر...... ایسا نہ ہوتا تو بھی میں یہاں آکر تم سے رابطہ کرتی۔''

''آخر ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''تم کو بتا چکی ہوں کہ ٹریننگ اسکول کا مالک مجھ پر زور ڈال رہا ہے۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا اور اس نے اپنے گھر والوں کے ذریعے میرے والدین تک رسائی حاصل کر لی۔ کل شام وہ لوگ میرا رشتہ لینے گھر آنے والے ہیں۔''

''اوہ۔''

''اتنے دن سے کہہ رہی تھی کہ تم میرے والد سے رابطہ کرنے میں جلدی کرو لیکن تم کوئی نہ کوئی بہانہ بناتے رہے۔ پہلے کہتے تھے کہ ملازمت کی تلاش ضروری ہے۔ ملازمت مل گئی تو کہتے ہو ابھی قدم جمانے میں کچھ دیر لگے گی۔ اب بھی کوئی بہانہ کرو گے تو سب گڑبڑ ہو جائے گا۔ اجمل پیسے والا ہے۔ جاہل تو وہ ہے لیکن اس کے پیسے کی وجہ سے میرے گھر والے اس کی بات مان سکتے ہیں۔ وہ لوگ کل شام رشتہ لے کر آنے والے ہیں۔''

"اوہ۔" جوہر کے لہجے میں تشویش تھی۔ "معاملہ اس حد تک آگے بڑھ گیا۔"

"ہاں، اب تم ان لوگوں سے زیادہ جلدی کرو۔"

"مگر کیسے؟"

"تم لوگ سرِشام ہی، یعنی ان لوگوں سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ میرے گھر پہنچو اور میرا ہاتھ مانگو۔"

"اچانک تمہارے گھر پہنچنا تو عجیب سی بات ہو گی۔"

"کچھ سوچو، کوئی راستہ نکالو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی جوہر! اگر میرے گھر والوں نے اس کا رشتہ منظور کرلیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔"

"جذباتی نہ ہو۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔"

"کچھ بھی کرو۔ کل جلد سے جلد میرے گھر پہنچنے کا کوئی راستہ نکالو۔"

"خاصا سوچنا پڑے گا۔ اچھا ابھی تو تم جاؤ۔ میں زیادہ دیر تھانے سے باہر نہیں رہ سکتا۔ تمہیں بتا چکا ہوں کہ تھانے کا انچارج میرا شدید مخالف ہے۔"

"اچھا تو جاؤ لیکن یقین کرلو کہ اگر تم کچھ نہ کرسکے تو میں......"

"خودکشی کی بات نہ کرو۔" جوہر جلدی سے بول پڑا۔ "میں نکال لوں گا کوئی راستہ۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ...... موبائل پر مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

جوہر نے اُسے تسلی دی اور تھانے میں لوٹ آیا۔ وہ رضیہ کی اطلاع پر اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ اسے اپنے ہیڈ کانسٹیبل بننے کی خوش خبری دینا بھی بھول گیا۔

☆☆☆

ڈیوٹی ہی کے اوقات میں موقع دیکھ کر جوہر نے عباس کو رضیہ کے مسئلے سے آگاہ کیا اور اس سلسلے میں اس سے مشورہ مانگا۔

"مجھے رضیہ کے بارے میں وضاحت سے بتاؤ تو میں کچھ سوچوں۔ وہ کہاں رہتی ہے؟ اس کا گھر کہاں ہے؟ اس کے گھر والے کس قسم کے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔"

جب جوہر نے رضیہ کے گھر کا پتا اور اس کے والد کا نام بتایا تو عباس تیزی سے بولا۔ "ارے یہ کام تو آسانی سے ہوسکتا ہے۔ میرا تو اس گھر میں آنا جانا ہے۔ بہت دور کی..... رشتے داری بھی نکلتی ہے۔ رضیہ کا باپ میری عزت بھی کرتا ہے۔ تم نے یہ سب بتا کر مجھے تو چونکا دیا ہے۔"

جوہر خوش ہوگیا۔ "پھر تو آپ اس معاملے میں ٹانگ اڑا سکتے ہیں۔"

"مجھے سوچنے دو کہ ٹانگ کس طرح اڑائی جاسکتی ہے۔ کیا نام بتایا تم نے اس کا جو رضیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جمیل؟"

"نہیں۔" جوہر نے تصحیح کی۔ "اجمل نام ہے اُس کا۔"

"یہ تو تم نے بتا دیا کہ اجمل جاہل لیکن پیسے والا ہے۔ اس کے گھر والوں کے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ رضیہ جانتی ہوگی۔"

"تو ابھی اس سے معلوم کرو۔"

جوہر نے فوراً رضیہ سے موبائل پر رابطہ کیا اور اس سے وہ معلومات حاصل کیں جو عباس جاننا چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ اس نے عباس کو بتایا۔

"ہوں۔" عباس سوچنے لگا۔ کچھ توقف سے بولا۔ "تم نے بتایا کہ وہ لوگ شام کو رضیہ کے گھر جائیں گے؟"

"ہاں، رضیہ نے مجھے یہی بتایا ہے۔"

"یعنی وہ لوگ بھی کچھ بارسوخ نہیں ہیں۔ اس معاملے میں تو میں ٹانگ اڑا سکتا ہوں۔ میں سادہ لباس میں رضیہ کے گھر جاتا ہوں ورنہ ابھی جا کر مل لیتا اس کے باپ سے...... میں ڈیوٹی کے بعد گھر جاکے کپڑے تبدیل کروں گا اور پھر رضیہ کے گھر جاکر اس کے باپ وغیرہ سے ملوں گا۔ ان سے ملنے کے بعد تمہیں فون پر بتاؤں گا کہ کیا رہا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بڑی بے چینی سے تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔"

"میں کروں گا کچھ۔" عباس نے سر ہلایا۔

ڈیوٹی کا وقت ختم ہونے کے بعد عباس اور جوہر اپنے اپنے گھر کے لیے تھانے سے نکلے تو عباس نے پوچھا۔ "ایک بات پوچھنا بھول گیا۔ تمہارے والدین کو معلوم ہے تمہارے اور رضیہ کے بارے میں؟"

"سب کچھ بتا چکا ہوں۔ وہ پہلے تو سوچ رہے تھے کہ میری شادی اُس لڑکی سے کرانے کی کوشش کریں جو بھیا سے منسوب تھی لیکن میری بات سن کر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ میری بات مان لی۔ وہ تیار ہیں کہ میں جہاں چاہوں، وہاں شادی کروں۔"

"یہ بہت ٹھیک ہوا۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور میرے فون کا انتظار کرو۔"

جوہر اپنے گھر چلا آیا۔
اندھیرا ہونے لگا تھا جب عباس کی کال آئی۔ اس نے کہا۔ ''میں نے ان لوگوں کو اجمل کے خلاف کافی بھڑکا دیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کل شام کو اجمل اپنے گھر والوں کے ساتھ آنے والا ہے۔ میں نے ان سے تمہاری بہت تعریف کر ڈالی تھی۔ وہ تمہارے نام سے واقف بھی ہیں۔ سی ایم کے معاملے میں تم خاصے مشہور ہو گئے ہو۔ ہیرو بن گئے ہو۔ میں نے انہیں اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ ہم اجمل وغیرہ سے پہلے تیسرے پہر ہی کو ان کے گھر پہنچ جائیں گے۔ اس طرح ان لوگوں کو اجمل والوں سے جان چھڑانے کے لیے یہ بہانہ مل جائے گا کہ انہوں نے رضیہ کی شادی کہیں اور طے کر دی ہے۔'' عباس ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔
''پھر تو بات بن جائے گی۔'' جوہر نے کہا۔
''ضرور۔'' عباس نے کہا۔ ''اب تم اپنے گھر والوں کو کل رضیہ کے گھر جانے کے لیے تیار کر لو۔''
''زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔'' جوہر نے کہا۔ ''والدین کے علاوہ میں اپنے کسی قریبی... دوست کو لے لوں گا۔''
''ٹھیک ہے۔ کل تم تھانے سے چھٹی لے لینا۔ میں بھی کوئی بہانہ کر کے تھانے سے تین بجے ہی نکل کر اپنے گھر سے ہوتا ہوا تمہارے گھر آ جاؤں گا۔''
''میں ابھی بات کرتا ہوں اپنے والدین سے۔''
''بس ٹھیک ہے۔'' عباس نے رابطہ منقطع کر دیا۔
جوہر نے فون پر رضیہ کو بتا دیا کہ بازی کس طرح پلٹی جائے گی۔

☆☆☆

دوسرے دن پانچ بجے جوہر کا پانچ رکنی قافلہ رضیہ کے گھر پہنچا۔ وہاں ایک بات نے انہیں چونکا دیا۔ اجمل اپنے گھر والوں کے ساتھ پہلے ہی موجود تھا۔
''عجیب معاملہ ہو گیا ہے۔'' رضیہ کے باپ نے کہا۔ ''بہ یک وقت دو رشتے آ گئے رضیہ کے لیے۔''
''پہلے ہم سے بات کیجیے۔'' اجمل کا باپ اکڑا۔
''اب فیصلہ تو رضیہ کو کرنا ہو گا کہ وہ کس کے ساتھ شادی کرنا چاہے گی۔'' جوہر بولا۔
رضیہ وہاں اپنے ماں باپ کے علاوہ کچھ دوسرے رشتے داروں کے ساتھ موجود تھی۔
''تم بیچ میں مت بولو۔'' اجمل اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے مار پیٹ کے لیے آمادہ ہو۔
''تم بھی مت بولو۔'' جوہر نے تیز لہجے میں کہا۔ ''بڑوں کو بات کرنے دو۔''
''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں جوہر!'' اجمل بولا۔ ''تم لوگ یہاں پولیس کی دھونس مت چلانا۔''
''میں نے ابھی پولیس کا نام بھی نہیں لیا۔''
عباس نے رضیہ کے باپ کی طرف دیکھا جو اس طرح بولنے لگا تھا جیسے دونوں پارٹیوں کو جھگڑے سے روکنا چاہتا ہو۔
لیکن اسے کامیابی نہیں ہو سکی۔ اجمل کے ساتھ آنے والے گھٹیا باتوں پر اتر آئے۔ اجمل نے تو ایسا جملہ کہا کہ جوہر کو شدید غصہ آ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اجمل کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا۔
اجمل کے ساتھ آنے والے گھٹیا قسم کے لوگ تھے۔ باقاعدہ تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر رضیہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔
''فیصلہ تو رضیہ کو کرنا چاہیے۔'' عباس پہلی مرتبہ بولا۔
''رضیہ کا فیصلہ میرے حق میں ہو گا۔'' جوہر نے کہا۔ ''ہم دونوں اسکول کے زمانے سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''
ان لوگوں میں تو تکار.... ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ جس میں جوہر نے تین آدمیوں کو دھنک کر رکھ دیا۔
یکایک رضیہ کا باپ ان لوگوں کے بیچ میں آ گیا اور چیخا۔ ''ختم کرو یہ فساد...... میں اپنے گھر میں ایسے فساد برداشت نہیں کر سکتا۔ اس وقت آپ سبھی لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ یہ معاملہ کس طرح طے کیا جائے۔'' اجمل والے باز نہیں آ رہے تھے لیکن عباس نے جوہر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''چلو یہاں سے۔''
جوہر کے والدین اس دوران میں خاموش رہے تھے۔
رضیہ کے باپ نے دونوں ہی پارٹیوں کو رخصت کر دیا۔
''افسوس کہ تم خاموش رہیں۔'' جوہر نے جاتے جاتے رضیہ سے کہا تھا۔ اس وقت رضیہ کی ماں نے اس کی کلائی بہت زور سے پکڑ رکھی تھی۔
جوہر وغیرہ ٹیکسی میں آئے تھے۔ ٹیکسی ہی میں وہاں

سے روانہ ہوئے۔

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے عباس نے مڑ کر پیچھے بیٹھے ہوئے جوہر سے کہا۔ ''میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ......''

''تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جوہر بول پڑا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں سارا چکر...... یہ ممکن نہیں کہ اجمل پہلے سے پہنچ جائے۔۔۔۔ ان لوگوں کو ضرور رضیہ کے باپ نے اس وقت بلایا ہوگا تا کہ......''

اس مرتبہ عباس نے جوہر کی بات کاٹی۔ ''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ دھوکا دیا ہے ہمیں رضیہ کے باپ نے...... اس کے دل میں لالچ آ گیا ہے۔ وہ اجمل سے ہی رضیہ کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ دونوں پارٹیوں میں تکرار ضرور ہو گی اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس وقت تو معاملے کو رفع دفع کر دے گا۔ وہ اتنی ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے اسی وقت ٹکا سا جواب دے دیتا جب میں تنہا اس سے ملنے آیا تھا لیکن......'' وہ کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔

''لیکن کیا عباس بھائی!'' جوہر نے پوچھا۔

''کچھ وقت گزر جائے، پھر دیکھنا۔ میں رضیہ کے باپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے کالے دھندے میں اس کا ہاتھ ہے۔ میں اسے اب تک اس لیے نظر انداز کرتا رہا کہ اس قسم کے چھوٹے موٹے کالے دھندے تو بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس سے میری دور کی رشتے داری بھی ہے لیکن اب میں اس رشتے داری کو لات مار دوں گا۔''

''مجھے تو رضیہ پر غصہ آ رہا ہے۔'' جوہر نے کہا۔ ''اس نے خاموشی سے میری توہین برداشت کر لی۔''

''والدین کی موجودگی میں لڑکیاں دب جاتی ہیں۔''

''میں اسے معاف نہیں کروں گا۔''

''غصے میں ہو تم اس وقت...... اس کی محبت تمہارے دل سے نہیں نکل سکتی، کوئی اور حل سوچنا پڑے گا۔''

جوہر کے ساتھ اس کے والدین چپ بیٹھے رہے۔ وہ شروع ہی سے چپ رہے تھے۔ بابو میاں تو تحمل مزاج تھے ہی۔ بیوی نے جھگڑے کے دوران میں کچھ بولنا چاہا تھا لیکن بابو میاں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔

''گھر جا کر آرام کرو۔'' عباس نے جوہر سے کہا۔ ''دماغ ٹھنڈا رکھو، سکون سے کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔''

جوہر جواب میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

گھر پہنچنے کے بعد جوہر کی ماں بگڑ کر بولیں۔ ''تم نے ہمیں بھی بے عزت کرایا۔ اب رضیہ کا خیال دل سے نکال دو۔''

''چپ رہو۔'' بابو میاں بول پڑے۔ ''عباس نے راستے میں جو کچھ کہا، ٹھیک ہی کہا۔ لالچ آ گیا ہے رضیہ کے باپ کے دل میں۔ اب ہمیں اس پر جلنے کڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جوہر کے پاس بھی دماغ ہے۔ وہ خود فیصلہ کر لے گا کہ اب اسے رضیہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔''

ان دونوں میں اس موقع پر کچھ تکرار ہوئی لیکن جوہر خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ رضیہ کی خاموشی پر اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

خاصی رات کو اس کے موبائل پر رضیہ کی کال آئی۔

''اب کیا کہنا چاہتی ہو؟'' جوہر نے غصے سے کہا۔ ''مجھے ذلیل ہوتے دیکھ کر ایک لفظ بھی میرے حق میں نہیں بولی تھیں...... اب کیا رہ گیا ہے کچھ کہنے کے لیے؟''

''لڑکی کی مجبوری نہیں سمجھ سکتے تم۔'' رضیہ نے کہا۔ ''اگر میں اس وقت کچھ بولتی تو بعد میں میری شامت آ جاتی۔ تم نہیں جانتے، میرے والد بہت سخت گیر ہیں۔''

''تو بس...... ان کی سخت گیری جھیلتی رہو۔'' جوہر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

''کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے؟'' جوہر نے کال ریسیو کر کے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کل مجھ سے ملو۔'' رضیہ نے کہا۔ ''کسی وقت بھی، کہیں بھی...... میں نے کچھ سوچا ہے۔''

''باپ سخت گیر ہے تو تم کیا سوچ سکتی ہو؟''

''تم ملو تو مجھ سے۔ میں بتاؤں گی۔''

''موقع ملا تو مل لوں گا۔'' جوہر نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے یہ جواب نہیں دیا تو رضیہ فون کرتی رہے گی۔ فون اس نے اپنے گھر سے ہی کیا ہوگا۔ وہ مدھم آواز میں بول رہی تھی تا کہ اس کے گھر میں کوئی اس کی آواز نہ سن لے۔

جوہر جواب دے کر فون بند کرنے والا تھا کہ رضیہ

جلدی سے بول پڑی۔ ”ٹالنے والی بات نہ کرو۔ موقع تو تمہیں نکالنا ہی ہوگا۔ اگر تم نہ ملے تو میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔“ رضیہ کی آواز بھرا گئی۔ ”میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مار ڈالوں گی خود کو۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔“ جوہر نے اپنا لہجہ نرم کیا۔ ”کہہ تو دیا کہ مل لوں گا۔“

”تم نے موقع تلاش کرنے کی بات کی تھی۔“

”نکال لوں گا کسی طرح موقع......“

”میں سارے دن بے چین رہوں گی۔ مجھے کوئی وقت بتاؤ، کہاں ملو گے؟“

”پولیس میں ملازمت کرتا ہوں میں۔ وقت بتانا ممکن نہیں۔ بہرحال میں کسی طرح مل ہی لوں گا۔ اب آرام کرو، مجھے بھی آرام سے کچھ سوچنے دو۔“ جوہر نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن جوہر ڈیوٹی پر پہنچا ہی تھا کہ سب انسپکٹر راجا نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔

”ہوں۔“ راجا اسے کڑی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”کیا میں تمہیں اور تمہارے باپ کو حوالات میں پہنچا دوں؟“

”میں سمجھا نہیں سر!“

”کل تم تینوں کس جگہ گئے تھے اور تم نے مار پیٹ کی تھی۔ کسی اجمل اور اس کی ہونے والی بیوی کے باپ نے تم لوگوں کے خلاف کل رات ہی رپورٹ کی ہے۔“

”وہ تو رشتے کے سلسلے میں جھگڑا ہوا تھا سر!“ جوہر نے کہا۔ ”لڑکی رضیہ مجھے چاہتی ہے۔ اجمل وغیرہ نے بھی مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔“

”مار پیٹ تو ہوئی تھی نا؟“

”جی سر!“

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

جوہر خاموش رہا۔

راجا پھر بولا۔ ”میں نے ایف آئی آر درج نہیں ہونے دی۔ تمہارا خیال کیا تھا میں نے۔ تمہارے بوڑھے باپ کو بھی حوالات میں بند کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگا تھا۔ ان لوگوں کو کسی طرح ٹالا کہ میں تحقیقات کروں گا۔ ترس آیا تھا مجھے تمہارے بوڑھے باپ پر جو تمہاری وجہ سے...... خیر! میں اس معاملے کو دبا دوں گا۔“

”شکریہ سر۔“

”آئندہ میں ایسی کوئی بات نہیں سنوں ورنہ لحاظ نہیں کروں گا۔“

”جی۔“ جوہر زیادہ نہیں بول سکا۔ اُسے حیرت ہوئی تھی کہ عباس کا نام نہیں آیا تھا۔

”لیکن......“ راجا نے کہا۔ ”آج سے تم میرے ڈرائیور رہو گے۔ میں چند منٹ بعد راؤنڈ پر نکلنے والا ہوں۔ ڈرائیونگ تم کرو گے۔“

جوہر کوئی احتجاج نہیں کر سکا۔ وہ اب ہیڈ کانسٹیبل بن چکا تھا۔ راجا اپنا ڈرائیور کسی کانسٹیبل کو بنایا کرتا تھا۔

”اب تم جا سکتے ہو۔“ راجا نے کہا۔

جوہر سلام کر کے کمرے سے نکل آیا۔ کھول تو گیا تھا لیکن اس نے فی الحال ضبط سے کام لینا مناسب سمجھا۔

فوراً ہی عباس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ جوہر کے فوراً بعد ہی تھانے پہنچا تھا۔ اسے رپورٹ کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔

”کیا رہا؟“ عباس نے بے چینی سے پوچھا۔

جوہر نے سب کچھ بتا دیا۔

عباس بولا۔ ”مجھ پر احسان فرمایا گیا ہے۔ رپورٹ میں میرا نام نہیں ہے۔“

”مجھے حیرت ہوئی تھی اس بات پر۔“ جوہر نے کہا۔

”میرا لحاظ اُس کمینے نے مصلحتاً کیا ہے۔ جانتا ہے نا کہ میں اس کے کالے کرتوت سے واقف ہوں۔“

”میں اس پر احتجاج کروں گا کہ مجھے ڈرائیور بنایا جا رہا ہے جبکہ یہ کام کسی کانسٹیبل کو کرنا پڑتا ہے۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ احتجاج کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ پہلے ہی تمہارا مخالف ہے پھر دشمنی پر اتر آئے گا۔“

”میں استعفا دے دوں گا۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ وہ ایف آئی آر درج کر لے گا۔ غصہ تھوک دو اور مناسب وقت کا انتظار کرو۔ چیف منسٹر تمہیں پسند کرتی ہے۔ کسی طرح اِن ڈائریکٹ طریقے سے بات اس تک پہنچانا چاہیے کہ راجا تمہارا دشمن ہو گیا ہے۔ کوئی خاص ایکشن نہیں لیا گیا تو کم از کم تمہارا یا اس کا تبادلہ کسی اور تھانے میں کرا دیا جائے گا۔ میں اس بارے میں سوچوں گا۔“

اسی وقت سب انسپکٹر راجا باہر آیا۔

”چلو جوہر!“ وہ بولا۔ ”راؤنڈ پر نکلنا ہے۔“

عباس نے جوہر کو اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔

راؤنڈ پر عموماً دو تین کانسٹیبل بھی موبائل میں ہوتے تھے لیکن اس وقت راجا نے کسی اور کو ساتھ نہیں لیا۔

جوہر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کیا۔

''ڈائریکٹر آف پروٹوکول سے ملنا ہے۔'' انسپکٹر راجا نے کہا۔

جوہر نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

راجا پروٹوکول کے دفتر کے علاوہ بھی دو جگہ گیا، پھر ایک بنگلے کے سامنے موبائل روکنے کے لیے کہا۔

جوہر نے موبائل روکی تو راجا نے اترتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اکیلے ہی راؤنڈ جاری رکھو۔ یہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ کچھ دیر یہاں آرام کروں گا۔''

جوہر حقیقت سمجھ گیا۔ اتنے دن سے پولیس اسٹیشن میں تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ راجا کے تعلقات کئی عورتوں سے تھے اور وہ روزانہ ہی اپنا کچھ وقت کسی عورت کے گھر پر گزارتا ہے۔

''میں اکیلا ہی راؤنڈ پر جاؤں؟'' جوہر نے کہا۔

''ہاں، جب مجھے تھانے واپس جانا ہوگا تو میں تمہیں فون کر کے بلا لوں گا۔ وہاں ظاہر یہی کرنا کہ تم مستقل طور پر میرے ساتھ رہے تھے۔ بس جاؤ۔''

''عیاش۔'' جوہر نے زیرِلب بڑبڑا کر موبائل آگے بڑھا دی۔

کچھ طے نہیں تھا کہ راجا کب اسے طلب کر لیتا اور اسے رضیہ سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد تھا کہ وہ موقع نکال کر اس سے مل لے گا لیکن اب موقع ملنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ہی ایسی لگا دی گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ فون کر کے ہی رضیہ کو بتا دے کہ وہ کس قسم کی ڈیوٹی میں پھنس گیا تھا۔ اگر وہ موبائل ہی میں رضیہ سے ملنے کی جگہ اور وقت کا تعین کر لیتا تو عین ممکن تھا کہ اسی وقت راجا اسے طلب کر لیتا۔

فون پر اس نے رضیہ سے پوچھا۔ ''اس وقت تمہارے قریب کوئی اور تو نہیں ہے؟''
''نہیں، کیوں؟'' رضیہ بولی۔
''ایسی بات کرنا ہے کہ اور کوئی نہ سن لے۔''
''بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ملنا ضروری ہے۔''
''میری ڈیوٹی ایسی لگ گئی ہے کہ میں آج نہیں مل سکوں گا۔ کل پر رکھو۔''
''کل میں تم سے نہیں مل سکوں گی اور تمہیں ہمیشہ کے لیے کھودوں گی۔ تم سے مل کر مجھے بتانا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ تمہیں کوئی تدبیر سوچنا پڑے گی جوہر۔''
''فون پر اتنا تو بتادو کہ آخر ملنا کیوں ضروری ہے اور کل کیا ہوجائے گا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے کھودو گی؟''
''کل اجمل سے زبردستی میری شادی کرادی جائے گی۔''
''کیا؟'' جوہر کا جسم سنسنا گیا۔ رضیہ کے خلاف اس کا غصہ تو کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔
''ہاں۔'' رضیہ نے کہا۔ ''اور یہ جلدی اس لیے کی جارہی ہے کہ تمہاری طرف سے کوئی اور حرکت سے پہلے میرے شادی کرادی جائے۔''
''بہت بُری خبر سنائی ہے تم نے۔''
''یہ بُری خبر سنانے ہی کے لیے میں نے تم سے ملاقات کی بات کی تھی۔
''اچھا ذرا انتظار کرو۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں فون کروں گا۔''
''کچھ دیر بعد کیوں؟''
''مجھے سوچنا پڑے گا کہ ایسی صورت میں کیا ہوسکتا ہے۔''
''وقت نہیں ہے جوہر۔''
''میں جلدی فون کرکے کچھ بتاؤں گا۔''
''پلیز جوہر۔''
''اپنے اعصاب پر قابو رکھو اور میرے دوسرے فون کا انتظار کرو۔'' جوہر نے کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور موبائل تھانے کی طرف دوڑا دی۔ وہ اس مشکل صورتِ حال میں عباس سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔
موبائل کھڑی کرکے وہ تھانے میں جانا چاہتا تھا جس سے کوئی خرابی بھی پیدا ہوسکتی تھی۔ راجا کو معلوم ہوجاتا کہ وہ راؤنڈ لگانے کے بجائے تھانے پہنچ گیا تھا لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عباس باہر ہی مل گیا۔ وہ کہیں جانے کے لیے اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہورہا تھا۔
جوہر جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''اچھا ہوا تم باہر مل گئے۔''
''کیا بات ہے......؟ تم تو راجا کے ساتھ گئے تھے؟''
''وہی تو مصیبت ہے۔'' جوہر نے بتایا کہ راجا نے اس کی کیا ڈیوٹی لگائی تھی پھر اس نے کہا۔ ''آج میں رضیہ سے ملنے کا وعدہ کرچکا تھا لیکن اس ڈیوٹی کی وجہ سے میرا اس سے ملنے جانا مشکل ہے۔ راجا کسی وقت بھی مجھے طلب کرسکتا ہے۔ مجبوراً میں نے فون کرکے رضیہ کو بتایا کہ میں کس مشکل میں ہوں۔ تب اس نے بتایا کہ مل کر کچھ سوچنا ضروری ہے۔''
''کس بارے میں سوچنا ضروری ہے؟''
جواب میں جوہر نے بتایا کہ اسے رضیہ سے کیا معلوم ہوا ہے۔
''تو......'' عباس نے کہا۔ ''ملاقات ضروری ہو گئی۔''
''ہاں۔ میں اِن حالات میں کیا کرسکتا ہوں۔''
''موبائل یہاں چھوڑ دے۔'' عباس نے کہا۔ ''میں اس پر کسی کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگادیتا ہوں تو میری موٹر سائیکل پر چل۔ میں راجا سے کہہ دوں گا کہ تمہارے پیٹ میں اچانک بہت تکلیف ہوگئی تھی اس لیے مجھے ایسا کرنا پڑا اور میں تجھے لے کر کسی اسپتال گیا ہوں۔''
''تم یہ کام کرو۔ میں جلدی سے سادہ لباس پہن لوں۔ پولیس کی وردی میں رضیہ سے ملنا مناسب نہیں ہو گا۔''
جوہر کا سادہ لباس تھانے ہی میں ہوتا تھا۔ وہ ڈیوٹی پر پہنچنے کے بعد وردی پہنا کرتا تھا۔
''اس سے ملنا کہاں ہے؟'' عباس نے پوچھا۔
''میں ابھی اسے فون کرکے پوچھ لیتا ہوں۔''
اس کے بعد دونوں نے اپنے اپنے کام جلدی جلدی کیے۔ عباس نے موبائل پر ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگادی۔ جوہر سادہ لباس پہن کر باہر آ گیا۔
عباس نے اسے دیکھتے ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ ''چل بیٹھ جلدی سے جانا کہاں ہے۔''
''رضیہ سے بات کرلی ہے میں نے......وہ چھوٹے ٹاور کے سامنے ملے گی۔'' جوہر نے عباس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بات کیا کرتا ہے؟" عباس نے پوچھا۔

"میں نے اُس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ اس نے کوئی منصوبہ بنایا ہے۔" عباس نے موٹر سائیکل کی رفتار تیز کردی۔

☆☆☆

چیف منسٹر ہاؤس کا ایک کمرا ایسا تھا جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے کھولنے یا بند کرنے کے لیے قفل نہیں بلکہ نمبروں کی ترتیب تھی جسے چیف منسٹر ثانیہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے ظاہر یہ کر رکھا تھا کہ اس کمرے میں ٹاپ سیکرٹ فائلیں ہیں اس لیے اس کمرے میں جانے کی کوشش کرنے والے کو معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس کمرے میں کسی ایک فائل کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ صرف مذہبی نوعیت کے مجسمے رکھے ہوئے تھے، جیسے وہ کوئی عبادت گاہ ہو۔ چیف منسٹر ثانیہ کو جب بھی کچھ فارغ وقت ملتا تھا، وہ اس کمرے میں جا کر ان مجسموں کی پوجا کیا کرتی تھی۔ پوجا کا کوئی وقت نہیں تھا۔ کبھی وہ پوجا سے پانچ منٹ میں فارغ ہوجاتی تھی، کبھی دس پندرہ منٹ بھی گزر جاتے تھے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ اس کے پاس فارغ وقت کتنا ہے۔

دس منٹ پوجا کے بعد وہ اس کمرے سے نکلی۔ نمبروں کی ترتیب سے اس کا دروازہ بند کیا۔ پھر کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر اوپری منزل کا رخ کیا جہاں ایک کمرے میں بڑھاپے کی طرف قدم بڑھاتا ہوا ایک شخص رہتا تھا جسے ثانیہ "بابا" کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور اس کا بے حد احترام کرتی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے دونوں ہاتھ اس طرح جوڑے جیسے وہ سلام کا طریقہ ہو۔

بوڑھا ایک بڑی سی دوربین ٹھیک کر رہا تھا جو ایک کھڑکی کے قریب تھی۔ غالباً وہ شوق میں یا کسی وجہ سے ستارہ شناسی کرتا ہوگا۔

"آگئیں بیٹی!" وہ صرف آہٹ سن کر بولا، پھر اس نے پلٹ کر ثانیہ کی طرف دیکھا۔

"جی بابا!" ثانیہ نے کہا۔ "آپ نے مجھے اسی وقت بلایا تھا۔"

"ہاں۔" بوڑھے نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ میں اس وقت تک اپنی دوربین ٹھیک کرلوں گا لیکن ابھی کچھ کام باقی ہے۔ خیر! وہ میں بعد میں کرلوں گا۔ مجھے تم پر اتنا بھروسا ہے کہ میں تمہاری ایکٹی ویٹیز کے بارے میں کبھی کچھ زیادہ نہیں پوچھتا۔ کبھی کبھی تم خود ہی کچھ بتا دیتی ہو اور کبھی مجھے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔"

"کچھ دن پہلے تم نے ایک بم بلاسٹ کروایا تھا۔ اس کا ضرور کچھ مقصد ہوگا۔ میرے علم کے مطابق وہ بلاسٹ تم نے ایک خاص آدمی کی کار اُڑانے کے لیے کیا تھا۔"

"جی ہاں بابا...... وہ یہاں صرف اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ صفائی کے معاملے میں ملازمین نے کسی جگہ کوتاہی نہ کی ہو۔ میں ایک مرتبہ پوجا کر کے نکلی تھی تو وہ اس کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مجھے اُس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے اچٹتی سی نظر میں ہی کمرے میں رکھے ہوئے مجسمے دیکھ لیے تھے۔ وہ مجھے سلام کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ میں عبادت گاہ بند کر کے اپنے کمرے میں گئی اور اس شخص کو طلب کیا۔ اس طلبی پر وہ کچھ نروس تھا۔ مجسمے دیکھ لیے جانے کے باعث وہ خوف زدہ تھا کہ میں اسے کوئی سزا دوں گی لیکن میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا کہ میں نے اس کی ایک ایسی حرکت بھانپ لی تھی جس پر اسے سزا دی جا سکتی تھی۔ میں نے بالکل عام انداز میں اس سے بات کی۔ وہ پارٹی ورکر بھی تھا۔ میں اس سے کبھی کبھی باہر کے کام بھی لیا کرتی تھی۔ میں نے اسے ایک لفافہ دیا جس میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ لفافہ لے کر اپنی کار میں تیزی سے کارٹر اسٹریٹ پر واقع میڈیکل اسٹور سے کچھ فاصلے پر رکے۔ وہاں نیلے سوٹ میں ملبوس ایک شخص اس کے پاس آئے گا اور آہستہ سے صرف چیف منسٹر کہے گا۔ بس اسی کو لفافہ دے کر وہ واپس آجائے۔ میں اسی جگہ اس کی کار اُڑانا چاہتی تھی۔ اس کی روانگی سے پہلے میں نے ایک آدمی کو بلاسٹ کرنے کے سلسلے میں ہدایات دے دی تھیں۔ میں وہاں زیادہ تباہی نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی کار کے جلتے ہوئے ٹکڑے دو ایک اور کاروں پر جا گرے۔ ان کے پیٹرول کی ٹنکیاں پھٹیں تو اس سے وہاں تباہی بہت پھیل گئی تھی۔"

"بلاسٹ کروانے کے لیے تم نے اپنے ایک آدمی شاخاں کو ہدایت کی تھی۔" بوڑھے نے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ بھی پارٹی ورکر ہے جس پر میں بہت

بھروسا کرتی ہوں۔"

"وہ بہت شراب پیتا ہے۔"

"جی ہاں۔" ثانیہ کو اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ اس کا بابا شاخاں کو ہی نہیں، اس کی زیادہ شراب نوشی سے بھی واقف تھا۔

"ایک شرابی پر تم اتنا زیادہ بھروسا کرتی ہو؟"

"شرابی ہونے کے باوجود وہ میرے لیے کئی اور کام بھی کر چکا ہے۔ بلاسٹ کے سلسلے میں تو وہ بہت ہی ماہر ہے۔"

"پولیس کی نظر میں مشتبہ نہیں؟"

"قطعی نہیں۔"

"ہوں۔" بوڑھا کچھ سوچنے لگا۔

"ایک بات کہنے کی جسارت کروں بابا؟"

"کہو۔"

"میں وہ ڈائری پڑھنا چاہتی ہوں جو آپ لکھتے رہتے ہیں۔ شاید وہ ڈائری بھی نہیں۔ آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ میں وہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ کے تجربات سے مجھے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا تمہیں اُس کے پڑھنے سے!" بوڑھے نے کہا۔ "میں نے یہاں اپنے وطن کے لیے کچھ کیا ہی نہیں...... مجھے اس ملک میں مامور تو کر دیا گیا لیکن مجھ سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ تم جان چکی ہوگی کہ ایسا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہیں مامور کر دیے جاتے ہیں۔ جن سے کوئی کام کروانا ہوتا ہے، اسے وہ ذمّے داری نبھانا ہوتی ہے لیکن میرے وطن کو ایسا کوئی کام نہیں پڑا جو میرے لائق ہوتا اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ ساری زندگی گزار کر مر جاتے ہیں لیکن ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ میں انہی بدقسمت لوگوں میں سے ہوں، جنہیں یہاں اپنے وطن کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ یہ تو میری اپنی سوچ تھی کہ میں نے تمہیں اسکول کالج کی تعلیم کے علاوہ خود ہی سیاست کی تعلیم دی۔ تم سیاست میں باقاعدہ حصہ لینے لگیں اور میرے مشورے سے تم نے ایک سیاسی پارٹی بنائی اور میرے مشوروں سے الیکشن میں حصہ لینے لگیں اور آخر وہ وقت آ گیا کہ تم اس صوبے کی چیف منسٹر بن گئیں۔ میری خواہش ہے تم پرائم منسٹر بن کر اپنے وطن کے لیے زیادہ اہم کام کر سکو۔ میں جانتا ہوں کہ اب تمہارا اپنے وطن کے بڑوں سے رابطہ ہو گیا ہے اور تمہیں وہاں سے ہدایات ملنے لگی ہیں۔ تمہارا مشن یہ ہے کہ اس ملک کو معاشی طور پر تباہ کر سکو۔ تم اس سلسلے میں کیا کر رہی ہو اور تمہیں اپنے بڑوں سے کیا ہدایات ملتی ہیں، مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم...... میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا۔ ہمارا وطن...... میرا مطلب ہے، وہاں کے بڑے تم سے جو کام لے رہے ہیں، میں اس سے قطعی بے خبر ہوں۔ تم بہت خود اعتماد ہو اس لیے اب میں تمہیں کوئی مشورہ بھی نہیں دیتا۔ بس ایک بات پوچھنے کے لیے میں نے اس وقت تمہیں خاص طور سے بلایا ہے۔"

چیف منسٹر ثانیہ نے بڑے تحمل سے اپنے باپ کی باتیں خاموشی سے سنیں، پھر باپ کے خاموش ہونے پر بولی۔ "آپ مجھ سے شاخاں کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں...... میں حیران ہوں کہ تم نے ایک شرابی پر بہت زیادہ بھروسا کر لیا ہے۔"

"وہ بہت کام کا آدمی ہے بابا...... مجھے ہدایت ملی تھی کہ میں اپنی پارٹی میں ایک تھنڈر اسکواڈ قائم کروں کیونکہ جو کام میں چیف منسٹر کی حیثیت سے قانونی طور پر نہیں کر سکتی، وہ کام تھنڈر اسکواڈ کے ذریعے سے کروں۔ شاخاں کا تعلق تھنڈر اسکواڈ ہی سے ہے۔ میں دوسرے سیاسی معاملات سے اس کو بالکل الگ رکھتی ہوں۔ وہ نہیں جانتا کہ میں اپنے وطن کے لیے اس ملک کے خلاف کیا کچھ کرنا چاہتی ہوں یا کرنے والی ہوں۔ عنقریب مجھے حزبِ اختلاف کے ایک لیڈر کو قتل کروانا ہے۔ اس کے لیے میں شاخاں ہی کے نام پر غور کر رہی ہوں۔"

"میں تمہیں اس وقت یہی بتانا چاہتا ہوں کہ اب مستقل طور پر نہیں تو کچھ عرصے کے لیے اسے قطعی غیر فعال بنا دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔"

"وہ کیسے بابا؟" ثانیہ نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ اب مشتبہ ہو چکا ہے۔ انٹیلی جنس کے لوگ اس کو کسی طرح گرفتار کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔"

ثانیہ چونک گئی۔

"آپ مجھے بڑی سنسنی خیز اطلاع دے رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز اطلاع تمہارے لیے یہ ہے کہ آج ہی کسی وقت انٹیلی جنس کسی بنیاد پر اسے گرفتار کروانے والی ہے۔"

"مائی گاڈ!" ثانیہ پریشان ہو گئی۔ "اس کا مطلب

ہے کہ مجھے فوری طور پر اسے ہوشیار کرنا چاہیے۔''

''ہاں۔''

''میں ابھی اسے فون کرتی ہوں۔'' ثانیہ نے وہ موبائل نکالا جس پر وہ صرف تھنڈر اسکواڈ کے لوگوں سے بات کرتی تھی۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ چیف منسٹر کے پاس اس نمبر کا بھی کوئی موبائل ہے۔'' وہ تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

☆☆☆

اس وقت شاخاں ایک بار میں شراب کی آدھی بوتل خرید کر وہیں ایک میز پر بیٹھا پی رہا تھا جب اس کے موبائل پر ثانیہ کی کال آئی۔

''اپن سے ضرور کوئی کام پڑا ہوگا میڈم!'' شاخاں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''کام تو کوئی نہیں لیکن تم خطرے میں ہو۔ کسی وقت بھی انٹیلی جنس کے لوگ تم پر ہاتھ ڈالنے والے ہیں...... تم......''

شاخاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اپن کے بارے میں انہیں کیا معلوم ہو گیا ہے؟'' شاخاں نے ثانیہ کی بات کاٹتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''ابھی مجھے تفصیل نہیں معلوم لیکن جو میں کہہ رہی ہوں، وہ غلط نہیں ہے۔ تم فوری طور پر کہیں روپوش ہو جاؤ اور اس وقت تک روپوش رہو جب تک میں تمہیں دوبارہ فون نہ کروں۔''

''ٹھیک ہے میڈم...... اپن ابھی ایک بار میں ہوں۔ یہاں سے نکل کر اپنے بھائی ساون کے گھر چلا جاتا ہوں۔ وہ موٹر مکینک ہے۔ اس کا کسی غیر قانونی کام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''جہاں تم ٹھیک سمجھو، وہاں روپوش ہو جاؤ۔''

''اپن ابھی یہاں سے نکلتا ہے میڈم!''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

شاخاں نے دو بڑے گھونٹ لیے۔ بوتل بند کر کے اندرونی جیب میں رکھی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

''جلدی کیا ہے؟'' دروازے پر موجود ایک شخص نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ نیلی پتلون پر سرخی مائل شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں کالی بنکیوں کا سفید مفلر تھا۔

''ہٹ!'' شاخاں نے اسے ایک طرف دھکا دیا اور دوڑ کر قریب ہی کھڑی اپنی کار میں جا بیٹھا۔

''رک جاؤ شاخاں!'' نیلی پتلون والے نے اُسے للکارا۔

شاخاں نے کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے دوڑا دی۔ ایک اجنبی چہرے والے سے اپنا نام سن کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ اجنبی انٹیلی جنس کا آدمی ہوگا۔

وہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی اور اس پر ٹریفک بھی برائے نام تھا۔ شاخاں نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ بار کے سامنے کھڑی ہوئی ایک کار اسٹارٹ ہوئی۔ شاخاں نے سرخی مائل شرٹ اور سفید گلوبند کی وجہ سے سمجھ لیا کہ وہ وہی شخص ہے جس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

اس کی کار شاخاں کی کار سے بڑی اور مضبوط تھی۔ وہ شاخاں کی کار کے تعاقب میں دوڑ پڑی۔

شاخاں نے ایکسیلیریٹر پوری طرح دبا دیا لیکن سرخ شرٹ والے کی کار زیادہ تیزی سے اس کے قریب آ گئی۔ شاخاں نے اپنی کار ایسے زاویے پر ڈالی کہ سرخ شرٹ والے کی کار آگے نہ نکل سکے۔ وہ اپنے اس مقصد میں تو کامیاب رہا لیکن سرخ شرٹ والے کی کار نے اس کی کار کو بڑی زور سے ٹکر ماری۔ شاخاں کی کار اس کے کنٹرول میں نہ رہی اور ایک موٹر سائیکل کو سائڈ مارتے ہوئے ایک الیکٹرک پول سے جا ٹکرائی۔

☆☆☆

اس موٹر سائیکل پر عباس اور جوہر تھے۔ ان کی بائیک گری تو وہ دونوں بھی گر پڑے۔

سرخ شرٹ والے نے اپنی کار تیزی سے روکی اور اتر کر شاخاں کی طرف لپکا جو اپنی کار سے بمشکل نکل سکا تھا کیونکہ اس کا دروازہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔

''الو کے پٹھے!'' جوہر کار والوں کو گالیاں دے کر مشکل سے اٹھ سکا اور عباس .... کی طرف متوجہ ہوا جسے زیادہ چوٹ لگی تھی اور وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا زیادہ چوٹ لگی ہے؟'' جوہر نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔ سرخ شرٹ والا اور شاخاں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ عباس کو سنبھالنے کے بعد جوہر نے دیکھا کہ سرخ شرٹ والے نے ریوالور نکال لیا تھا لیکن شاخاں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

عباس کو سنبھالنے میں جوہر کو زیادہ وقت نہیں ہوئی اور پھر وہ تیزی سے ان دونوں آدمیوں کی طرف لپکا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جوہر نے ان

دونوں کو للکارا۔

''کون ہو تم لوگ؟ کیا ارادہ ہے؟''

ان دونوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ شاخاں نے سرخ شرٹ والے کے ہاتھ سے ریوالور گرا دیا تھا اور اس کے منہ پہ گھونسا بھی رسید کر چکا تھا۔

''رک جاؤ!'' جوہر نے قریب جا کر ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کی۔

شاخاں نے جوہر کے پیٹ پر لات مار کر اسے گرا دیا۔

اس اثنا میں عباس پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ وہ جوہر کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔

اب ان چاروں ہی میں لڑائی شروع ہوگئی۔

''میری وردی دیکھ رہے ہو؟'' عباس نے ایک کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

جوہر نے اٹھ کر شاخاں کے ٹانگ مار کر اسے گرا دیا۔ شاخاں اس طرح گرا کہ سڑک پر پڑے ہوئے سرخ شرٹ والے کا ریوالور اس کے ہاتھ میں آگیا۔ وہ اسے استعمال نہیں کر سکا۔ جوہر نے اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھ کر پوری طاقت سے دبا دیا۔

کچھ فاصلے پر ایک موبائل تھی جو تیزی سے ان چاروں کے قریب پہنچ گئی۔ اس میں سے کئی کانسٹیبل کود کر آگئے۔ اب سرخ شرٹ والے اور شاخاں کے لیے سنبھلنا مشکل تھا۔ عباس کو ان لوگوں نے فوراً پہچان لیا۔

''تھانے لے جانا ہے ان لوگوں کو۔'' عباس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ عباس کے ساتھ پانچ پولیس والے شامل ہوگئے تھے اس لیے ان دونوں کو بے بس کر لیا گیا۔

جوہر نے عباس کی موٹر سائیکل اٹھائی۔

پولیس والے سرخ شرٹ والے اور شاخاں کو پولیس موبائل میں ٹھونس رہے تھے۔

''میرا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔'' وہ چیخا۔

''ارے تم ملکہ وکٹوریہ کے چچا ہو گے۔'' ایک کانسٹیبل نے ہنس کر اس کی پیٹھ پر لات ماری۔

☆☆☆

چیف منسٹر ہاؤس میں ایک لڑکی موبائل ہاتھ میں لیے تیزی سے چیف منسٹر ثانیہ کے کمرے میں پہنچی۔

''میڈم!'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''شاخاں گرفتار ہوگیا ہے۔ اس تھانے میں اپنا ایک آدمی ہے۔ اس نے ابھی موبائل پر مجھے اس کی اطلاع دی ہے۔''

چیف منسٹر ثانیہ پریشان ہو کر کھڑی ہوگئی۔ ''میری بات کراؤ اس سے۔'' وہ لڑکی سے موبائل لینا چاہتی تھی۔

موبائل اسے دے دیا گیا۔

''ہیلو!'' ثانیہ نے کہا۔ ''کس پولیس اسٹیشن میں ہو تم؟''

''میں اسی پولیس اسٹیشن میں ہوں میڈم جہاں وہ کانسٹیبل ہے جس نے آپ کے جلوس کو روکنے کے لیے راستہ بند کیا تھا۔''

''پوری سچویشن کیا ہے؟'' ثانیہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''شاخاں کے ساتھ ایک اور آدمی بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ دونوں الگ الگ لاک اپ میں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے ایک شخص خود کو انٹیلی جنس کا آدمی بتا رہا ہے لیکن اس کی بات پر دھیان نہیں دیا جا رہا۔''

''گرفتاری کی وجہ؟''

''نقضِ امن کے الزام کی بات سنی ہے میں نے...... وہ آدمی اور شاخاں ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔''

ثانیہ نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ اطلاع دینے والا اس پولیس اسٹیشن میں محرر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کا تعلق ثانیہ کی پارٹی کے ورکرز میں سے تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو ثانیہ نے کسی طرح کئی پولیس اسٹیشنوں میں لگوا دیا تھا۔

اس سے بات ختم کر کے ثانیہ نے اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ ''ڈوگر...... ! شاخاں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔'' اس نے پولیس اسٹیشن کا نام بتا کر مزید کہا۔ ''صبح ہونے تک شاخاں کو پولیس کے لاک اپ میں نہیں ہونا چاہیے۔ اسے وہاں پہنچا دیا جائے جہاں وہ جانا چاہے۔''

''او کے میڈم!'' ڈوگر نے تیزی سے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں اس معاملے کو۔''

''شاخاں کو ہر قیمت پر آزاد ہونا چاہیے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں میڈم!'' ڈوگر نے کہا۔ ''اس پولیس اسٹیشن سے نکالنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''مجھے جلدی جلدی رپورٹ دیتے رہنا۔''

''او کے میڈم!''

ثانیہ نے رابطہ منقطع کیا اور اطلاع دینے والی لڑکی سے کہا۔ ''کافی پینا چاہتی ہوں۔''

''یس میڈم!'' لڑکی نے کہا اور اپنا موبائل لیے چلی گئی۔

ثانیہ پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگی۔ تاہم اُسے اطمینان تھا کہ ڈوگرنا کام نہیں رہے گا۔ وہ پارٹی کے تھنڈر اسکواڈ کا چیف تھا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں شور مچا ہوا تھا۔ شور مچانے والے شاخاں اور سرخ شرٹ والے تھے۔ شاخاں کی جیب میں شراب کی بوتل اب بھی تھی۔ اس کی تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ ایک آدھ گھونٹ لے کر وہ چیخنے لگتا تھا کہ اس کی گرفتاری پولیس والوں کو مہنگی پڑے گی، وہ چیف منسٹر ہاؤس سے تعلق رکھتا ہے۔

سرخ شرٹ والا چیخ رہا تھا۔ ''میں انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہوں۔ جھگڑے میں میرا موبائل اور شناختی کارڈ کہیں گر گیا ہے ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ میں کون ہوں۔''

پولیس والے ان دونوں کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

''جب پولیس کے ہتھے چڑھتے ہو تم لوگ تو خود کو اسی طرح طرم خاں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو...... اور تم تو ریوالور والے ہو...... پکے جرائم پیشہ...... تم دونوں کی چمڑی اُدھیڑی جائے گی، تب تم بتاؤ گے کہ تم دونوں آپس میں لڑ پڑے تھے تو کیوں...... بس صاحب آ جائیں تو فیصلہ ہوگا کہ تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔''

سب انسپکٹر راجا اس وقت تھانے میں نہیں تھا۔ جوہر نے اسے موبائل پر ان دونوں کے بارے میں اطلاع دی۔

''ان میں سے ایک خود کو چیف منسٹر ہاؤس کا آدمی بتا رہا ہے اور دوسرا خود کو انٹیلی جنس کا آدمی کہہ رہا ہے۔''

''اس کے پاس شناختی کارڈ نہیں؟'' راجا نے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے کہ اس کا شناختی کارڈ اور موبائل جھگڑے میں کہیں گر گئے۔''

''جھگڑے کی وجہ؟''

''انٹیلی جنس کا آدمی ہونے کا دعوے دار بتا رہا ہے کہ وہ شاخاں کو گرفتار کرنا چاہ رہا تھا اور شاخاں فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''شاخاں اس آدمی کا نام ہے جو خود کو چیف منسٹر ہاؤس کا آدمی بتا رہا ہے۔'' جوہر نے جواب دیا۔ ''انہیں لاک اَپ میں ڈال دیا گیا ہے۔ ہمیں آپ کا انتظار ہے۔''

## حالات کا تقاضا

ایک بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ شادی سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ ڈارلنگ! تم میری دنیا ہو۔''

شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جب میں تمہیں اپنی دنیا کہتا تھا تو اس وقت میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا اور اب تو میں کئی دنیائیں دریافت کر چکا ہوں۔''

## اخلاقیات

دو سفری سیلز مین بہت عرصے بعد ملے۔ ایک نے حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کا دن تو بہت ہی بُرا گزرا۔ کہیں ڈانٹ پھٹکار سننے کو ملی۔ کہیں گالیاں، کہیں لوگوں نے منہ بنا کر دروازہ بند کر لیا، کہیں گرجنے برسنے لگے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔''

''کیا بیچ رہے ہو آج کل؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔'' پہلے نے جواب دیا۔

## پروفیسر

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اندر پروفیسر صاحب ایک کتاب پڑھنے میں مستغرق تھے۔ اچانک بیوی نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بلی تو یہیں گھوم رہی ہے۔''

''ایں؟'' انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کہ بلی کو باہر پھینک آیئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے میری بات نہیں سنی۔ بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔''

''بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے؟ تعجب ہے میں تو اسے باہر پھینک آیا تھا۔'' پھر معاً گھبرا کر بولے۔ ''ذرا دیکھنا تو بے بی پنگھوڑے میں ہے یا نہیں؟''

عمران احمد، حیدرآباد

"ان کی ایف آئی آر کاٹ دی ہے؟"

"آپ کی اجازت ضروری ہے سر...... دونوں بڑے بڑے رسوخ کی بات کر رہے ہیں۔"

"جب تک میں نہ آؤں کوئی کارروائی نہ کرو۔ مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹا بھی لگ سکتا ہے آنے میں۔"

"ٹھیک ہے سر!" جوہر سمجھ گیا کہ راجا اس وقت اپنی کسی داشتہ کے پاس ہوگا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

جوہر نے عباس کو بتایا کہ ان کی ایف آئی آر نہ کاٹی جائے۔

"تم تو ڈاکٹر کے پاس چلو۔" جوہر نے مزید کہا۔ "کچھ لنگڑا رہے ہو۔"

"معمولی چوٹ ہے یار، خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

وہاں کئی افراد جوہر کو اس کے نام سے مخاطب کر چکے تھے اس لیے انٹیلی جنس کا آدمی ہونے کا دعوے دار اسے پکار رہا تھا۔

"پلیز میری ایک بات سن لو۔"

"سن لے یار!" عباس نے کہا۔ "ایک آدمی کا شور تو کم ہو۔"

جوہر اس لاک اَپ کی طرف بڑھا جس میں لال شرٹ والا بند تھا۔ اس دوران میں پولیس اسٹیشن کے فون کی گھنٹی بھی بار بار بج رہی تھی۔ فون کرنے والا کوئی ایک ہی شخص تھا لیکن اپنا نام نہیں بتا رہا تھا۔ وہ سب انسپکٹر راجا سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"وہ ابھی نہیں ہیں۔" اسے جواب دیا جاتا رہا تھا۔

"ان کا موبائل نمبر دے دو۔"

"ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے۔" پولیس اسٹیشن سے جواب دیا گیا۔

جوہر، لال شرٹ والے کے قریب پہنچ گیا۔

"یہ......" لال شرٹ والے نے ایک بوسیدہ سا کاغذ سلاخوں سے باہر جوہر کو دیا۔ "یہاں مجھے یہی کاغذ پڑا ملا۔ چھوٹا سا کوئلہ بھی مل گیا۔ اس سے میں نے کاغذ پر اپنے مقامی چیف کا نام اور نمبر لکھ دیا ہے۔ پلیز انہیں فون کر دو۔ تم کو میری حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

جوہر کاغذ لے کر پلٹا اور عباس کو اس بارے میں بتانے لگا۔

عباس نے کہا۔ "فون کرنے سے حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

"دیکھتا ہوں۔"

شاخاں برابر چیخے جا رہا تھا کہ اس کی بات چیف منسٹر ہاؤس سے کرائی جائے۔

جوہر نے لال شرٹ والے کا لکھا ہوا نمبر ملایا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"داور صاحب ہیں آپ؟" جوہر نے کاغذ پر لکھا ہوا نام لیا۔

"ہاں، داور بول رہا ہوں، آپ کون ہیں؟"

"میں ایک پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔" جوہر نے کہا۔ "آپ خلیل نام کے کسی آدمی سے واقف ہیں۔"

"کیوں؟" چونک کر کہا گیا۔ "پولیس اسٹیشن سے خلیل کا نام کیوں لیا جا رہا ہے؟"

"وہ نقصِ امن میں گرفتار ہوا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اس کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے وہ۔" جلدی سے کہا گیا۔ "میں یہاں انٹیلی جنس کے ڈپارٹمنٹ کا چیف ہوں۔ وہ نقصِ امن میں کیوں پکڑا گیا ہے۔"

"وہ کسی سے لڑ رہا تھا۔"

چونک کر پوچھا گیا۔ "شاخاں سے تو نہیں؟"

"جی ہاں وہ بھی گرفتار ہے۔"

"میں فوراً پولیس اسٹیشن آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہہ کر فوراً رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اس بارے میں عباس سے بات ہوئی تو جوہر نے کہا۔ "یہ واقعی انٹیلی جنس کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جسے فون کیا تھا، وہ خود یہاں آنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس اس کی شناخت کی کوئی چیز ہوگی۔"

"مجھے شراب دو۔" شاخاں چیخا۔ "میری بوتل ختم ہو گئی ہے۔" اس نے بوتل دیوار سے مار کر توڑ دی۔ "چیف منسٹر ہاؤس سے تو میرے لیے شراب کا ایک بیرل آ جائے گا۔ تم لوگ وہاں فون کر کے تو دیکھو۔"

"یہ ضرور کوئی جرائم پیشہ ہے۔" عباس نے کہا۔ "ورنہ انٹیلی جنس والے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کیوں کرتے؟"

"اب داور آ جائے تو فیصلہ ہو کہ خلیل کے ساتھ کیا کیا جائے۔" جوہر نے کہا۔ "لیکن ہر صورت میں ہمیں اپنے سب انسپکٹر کا انتظار تو کرنا ہوگا۔"

"یہ تو طے شدہ بات ہے۔"
سب انسپکٹر راجا آدھے گھنٹے میں آ گیا۔
"کہاں ہیں دونوں؟" اس نے پوچھا۔
"میں نے آپ کو بتایا تو تھا سر!" جوہر نے کہا۔ "لاک اَپ میں ہیں۔"
"ہوں۔" سب انسپکٹر راجا نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل بول پڑا۔ "سر!...... آپ کے لیے فون ہے۔ یہ صاحب دس گیارہ بار فون کر چکے ہیں۔" کانسٹیبل ریسیور ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔
"کون ہے؟" راجا بڑبڑاتا ہوا کانسٹیبل کی طرف گیا۔
ریسیور ہاتھ میں لے کر راجا نے کہا۔ "ہیلو!" اور پھر دوسری طرف سے کچھ سن کر چونک پڑا۔ پھر اس نے فوری طور پر کوئی خاص بات نہیں کی۔ صرف "ہوں، ہوں" کرتا رہا، پھر ریسیور کریڈل پر رکھنے سے پہلے کہا۔ "ٹھیک ہے ہو جائے گا۔"
اسی وقت ایک باوقار شخص تھانے میں داخل ہوا۔ راجا کی توجہ اسی طرف ہو گئی۔ نووارد نے قریب جا کر ایک کارڈ سب انسپکٹر کو دیا۔
"اوہ...... سر!" راجا مؤدب ہو گیا۔ "میرے کمرے میں آیئے۔"
"تمہارا شکریہ جوہر!" لال قمیص والے نے کہا۔ "تم نے میرے چیف کو فون کر دیا۔ آ گئے ہیں وہ...... اب مجھے اس لاک اَپ سے نجات مل جائے گی۔"
راجا نووارد کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔
"رہائی تو مجھے بھی ملے گی۔" شاخاں بولا۔ "سب انسپکٹر کو وہ فون ضرور چیف منسٹر ہاؤس سے ملا ہوگا۔"
"اس کو ہرگز نہ چھوڑنا۔" لال قمیص والا بولا۔ "یہ بہت بڑا دہشت گرد ہے۔ وہ خوفناک بم بلاسٹ اسی نے کرایا تھا۔"
"بکتا رہ۔" شاخاں نے ہنس کر کہا۔
لیکن جوہر سرخ شرٹ والے کی بات پر چونک پڑا تھا۔ اسے دھماکوں کے بعد کا منظر یاد آ گیا۔ انہی دھماکوں کی وجہ سے اس کے بڑے بھائی کی جان گئی تھی۔ اس نے شدید غصے کے عالم میں شاخاں کی طرف دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ سرخ شرٹ والا انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ وہ نووارد کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ سب انسپکٹر بھی نووارد کا کارڈ دیکھنے کے بعد خوش ہو گیا تھا۔ وہ نووارد یقیناً اس کا چیف داور ہوگا۔
دفعتاً کچھ لوگ بہت تیزی سے اندر آئے۔
"کہاں ہے سب انسپکٹر!" ان میں سے ایک نے بلند آواز میں پوچھا۔
"جیو!" شاخاں اس شخص کو دیکھ کر خوش ہوا۔
"کیا واقعی یہ شخص سچ بول رہا ہے۔" عباس نے جوہر سے سرگوشی کی۔ "یہ آنے والے چیف منسٹر ہاؤس کے لوگ ہو سکتے ہیں۔"
"تو کیا چیف منسٹر......" جوہر بولا۔
"ضروری نہیں۔" عباس نے کہا۔ "وہ اس معاملے سے بے خبر ہوگی۔"
سب انسپکٹر کو پوچھنے والے کی آواز اتنی بلند تھی جو راجا نے بھی اپنے کمرے میں سنی ہوگی۔ وہ تیزی سے باہر آیا۔
"ڈوگر صاحب!" راجا کی مدھم آواز بھی جوہر نے سن لی۔ "آپ کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے فون پر آپ سے کہا تھا کہ ٹھیک ہے، ہو جائے گا۔"
"ڈوگر!" عباس زیرِ لب بڑبڑایا۔
راجا اور ڈوگر میں مدھم آواز میں دو تین جملوں کی بات ہوئی۔
"سب لوگ پولیس اسٹیشن سے باہر نکل جائیں۔" راجا نے زور سے حکم دینے والے انداز میں کہا۔
ایک اے ایس آئی اور کانسٹیبلز تیزی سے باہر جانے لگے۔
"اے!" راجا جوہر اور عباس کی طرف دیکھ کر غرایا۔ "تم دونوں بھی تھانے سے باہر جاؤ۔"
جوہر کا موڈ ایسا تھا جیسے وہ باہر جانے کے موڈ میں نہ ہو۔
"چل بھئی!" عباس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ سرگوشی کا انداز تھا۔ "یہ لمبا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس دلدل میں نہیں پھنسنا چاہیے۔"
جوہر اس کے ساتھ باہر تو نکلا لیکن دروازے کے باہر رک گیا۔ وہ تھانے میں جھانک رہا تھا۔ عباس نے اسے گھسیٹنا چاہا لیکن ناکام رہا۔
تھانے کے دوسرے لوگ کچھ فاصلے پر جا کر رکے تھے۔
دو کانسٹیبلوں کو راجا نے اشارے سے روک لیا تھا۔
اسی وقت انٹیلی جنس چیف داور کمرے سے نکلا۔

راجا لپک کر اس کے قریب گیا۔ ”آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھیے صاحب۔ آپ کے آدمی کو لاک اپ سے نکال کر آپ کے پاس ہی لایا جائے گا۔“

داور کو واپس کمرے میں پہنچا کر راجا باہر آیا اور کانسٹیبلوں سے بولا۔ ”ان دونوں کو لاک اپ سے نکالو۔“

”یہ تو غلط ہو رہا ہے۔“ جوہر بڑبڑایا۔ ”شاخاں کو تو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں اس معاملے کو روکوں گا۔ ایسی کی تیسی راجا کی۔“

لیکن عباس نے اُس کا بازو پکڑ کر زبردستی اندر جانے سے روکا۔

کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا اے ایس آئی تیزی سے ان دونوں کے قریب آکر بولا۔ ”کیا تم نے صاحب کا حکم نہیں سنا؟“

اس وقت لال قمیص والے کے ساتھ ہی شاخاں کو بھی لاک اپ سے نکال لیا گیا تھا۔ جوہر نے یہ بھی دیکھا کہ ڈوگر کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے ریوالور نکالا تھا۔

جوہر نے بڑی تیزی سے اے ایس آئی کے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور خود کو عباس سے چھڑا کر تھانے میں داخل ہو گیا۔

جس نے ریوالور نکالا تھا، اس نے لال قمیص والے کا نشانہ لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ لال قمیص والے کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوتا جوہر نے اس پر گولی چلا دی۔ ڈوگر کا آدمی کراہ کر گرا لیکن فائر وہ بھی کر چکا تھا۔ جوہر کی چلائی ہوئی گولی بہک گئی۔ اس نے شاخاں کے جسم کو نشانہ بنا ڈالا تھا۔

راجا نے تیزی سے ریوالور نکال کر جوہر کا نشانہ لیا لیکن جوہر نے اس پر جست لگا کر اس کو گرا دیا اور چیخا۔ ”انصاف کا ساتھ دو عباس!“

”مجھے ہی ٹھونک دیا۔“ شاخاں کراہتا ہوا ایک طرف گرا۔

راجا نے سب انسپکٹر کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

”تمھاری شامت نے دھکا دیا ہے جوہر!“ راجا غرایا۔

ڈوگر کے دوسرے آدمی جوہر پر ٹوٹ پڑے۔ لاتیں اور گھونسے چلنے لگے۔ ان لوگوں میں سے کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔

تھانے میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ عباس نے جوہر کا ساتھ دیا تھا۔ اس وقت جوہر کے جسم میں بڑی پھرتی آ گئی تھی۔ ڈوگر کے آدمی اس پر قابو نہیں پا سکے۔ اس دھماچوکڑی میں لال قمیص والا بھی ایک طرف گرا لیکن پھر سنبھل گیا۔ وہ گرا بھی ٹیلی فون پر تھا اور انسٹرومنٹ زمین پر گر کے ٹوٹ گیا تھا۔

یہ آوازیں سن کر انٹیلی جنس چیف داور کمرے سے نکل آیا۔

جو پولیس والے تھانے سے نکل گئے تھے، دوڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ انہوں نے راجا کا ساتھ دیا۔

لال قمیص والا جوہر کے مخالفوں سے ٹکراتا ہوا شاخاں کے قریب پہنچ گیا۔

داور نے دو ہوائی فائر کیے اور چیخا۔ ”جلدی یہاں سے نکلو عابد!“ لال قمیص والے کا نام عابد تھا۔

”اسے ساتھ لے جانا ضروری ہے سر!“ عابد نے اپنے چیف کو جواب دیا۔ اس نے ایک جگہ لٹکی ہوئی ہتھکڑیوں میں سے ایک ہتھکڑی نکال لی تھی جو وہ شاخاں کے لگانا چاہتا تھا۔

راجا کے ہاتھ سے گرا ہوا ریوالور ڈوگر کے آدمیوں میں سے ایک کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے داور پر فائر کر دیا۔ گولی داور کے گلے میں لگی اور وہ گر پڑا۔ گولی ایسی جگہ لگی تھی کہ اس کے زندہ بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

”تجھے تو میں نہیں چھوڑوں گا شاخاں!“ عابد نے ہتھکڑی کا ایک حصہ شاخاں کی کلائی میں ڈال دیا اور دوسرا حصہ اپنی کلائی میں ڈال لیا۔

شاخاں کے گولی تو لگی تھی لیکن پیٹ کے بائیں حصے میں لگی تھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔

جوہر کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ اس کے تصور میں اپنے بھائی کی لاش تھی۔ وہ ڈوگر سمیت اس کے آدمیوں پر بھاری پڑ رہا تھا۔

راجا کوئی چوٹ کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا اور گرا پڑا تھا۔

عابد نے شاخاں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”میرا ساتھ دو بہادر جوہر۔“

اتنی دیر میں جوہر نے پولیس والوں سمیت سبھی کو زمین چٹا دی تھی۔ اس کے لیے افسوس ناک بات صرف یہ تھی کہ عباس اس مقابلے میں مارا جا چکا تھا۔

”بس اب یہاں سے نکلنا ہے جوہر۔“ عابد چیخا۔ ”میرا ساتھ دو۔ تم ایک ایمان دار پولیس والے ہو۔“

شاخاں ہتھکڑی لگنے کے باوجود عابد کے قابو میں نہیں آرہا تھا لیکن بچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے لگی ہوئی ہتھکڑی کا دوسرا حصہ عابد نے اپنی کلائی میں پہن لیا تھا۔

عابد اور جوہر، شاخاں کو گھسیٹتے ہوئے تھانے سے نکل آئے۔

زمین پر پڑے ہوئے کچھ پولیس والے اٹھنے کی کوشش کررہے تھے۔

''بند کردو دروازہ۔'' عابد نے کہا۔

چوٹیں جوہر کے بھی لگی تھیں لیکن اس وقت وہ اپنی ہر تکلیف سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ اس نے تھانے کا بڑا دروازہ بند کردیا۔

وہاں کسی کی وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص حیران نظر آرہا تھا۔ جوہر نے اسے گھسیٹ کر وین سے نکالا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

عابد، شاخاں کے ساتھ وین میں سوار ہوچکا تھا۔
اس وقت تھانے کی طرف سے ایک فائر آیا لیکن جوہر وین کو تیزی سے حرکت میں لاچکا تھا۔

عابد نے اپنی کلائی کی ہتھکڑی اتار کر وین کے ایک حصے میں لگادی۔ شاخاں نے زور سے جھٹکا دے کر دوسری ہتھکڑی کو وین سے الگ کرنا چاہا لیکن نہیں کرسکا۔ ہتھکڑی لگائی ہی ایسی جگہ تھی کہ شاخاں اپنی ساری طاقت لگا دیتا لیکن کامیاب نہیں ہوپاتا۔ آخر وہ ہتھکڑی وین سے لگانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ جسے سمجھ دار تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ شاخاں گالیاں بک کر رہ گیا۔

''اے ہیڈ کانسٹیبل!'' وہ بولا۔ ''یہ سی آئی ڈی والا تو میرے لوگوں کے ہاتھوں مارا ہی جائے گا اس کا ساتھ نہ دے ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔''

''بک بک نہ کر۔'' جوہر نے کہا۔

''اسے کل عدالت میں پیش کرنا ہے لیکن پہلے اس کی زندگی بچانا ضروری ہے۔ جو گولی اس کے لگی ہے، وہ کسی ڈاکٹر سرجن سے نکلوانا ضروری ہے ورنہ خون بہتا رہا تو یہ مرجائے گا۔''

''گولی کہاں نکلوائی جاسکتی ہے؟''

''اب جو موڑ آئے گا۔ تو دائیں طرف موڑ لینا۔ میں اس گھر تک تمہاری رہنمائی کروں گا جو ایک ریٹائرڈ سرجن ہے فوج کا...... ایک غلط آپریشن ہوگیا تھا اس سے جس کے باعث فوج سے نکالا گیا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ

ایک محب وطن شخص ہے۔ اس سے ہمیں مدد ضرور مل جائے گی۔''

''کتنی دور ہے؟'' جوہر نے پوچھا۔

''یہاں سے آٹھ گھنٹے کا فاصلہ تو ہوگا۔''

جوہر نے پیٹرول کی مقدار بتانے والی سوئی پر نظر ڈالی۔

''پیٹرول کی مقدار اطمینان بخش نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''اوہ!'' عابد کو تشویش ہوئی۔

''ویسے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم گاڑی بدلیں۔''

''میں بھی یہ بات کہنے والا تھا۔'' عابد نے کہا۔ ''پولیس اسٹیشن سے جس نے بھی ہم پر فائر کیا تھا، اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم ایک وین میں نکلے ہیں۔ پولیس شہر بھر کی ہر وین چیک کرے گی۔''

''آگے ایک پرائیویٹ ایمبولینس جارہی ہے۔ اس پر قبضہ کیا جانا چاہیے۔'' جوہر نے کہا۔ ''پیٹرول تو کسی پیٹرول پمپ سے بھروایا جاسکتا ہے۔''

''تو روکو اسے۔''

''وہ سائرن بھی نہیں بجارہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی مریض کی وجہ سے ایمرجنسی میں نہیں ہے۔''

''اس میں اگر کئی آدمی بھی ہوئے تو انہیں قابو میں کیا جاسکتا ہے، ان کے پاس کوئی ہتھیار تو ہوگا نہیں۔''

شاخاں بول پڑا۔ ''ہوائی جہاز بھی پکڑ لو تو بچو گے نہیں، چیف منسٹر جہاز بھی اتروا سکتی ہے۔''

جوہر چونکا۔

''میں جانتا ہوں۔'' عابد نے کہا۔ ''فساد کی جڑ ہی

چیف منسٹر ہے۔"

"کیا؟" جوہر مزید چونکا۔

"ہاں۔" عابد نے کہا۔ "مت بھولو کہ اس معاملے میں میرا محکمہ کام کر رہا ہے۔ بہت کچھ معلوم کر لیا ہے ہم نے...... شاخاں سب کچھ جلتا ہوگا۔"

شاخاں بھدے انداز میں ہنسنے لگا۔

وین ایمبولینس کے قریب پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

شام قریب ہوتے ہوتے رضیہ کی پریشانی بڑھ گئی۔ جوہر نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی یا کر نہیں سکا تھا۔ رضیہ اس کے موبائل سے بھی رابطہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ موبائل بند مل رہا تھا۔ رضیہ نے پولیس اسٹیشن بھی فون کیا تھا لیکن وہاں گھنٹی بج رہی تھی لیکن کسی نے بھی فون نہیں اٹھایا تھا۔

رضیہ دیوانہ وار ایک سڑک پر چل رہی تھی۔ یونہی اس کے دماغ میں آیا تھا کہ وہ پولیس موبائل میں راؤنڈ پر ہو سکتا ہے۔ موبائل اس نے شاید اس لیے بند کیا ہو کہ تھانے کا انچارج بھی اس کے ساتھ ہو۔

اچانک اس کی نظر اجمل پر پڑی جو ایک دکان سے نکل کر اپنی اسکوٹر پر بیٹھ رہا تھا۔

پیدل چلنے سے بہتر ہے کہ اسے کوئی سواری مل جاتی۔ تیزی سے ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ وہ فوراً اجمل کی اسکوٹر کے سامنے پہنچ گئی۔ اجمل اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"بہت اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔" رضیہ نے مسکرانے کی اداکاری کی۔

"بڑی مہربان سی نظر آرہی ہو۔" اجمل کی حیرت کم نہیں ہوئی۔

"میں نامہربان کب تھی۔ اُس جھگڑے میں اس لیے نہیں بول سکی کہ گھر والے تھے۔ پسند تو میں تم ہی کو کرتی ہوں۔"

"اچھا!" اجمل کھِل اٹھا۔

"میرا ایک کام کرو گے؟"

"بولو!" اجمل ریشہ ختمی ہونے لگا۔

"مجھے اپنے ساتھ اسکوٹر پر بٹھالو۔ شہر گھومنا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی پولیس موبائل میں نظر آسکتا ہے۔"

اب اجمل چونکا۔ "تم جوہر سے ملنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔" رضیہ نے کہا۔ "اکیلے میں اسے اچھی طرح جھاڑ دوں گی۔ مجھے بڑا غصہ ہے اُس پر...... تمہاری توہین ہوئی تھی اُس کی وجہ سے...... مجھے بہت بُرا لگا ہے...... میں اسے اچھی طرح جھاڑوں گی۔"

"یہ بات ہے۔" اجمل خوش ہو گیا۔ "چلو بیٹھو۔"

رضیہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"لیکن......" اجمل بولا۔ "وہ پولیس موبائل میں ہو گا تو تم اسے کیسے جھاڑو گی۔"

"تم دیکھنا میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"لیکن پولیس موبائل ملے گی کہاں؟"

"کہیں نہ کہیں ملنا چاہیے۔" رضیہ نے کہا۔ "اسی لیے تو میں نے شہر میں گھومنے کی بات کی ہے۔"

اجمل نے اسکوٹر چلا دی۔ رضیہ اسے بے وقوف بنانے کے لیے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ اجمل کی باچھیں کھِلتی رہیں۔

پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ رضیہ ایک ایمبولینس کی ڈرائیونگ سیٹ پر جوہر کو بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

"جوہر!" اس نے زور سے پکارا۔

جوہر نے چونک کر عقب نما آئینے میں رضیہ کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اس نے بریک لگائے۔

"کیا بات ہے؟" عابد تیزی سے بولا۔ "کون ہے یہ لڑکی؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" جوہر وین روک کر اترا۔

اجمل کی رکی ہوئی اسکوٹر سے رضیہ بھی اتر آئی تھی۔

"یہ کیا......؟" جوہر نے اس سے پوچھنا چاہا۔

رضیہ نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے اجمل سے کہا۔ "اب تم دفع ہو، مجھے جوہر کے ساتھ جانا ہے۔"

"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ......" اجمل نے کچھ کہنا چاہا۔

رضیہ نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا اور جوہر سے پوچھنے لگی۔ "یہ تم ایمبولینس میں کیسے؟"

"لمبی کہانی ہے۔ میں پولیس ہی سے فرار ہو رہا ہوں۔ میرے ساتھ ایک خطرناک مجرم ہے۔"

"کوئی بھی ہو، میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔ میں گھر سے بھاگ آئی ہوں۔ میرے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا ہے۔"

"اچھی طرح سوچ لیا ہے؟"

"خوب سوچ چکی ہوں۔"

اجمل نے رضیہ کو جوہر کے ساتھ ایمبولینس کی طرف

جاتے دیکھا تو اس کے خلاف گھٹیا زبان استعمال کرنے لگا۔

شاخاں اور عابد پچھلی سیٹ پر تھے۔ جوہر نے رضیہ کو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

"اس غیر معمولی صورتِ حال میں تم کس لڑکی کو......" عابد بولا۔

جوہر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔" ساتھ ہی اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔ ایمبولینس تیزی سے آگے بڑھی۔

عابد نے پوچھنا چاہا۔ "یہ راستے میں کہاں......"

جوہر نے پھر اس کی بات کاٹی۔ "مجھے اس سے آج ہی ملنے جانا تھا لیکن حالات نے مجھے کہاں پھنسا دیا، یہ تم جانتے ہو۔ یہ مجھے اور میں اسے چاہتا ہوں۔ اس کے گھر والے اس کی شادی زبردستی کرنے والے تھے لہٰذا یہ آج ہی اپنے گھر سے بھاگ آئی ہے۔ میری تلاش میں تھی۔"

"جیو!" شاخاں نے جیسے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن۔" جوہر نے رضیہ سے پوچھا۔ "تم اجمل کے ساتھ کیسے تھیں؟"

رضیہ نے بتایا کہ اس نے اجمل کو کس طرح بے وقوف بنایا۔

"خوب جیو!" شاخاں پھر بول پڑا۔ "اوئے ہیڈ کانسٹیبل! یہ لڑکی تو بہت ذہین ہے تو جا کر اس سے شادی بنا۔ اس سی آئی ڈی والے کے چکر میں نہ پڑ۔"

"ہاں بھیا!" رضیہ نے مڑ کر اسے دیکھے بغیر کہا۔ "میں اسی کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی۔"

"اچھا ہوا کہ تم مجھے اس طرح مل گئیں۔" جوہر بولا۔ "ورنہ میں آج تم سے کسی قیمت پر نہیں مل پاتا۔ میں اس وقت پولیس سے فرار ہو رہا ہوں۔"

"پولیس سے!" رضیہ کو حیرت ہوئی۔ "اور یہ ایمبولینس؟"

"فرار تو ہم ایک وین میں ہوئے تھے لیکن اسے پولیس پکڑ لیتی۔ راستے میں ہم کو یہ ایمبولینس مل گئی۔ اس میں تین آدمی تھے جن کو ہم نے کسی طرح ایمبولینس سے نکال پھینکا اور اس پر خود قبضہ کر لیا۔"

"پولیس سے کیوں بھاگ رہے ہو؟ تم تو خود پولیس میں ہو۔"

"سمجھو کہ اب نہیں ہوں۔ پولیس اسٹیشن پر جھگڑا ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ایک خطرناک مجرم ہے۔ پولیس اسٹیشن کا انچارج اسے بھگانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی غیر قانونی حرکت برداشت نہیں کی۔ اب میں اور انٹیلی جنس کے یہ صاحب بھی اس مجرم کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔"

"چھوڑنا تو پڑے گا کسی وقت۔" شاخاں ہنسا۔ پیٹ میں گولی لگنے کے باوجود وہ نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیٹ سے بہتا ہوا خون ایمبولینس کی سیٹ رنگین کر رہا تھا۔ "میرے ساتھی مجھے بچا لیں گے اس سؤر سے۔"

عابد نے اس کے منہ پر گھونسا مار دیا۔ "گالیاں بکے گا؟...... ہم پہلے تو تجھے اس گولی سے بچانا چاہتے ہیں جو تیرے پیٹ میں ہے زیادہ خون بہہ گیا تو مر جائے گا تو اور مجھے حسرت رہ جائے گی کہ تجھے کورٹ تک نہیں لے جاسکوں گا۔"

"کورٹ کا جج بھی میرا کچھ نہیں کر سکتا۔" شاخاں پھر ہنسا۔ "ہاں اپن اگر خون نکل جانے سے مر گیا تو اور بات!"

رضیہ نے اب سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"جوہر!" عابد بولا۔ "اپنے ساتھ تم اس لڑکی کو بھی مصیبت میں ڈالو گے۔"

رضیہ بولی۔ "میں اس کے ساتھ مرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"محبت زندہ باد۔" شاخاں کو اپنی زبان پر قابو نہیں تھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" رضیہ نے جوہر سے پوچھا۔

جوہر کے بجائے عابد بول پڑا۔ "پہلے تو یہ شاہ خاں کہلاتا تھا پھر کسی طرح اس کا نام بگڑ گیا۔"

"کیا کیا ہے اس نے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"بہت سے کارنامے ہیں اس کے۔" عابد نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "وہ خوفناک بم بلاسٹ بھی اسی نے کیا تھا۔"

"جس میں میرا بھائی مارا گیا۔" جوہر کی آواز بھرّا گئی۔ "بہت سے لوگ مرے تھے اس بم بلاسٹ میں۔ اس کو اس کی سزا ملنا ہی چاہیے۔"

اب رضیہ نے شاخان کی طرف دیکھا تو خوف زدہ نظر آئی۔

☆☆☆

ڈی آئی جی پولیس اسٹیشن پہنچا اور اِدھر اُدھر مرے ہوئے یا زخمی لوگوں کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ''یہ سب کس نے کیا ہے؟''

''ہمارے ہی ایک ہیڈ کانسٹیبل نے۔'' سب انسپکٹر راجا نے بتایا۔ ''وہ شاخاں نامی ایک شخص کو لے کر فرار ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی ہے جس نے خود کو انٹیلی جنس کا آدمی بتایا تھا۔''

''تم نے مجھے فون پر صرف یہ اطلاع دی تھی کہ پولیس اسٹیشن میں کوئی بڑا ہنگامہ ہوگیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دو ایک آدمیوں نے اتنے لوگوں کا یہ حال کیا ہے۔ تمہارا ایک جبڑا ابھی سوجا ہوا ہے۔ وہ فرار کیسے ہوا؟''

''تھانے کے قریب ایک وین کھڑی تھی کسی کی۔'' سب انسپکٹر راجا نے بتایا۔ ''وہ دونوں شاخاں کو لے کر اسی میں فرار ہوئے ہیں۔''

''تو اس وین کو پکڑنے کے لیے تم نے کیا کیا؟''

''اس وقت ہماری موبائلز سارے شہر میں اس وین کو تلاش کر رہی ہیں۔''

کچھ لوگ شور مچاتے ہوئے تھانے میں داخل ہوئے۔

''حد ہوگئی ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر آدمی چیخ رہا تھا۔ ''اب پولیس والے بھی لڑکیوں کو اغوا کیا کریں گے۔''

''اس وقت یہ کیا معاملہ کھڑا ہو رہا ہے۔'' ڈی آئی جی بڑبڑایا۔

سب انسپکٹر راجا تیزی سے اس شخص کے قریب پہنچا۔ ''پولیس نے کس کو اغوا کرلیا؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''میری بیٹی کو۔'' جواب دیا گیا ''...... تمہارے تھانے کے ہیڈ کانسٹیبل جوہر نے اغوا کیا ہے۔''

''وہ اس وقت کسی لڑکی کو اغوا نہیں کرسکتا۔'' راجا نے کہا۔

''گواہ موجود ہے۔'' وہ شخص آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے ایک قدم پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو آگے گھسیٹا۔ وہ اجمل تھا۔

''میرے سامنے وہ رضیہ کو ایک ایمبولینس میں لے کر بھاگا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ایمبولینس میں؟'' راجا کو حیرت ہوئی۔

''ہاں۔'' اجمل نے کہا۔ ''رضیہ سے کل میری شادی ہونے والی ہے اور وہ جوہر کے ساتھ بھاگ گئی۔''

''بکواس کر رہے ہو تم۔'' راجا نے بگڑ کر کہا۔ ''جوہر تو اس وقت ایک وین میں ہوگا۔''

''ٹھہرو!'' ڈی آئی جی آگے بڑھ کر راجا کے برابر میں پہنچا اور اجمل کو گھورتا ہوا بولا۔ ''پوری بات بتاؤ!''

''رضیہ میری اسکوٹر پر تھی اور میری مدد سے جوہر کو ڈھونڈنا چاہتی تھی۔'' اجمل نے جواب دیا۔ ''وہ چاہتی تھی کہ میرے سامنے جوہر کو تلاش کرے اور اُس کو میرے سامنے ہی ذلیل کرے۔''

''تم نے اسے اپنی اسکوٹر پر کیوں بٹھایا تھا؟''

اجمل نے کسی قدر جھینپے ہوئے انداز میں اپنی بے وقوفی بیان کردی اور اس میں جھوٹ کا اضافہ کیا۔ ''جوہر اسے زبردستی گھسیٹ کر ایمبولینس میں لے گیا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ وہ شہر کے کسی حصے میں کسی پولیس موبائل میں ہوگا لیکن وہ ایک ایمبولینس میں تھا۔ وہ اچانک دکھائی دے گیا تھا اور رضیہ نے اس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ اس ایمبولینس میں شاید دو آدمی اور بھی تھے۔ ایمبولینس کسی پرائیویٹ ادارے کی تھی۔''

''یہ بیان درست ہوسکتا ہے۔'' ڈی آئی جی نے سب انسپکٹر راجا کو گھورتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''جوہر کو بھی خطرہ ہوگا کہ اسے وین میں فرار ہوتے دیکھ لیا گیا ہے اس لیے اس نے گاڑی بدلنا ضروری سمجھا۔ انٹیلی جنس کا بھی ایک آدمی اس کے ساتھ ہے۔ جو یہ بات سوچ سکتا ہے کہ ہم شہر بھر کی وین چیک کر رہے ہوں گے۔ ایمبولینس اس نے کس طرح ہتھیائی۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ وین کے بجائے ایمبولینس تلاش کرواؤ...... جوہر اور وہ انٹیلی جنس والا شہر سے بھی بھاگ سکتے ہیں۔''

☆☆☆

ایمبولینس ایک ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ رات کا کچھ حصہ گزر چکا تھا۔ ''رفتار بڑھاؤ جوہر۔'' عابدہ بولا۔ ''ہمیں جلد از جلد......''

جوہر نے اس کی بات کاٹی۔ ''انجن اتنا طاقتور نہیں ہے کہ رفتار اور بڑھائی جاسکے۔'' پھر یکایک پریشان ہوا۔ ''ابھی میں نے دیکھا ہے کہ انجن انتہائی گرم ہوچکا ہے۔ غالباً ریڈی ایٹر کا پانی ختم ہوگیا ہے۔'' اس نے تیزی سے رفتار کم کی۔ ''آگ بھی لگ سکتی ہے۔''

''مزہ آئے گا۔'' شاخاں ہنسا۔

''پانی لانا پڑے گا۔'' جوہر نے ایمبولینس سے

اترتے ہوئے کہا۔ ”ابھی منٹ بھر پہلے ہی ہم ایک پیٹرول پمپ کے سامنے سے گزرے ہیں۔ وہاں سے پانی مل سکتا ہے۔“

”لایا کیسے جاسکتا ہے؟“ عابد کے لہجے میں تشویش تھی۔

”گاڑی میں کوئی ٹن ملنا چاہیے۔“ جوہر نے کہا۔

اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ گاڑی میں ایک بڑا ٹن مل گیا۔

”میں آتا ہوں پانی لے کر۔“ جوہر نے ٹن کے ساتھ پیٹرول پمپ کی طرف دوڑ لگادی۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“ رضیہ نے چیخ کر کہا اور ایمبولینس کا دروازہ کھولنے لگی۔

”بے وقوفی مت کرو۔“ عابد نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تم اتنی تیز نہیں دوڑ سکتیں۔“

جوہر بے تحاشا دوڑتا ہوا پیٹرول پمپ پہنچا۔

”یہاں کیسے نکل آئے جوہر بھائی؟“ پیٹرول پمپ کا ایک آدمی بول پڑا۔ وہ جوہر کو پہچانتا ہوگا۔

جوہر کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی کیونکہ قریب ہی ایک کانسٹیبل کھڑا وائرلیس انسٹرومنٹ پر کسی سے سن رہا تھا۔ ”اب وہ وین میں نہیں، کسی ایمبولینس میں ہوگا۔“ آواز آرہی تھی۔

جوہر اس وقت جتنی تیزی دکھا سکتا تھا، وہ اس نے دکھائی۔ پانی کے ایک ڈرم سے اس نے ٹن بھر لیا۔

”اے!“ کانسٹیبل اس کی طرف لپکا۔ اس نے یقیناً جوہر کا نام سن لیا ہوگا۔

قریب ہی ایک ہتھوڑا پڑا تھا۔ جوہر نے وہ پھرتی سے اٹھایا۔ کانسٹیبل اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جوہر نے ہتھوڑا اس کے سر پر مارنا چاہا لیکن اس نے بچنے کی کوشش کی تو ہتھوڑا کھوپڑی کے وسط میں پڑنے کے بجائے سر کے اس حصے میں لگا جو کنپٹی کے قریب تھا۔ کانسٹیبل چکرا کر گر پڑا۔ سر سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔

پیٹرول پمپ کے جس آدمی نے جوہر کو پہچانا تھا، وہ اس وقت کسی اور طرف متوجہ تھا لہٰذا سپاہی کا حشر نہ دیکھ سکا۔

جوہر نے پانی کا کین اٹھا کر ایمبولینس کی طرف دوڑ لگائی لیکن اس مرتبہ کین کے وزن کی وجہ سے اس کی رفتار پہلے جیسی نہیں تھی لیکن بہرحال وہ ایمبولینس تک پہنچ ہی گیا۔

”جلدی کرو۔“ عابد نے اس سے کہا۔

وہ کچھ نہ کہتا تو بھی جوہر جلدی ہی کرتا لیکن اُس کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ اس لمبے سفر کے لیے وہ پانی کافی نہیں تھا اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ پولیس اب وین کے بجائے ایمبولینس کو تلاش کرتی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور بولا۔ ”پولیس کو معلوم ہوگیا ہے کہ اب ہم وین میں نہیں، ایمبولینس میں ہیں۔“

”کیسے؟“ عابد چونکا۔

جوہر نے بتایا کہ پیٹرول پمپ پر موجود کانسٹیبل کو کیا اطلاع دی گئی تھی۔

”پھر تو......“ عابد کے لہجے میں تشویش بھی تھی۔ ”ایمبولینس میں سفر کرنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔“

”ہاں۔“ جوہر نے کہا۔ ”وین تو ہمیں چھوڑنا ہی پڑے گی۔ ویسے بھی جتنا پانی ریڈی ایٹر میں ڈالا گیا ہے، وہ اس سفر کے لیے ناکافی ہے۔“

”یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس نے شہر کے علاوہ اردگرد کے علاقوں کو بھی خبر دے دی ہو۔“

”وہ تو یقینی بات ہے۔“ جوہر نے کہا۔ ”یہ پیٹرول پمپ شہری حدود میں نہیں ہے جہاں کانسٹیبل کو اطلاع دی گئی ہے۔“

”اب ہوائی جہاز ڈھونڈو!“ شاخاں ہنس کر بولا۔

رضیہ بھی پریشان نظر آرہی تھی۔

”ہوں۔“ جوہر بولا۔ ”جس راستے پر جارہے ہیں، یہاں کسی اور گاڑی کا گزر بھی نہیں ہوسکتا۔“

”شاید کوئی آرمرڈ کار مل جائے۔“ شاخاں نے مذاق اُڑایا۔

عابد نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کردیا اور بولا۔ ”گولی ہے تمہارے جسم میں، خون بہہ رہا ہے، موت کی طرف بڑھ رہے ہو لیکن بکواس سے باز نہیں آرہے ہو۔“

”بہت خون ہے میرے جسم میں۔“ شاخاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں مروں گا نہیں۔ تم نے پٹی بھی کس کر باندھی ہے۔ خون زیادہ تیزی سے نہیں بہہ رہا ہے۔“

”اب کیا ہوگا جوہر؟“ رضیہ کی پریشانی صاف ظاہر تھی۔

”اپنی جان بچانے کی فکر کر لڑکی!“ شاخاں بولا۔ ”ان دونوں کے ساتھ تو بھی ماری جائے گی۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ میرے آدمی انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”اپنا منہ بند رکھ۔“ عابد غرایا۔ ”ورنہ تیرے منہ پر

ٹیپ چپکا دوں گا۔''

''اچھا!'' شاخاں ہنسا۔ ''وہ جو شعر ہے...... لہو پکارتا ہے، خنجر کی زباں بند......''

جوہر نے عابد سے کہا۔ ''تم اس کو بکواس کرنے دو۔ یہ سوچو کہ جلد از جلد اس ایمبولینس سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔''

''وہی سوچ رہا ہوں۔'' عابد نے کہا۔ ''چند میل آگے جا کر دائیں ہاتھ پر ایک گھنا جنگل پڑے گا۔ جنگل کے بعد ویرانہ ہے۔ وین جنگل میں چھپائی جاسکتی ہے۔''

''تو ہم آگے کیسے چلیں گے؟''

''ویرانہ سات آٹھ میل کا ہے۔ پیدل چلنا پڑے گا۔ اس کے بعد ایک سڑک آجائے گی۔ وہاں اِکّا دُکّا گاڑیاں بھی چلتی دکھائی دیں گی۔ انہی میں سے کسی پر قبضہ کرنا ہوگا۔''

''وقت زیادہ گزر جائے گا۔ یہ مر نہ جائے۔'' جوہر کا اشارہ شاخاں کی طرف تھا۔ ''اور تم اسے کورٹ تک پہنچانے کے لیے زندہ رکھنا چاہتے ہو۔''

''اور کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔''

''اپنے بارے میں سوچو جوہر۔'' رضیہ بولی۔ ''انتیلی جنس والا جانے اور شاخاں...... تم کو ان سے کیا لینا دینا۔''

''میری خواہش بھی یہی ہے کہ اسے کورٹ تک پہنچایا جائے۔'' جوہر نے کہا۔ ''بم کے دھماکے کا ذمے دار یہی ہے۔ اسی دھماکے میں میرے بھائی کی جان گئی تھی۔''

''تم اس سے انتقام لینا چاہتے ہو؟''

''بہت سے لوگ مرے تھے اس دھماکے میں...... ان سب کی سزا ملنا چاہیے اِسے۔''

شاخاں نے جماہی لی۔ ''بہت دیر سے شراب نہیں ملی۔''

''جنگل قریب آگیا ہے۔'' عابد بولا۔ ''رفتار بڑھاؤ۔''

''ایمبولینس پوری رفتار سے چل رہی ہے۔''

''اوہ......!'' عابد چونکا۔ ''سامنے سے کئی گاڑیاں آرہی ہیں۔ ہیڈ لائٹس ابھی دور ہیں۔ میں دیکھ چکا ہوں۔ پیچھے سے بھی ایک گاڑی آرہی ہے۔ شاید پیٹرول پمپ والے آدمی نے پولیس کو اطلاع دی ہوگی۔''

''اتنے لوگوں سے مقابلہ ممکن نہیں ہوگا، ابھی بائیں جانب جو راستہ آرہا ہے، اس طرف موڑو ایمبولینس کو۔''

''وہ تو دریا کا پُل ہے۔'' جوہر نے کہا۔

''ان لوگوں سے بچنا ہے تو اُدھر ہی کا رخ کرنا ہوگا۔''

''پُل بھی خطرناک ہے۔ دائیں بائیں دیواریں نہیں ہیں۔ جنگلے بنے ہوئے ہیں۔''

''یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔'' عابد نے کہا۔

جوہر کو اس سے اتفاق تھا۔ اس نے ایمبولینس موڑی۔

''تعاقب کرنے والی گاڑی بھی اسی طرف مڑی ہے۔'' عابد نے کہا۔ ''اس کی رفتار بہت تیز معلوم ہوتی ہے، گاڑی بھی کافی بڑی ہے۔''

''اب جو بھی ہو۔'' جوہر نے کہا۔

''اس سے تو مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔'' عابد نے کہا۔

''جلدی مارے جاؤ گے تم سب۔'' شاخاں بولا۔

تعاقب کرنے والی گاڑی تیزی سے قریب آچکی تھی۔ اس نے آگے نکلنا چاہا تو جوہر ایمبولینس اس کے سامنے لے آیا۔ تعاقب کرنے والی گاڑی نے اسے بڑی زور سے ٹکر ماری۔ اسٹیئرنگ پر جوہر کو پوری طرح قابو نہیں رہ سکا اور وہ جنگلے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''رک جاؤ'' تعاقب کرنے والی گاڑی سے چیخ کر کہا۔ ''ورنہ تم پر گولیوں کی برسات کردی جائے گی۔''

''یہ تو اپنا آدمی ہے۔'' شاخاں خوش ہو کر بولا۔

جوہر نے چیخ کر جواب دیا۔ ''گولیوں کی برسات کرو گے تو تمہارا آدمی شاخاں بھی مارا جائے گا جو ہمارے ساتھ ہے۔''

''اس کی ہمیں بالکل پروا نہیں ہے۔''

''یہ کیا بک رہا ہے جاور کا بچہ۔'' شاخاں بڑبڑایا۔

''اس کو میری پروا نہیں ہے۔''

تعاقب کرنے والی گاڑی نے اس موقع پر پھر ایمبولینس سے آگے نکلنا چاہا۔ جوہر یہی سمجھا تھا کہ اب اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی جائے لیکن اس کے برعکس برابر آتے ہی ایمبولینس کو اتنی زور سے ٹکر ماری کہ ایمبولینس جنگلا توڑتی ہوئی دریا میں جا گری۔

کھڑکیوں سے پانی ایمبولینس میں آنے لگا۔

''تم تیرنا جانتی ہو رضیہ۔'' جوہر نے کہا۔ ''باہر نکل کر تیرتی ہوئی کنارے کی طرف بڑھو۔''

عابد نے جلدی سے شاخاں کی وہ ہتھکڑی کھولی جو

اس نے ایمبولینس کے ایک حصے سے باندھ دی تھی۔ وہ ہتھکڑی اس نے اپنی کلائی سے باندھ لی۔ وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

پانی کے دباؤ کی وجہ سے بمشکل دروازے کھل سکے اور وہ چاروں باہر نکل پائے ورنہ ایمبولینس کے ساتھ ڈوبتے ہی چلے جاتے۔

پانی میں سانس روک کر تیرنا آسان کام نہیں تھا۔

شاخاں نے پانی سے باہر سر نکالا۔

پُل پر ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ شاخاں کا ساتھی جاور ہی ہوسکتا تھا۔ شاخاں چیخا۔ ”مجھے بچا جاور۔“

جاور نے قہقہہ لگایا۔ ”میڈم نہیں چاہتیں کہ تم کورٹ پہنچ سکو۔ آرڈر ہوا ہے کہ جو بھی شاخاں کو مارے گا، اسے شاخاں کی جگہ دے دی جائے گی۔“ اس نے اپنے ریوالور کا رخ پانی سے اُبھرے ہوئے شاخاں کی طرف کر دیا۔

عابد نے اسے جلدی سے پانی میں نیچے کی طرف گھسیٹا ورنہ جاور کی گولی شاید شاخاں کا سر ہی اُڑا دیتی۔

وہ چاروں تیرتے ہوئے اندازے سے پُل کی مخالف سمت کی طرف بڑھنے لگے۔

یہ بھی خوب ہوا تھا کہ شاخاں کا ساتھی ہی اس کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔

وہ چاروں کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

”میں خون میں ڈوبا ہوا ہوں جوہر۔“ عابد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اپنی کلائی کی ہتھکڑی جوہر کو پہنا دی۔ پانی کے کسی جانور نے میرا پیٹ بُری طرح پھاڑ دیا ہے۔ میں اب زندہ نہیں بچ سکتا۔ اب شاخاں کو ڈاکٹر کے پاس اور پھر کورٹ تک پہنچانا تمہاری ذمّے داری ہے۔“

”یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ جوہر بولا۔

”میرا پیٹ بُری طرح...... پھٹ گیا ہے۔ ڈاکٹر کا پتا میں تم کو دے چکا ہوں۔“ عابد نے کہا اور پھر ایک ہچکی لی۔

”نہیں عابد!“ جوہر نے اسے اٹھانا چاہا۔ ”ہمت کرو، ڈاکٹر تک پہنچ گئے تو تم کو بھی بچالیا جائے گا۔“

”اس طرف بھی جنگل ہے جلدی نکل جاؤ...... بس......بس......“ اس نے پھر ایک ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔

”ایک تو گیا۔“ شاخاں بولا۔ ”اب اپنی فکر کر۔“

☆☆☆

اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ وہ تینوں جنگل میں گھستے چلے جاتے۔ جوہر کو عابد کی موت کا شدید افسوس تھا۔

”تمہارا ہی ساتھی تمہارا دشمن بن گیا شاخاں۔“ جوہر بولا۔

”سمجھ گیا ہوں، ایسا کیوں ہوا ہے۔ زندہ رہ گیا تو اس سؤر کی بچی کو مزہ چکھادوں گا۔“ اس نے چیف منسٹر ثانیہ کو گالی بھی دی۔

رضیہ کو ان کی باتوں سے زیادہ یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ ان کا زندہ بچ نکلنا ممکن بھی ہوگا یا نہیں۔ عابد کی موت کا افسوس اسے بھی تھا۔

”وہ لوگ ہمیں گھیرنے کی کوشش تو کریں گے جوہر۔“ وہ بولی۔ ”اندازہ تو ہوگا انہیں کہ ہم اس کنارے کی طرف آئے ہیں۔ دوسری گاڑیاں بھی پل پر پہنچ چکی ہوں گی۔ وہ پُل ہی کے راستے سے ادھر آسکتے ہیں۔“

”یہ خیال میرے ذہن میں بھی ہے۔“ جوہر نے کہا۔ ”لیکن ہم حالات کے دھارے پر بہہ رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دھارا ہمیں کہاں لے جائے گا۔“

”مجھے ہتھکڑی سے نجات دلا۔“ شاخاں پہلی بار سنجیدگی سے بولا۔ ”اب جو تمہارا دشمن ہے، وہی میرا بھی ہے۔ اب میں خود بھی عدالت میں جانا چاہوں گا۔ میرے بیانات کے بعد اس کی چیف منسٹری دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

اُس کی بات درست تھی۔ جوہر نے اسے ہتھکڑی سے آزاد کردیا۔

جنگل میں ان کی تلاش شروع ہوچکی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپاتے جنگل پار ایک سڑک پر پہنچ گئے جہاں خوش قسمتی سے انہیں ایک ایسی بس مل گئی جو انہیں اس جگہ سے بہت دور لے جاسکتی تھی۔

”عابد نے مجھے بہت بڑی ذمّے داری سونپ دی۔“ جوہر بولا۔ ”ڈاکٹر کا پتا تو اس نے مجھے بتا دیا تھا لیکن ہم بھٹک چکے ہیں۔ راستے کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل معلوم ہورہا ہے۔“

شاخاں اب کسی سوچ میں غرق تھا۔

جوہر اس دوران میں بس کے مسافروں کا جائزہ لے چکا تھا اور ان کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ وہ غنودگی میں بھی تھے۔ کسی نے شاخاں کا زخم نہیں دیکھا۔ کنڈیکٹر قریب

آیا..تو جوہر نے اس طرح شاخاں کی آڑلی تھی کہ کنڈیکٹر بھی شاخاں کی حالت سے باخبر نہیں ہوسکا۔

"تین اسٹاپ بعد بس سے اترنا ہوگا۔" شاخاں بولا۔

"کیوں؟" جوہر نے اس سے پوچھا پھر کہا۔ "یہ سب دیہی علاقہ ہے۔"

"اسی علاقے میں ہمیں ایک ڈاکٹر مل جائے گا۔" شاخاں نے کہا۔ "وہ سرجن بھی ہے۔"

"دیہی علاقے میں سرجن؟" جوہر کو حیرت ہوئی۔

"ہاں۔" شاخاں نے کہا۔ "اسے غریبوں کے لیے کام کرنے کا شوق ہے۔ وہ ان لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے گھر میں ہی اسپتال جیسا کلینک بنا رکھا ہے۔"

"وہ تم کو یا تم اُس کو جانتے ہو؟"

"لو۔" اسٹاپ آرہا ہے۔ اترنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" جوہر کو فوری طور پر اپنے سوال کا جواب نہیں مل سکا۔

اس اسٹاپ پر وہ تینوں اتر گئے۔ کافی کافی فاصلے سے دیہی علاقے تھے۔ اس لیے روشنی کہیں کہیں تھی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" جوہر بولا۔ "اس ڈاکٹر کے بارے میں۔"

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں نے ایک معاملے میں اُس کی مدد کی تھی۔ اس کی مدد کرنے میں دراصل میرا ایک مقصد پورا ہو گیا۔ تبھی سے وہ میری عزت کرتا ہے۔"

"کتنی دور ہے اُس کا گھر یا کلینک؟"

"یہاں سے مجھے صحیح راستہ یاد نہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میں اسے ڈھونڈ ہی لوں گا۔"

"اس میں دیر بھی لگ سکتی ہے اور تمہارا زخم......"

"اس کی پروا نہ کرو۔ دیکھو، میری چال سے کیا اندازہ ہو رہا ہے کہ میں بہت زخمی ہوں۔"

"نہیں۔" جوہر نے کہا۔ "تم بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔"

شاخاں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ راستوں پر غور کر رہا تھا۔ آخر ایک گھنٹے میں وہ تینوں اس گھر تک پہنچ ہی گئے جس کے دروازے پر ڈاکٹر راہول کی تختی لگی ہوئی تھی۔

"یہ ڈاکٹر۔" جوہر بولا۔ "نام سے تو ہندو معلوم ہو رہا ہے۔"

"ہاں وہ ہندو ہے لیکن بہت غیر مذہبی آدمی ہے۔" شاخاں نے جواب دیتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔

"گھر تو سارا سناٹے میں ڈوبا ہوا ہے۔" رضیہ بولی۔

"ان دیہاتوں میں مریض رات کو کہاں آئیں گے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جوہر نے اس کے خیال سے اختلاف نہیں کیا۔

شاخاں نے دروازے پر دوسری دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"میں شاخاں ہوں ڈاکٹر صاحب!" شاخاں نے بلند آواز میں کہا۔

"تم......اس وقت؟" لہجے میں حیرت تھی۔

پھر دروازہ کھلا۔ اندر کی روشنی ان تینوں پر پڑی۔

"یہ کیا؟" ڈاکٹر راہول نے حیرت سے دیکھا کہ شاخاں کے پیٹ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے اپنا پیٹ دبائے ہوئے تھا۔

"گولی لگی ہے ڈاکٹر۔"

"یہ کیسے......؟ اچھا اندر تو آؤ۔"

وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔

"ان دونوں کا تعلق پولیس سے ہے۔" شاخاں نے جوہر اور رضیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری مدد کر رہے ہیں۔"

"تفصیل میں وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً آپریشن کر کے تمہاری گولی نکالنے کی ضرورت ہے، آؤ۔"

ڈاکٹر راہول انہیں اس کمرے میں لے گیا جسے آپریشن تھیٹر کہا جاسکتا تھا۔

"تمہیں میری تھوڑی سی مدد کرنا ہو گی آپریشن میں۔" ڈاکٹر راہول نے جوہر سے کہا۔

"میں آپریشن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپریشن کے دوران میں مجھے تیزی سے کسی دوسرے آلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی آپریشن کرنا ہوتا ہے، میں گاؤں کے ایک لڑکے کو بلا لیتا ہوں۔ وہ پرائمری اسکول تک پڑھا ہوا ہے، ذہین بھی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سکھا دیا ہے۔ لیکن تمہیں چند منٹ میں بھی نہیں سکھا سکتا۔ اس کی ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے۔ میں ان آلات پر کاغذ کی چٹیں لگا دیتا

ہوں۔ اس پر مختلف نمبر ہوں گے۔ میں بس نمبر پکاروں گا تم مجھے اس نمبر کا آلہ دے دیا کرنا۔''

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔'' جوہر نے کہا۔ پھر رضیہ سے بولا۔ ''تم بھی ذرا دھیان رکھنا۔''

نمبروں کی وجہ سے کام مشکل نہیں رہتا اس لیے رضیہ فوراً آمادہ ہوگئی۔

اس طرح آپریشن کامیابی سے ہو گیا۔ گولی شاخاں کے پیٹ سے نکالنے کے بعد ڈاکٹر نے ڈریسنگ کی۔

''اب ایک مسئلہ اور ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ پھر جوہر کو ذرا الگ لے جا کر آہستہ سے بولا۔ اس کا خون بہت بہہ چکا ہے۔ اس کی زندگی چند گھنٹے کی مہمان ہے، اگر اسے خون نہ دیا گیا۔''

''تو آپ میرا خون......''

''چیک کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہیں اپنے خون کا گروپ معلوم ہے؟''

''جی ہاں۔'' جوہر نے کہا۔ ''پولیس میں خون کا گروپ ضرور چیک کیا جاتا ہے۔'' جوہر نے اپنے خون کا گروپ بھی بتایا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ گروپ شاخاں کے گروپ سے میچ نہیں کر سکتا۔''

جوہر نے رضیہ کو قریب بلا کر اسے مسئلے سے آگاہ کیا۔

رضیہ بولی۔ ''میں خون دینے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرے خون کا گروپ کیا ہے۔''

''وہ میں ابھی معلوم کیے لیتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے رضیہ کا خون چیک کیا، پھر مایوسی سے بولا۔ ''یہ بھی نہیں چلے گا۔''

''خدایا مدد!'' رضیہ کے منہ سے نکلا۔

جوہر نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''خون نہ ملنے کی صورت میں یہ کتنی دیر زندہ رہ سکتا ہے؟ ہم اگر اسے شہر تک لے جائیں تو خون کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ ہمیں کورٹ لے جانا ہے اِسے۔''

''وہ شہر یہاں سے پانچ گھنٹے کے فاصلے پر ہے اگر کار تیزی سے چلائی جائے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''کار میں اپنی دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کی زندگی اب پانچ گھنٹے سے بھی کم ہے۔ کوئی معجزہ ہو جائے تو دوسری بات ہے۔''

''کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں ۔ آپ ہمیں اپنی کار دے دیں جو بعد میں آپ کو مل جائے گی۔''

''تو فوراً روانہ ہو جاؤ۔''

شاخاں کی سماعت بہت تیز تھی۔ اس نے کچھ باتیں سن لی تھیں اور جان لیا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔

اس عالم میں بھی وہ مسکرا کر بولا۔ ''معجزوں کا زمانہ گزر چکا ہے دوستو!''

تینوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''صرف ایک صورت ہے کہ میرا بیان کورٹ میں سنا جا سکے۔''

''وہ کیا؟'' جوہر نے جلدی سے پوچھا۔

شاخاں کی نظریں ایک طرف اٹھیں۔ ان تینوں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ شاخاں کی نظریں دروازے کی طرف گئی تھیں۔

''اس کمرے میں ایک چیز دیکھی ہے میں نے۔'' شاخاں نے کہا۔

''صاف صاف بتاؤ۔'' جوہر تیزی سے بولا۔

شاخاں نے صاف صاف بتا دیا۔

''نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس طرح تو کچھ وقت اور گزر جائے گا۔''

''میں اپنی زندگی کی قیمت پر ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔ بس مقصد پورا ہونا چاہیے۔''

ڈاکٹر نے جوہر سے کہا۔ ''تمہیں اس کی بات مان لینی چاہیے۔''

رضیہ اور جوہر متذبذب نظر آئے لیکن ڈاکٹر کے اصرار پر انہیں شاخاں کی بات ماننا پڑی۔

☆☆☆

جوہر نے ڈاکٹر کی کار دوڑاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری دکھائی۔ پولیس کی نظر سے بچنے کے لیے اس نے اپنے حلیے میں بس اس قدر تبدیلی کی تھی کہ ڈاکٹر کی مہیا کردہ ایک ٹوپی پہن لی تھی۔ جو سرمائی ٹوپیوں جیسی تھی۔ اس کی ایک آنکھ پر ڈاکٹر نے ایسی ڈریسنگ کی تھی جیسے اس آنکھ کا آپریشن ہو چکا ہو۔ شاخاں کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ رضیہ بھی پچھلی سیٹ پر تھی۔ اسے جوہر نے یہ ہدایت کی تھی کہ اگر کوئی گاڑی آتی جاتی نظر آئے تو وہ خود کو پائدان میں چھپا لے۔

راستے میں رضیہ نے کہا۔ ''وکیل کے بغیر کورٹ میں کیا کر سکو گے؟''

''اس کا بندوبست ہے۔'' جوہر نے کہا۔ ''عابد نے

مجھے وہ فون نمبر بھی دیا تھا جس پر انٹیلی جنس سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن تمہارے پاس موبائل کہاں ہے؟"

"ڈاکٹر راہول نے مجھے اپنا موبائل دے دیا ہے۔" جوہر نے بتایا۔ "شاخاں کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ انٹیلی جنس سے تعاون مل جائے گا۔ شاخاں کا اسپتال میں داخلہ بھی آسان ہوجائے گا۔"

شاخاں ہنسا۔ "وہاں تک پہنچنے سے پہلے میں مر چکا ہوں گا۔"

"ہمت نہ ہارو شاخاں! تمہاری خاطر سب کچھ کیا جارہا ہے۔"

شاخاں پھر ہنسا لیکن اس بار کچھ بولا نہیں۔

آدھا سفر طے ہوگیا۔

رضیہ نے دیکھا کہ شاخاں نے اب آنکھیں بند کرلی تھیں۔

"شاخاں!" رضیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

شاخاں نے آنکھیں کھولیں اور پھیکے لہجے میں بولا۔ "مجھ پر غشی طاری ہورہی ہے۔"

"ہمت سے کام لو شاخاں!" جوہر بولا۔

"ہمت سے موت کو شکست نہیں دی جاسکتی۔"

"دی جاسکتی ہے۔" جوہر نے کہا۔ "وقت کو ٹالا جا سکتا ہے۔ تم تو بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔"

رضیہ نے جوہر سے کہا۔ "تم ابھی رابطہ کیوں نہیں کرتے اس نمبر سے جو عابد نے تمہیں دیا ہے۔"

"مناسب نہیں۔" جوہر نے جواب دیا۔ "وہاں بھی کوئی کالی بھیڑ ہوسکتی ہے۔ وہ فوراً اس کی اطلاع چیف منسٹر کو دے دے گی۔ میں اس نمبر سے رابطہ اس وقت کرنا چاہتا ہوں کہ چیف منسٹر کو اطلاع مل جانے کے باوجود وہ اپنے تھنڈر اسکواڈ یا پولیس کو حرکت میں نہ لا سکے۔ اسے اتنی مہلت نہ ملے۔"

"ہوں۔" رضیہ نے سرہلا دیا پھر بولی۔ "لیکن اس وقت صبح ہورہی ہوگی ممکن ہے کہ انٹیلی جنس کا متعلقہ آدمی اس وقت دفتر نہ پہنچ سکا ہو۔"

"عابد نے کہا تھا کہ کال کوئی بھی ریسیو کرے، متعلقہ شخص کو اطلاع دے دی جائے گی۔ امکان ہے کہ وہ شخص ادارے کے چیف کا اسسٹنٹ ہو، چیف تو پولیس اسٹیشن میں مارا جاچکا تھا۔ اس کی جگہ اتنی جلدی کسی اور کو نہیں دی گئی ہوگی۔"

اسی قسم کی باتوں میں سفر طے ہوتا رہا۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی جب کار شہری حدود میں داخل ہوئی لیکن اس وقت شاخاں کی زندگی کی شام قریب معلوم ہورہی تھی۔

اس وقت جوہر نے عابد کے بتائے ہوئے نمبر پر کال کی۔

☆☆☆

جادو کی طرح آناً فاناً بہت کچھ ہوگیا۔ انٹیلی جنس کی چار گاڑیوں نے آکر اس کار کو اپنی حفاظت میں لے لیا جس میں رضیہ، جوہر اور شاخاں تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایمبولینس بھی آئی اور شاخاں کو اس میں اسپتال روانہ کردیا گیا.... انٹیلی جنس کی دو گاڑیاں بھی ایمبولینس کے ساتھ آئی تھیں جو ایمبولینس کو اپنی حفاظت میں لے کر روانہ ہوگئی تھیں۔

انٹیلی جنس کے ڈپٹی ڈائریکٹر سے جوہر نے فون پر ایسی باتیں کی تھیں اور ایسا کچھ بتایا تھا کہ ڈپٹی ڈائریکٹر نے ہر بات پر یقین کرلیا تھا ورنہ آدھے گھنٹے کے اندر یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

جن گاڑیوں نے ڈاکٹر راہول کی گاڑی اپنے حصار میں لی تھی، ان میں سے ایک کار میں ڈپٹی ڈائریکٹر بھی تھا۔ اس نے رضیہ اور جوہر کو اپنی کار میں بٹھالیا۔ ڈاکٹر راہول کی کار انٹیلی جنس کے ایک آدمی کے سپرد کردی گئی جو وہ کار انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیتا۔

ڈپٹی ڈائریکٹر نے جوہر سے کہا۔ "تم پولیس میں رہ کر تو ہیرو بن ہی گئے تھے، اب انٹیلی جنس کی وساطت سے تم سُپر ہیرو بن جاؤ گے۔"

جوہر نے کہا۔ "میں نے پولیس میں رہ کر جو کچھ کیا تھا یا اب جو کچھ انٹیلی جنس کے لیے کیا ہے، وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ میں نہ تو پہلے ہیرو بننا چاہتا تھا، نہ اب بننا چاہتا ہوں۔"

"مجھے عابد کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔" ڈپٹی ڈائریکٹر نے کہا۔ "وہ ہمارا بہت دلیر اور ذہین آفیسر تھا۔"

"اس کا دکھ تو ہمیں بھی ہے۔"

رضیہ خاموش بیٹھی رہی تھی۔

ڈپٹی ڈائریکٹر نے کہا۔ "وقت اتنا کم ہے کہ آج... چیف منسٹر کو عدالت میں طلب نہیں کیا جاسکتا۔ میں... اتنی تو تسلی کرلوں گا کہ چیف منسٹر کو عدالت میں کل ہی بلایا جا سکے گا۔"

"شاید مناسب بھی یہی ہے۔" جوہر نے کہا۔

''صرف شاخاں کا بیان چیف منسٹر کے خلاف ثبوت نہیں بن سکے گا۔''

''ہاں، اس لیے ضروری ہے کہ شاخاں کے پاس چیف منسٹر کے خلاف جو ثبوت ہیں، وہ بھی عدالت میں پیش کیے جائیں۔ شاخاں کا بیان چیف منسٹر کی کردار کشی کے سوا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''وہ ثبوت حاصل کرنے کے لیے شاخاں کے اڈے تک پہنچنے کے لیے بھی میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ ہماری دو گاڑیاں اس شہر کی طرف روانہ ہو چکی ہیں۔''

''انہیں ثبوت لے کر واپس آنے میں شام ہو جائے گی۔'' جوہر نے کہا۔

''اسی لیے چیف منسٹر کو کل ہی عدالت میں طلب کرنا مناسب ہوگا۔''

اسی اثنا ڈپٹی ڈائریکٹر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع پر اس کے منہ سے ''اوہ'' نکل گیا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے کی رنگت بھی اس طرح بدلی جیسے اس نے کوئی بُری خبر سنی ہو۔

فون پر مختصر بات کے بعد اس نے جوہر سے کہا۔ ''شاخاں کو آپریشن ٹیبل پر لٹایا ہی تھا کہ اس نے دم توڑ دیا۔''

''آپ نے مختصر بات کی لیکن میں سمجھ گیا تھا۔'' جوہر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بہرحال...... اسے جو کام کرنا تھا، وہ تو اس نے کر ہی دیا۔ جہاں چیف منسٹر کے خلاف ثبوت ہیں، اس شہر کی نشاندہی تو وہ کر چکا تھا۔

''اسی لیے تو میں ثبوت حاصل کرنے کے لیے ٹیم... روانہ کر چکا ہوں۔''

''اچھا ہوتا اگر شاخاں زندہ رہ جاتا۔'' جوہر نے ٹھنڈی سانس لی۔

رضیہ اس وقت بھی خاموش رہی تھی۔

☆☆☆

ڈپٹی ڈائریکٹر نے نہ جانے کیا اہم ذرائع تلاش کیے کہ چیف منسٹر کو دوسرے ہی دن عدالت میں طلب کر لیا گیا۔

چیف منسٹر جب عدالت پہنچی تو اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ کپکپا رہی تھی۔ چہرے سے بھی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔

جوہر نے سرگوشی میں ڈپٹی ڈائریکٹر سے کہا۔ ''بہت مطمئن نظر آ رہی ہے۔''

''اسے اسپتال سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ شاخاں مر چکا ہے۔''

''لیکن اس کے خلاف ثبوت تو موجود ہیں۔''

''میں نے تمہیں ایک بات نہیں بتائی جو ہمیں شاید مشکلات میں ڈال دے۔''

''ایسا کیا ہو گیا؟''

''تم نے شاید ٹی وی کی خبریں نہیں سنیں۔'' ڈپٹی ڈائریکٹر نے کہا۔ ''مجھے میرے آدمیوں نے دوپہر کے بعد ہی اطلاع دے دی تھی کہ اس شہر کی ایک پٹی پر زلزلہ آ چکا ہے۔ اسی پٹی میں وہ عمارت بھی تھی جس میں شاخاں کا ٹھکانا تھا۔ وہ عمارت بھی کھنڈر بن چکی ہے۔''

''اوہ!'' جوہر کے منہ سے نکلا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ ثبوت آ گئے ہوں گے۔''

''زیادہ مایوس نہ ہو۔'' ڈپٹی ڈائریکٹر نے کہا۔ ''اس سے فرق اتنا پڑے گا کہ عدالت آج ہی چیف منسٹر کے خلاف فیصلہ نہیں سنا سکے گی۔ مجھے امید ہے کہ وہ ثبوت تلاش کر لیے جائیں گے۔ ملبا ہٹانے والی ٹیم میں انٹیلی جنس کے پندرہ آدمی شامل کر دیے گئے ہیں۔ وہ ملبے میں وہ دونوں چوبی صندوق تلاش کر ہی لیں گے اگر وہ صندوق بھی تباہ ہوئے ہوں گے تو ان میں موجود ثبوت اس کے آس پاس ہی ہوں گے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ہمیں ثبوت مل جائے گا۔ وکیل کو میں نے صورت حال بتا ہی دی ہے۔ اس کی کوشش سے عدالت ثبوت پیش کرنے کے لیے دو دن کی مہلت تو دے ہی دے گی۔''

جوہر کچھ نہیں بولا لیکن فکرمند نظر آ رہا تھا۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی۔ چیف منسٹر کے وکیل نے کھڑے ہو کر کہا۔

''مائی لارڈ...... انٹیلی جنس نے صرف الزامات لگائے ہیں۔ چیف منسٹر کے خلاف نہ کوئی ثبوت پیش کیا گیا ہے، نہ کوئی گواہ ہے۔''

''گواہ تو موجود ہے مائی لارڈ!'' وکیل صفائی نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''عدالت اجازت دے تو اسے پیش کیا جائے۔''

''اجازت ہے۔'' عدالت نے کہا۔

وکیل صفائی نے جوہر کو کٹہرے میں بلا لیا۔ وہ عدالت میں اس طرح بیٹھا رہا تھا کہ چیف منسٹر اور اس کے ساتھ آنے والے پولیس آفیسرز میں سے کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔

جوہر کو دیکھ کر چیف منسٹر چونکی لیکن اس کے وکیل

نے اس کی طرف جھک کر کچھ کہا تو وہ کچھ مطمئن نظر آئی۔

جوہر نے بیان دینا شروع کیا۔ سارے واقعات شروع سے آخر تک سنا ڈالے۔ اس کے خاموش ہونے پر وکیل صفائی نے کھڑے ہو کر کہا۔

''ان باتوں کی سچائی صرف شاخاں کے بیان سے ثابت ہو سکتی ہے۔''

''اس کا بیان بھی سامنے لایا جا سکتا ہے۔'' جوہر نے کہا۔

''تم نے ابھی بتایا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔''

''جی ہاں، وہ مر چکا ہے لیکن اس کا بیان سنایا جا سکتا ہے۔''

''کیسے؟'' منسٹر کے وکیل نے مضحکہ اڑایا۔ ''مرا ہوا شخص بیان دے گا؟''

''جی ہاں مائی لارڈ!'' جوہر کے وکیل نے کہا۔ ''عدالت اجازت دے تو کچھ سامان عدالت میں لایا جائے۔''

''ضرور لایا جائے۔'' عدالت نے کہا۔

ڈپٹی ڈائریکٹر نے سب انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر ایک ٹی وی سیٹ اور ایک سی ڈی پلیئر عدالت میں لا کر سیٹ کیا گیا۔

''مائی لارڈ!'' انٹیلی جنس کے وکیل نے کہا۔ ''ڈاکٹر راہول کے گھر میں ایک وڈیو کیمرا تھا۔ اسی پر شاخاں کا بیان ریکارڈ کیا گیا ہے۔ کیا وہ سنایا جائے؟''

''اجازت ہے۔'' عدالت نے کہا۔

ٹی وی آن کیا گیا جسے سی ڈی پلیئر سے منسلک کر دیا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر شاخاں کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کوئی بات شروع کرنے سے پہلے قہقہہ لگایا، پھر بولا۔ ''اے بھائی عدالت صاحب! کوئی اپنی موت پر نہیں ہنستا لیکن میں ہنس رہا ہوں۔ میں چند گھنٹے میں شاید مر جاؤں گا لیکن زندہ رہا تو عدالت میں وہی سب کچھ کہوں گا جو اس وقت کیمرے کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ میں اس صوبے کی منسٹر کے قائم کیے ہوئے تھنڈر اسکواڈ کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ میں نے اندازہ تو لگا لیا تھا کہ یہ کسی دشمن ملک کے لیے کام کر رہی ہے لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے منسٹر سے خوب پیسا ملتا تھا۔ اسی کے اشارے پر میں نے بم بلاسٹ کیا تھا جس میں بہت سے لوگوں کی زندگی کھڈے لگ گئی۔ میں اب بھی اس کے لیے کام کرتا رہتا لیکن اچانک اس کا دماغ کچھ خراب ہو گیا

تھا۔ اس نے تھنڈر اسکواڈ کے لیے حکم جاری کیا کہ جو شاخاں کو جان سے مارے گا، اسے تھنڈر اسکواڈ میں شاخاں کی جگہ دے دی جائے گی۔ اسی لیے تھنڈر اسکواڈ کے ایک آدمی جاور نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں نے اس منسٹرنی کے لیے بہت سے غیر قانونی کام کیے ہیں۔ یہ مجھے مروانا چاہتی تھی اس لیے اب میں اسے مروانا چاہتا ہوں۔ میں نے جو غیر قانونی کام کیے، ان کی فہرست خاصی لمبی ہے لیکن میں وہ سب بتاؤں گا۔'' اس نے ان جرائم سے پردہ اٹھانا شروع کیا جو اس نے چیف منسٹر کے ایما پر کیے تھے۔ اس نے ان جرائم کی تفصیل بیان کرنا شروع کی۔ بہت کچھ بتانے کے بعد شاخاں نے کہا۔ ''یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے ایک بار خیال آیا کہ کبھی یہ سب کچھ صرف میرے گلے میں آپڑے اور چیف منسٹرنی خود کو بچالے جائے اس لیے یہ جب بھی مجھے فون کرتی میں اس کی آواز ریکارڈ کرتا رہا۔ وہ سب آوازیں میں ایک ڈی وی ڈی پر منتقل کرتا رہتا تھا جو میں اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر رکھتا ہوں۔ میں تھنڈر اسکواڈ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔ جب تھنڈر اسکواڈ کی میٹنگز ہوتی تھیں تو میں وہ بھی خفیہ ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرلیا کرتا تھا۔ میرا یہ کام اس لیے تھا کہ اگر کبھی مجھ پر آنچ آئے تو یہ چیف منسٹرنی خود کو بچا نہ سکے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے خلاف میرے پاس بہت ثبوت ہیں اور جہاں ہیں، اس جگہ کے بارے میں جوہر کو بتا چکا ہوں۔ وہ سب ثبوت بھی عدالت میں پیش کردیے جائیں گے۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے۔''

جیسے جیسے شاخاں بولتا جارہا تھا، چیف منسٹر کے چہرے کی رنگت بدلتی رہی تھی۔ ٹی وی بند ہونے کے بعد وکلا میں جرح کا آغاز ہوا جسے کچھ دیر عدالت نے برداشت کیا، پھر ''آرڈر، آرڈر'' کر کے سب کو خاموش کرنے کے بعد کہا۔ ''شاخاں کا بیان اہمیت رکھتا ہے لیکن جب تک ثبوت سامنے نہیں لائے جائیں گے، عدالت چیف منسٹر کے خلاف کوئی فیصلہ صادر نہیں کرسکتی۔''

''مائی لارڈ!'' جوہر کے وکیل نے کہا۔ ''وہ ثبوت ایک دور دراز مقام پر محفوظ ہیں۔ جوہر کو وہ ثبوت عدالت تک لانے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔''

کچھ اور باتوں کے بعد عدالت نے کہا۔ ''اس کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ فیصلہ سنانے کے لیے عدالت دو دن کے لیے برخاست کی جاتی ہے۔''

☆☆☆

صورت حال بہت غیر یقینی تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ثبوت مل سکیں گے یا نہیں...... برباد شدہ عمارت کے ملبے سے کچھ تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ثبوت لانے کے سلسلے میں کیونکہ جوہر کا نام لیا گیا تھا اسی لیے انٹیلی جنس نے اسے ''روپوش'' کردیا۔ اندیشہ یہی تھا کہ اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

جوہر نے روپوشی کے دوران میں رضیہ کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔

ایک دن بعد اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے جوہر کو خوش خبری سنائی کہ اس کے آدمی سو فیصد ثبوت تو تلاش نہیں کرسکے لیکن جو نوے فیصد ثبوت حاصل ہوئے ہیں، وہی مقدمہ جیتنے کے لیے کافی ثابت ہوں گے۔

''کل ایک خوشگوار دن ہوگا۔'' اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہا۔

رات کو جوہر نے اُس کی کال ریسیو کی۔ ''تم کو یہ سن کر عجیب لگے گا کہ میں اس وقت چیف منسٹر ہاؤس سے بول رہا ہوں۔ اطلاع ملی تھی کہ یہاں دو فائرز کی آوازیں سنی گئی ہیں۔ میں یہاں آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ فائر کیوں ہوئے تھے۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ چیف منسٹر ثانیہ نے خودکشی کرلی ہے۔ اس نے اپنی کنپٹی پر گولی چلائی تھی۔ اس کے قریب ہی اس کے باپ کی لاش بھی ملی ہے۔ کچھ جلے ہوئے کاغذات بھی ملے ہیں۔ غالباً چیف منسٹر ثانیہ کو اپنے کچھ خاص ذرائع سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ثبوت حاصل کرلیے گئے ہیں۔''

''واہ!'' جوہر نے کہا۔ ''پھر تو قصہ ہی ختم ہوا۔ اب عدالت کیا کرے گی!''

''عدالت تو کل اپنا کام کرے گی۔ کچھ پولیس والوں کے خلاف بھی ثبوت ملے ہیں۔ ان کو تو سزائیں ملیں گی۔ کل عدالت میں آکر مزے لینا۔''

''آنا تو چاہیے۔'' جوہر نے مسکرا کر کہا۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے فون بند کردیا۔

جوہر سے رضیہ نے سب کچھ سنا، پھر ذرا دیر سوچنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شاخاں کو عابد نے اپنی کسٹڈی میں لیا تھا۔ پھر اس نے شاخاں کو تمہاری کسٹڈی میں دے دیا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تمہیں اپنی کسٹڈی میں کب لوں؟''

جوہر ہنس دیا۔ اب دونوں ہی خوشگوار موڈ میں تھے۔

❖❖❖

# بے زبان

احمد نعمان شیخ

کہا جاتا ہے کہ لاش بن جانے کے بعد مردہ بے زبان ہو جاتا ہے... مگر سائنسی ترقی نے مُردے کو بھی بولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب لاشیں... ڈھانچے اور جائے واردات پر ملنے والی اشیا بے زبان نہیں ہوتیں... جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کسی بھی مُردے کی زبان کھلوائی جا سکتی ہے۔ ایک ڈھانچے کی صورت ملنے والی لاش نے پرانے اور نئے کھاتے سب کھول دیے تھے۔

**ایک ماہر سراغ رساں کا قاتل و مقتول تک رسائی حاصل کرنے کا جدید طریقہ......**

وہ فروری کی ایک سرد صبح تھی۔ تین دن سے سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپا بیٹھا تھا۔ آج بھی سورج سرمئی بادلوں کے حصار میں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کے ابھی سرمئی بادل چھلک جائیں گے۔

شہر سے باہر ایک نئی کالونی میں ایک گھر کی تعمیر کرتے ہوئے مزدوروں کو کھدائی کرتے ہوئے ایک انسانی ڈھانچا ملا تو پولیس کو اطلاع کر دی گئی۔ انسپکٹر جنید عالم اپنے ..... سب انسپکٹر حماد اور چند ماتحتوں کے ساتھ پیراڈائز کالونی پہنچا اور فوراً معاملے کی چھان بین شروع کر دی گئی۔

انہیں ڈھانچے کے ساتھ ایک کارتوس، دو کارتوسوں کے خول، دل کی دھڑکن کنٹرول کرنے والا ایک پیس میکر، ایک لاکٹ جس کا پینڈنٹ دل کی شکل کا تھا اور مقتول کے لباس کی باقیات ملیں۔ ڈھانچے کے پاس کوئی بھی پرس یا ایسا کاغذ نہیں تھا جس سے اس کی شناخت کی جاسکتی۔

انسپکٹر جنید نے ڈھانچا اور باقی اشیا پوسٹ مارٹم کے لیے فرانزک لیب میں ڈاکٹر جبران کے پاس بھجوا دیں اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنے لگے۔

☆☆☆

پیراڈائز کالونی سے ملا انسانی ڈھانچا، اس وقت فرانزک لیب میں اسٹریچر پر موجود تھا۔ کمرے میں فرانزک ٹرینی نورین جمال اور سینئر ڈاکٹر جبران خان سفید ایپرن اور سر پر پلاسٹک کیپ پہنے پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے تیار تھے۔

”سر! میرے سامنے پہلی بار ایک ڈھانچے کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔“ نورین نے ڈاکٹر جبران کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ ایم بی بی ایس کی طالبہ تھی اور ہاؤس جاب کے سلسلے میں فرانزک لیب میں کام کر رہی تھی۔

”چلو اچھی بات ہے۔ تم اسے بے زبان مت سمجھنا، آج تمہارے سامنے ڈھانچے کی زبان کھلواتے ہیں۔ دیکھنا ابھی کچھ ہی دیر میں سب بتا دے گا۔“ ڈاکٹر جبران مسکراتے ہوئے بولے۔

”کیا واقعی آپ پتا لگالیں گے کہ یہ ڈھانچا کس کا ہے؟ مرتے وقت کیا عمر تھی؟ کیسے مرا اور کتنے سال پہلے مرا؟“ نورین نے پے در پے کئی سوالات کر ڈالے۔

”ہاں ہاں! فرانزک سائنس کا اور کام ہی کیا ہے؟ وہ مردوں اور ڈھانچوں سے سب اگلوا لیتی ہے۔“ ڈاکٹر جبران نے جواب دیا اور ڈھانچے کو غور سے دیکھنے لگے۔

”نورین! سب سے پہلے تو یہ جان لو کہ یہ ڈھانچا ایک مرد کا ہے۔“ ڈاکٹر جبران بولے۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”کولھے کی ہڈیوں کو دیکھ کر پتا چل جاتا ہے کہ ڈھانچا مرد کا ہے یا عورت کا۔ دانتوں اور جبڑوں کو دیکھ کر ہم اس کی عمر کا بھی پتا چلا سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر جبران اب ڈھانچے کے دانتوں اور جبڑے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

”تو مرتے وقت کیا عمر ہوگی؟“

”یہی کوئی پینتیس سال کے آس پاس۔“

”اور موت کیسے ہوئی؟“

”موت سینے میں گولی لگنے سے ہوئی ہے۔ گولی اس کے سینے میں لگی جس سے اس کی موت ہوگئی۔ سینے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے، تو پتا چلے گا کہ گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی۔ دوسرا ہمیں ڈھانچے کے قریب سے ہی گولی اور گولی کا خول ملا۔“ ڈاکٹر جبران نے ڈھانچے کے سینے کو دیکھتے ہوئے کہا اور نورین کو اشارہ کیا، وہ سینے کی فوٹو لینے لگی۔

”سر! پولیس کو لاش کے پاس دو گولیوں کے خول ملے ہیں لیکن ہمیں صرف ایک ہی گولی ملی جو مقتول کے سینے پر لگی۔ اب سوال یہ ہے کہ دوسری گولی کہاں گئی؟“ نورین نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن یہ اتنی سوچنے والی بات نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قاتل کا نشانہ خطا گیا ہو اور گولی آس پاس کسی درخت میں جا لگی ہو۔“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ دوسری گولی قاتل کو لگی ہو لیکن وہ بچ نکلا ہو۔“ نورین نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہاں! یہ بھی ممکن ہے۔ خیر اس بارے میں بعد میں سوچیں گے، ابھی ہمیں پوسٹ مارٹم مکمل کرنا ہے۔“

ڈاکٹر جبران فیتہ پکڑتے ہوئے ڈھانچے کا قد ناپنے لگے۔

”اس کا قد تقریباً پانچ فٹ دس انچ تھا۔“

”تو اب تک ہمیں یہ پتا چلا کہ ایک مرد جس کی عمر پینتیس سے اڑتیس سال کے درمیان تھی۔ سینے میں گولی لگنے سے مر گیا اور اس کا قد پانچ فٹ دس انچ تھا۔“ نورین سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں بالکل! ایسا ہی ہے۔“ ڈاکٹر جبران نے تائید کی۔

”سر! سب سے مشکل سوال، یہ کتنے سال پرانا ڈھانچا ہے؟ یعنی اس کی موت کتنے سال پہلے ہوئی ہوگی؟“

”ہڈیاں دیکھ کر تو لگتا ہے کہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ شاید دو سے ڈھائی سال پہلے اس کی موت ہوئی ہوگی۔“ اس کے بعد انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ ڈھانچے کے پاس سے ملی گولی کا معائنہ کیا گیا۔ دوپہر تین بجے تک وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ بنا چکے تھے۔

اسی وقت انسپکٹر جنید اور سب انسپکٹر حماد لیب میں داخل ہوئے۔

”جی ڈاکٹر صاحب! آپ نے سب پتا لگالیا کہ ڈھانچا کس کا ہے؟ کب اور کیسے موت ہوئی؟“ جنید نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔ ڈاکٹر جبران مسکرا دیے اور انہیں ایگزامنیشن روم میں لے آئے۔ وہ سب ڈھانچے کے گرد کھڑے ہوگئے اور ڈاکٹر جبران نے بات کا آغاز کیا۔

"یہ ایک مرد کا ڈھانچا ہے، جس کی عمر مرتے وقت پینتیس سے اڑتیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کا قتل اسی گولی سے کیا گیا، جو آپ کو مٹی میں ملی۔"

"یعنی! اس کی موت طبعی نہیں تھی، اسے قتل کیا گیا تھا؟"

"بالکل! یہ قتل کا ہی معاملہ ہے۔ ورنہ طبعی موت پر کون کسی کو ایسے جنگل میں دفن کرتا ہے۔ ویسے بھی آپ کو ڈھانچے کے پاس کارتوس بھی تو ملا تھا، اسی بات سے پتا چل جاتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ گولی مقتول کے سینے میں لگی تھی۔ زمین میں دفن رہنے سے گوشت تو ختم ہوگیا لیکن لوہے کی یہ گولی اپنی اصل حالت میں موجود رہی۔"

"ہمیں گولیوں کے دو خول ملے تھے لیکن دوسری گولی نہیں مل سکی۔" حماد بولا۔

"ہاں! نورین بھی یہی بات کر رہی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ پہلی گولی مقتول کو نہ لگ سکی ہو اور اس کی موت دوسری گولی لگنے سے ہوئی ہو۔" ڈاکٹر جبران بولے۔

"ہاں! یہ ممکن ہے۔ اچھا موت کتنے سال پہلے ہوئی ہوگی؟" جنید نے پوچھا۔

"تقریباً دو سے ڈھائی سال پہلے۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ!" حماد بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! ڈھانچے کی شناخت کیسے کی جائے گی؟ آپ کو ڈھانچے کے پاس ملے سامان میں سے کچھ ایسا ملا جس سے ہم اس کی شناخت کر سکیں؟"

"مقتول دل کا مریض تھا۔ اکثر ایسے مریضوں کے دل کی دھڑکن کو کنٹرول کرنے کے لیے پیس میکر یا آئی سی ڈی لگایا جاتا ہے۔ آپ خوش قسمت رہے کہ ہمیں ڈھانچے کے پاس ایک پیس میکر ملا۔ اس پیس میکر کے ذریعے ہم اس اسپتال تک پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے اسے لگایا۔ وہ اپنے ریکارڈ میں دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ پیس میکر کب اور کسے لگایا گیا تھا۔ اس طرح آپ مقتول تک پہنچ جائیں گے اور پھر قاتل کا سراغ لگا سکیں گے۔" ڈاکٹر جبران نے ڈھانچے کے پاس ملا پیس میکر انہیں دکھاتے ہوئے بتایا۔

"اوہ! پیس میکر......" حماد بڑبڑایا۔

"دو ڈھائی سال میں جسم کا گوشت تو ختم ہوگیا لیکن پیس میکر ویسے کا ویسا ہی رہا۔ خیر! اب یہ کام تو نہیں کر رہا لیکن اس پر درج سیریل نمبر سے آپ اسے لگانے والے تک پہنچ سکتے ہیں۔" نورین نے بتایا۔

"انسپکٹر صاحب! ہم نے آپ کی یہ مشکل بھی آسان کر دی ہے۔ یہ پیس میکر سن فلاور اسپتال میں لگایا گیا ہے۔" ڈاکٹر

## نجومی

جوان اور خوب صورت لڑکی نجومی کے پاس اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے گئی۔ نجومی نے جوان لڑکی کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے اندازے سے کہا۔

"تمہاری شادی تمہارے خوابوں کے شہزادے سے ہوگی جو جوان، خوب صورت اور صحت مند ہوگا۔"

"اور دولت مند بھی؟" لڑکی نے سوالیہ نظروں سے نجومی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں دولت بے انتہا، ساتھ میں عمر بھی 28 سال کے قریب۔" نجومی نے جواب دیا۔

لڑکی خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

"اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میں اپنے موجودہ شوہر سے کس طرح جان چھڑا سکتی ہوں!!"

ابیہا کامران، کراچی

## نمک پارے

☆ بچوں کو ٹافی مت دو، ہمارے نمک پارے دو۔

☆ میرا روپ نہ حسن سے بنا تھا، نہ ناز و نزاکت سے، بلکہ حوصلوں ہمتوں اور مقابلوں سے۔

☆ مشکل اچھی چیز ہے بشرطیکہ تم اسے صحیح استعمال کر سکو۔

☆ اٹھ جاگ رے راہی مجبور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے جو جاگت ہے سو پاوت ہے، جو سووت ہے سو کھووت ہے۔

☆ یہ ایک دل فگار مسئلہ ہے جس کا حل دو نئے مسئلوں کو جنم دیتا ہے۔

☆ میں اپنے درد کے لیے گرم بوتل کی جگہ کمر سے بلی لگا کر سوتا ہوں، وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

☆ ہائے کتنے پُرسکون دن تھے اور پُرسکون راتیں جب ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوا تھا۔

☆ جب سقراط جیسا عقل مند زہر پی گیا تو ظاہر ہوا، احمق سے احمق عورت عقل مند سے عقل مند مرد کو احمق بنا سکتی ہے۔

احمر جاوید، اسلام آباد

جبران نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ارے واہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو کمال کر دکھایا۔ اچھا یہ بتائیں کہ ڈھانچے کے پاس ملی گولی کون سی ہے؟''

''یہ اعشاریہ اڑتیس بور کے پستول کی گولی ہے جو ہمارے ملک میں کافی عام ہے۔ اس گولی سے قاتل تک پہنچنا بہت ہی مشکل ہے۔''

''خیر! پہلے مقتول تک پہنچ جائیں، پھر قاتل تک بھی پہنچ جائیں گے۔'' حماد نے کہا۔

''ہم اس ڈھانچے کا چہرہ بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرانزک سائنس کسی بھی ڈھانچے کا اصل چہرہ بنا سکتی ہے۔'' نورین نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''ہاں فیس ری کنسٹرکشن کے ذریعے ڈھانچے کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انسان کی شکل بنائی جا سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب آپ ڈھانچے کا چہرہ تیار کریں، ہم اس کی شناخت کی کھوج میں نکلتے ہیں۔'' جنید نے کہا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے کے بعد جنید اور حماد سن فلاور اسپتال گئے اور پیس میکر کی تفصیلات بتا کر سب جان گئے۔ مرنے والے کا نام اکرام حسین تھا جو گرین روڈ کا رہائشی تھا۔

اگلے بیس منٹ بعد وہ اکرام حسین کے گھر کے سامنے موجود تھے۔ وہ ایک کنال کا خوب صورت گھر تھا۔ سفید رنگ کی بیرونی دیواروں پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔

گھنٹی بجانے پر ایک پچیس چھبیس سالہ لڑکے نے دروازہ کھولا۔

''کیا یہ اکرام حسین صاحب کا گھر ہے؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''جی ہاں! لیکن وہ تو دو سال سے لاپتا ہیں۔ کیا آپ کو ان کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟''

''ہاں! کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟''

''جی آئیں، تشریف لے آئیں۔''

ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد جنید نے نوجوان کو سب تفصیل بتا دی۔ اس کا نام عمران حسین تھا۔ اکرام حسین کی موت کی خبر سن کر وہ رونے لگا۔ گھر کے باقی افراد کو بھی یہ خبر پہنچا دی گئی۔

''اکرام بھائی میرے بڑے بھائی ہی نہیں، میرے والد جیسے تھے۔ ہمارے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے مجھے کبھی بھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ پتا نہیں کون ان کا دشمن ہے جس نے انہیں مار دیا۔ ہم تو دو سال سے انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ دس نومبر دو ہزار اکیس سے لاپتا ہیں۔'' عمران نے بتایا۔

''عمران! کیا آپ ہمیں اکرام حسین کا موبائل نمبر بتا سکتے ہیں؟'' کچھ سوچتے ہوئے جنید نے سوال کیا۔

''ہاں! لیکن اب وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں، آپ ہمیں ان کا موبائل نمبر اور کچھ مزید تفصیلات بتا دیں، ہم قاتل کا سراغ ضرور لگا لیں گے۔'' جنید نے کہا۔

مزید کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد جنید اور حماد پولیس اسٹیشن واپس چلے گئے۔

''حماد! اس عمران حسین پر بھی نظر رکھو! کیا پتا اسی نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہو۔'' جنید نے حماد کو ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے سر! میں اکرام حسین کے ساتھ ساتھ عمران حسین کا بھی کال ریکارڈ نکلواتا ہوں اور دو کانسٹیبل اس کی نگرانی پر بھی مامور کر دیتا ہوں۔'' حماد نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اکرام حسین کے ساتھ ساتھ عمران کا موبائل نمبر بھی سائبر سیل میں فاروق کو بھجوا دیا۔

''فاروق! ایک نمبر تو اکرام حسین کا ہے۔ یہ نمبر دو سال پہلے بند ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی لاسٹ لوکیشن اور بند ہونے سے تین ماہ پہلے کا کال ریکارڈ چاہیے۔ دوسرا نمبر اس کے چھوٹے بھائی عمران حسین کا ہے۔ اس کا بھی ریکارڈ نکلواؤ۔''

''جی انسپکٹر صاحب! میں ابھی نکلواتا ہوں۔'' فاروق نے جواب دیا۔

پھر حماد نے ڈاکٹر جبران کو کال ملائی۔ ''ڈاکٹر صاحب! کوئی نئی خبر؟''

''ہاں! ایک اہم سراغ ہاتھ لگا ہے۔ آپ فرانزک لیب میں آ جائیں۔''

''ارے واہ!''

دس منٹ بعد وہ فرانزک لیب میں ڈاکٹر جبران کے سامنے بیٹھے تھے۔

''ڈھانچے کا پوسٹ مارٹم تو ہم کر چکے ہیں، رپورٹ بھی آپ تک پہنچ چکی ہے۔ میں نے ڈھانچے کے لباس کا معائنہ کیا۔ ویسے تو اس کا لباس بھی کافی حد تک خراب ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی ہمیں اس پر خون کے نشان ملے۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ یہ صرف مقتول کا خون ہوگا لیکن جب فرانزک معائنہ کیا گیا تو پتا چلا کہ لباس پر دو الگ الگ خون کے سیمپل موجود ہیں۔ مقتول کا

بلڈ گروپ بی نیگیٹو تھا۔ ہمیں لباس پر او پازیٹو خون کے بھی ذرات ملے ہیں جو یقیناً قاتل کا خون ہوسکتا ہے۔“

”زبردست! اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اکرام حسین کا جس جس سے بھی تعلق تھا، ان میں سے او پازیٹو بلڈ گروپ کس کس کا ہے؟“ حماد نے پُرجوش انداز میں کہا۔

”او پازیٹو بہت ہی عام بلڈ گروپ ہے۔ ہر چوتھے آدمی کا یہی بلڈ گروپ ہوتا ہے۔ آپ کو جن جن پر شک ہو، ہم ان کا ڈی این اے ٹیسٹ کریں گے۔ پھر جس کا ڈی این اے مقتول کے لباس پر ملے ہوئے خون سے مل گیا سمجھیں وہی آپ کا مجرم ہے۔“ ڈاکٹر جبران نے بتایا۔

”ارے واہ! آپ نے تو یہ کیس کافی آسان کر دیا۔“ حماد مسکرایا۔

”فرانزک سائنس تو ہوتی ہی پولیس کا کام آسان کرنے کے لیے ہے۔“ نورین نے مسکراتے ہوئے حماد کو جواب دیا۔

”فیس ری کنسٹرکشن کا کام کہاں تک پہنچا؟“

”اس میں ابھی کچھ وقت درکار ہے۔ کل صبح آپ کو فوٹو مل جائے گی۔“ نورین نے بتایا۔

”لیکن سر! ہمیں پتا تو چل چکا ہے کہ یہ ڈھانچا اکرام حسین کا ہے۔ اب چہرہ بنوانے کا کیا فائدہ؟“ حماد نے جنید سے پوچھا۔

”تاکہ مکمل طور پر اس بات کی تصدیق ہو جائے کہ یہ ڈھانچا اکرام حسین کا ہی ہے۔“ جنید نے جواب دیا۔

”اکرام حسین کے بھائی کو فرانزک لیب بلوائیں گے۔ اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کیا جائے گا اور ڈھانچے کے ڈی این اے سے ملا کر دیکھا جائے گا۔ یہ بھی تصدیق کا ایک ذریعہ ہے۔“ ڈاکٹر جبران بولے۔

”ہاں! اکرام حسین غیر شادی شدہ تھا۔ اس لیے اولاد تو ہے نہیں اب والدین یا بہن بھائیوں کا ڈی این اے ملا کر ہی دیکھا جاسکتا ہے۔“ حماد نے کہا۔

”میں کل صبح ان کو بھی بلوا لیتا ہوں۔“ جنید نے کہا۔

شام کے چھ بج رہے تھے، وہ سب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اگلے دن گیارہ بجے وہ سب ایک بار پھر فرانزک لیب میں موجود تھے۔ اکرام حسین کا بھائی عمران بھی آچکا تھا۔ اس کا ڈی این اے، ڈھانچے کے ڈی این اے سے میچ ہو گیا تھا، جس کا مطلب تھا کہ دونوں سگے بھائی ہیں اور وہ ڈھانچا اکرام حسین کا ہی ہے۔ فیس ری کنسٹرکشن کے ذریعے بنایا گیا چہرہ بھی اکرام حسین کا ہی تھا۔

”یعنی! اب مکمل طور پر تصدیق ہو چکی ہے کہ یہ ڈھانچا اکرام حسین صاحب کا ہی ہے، ہمیں مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔“ جنید نے کہا اور عمران کی طرف متوجہ ہوا۔

”عمران صاحب! آپ یہ بتائیں کہ آپ کو کسی پر شک ہے؟ کون اکرام صاحب کو مار سکتا ہے؟“

”اکرام بھائی پراپرٹی کا کاروبار کرتے تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کاروباری حریف تو ہر شخص کے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بھائی کو بھی ان کے کسی حریف نے قتل کر دیا ہو؟“ عمران نے جواب دیا۔

”کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور ہوگا جس سے اکرام صاحب کا جھگڑا ہوا ہوگا۔“ جنید نے پوچھا۔

”ہاں! کچھ کچھ مجھے یاد آرہا ہے۔ ایک تو ہمارے ہمسائے اختر خان ہمیشہ بھائی سے لڑتے تھے۔ ہمارے گھر کے پیچھے ایک پانچ مرلے کا خالی پلاٹ ہے۔ وہ پلاٹ بہت سال پہلے بھائی نے خریدا تھا لیکن بعد میں اختر خان نے کہا کہ یہ پلاٹ ان کی ملکیت ہے اور بھائی نے جعلی کاغذات بنوا کر پلاٹ ہتھیا لیا۔ اب پلاٹ کا اصل مالک کون ہے! یہ کیس سالوں سے عدالت میں چلتا رہا۔ اسی وجہ سے دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا رہا۔ بھائی کے لاپتا ہو جانے کے بعد کوئی بھی کیس کی پیروی نہیں کر سکا اور عدالت نے اختر خان کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ میں اپنی پڑھائی میں مصروف تھا ورنہ میں اس کیس کی پیروی ضرور کرتا۔“ عمران نے تفصیلاً بیان کیا۔

”ہونہہ! یعنی اکرام حسین کی موت سے اختر خان کو فائدہ پہنچا، ہوسکتا ہے اسی نے قتل کیا ہو۔“ حماد نے اندازہ لگایا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ اختر خان ایسا کام کر سکتا ہے؟“ جنید نے پوچھا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دولت کا نشہ انسان سے کچھ بھی کروا سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔

”ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی اُن کا دشمن؟“

”ہاں! ان کا بزنس پارٹنر...... ہارون شاہد۔ وہ ایک نمبر کا بدمعاش آدمی ہے۔ شراکت کے معاملات کو لے کر دونوں میں اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ بھائی شراکت داری ختم کرنا چاہ رہے تھے۔“

”ایسا کیوں؟“

”بھائی کو شک تھا کہ ہارون ان کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ فراڈ کر رہا تھا۔ ایک بار پکڑا بھی گیا تھا لیکن بھائی نے اسے

معاف کر دیا لیکن پھر بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ اگر بھائی دو تین ماہ اور زندہ رہتے تو کاروبار الگ کر لیتے۔ ہو سکتا ہے اسی نے بھائی کو قتل کیا ہو۔"

"ٹھیک ہے عمران صاحب! ہم اختر خان اور ہارون شاہد سے ملاقات کریں گے۔ آپ ہمیں ان کا رابطہ نمبر اور پتا دے دیں۔ اس کے بعد آپ جا سکتے ہیں۔" جنید نے کہا اور عمران چلا گیا۔

بیس منٹ بعد وہ ہارون شاہد کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھے۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور نیلا مفلر لیا ہوا تھا۔

"ہمیں آپ کے لاپتا بزنس پارٹنر اکرام حسین کا ڈھانچا ملا ہے۔ انہیں دو سال پہلے گولی مار کر قتل کیا گیا اور لاش پیراڈائز کالونی میں دفنا دی گئی۔" جنید نے بات کا آغاز کیا۔

"ہاں! مجھے اس بات کی اطلاع مل چکی ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔"

"ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ آپ پر اکرام حسین نے بے ایمانی اور کمپنی کا پیسہ چرانے کا الزام لگایا تھا۔" جنید نے ہارون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ہارون کے چہرے کی رنگت یک دم تبدیل ہو گئی مگر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایک غلط فہمی تھی جو بعد میں دور ہو گئی تھی۔ ہمارے اکاؤنٹس منیجر نے غبن کیا اور مجھ پر الزام لگا دیا تھا۔ میں کمپنی کا پارٹنر ہوں، اپنی ہی کمپنی کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں؟"

"ہاں! آپ کی بات ٹھیک ہے۔ تو پھر اکرام حسین کو کس نے قتل کیا ہو گا؟"

"میں نہیں جانتا، آپ عمران سے تفتیش کریں یا پھر ان کا ہمسایہ اختر خان۔ مجھے یقین ہے، ان دونوں میں سے ہی کوئی ایک اکرام کا قاتل ہو گا۔"

"شک سے کوئی بھی بری نہیں ہے۔ ہم سب سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے چند مزید سوال پوچھے اور ہارون شاہد کا موبائل نمبر لے کر وہاں سے چلے گئے۔ اب ان کا رخ اختر خان کے گھر کی طرف تھا۔

جب وہ اس کے گھر پہنچے تو وہ لان میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ناول تھا۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے ناول سامنے پڑی میز پر رکھا اور بولا۔

"مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟ مرنے والا مر گیا اور مارنے والے نے مار دیا۔ میرا اس سب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔"

اختر خان کے اس رویے نے جنید کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

"اختر صاحب! آپ کا دشمن دو سال پہلے قتل ہو گیا لیکن آپ ابھی بھی اس سے خار کھائے بیٹھے ہیں؟"

"وہ ایک نمبر کا فراڈ آدمی تھا۔ میری ہی زمین غیر قانونی طور پر ہتھیا لی لیکن آخرکار عدالت نے میرے حق میں فیصلہ دے ہی دیا۔"

"ہاں! لیکن یہ فیصلہ اکرام حسین کے غائب ہونے کے بعد ہوا۔ گویا اس کی گمشدگی سے آپ کو اچھا خاصا فائدہ ہو گیا۔" حماد نے کہا۔

"تو آپ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟ مجھے اگر اکرام کے ساتھ کچھ کرنا ہوتا تو دس سال پہلے ہی کر چکا ہوتا۔ اتنی دیر انتظار نہ کرتا۔" وہ تو جیسے انگارے چبا رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے آپ اس عدالتی کارروائی سے تنگ آ گئے ہوں اور سوچا ہو کہ اکرام کو راستے سے ہٹانے میں ہی فائدہ ہے۔"

"اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو ثابت کریں!" یہ کہہ کر اختر نے میز پر پڑا ہوا ناول اٹھا لیا اور نظریں ناول پر جما دیں۔

"ہمیں آپ کا بلڈ سیمپل چاہیے۔" جنید نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"تفتیش کے سلسلے میں۔" جنید نے حماد کو اشارہ کیا، اس نے اختر کے بازو میں سرنج گھسا کر تھوڑا سا خون نکال لیا۔ اس سے پہلے وہ ہارون کا بھی بلڈ سیمپل لے چکے تھے۔

"وہ اس کا بزنس پاٹنر ہارون شاہد ہے نا! اس سے پوچھ گچھ کی آپ نے؟" اختر خان نے پوچھا۔

"آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اسی نے قتل کیا ہو گا، اکرام نے ایک بار بتایا تھا مجھے، وہ بھی اکرام کی طرح فراڈیا ہے۔"

"ہماری تفتیش جاری ہے۔"

پھر انہوں نے چند مزید سوال پوچھے اور اس کا موبائل نمبر لے کر گھر سے باہر نکل آئے۔

باہر نکل کر انہوں نے دیکھا کہ اکرام حسین کے گھر کے باہر کافی لوگ کھڑے تھے۔ اس کی موت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ وہ فی الحال اکرام کے گھر والوں کو دوبارہ تنگ نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے واپس تھانے چلے گئے۔

"سر! یہ تینوں ایک دوسرے پر الزام لگا رہے ہیں۔" حماد نے کہا۔

"ہاں! کہیں ایسا نہ ہو کہ قاتل کوئی چوتھا شخص ہی ہو۔" جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جنید نے سائبر سیل میں فاروق کو اس کیس سے جڑے چند افراد کے موبائل نمبر دیے اور سراغ لگانے کی ہدایت دی اور ڈاکٹر جبران کو ڈی این اے سیمپل بھجوا دیے تاکہ وہ فرانزک سائنس کے تحت قاتل کا سراغ لگا سکیں۔

دو گھنٹے کے بعد وہ سائبر سیل میں موجود تھے۔

"سر! عمران کے کال ریکارڈ سے ایک بات سامنے آئی ہے۔" فاروق نے بتایا۔

"کیسی بات؟"

"عمران کے کال ریکارڈ میں ایک نمبر ملا ہے جس سے وہ مستقل رابطے میں تھا۔ اس آدمی کا نام الیاس سندھو ہے۔"

"الیاس سندھو...... یہ نام تو سنا سنا لگ رہا ہے۔" جنید نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ تو وہی سندھو ہے جس پر منشیات کی فروخت کا الزام ہے، کئی بار پکڑا بھی گیا لیکن اپنا اثر رسوخ دکھا کر ہمیشہ چھوٹ جاتا ہے۔"

"ارے ہاں! یاد آیا، تین چار سال پہلے تو میں نے گرفتار کیا تھا اسے۔" جنید نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے یا تو عمران نشے کا عادی ہے یا پھر وہ الیاس سندھو کے لیے کام کرتا ہے۔"

"کہیں یہی تو وہ چوتھا آدمی نہیں ہے؟" حماد نے کہا۔

"کیا پتا!" جنید نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا اور وہ لنچ کرنے چلے گئے۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ کمرے میں صرف دو آدمی موجود تھے۔ ایک آدمی نے نیلی جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور دوسرے نے سیاہ کوٹ۔ نیلی جیکٹ والے کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"پولیس کو لاش بلکہ ڈھانچا مل گیا ہے۔ زور شور سے تفتیش بھی جاری ہے۔" نیلی جیکٹ والے نے بتایا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، پولیس تم تک پہنچ جائے گی؟" سیاہ جیکٹ والے نے پوچھا۔

"ہاں شاید! لیکن ایک بات یاد رکھو، اگر میں پکڑا گیا تو تمہارا نام بھی سامنے آجائے گا۔"

"ہمیں لاش جلا کر راکھ دریا میں بہا دینی چاہیے تھی۔ نہ لاش ہوتی اور نہ ہی تفتیش۔ اب خود بھی جیل جاؤ گے اور مجھے بھی ساتھ لے ڈوبو گے۔"

"اس وقت جو بہتر لگا، وہی کیا۔ ویسے بھی یہ سب تمہارا آئیڈیا تھا، میں کبھی بھی یہ قدم اٹھانے پر راضی نہیں تھا۔" نیلی جیکٹ والا بولا۔

"دیکھو! میرا کام صرف مشورہ دینا ہے، اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا دوسرے آدمی پر منحصر ہے۔ میں نے ایک مشورہ دیا، تم نے قبول کیا اور قتل کر ڈالا۔ اب مجھے بلاوجہ ذمے دار نہ ٹھہراؤ۔"

"دیکھو! اگر تم اسی طرح پریشان رہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی پولیس تم پر شک کرنے پر مجبور ہو جائے گی، اسی لیے گھر جاؤ اور سکون کا سانس لو۔ پیسے سے سب خریدا جا سکتا ہے، پولیس اور عدالت بھی۔"

"ہاں! اب بھی ایک اُمید باقی ہے۔" نیلی جیکٹ والے نے کہا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سیاہ کوٹ والے نے ایک نمبر ملایا۔

"اکرام حسین کے قتل کی تفتیش ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس قاتل تک پہنچ جائے، اگر ایسا ہوا تو میں بھی پکڑا جاؤں گا، اسی لیے بہتر ہے کہ......" اس کے بعد وہ فون پر ہدایات دیتا چلا گیا۔

☆☆☆

شام پانچ بجے انسپکٹر جنید اور سب انسپکٹر حماد فرانزک لیب میں داخل ہوئے۔ انہیں ڈاکٹر جبران نے بلایا تھا۔ ان کی بات نے کیس کا رخ ہی پلٹ دیا اور اب تک لگائے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا آپ یہ بات مکمل یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں؟" جنید نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں! سو فیصد یقین۔ یہ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں تصدیق کر چکا ہوں۔" ڈاکٹر جبران کی بات سُن کر جنید مسکرا دیا اور بولا۔

"تو اب تک کی تفتیش کے مطابق کہانی کچھ یوں ہے۔

"ہمیں پیراڈائز کالونی میں کھدائی کرتے ہوئے ایک انسانی ڈھانچا ملا۔ اس انسان کی موت طبعی تھی یا اسے قتل کیا گیا تھا؟ اور یہاں کس نے دفن کیا تھا؟ یہ سب جاننا ہمارے لیے بہت ضروری تھا۔ اس کیس کو حل کرنے کے لیے ہم نے جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لیا۔ ہمیں ڈھانچے کے سینے میں دل کی دھڑکن کنٹرول کرنے والا پیس میکر ملا۔ اس کی مدد سے ہم اس اسپتال تک پہنچ گئے۔ اس طرح ہمیں پتا چلا کہ ڈھانچا اکرام حسین نامی آدمی کا ہے جو گرین روڈ کا رہائشی تھا۔ دوسری طرف فرانزک سائنس کی مدد سے ہم نے ڈھانچے کا چہرہ ری

کنسٹرکٹ کرلیا جو ہو بہو اکرام حسین کا ہی تھا۔ تیسرا ڈھانچے کا ڈی این اے اکرام حسین کے بھائی عمران حسین سے ملا کر دیکھا گیا اور اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ڈھانچا اکرام حسین کا ہی ہے۔'' اتنا کہہ کر جنید خاموش ہوگیا۔

''اس کے بعد ہم نے سائبر سیل کی مدد سے اکرام حسین کا موبائل ریکارڈ اور لاسٹ لوکیشن نکلوائی۔ لاسٹ لوکیشن بھی وہیں کی تھی جہاں ہمیں ڈھانچا ملا تھا۔ پھر ہم نے کال ریکارڈ نکلوایا اور اس سے کافی حد تک معاملہ واضح ہوگیا۔ دوسرا ہمیں مقتول کے کپڑوں پر کسی اور کے خون کے دھبے ملے جو یقیناً قاتل کے تھے۔ اب ہمارے لیے قاتل تلاش کرنا بہت آسان ہوگیا۔ ہمیں صرف اس آدمی کی تلاش تھی جس کے خون کے دھبے مقتول کے لباس پر موجود تھے۔

''پہلے میرا شک اختر خان کی طرف گیا، اکرام حسین کی موت کے بعد سالوں سے زمین کے تنازعے کو لے کر جو کیس عدالت میں چل رہا تھا، اس کا فیصلہ اختر خان کے حق میں آگیا کیونکہ کیس کی پیروی کرنے والا اکرام حسین تو اب اس دنیا میں رہا نہیں تھا اور چھوٹا بھائی عمران ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ ان عدالتی معاملات کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا۔ پھر مجھے لگا کہ قتل ہارون شاہد نے کیا ہوگا۔ ہارون کافی عرصے سے کاروبار میں گھپلا کر رہا تھا اور اکرام حسین اسے پکڑ بھی چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کروڑوں کے کاروبار سے ہاتھ دھو بیٹھے اس نے سوچا کہ اکرام حسین کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور خود سارا کاروبار سنبھال لے۔ ہارون شاہد کے پاس بھی اکرام حسین کو قتل کرنے کی ٹھوس وجہ موجود تھی لیکن......''

''مقتول کے لباس پر لگا خون ان دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں ہے۔ خون کسی تیسرے شخص کا ہے اور اس شخص کا نام ہے عمران حسین۔'' ڈاکٹر جبران نے جنید کی بات آگے بڑھائی۔

''جی ہاں! جب ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے عمران کا خون لیا گیا تو ڈاکٹر جبران کو یہ بات پتا چلی کہ عمران آئس جیسے خطرناک نشے کا عادی ہے۔ ہم نے عمران کا ریکارڈ نکلوایا تو پتا چلا کہ وہ تین سال پہلے جیل کی ہوا کھا چکا ہے لیکن اس پر آئس فروخت کرنے کا الزام تھا جو ثابت نہ ہوسکا۔ ہوسکتا ہے اس وقت وہ صرف آئس فروخت کرتا ہو لیکن بعد میں خود بھی استعمال کرنے لگا ہو۔ وہ ایک منشیات فروش الیاس سندھو کے ساتھ بھی مستقل رابطے میں ہے، ہوسکتا ہے جب اکرام حسین کو یہ بات پتا چلی ہو تو انہوں نے اسے بہت ڈانٹا ہو۔ اسی وجہ سے عمران کے دل میں اپنے بھائی کے لیے نفرت پیدا ہوگئی ہو۔ شاید اس نے سوچا کہ اگر اکرام حسین اس دنیا میں نہ رہے تو وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتا ہے اور اکرام کی ساری دولت اور جائداد بھی اسی کی ہو جائے گی۔ اکرام حسین کی شادی نہیں ہوئی تھی، اسی لیے عمران ہی اس کی جائداد کا وارث تھا۔ پھر ایک دن وہ انہیں ایک غیر آباد کالونی میں لے گیا اور قتل کر کے لاش وہیں دفنا دی۔''

''اب ہمیں صرف عمران کو گرفتار کرنا ہے اور پھر کیس کلوزڈ۔'' حماد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسی وقت جنید کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال موصول کی اور بات کرنے لگا۔

''ہیلو!......کیا!......اوہ!'' جنید نے کال کاٹ دی۔

''سر! کیا ہوا؟''

''عمران حسین کو کسی نے قتل کر دیا۔''

''کیا!...... یعنی اکرام حسین کے قاتل کو ہی قتل کر دیا گیا۔'' وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔

☆☆☆

اگلی صبح گیارہ بجے وہ فرانزک لیب میں پہنچے۔ جس اسٹریچر پر کل تک اکرام حسین کا ڈھانچا پڑا تھا، آج وہاں اس کے بھائی عمران حسین کی لاش پڑی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا رپورٹ ہے؟'' انسپکٹر جنید نے پوچھا۔

''عمران حسین کی موت کل شام پانچ سے چھ بجے کے قریب ہوئی۔ اسے بھی اسی پستول سے مارا گیا ہے جس سے اکرام حسین کا قتل ہوا تھا۔''

''لیکن ہم تو سمجھ رہے تھے اکرام کا قاتل عمران ہے۔ اب عمران بھی مارا گیا۔'' حماد نے الجھن ظاہر کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اکرام حسین کے قتل میں عمران کے ساتھ ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم عمران تک پہنچ گئے ہیں، اس نے عمران کو ہی مروا دیا تا کہ ہم اس تک نہ پہنچ سکیں۔'' جنید نے عمران کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! الیاس سندھو پر ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے وہی عمران کا ساتھی ہے۔'' حماد نے خیال ظاہر کیا۔

''فاروق کو الیاس سندھو کا موبائل ریکارڈ نکالنے کے لیے کہا تھا، پتا کرو اس کی رپورٹ کہاں تک تیار ہوئی۔''

حماد نے فاروق کو فون ملایا۔ کچھ دیر اس سے بات کی اور پھر جنید سے کہا۔

''سر! رپورٹ تیار ہے، فاروق کہہ رہا ہے کہ دس نومبر دو

ہزارا کیس کے دن جس وقت اکرام حسین کا موبائل بند ہوا، اس وقت عمران اور الیاس بھی اس کے آس پاس ہی تھے۔ تینوں موبائلز کے سگنل ایک ہی ٹاور سے آرہے تھے۔"

"یعنی! ہمارا شک درست نکلا، الیاس سندھو کو اٹھا لاؤ!" جنید کی بات سُن کر حماد چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جنید نے ڈاکٹر جبران سے کہا۔

"الیاس سندھو کے خلاف کیا یہ ثبوت کافی ہوگا؟"

"بالکل بھی نہیں، اسی لیے میرے پاس آپ کے لیے ایک پکا ثبوت موجود ہے جسے الیاس سندھو جھٹلا نہیں سکے گا۔" ڈاکٹر جبران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور وہ کیا؟" جنید نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا تو ڈاکٹر جبران مسکرا دیے۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے تک ان کی تفتیش مکمل ہو چکی تھی اور وہ سب پولیس اسٹیشن کے کانفرنس روم میں موجود تھے۔ وہاں الیاس سندھو، اختر خان اور ہارون شاہد بھی موجود تھے۔ الیاس تو مطمئن تھا لیکن باقی دونوں کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان دونوں میں سے ہی کوئی قاتل ہے۔

انسپکٹر جنید نے بات کا آغاز کیا۔

"پرسوں صبح ہمیں پیراڈائز کالونی میں کھدائی کرتے ہوئے ایک انسانی ڈھانچہ ملا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد ہمیں پتا چلا کہ وہ ڈھانچہ اکرام حسین نامی ایک شخص کا ہے جو دو سال پہلے لاپتا ہو گیا تھا۔ ہم نے باقاعدہ تفتیش شروع کی اور جلد ہی جان گئے کہ اکرام حسین کو اس کے چھوٹے بھائی عمران حسین نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر قتل کیا۔ اس سے پہلے کہ ہم قتل کی وجہ جانتے، اسے بھی کسی نے قتل کر دیا۔ ہمارا شک اسی ساتھی کی طرف گیا جس کے ساتھ مل کر عمران نے قتل کیا تھا۔ اس ساتھی کا نام ہم جان چکے تھے لیکن ہمارے پاس اس کے خلاف صرف اندازے اور مفروضات تھے، کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ آخر کار ہمیں اس کے خلاف ٹھوس ثبوت مل ہی گیا۔" اتنا بتا کر جنید خاموش ہو گیا اور تمام حاضرین کی طرف دیکھنے لگا۔

"اور وہ ثبوت کیا ہے؟" الیاس سندھو نے پوچھا۔

"ایک لاکٹ...... جو ہمیں اکرام حسین کی لاش کے قریب ملا۔ پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ وہ لاکٹ اکرام حسین کا ہی ہے اس لیے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی لیکن آج صبح عمران کی لاش ملنے کے بعد اسی لاکٹ کا ڈاکٹر جبران نے بغور معائنہ کیا تو پتا چلا کہ وہ لاکٹ مقتول کا نہیں بلکہ قاتل کے ساتھی کا ہے۔"

"یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟" اختر خان نے پوچھا۔

"اس لیے کہ لاکٹ کھولنے پر اندرونی حصے میں دو تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ دائیں طرف مرد کی تصویر اور بائیں طرف ایک عورت کی تصویر۔ مرد کی تصویر نہ تو اکرام حسین کی ہے اور نہ ہی عمران حسین کی۔ یہ تصویر کسی تیسرے شخص کی ہے۔ ہمیں اکرام حسین کے کپڑوں سے خون کے داغ ملے جو کہ عمران کے تھے۔ اسی بنا پر ہمیں پتا چل گیا کہ اکرام حسین کی موت کے وقت عمران ساتھ ہی تھا۔ اب اکرام پر گولی عمران نے چلائی یا اس کے ساتھی نے، ہم یہ بات نہیں جانتے تھے۔"

"وہ تصویر کس کی ہے؟" الیاس سندھو نے پوچھا۔ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے جنید بولا۔

"ہم اپنی تفتیش کا دائرہ مزید بڑھاتے ہوئے ان سب افراد کی نگرانی کروانے لگے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ عمران کے ساتھ رابطے میں تھے۔ الیاس سندھو ہمارے شک کے دائرے میں اول نمبر پر تھا۔ عمران منشیات کا عادی تھا اور الیاس سندھو منشیات فروش۔ ایک اور بات، جس دن اکرام حسین قتل ہوا، الیاس سندھو اور عمران حسین کی موبائل لوکیشن بھی آس پاس تھی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ دونوں نے مل کر ہی اکرام کا قتل کیا ہے۔"

"میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔" الیاس چلا اٹھا۔

"میں نے کب کہا کہ آپ نے قتل کیا؟ ڈھانچے کے پاس سے ملنے والا لاکٹ آپ کا نہیں ہے بلکہ وہ تو اکرام حسین کے کاروباری شراکت دار ہارون شاہد کا ہے۔"

"ہارون شاہد......" سب چلا اٹھے۔

"جی ہاں! اس کہانی کا اصل ماسٹر مائنڈ ہارون شاہد ہی ہے۔ اسی نے اکرام حسین کو دھوکا دیا، فراڈ کیا اور عمران کو منشیات کا عادی بنایا اور پھر اسے اکرام کو قتل کرنے پر اکسایا۔ اور اب دو سال بعد جب ہمیں اکرام کا ڈھانچا مل گیا اور کیس کی تفتیش شروع ہو گئی تو اس نے عمران کو بھی قتل کروا دیا تاکہ پکڑے جانے پر وہ اس کا نام نہ لے دے۔" جنید نے عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے کہا، جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہو۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے ہی عمران کو قتل کیا اور وہ لاکٹ بھی میرا ہے۔ میری اور میری بیوی کی کئی تصاویر سوشل میڈیا پر ہیں، کوئی بھی تصاویر حاصل کر سکتا ہے اور جان بوجھ کر لاکٹ لاش کے پاس چھوڑ سکتا ہے تاکہ میں پکڑا جاؤں۔" ہارون چلایا۔

"یہ بات تو بالکل درست ہے اور اب دو سال پرانے لاکٹ پر کسی کے فنگر پرنٹس ملنا بھی ناممکن ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ لاکٹ آپ کا ہی تھا یا کسی نے آپ کو پھنسایا؟"

"میں یہ بات نہیں جانتا، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں... بلکہ اکرام کے انتقال کے بعد کاروبار بُری طرح متاثر ہوا۔ مجھ پر تو اب کروڑوں کا قرضہ ہے۔ میں کیوں کسی کو قتل کروں گا؟" ہارون نے بتایا۔

"بظاہر شک کے دائرے میں آپ نظر آتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اکرام حسین اور عمران حسین دونوں بھائیوں کے قاتل بلاشبہ الیاس سندھو ہی ہیں۔ ہم تو آپ کے ساتھ دل لگی کر رہے تھے۔" جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا مذاق ہے، کبھی کہتے ہیں میں قاتل ہوں اور کبھی کہتے ہیں ہارون شاہد۔ آپ بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ جائیں اور اصل قاتل کی تلاش کریں۔" الیاس سندھو چلایا۔

"اب ہم مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہمیں اکرام حسین کے ڈھانچے کے پاس ایک لاکٹ ملا۔ یہ بھی سچ ہے کہ لاکٹ میں ہارون شاہد اور اس کی بیوی کی فوٹو ہے لیکن ایک بات اور بھی سچ ہے وہ یہ کہ ہارون شاہد اور اس کی بیوی کی فوٹو پر آپ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر ہارون کو پھنسانے کے لیے لاکٹ لاش کے ساتھ پھینکا تھا تاکہ اگر پولیس لاش تک پہنچ جائے تو قتل کا الزام ہارون پر آئے۔"

"زمین میں دو سال سے زائد دفن شدہ لاکٹ میں انگلیوں کے نشان...... کیا مذاق ہے یہ!" الیاس سندھو مسکرا دیا۔

"فنگر پرنٹس لاکٹ پر نہیں، لاکٹ کے پینڈنٹ کے اندر موجود تصاویر پر ملے ہیں۔ پینڈنٹ تو بند تھا، اسی لیے فنگر پرنٹس محفوظ رہے اور آپ کا بچھایا ہوا جال تار تار ہو گیا۔"

یہ وہ لمحہ تھا جب الیاس سندھو کو احساس ہو گیا کہ وہ پکڑا گیا ہے۔ اس کا سر جھک گیا۔

"ہاں تو الیاس سندھو! اب بتاؤ یہ سارا کیا ماجرا ہے؟"

"میں عمران کو پچھلے چار سال سے منشیات فروخت کر رہا تھا۔ اسے میں نے ہی آئس کے نشے کا عادی بنایا۔ وہ شروع سے ہی بھائی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر بات پر اسے ٹوکتا رہتا اور گھنٹوں نصیحتیں کرتا رہتا۔ اسے یہ سب پسند نہیں تھا۔ وہ ایک آزادانہ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ عمران مجھ سے ہر بات شیئر کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ایک شیطانی منصوبہ بنایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اکرام کو مار کر اس کے قتل کا الزام ہارون شاہد پر لگا دیا جائے۔ اس طرح سارے کاروبار کا تنہا مالک عمران حسین بن جائے گا اور وہ تو پہلے ہی میری مٹھی میں قید تھا۔ اسی لیے میں نے ایک لاکٹ خریدا۔ سوشل میڈیا اکاؤنٹ سے ہارون اور اس کی بیوی کی فوٹوز پرنٹ کروا کر لاکٹ کے پینڈنٹ میں لگا دیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پولیس تصاویر پر لگے فنگر پرنٹس کا ریکارڈ بھی نکلوا سکتی ہے اور یہی میری غلطی تھی۔ عمران، اکرام کو پراپرٹی دکھانے کا بہانہ بنا کر پیراڈائز کالونی لے گیا۔ میں وہاں پہلے ہی موجود تھا۔ میں نے اپنا پستول نکالا اور عمران کو دے دیا۔ جیسے ہی اکرام نے عمران کے ہاتھ میں پستول دیکھا، وہ عمران پر جھپٹا۔ اسی کھینچا تانی میں گولی چل گئی جو عمران کے بازو کو چھو کر نکل گئی۔ وہ زخمی ہو گیا اور شاید اسی کا خون اکرام کے لباس پر لگ گیا لیکن پستول عمران کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس نے فوراً اکرام کے سینے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی اور وہ مارا گیا۔ اس جگہ گڑھا میں پہلے ہی کھود چکا تھا۔ ہم دونوں نے اکرام کا پرس اور موبائل نکال کر لاش گڑھے میں ڈال کر دفنا دی۔ ہارون کی فوٹو والا لاکٹ بھی لاش کے پاس پھینک دیا۔ پھر ہم نے اکرام کا موبائل اور سم توڑ دیے۔ اس کا شناختی کارڈ اور باقی کاغذات دریا میں بہا دیے۔ اس کے بعد عمران، اکرام کے کاروبار اور اس گھر کا مالک بن گیا۔ اب پتا نہیں کیسے آپ کو ڈھانچا مل گیا اور آپ دو دن میں ہی اصل مجرم تک پہنچ گئے۔"

الیاس سندھو نے اقرار جرم کر تو لیا تھا لیکن اس کی آنکھوں یا چہرے پر ذرا بھی پشیمانی نہیں تھی۔

"سندھو صاحب! جرم کبھی بھی چھپ نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن اس کا مجرم پکڑا ہی جاتا ہے۔ آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔ دو تین سال پرانے جرم کا سراغ لگانا تو معمولی بات ہے اب ٹیکنالوجی کی مدد سے ہم تیس چالیس سال پہلے کیے گئے جرم کا بھی سراغ لگا لیتے ہیں۔"

"لاشیں، ڈھانچے یا جائے واردات پر ملی اشیاء کبھی بھی بے زبان نہیں ہوتیں۔ فرانزک ڈاکٹر ٹیکنالوجی کی مدد سے ہر مُردے کی زبان کھلوا لیتے ہیں۔ لاش خود بتاتی ہے کہ اسے کب اور کیسے قتل کیا گیا!" ڈاکٹر جبران مسکراتے ہوئے بولے۔

"اور پھر اچھے سراغ رساں یہ بھی پتا لگا لیتے ہیں کہ کس نے اور کیوں قتل کیا۔" انسپکٹر جنید نے ڈاکٹر جبران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور مسکرا دیا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

دو کانسٹیبل آگے بڑھے اور الیاس سندھو کو حوالات کی طرف لے جانے لگے۔

❖❖❖

ڈکیتی کی ایک واردات سے شروع ہونے والی کشمکش کا معاملہ......

شکار کھیلنا بہادروں کا کام ہے... شکارگاہ پر دونوں حریف آمنے سامنے ہوتے ہیں... ایک چالاک شکاری اپنے شکار کی ہر کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ تجسّس و سنسنی خیز لمحوں سے گزرتی کہانی کے موڑ... شکار اور شکاری کے مابین فیصلہ کرنا مشکل تھا...

# شکاری

عبدالرب بھٹی

دن کے گیارہ بجے تھے۔ وہ کہیں جانے کے لیے خاصی عجلت میں تیار ہوا۔ بائیک کی چابی اُٹھائی اور اپنے فلیٹ کو لاک کر کے تیزی سے تھرڈ فلور سے نیچے اُترا۔ چوکیدار سے ہائے، ہیلو ہوئی اور پھر اپنی بائیک نکال کر وہ رہائشی فلیٹوں کی بلڈنگ سے باہر مین روڈ پر آ گیا۔

آج بھی اسے کل کی طرح بھاگ دوڑ کرنا تھی۔ تاخیر اس کے لیے خطرے کا پیش خیمہ ہوتی۔ اسے خود پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس خطرناک صورتِ حال کو کس طرح چوبیس گھنٹے بغیر کسی کھڑتیل کے گزار چکا ہے۔ اسے اب تک زہرہ

نگار کو تلاش کر کے گولی مار دینی چاہیے تھی لیکن نہیں...... اتنی عجلت مناسب نہ ہوتی۔ جس طرح ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے ایک اور جھوٹ بولنا غیر دانشمندی ہوتی ہے اسی طرح ایک جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسرا جرم نہیں کرنا چاہیے، مگر مجرمانہ زندگی میں کبھی کبھار ایسا کرنا ازبس ضروری بھی تو ہوجاتا ہے۔

وہ اُلجھ گیا۔ ابھی تک صورتِ حال واضح نہیں تھی۔ جرم البتہ اس کے گلے پڑنے کو بے چین تھا، جب تک کہ منصور جلد از جلد اس سلسلے میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر نہ ڈالتا۔ مگر وہ کرتا کیا؟ زہرہ نگار گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔

وہ کوئی معروف گلوکارہ تو تھی نہیں کہ ہر کوئی اس کے بارے میں اسے بتا دیتا کہ اب اگلا شو وہ کس جگہ اور کہاں کر رہی ہوگی۔ وہ ایک عام فائیو اسٹار ہوٹلز میں گاہکوں کی تقریبات کی زینت کے لیے نئے پرانے پاکستانی انڈین گیت نئے انداز میں گایا کرتی تھی۔ بہ الفاظِ دیگر وہ دوسرے درجے کی غیر معروف سی فنکارہ تھی۔

تاہم اس کی اتنی ''پی آر'' بن چکی تھی کہ شہر بھر کے ہوٹلز اسے کال کر کے کسی ''کسٹمر'' کی تقریب کا عندیہ دے کر بلا لیتے تھے۔

منصور کل سے زینت کی تلاش میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ کل تو وہ اتنا بڑا خطرہ مول لے کر اسی اسٹار ہوٹل میں بھی گیا تھا جہاں وہ خود واردات کر کے بھاگا تھا اور بدحواسی میں زینت سے ٹکرا گیا تھا۔ یوں کسی اور نے نہیں تو زینت نے اسے ضرور دیکھ لیا تھا۔ چند ثانیوں کے لیے ہی سہی وہ بہرحال ایک شخص کی نگاہوں میں آچکا تھا اور اب انہی نگاہوں والی کی اسے تلاش تھی، تاکہ پتا لگا سکے کہ وہ اسے اب بھی پہچان کر پولیس کو اس کے بارے میں اپنا بیان قلم بند کر سکتی ہے یا نہیں۔

چوبیس گھنٹے بیت جانے کے بعد بھی اس کا بیان سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ منصور کے لیے کچھ باعثِ تشفی تھا مگر اس کی ابھی پوری طرح تسلی نہیں ہوئی تھی۔

پرسوں رات دس بجے منصور نے ہوٹل سلور اسٹار میں ڈکیتی کی واردات کی تھی۔ یوں تو وہ عام ''اسٹریٹ اسنیچر'' تھا، راہ چلتے کسی کا سیل فون چھین لیا، پرس لے لیا، وغیرہ۔ مگر اب مہنگائی اور اخراجات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ چھوٹی موٹی واردات اب اس کے ''گزارے'' کے لیے ناکافی ہو چکی تھی۔ اب تو فلیٹ کا پورا کرایہ بھی اس کے گلے پڑ چکا تھا۔ پہلے اس کے دو ساتھی رہتے تھے، وہ بھی اسی ''قبیل'' کے تھے۔ مل کر فلیٹ کا ماہانہ کرایہ دے دیا کرتے تھے۔ کسی وجہ کے سبب وہ دونوں منصور کو فلیٹ سمیت چھوڑ کہیں جا چکے تھے۔

منصور نے بڑی ڈکیتی کا سوچا اور سب سے پہلے اس نے ایک دو دکان والوں کو لوٹا، مگر دکان والے ان حالات کے سبب خاصے محتاط اور چالاک ہو چکے تھے۔ دکان کے ''گلے'' میں کم ہی نقدی رکھتے۔ پھر اتنا مال ملتا نہیں تھا جتنا پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا۔ اکثر اس نے ایسے لٹیروں کو دکان کے مالک اور دیگر لوگوں سے بری طرح پٹتے بھی دیکھا تھا۔ بعد میں پتا چلتا کہ لوٹنے والے کے ہاتھ اتنا مال نہیں آیا جتنا اسے ''تگڑی'' ٹھکائی لگ گئی۔

پھر ایک دن ٹی وی دیکھتے ہوئے اس نے کسی انگریزی فلم میں ایک شخص کو اونچے درجے کے ہوٹل کے کیشئر کو لوٹنے کی واردات دیکھی جس نے اکیلے ہی یہ کامیاب واردات کر کے بہت بھاری مال ایک ہی ہلّے میں بنا لیا تھا۔

اس کے لیے یہ ایک نیا آئیڈیا تھا۔ ''نئے آئیڈیے'' والی واردات نسبتاً آسان ہوتی۔ یہ اس کا تجربہ تھا۔ عام سی وارداتوں میں لوگوں کا زیادہ دھیان ہوتا اور اتنی ہی احتیاط کا دخل بھی۔ اس کے خیال کے مطابق کسی بڑے فائیو اسٹار ہوٹل کے کیشئر کو لوٹنے کا آئیڈیا کم کم ہی ہوتا ہوگا۔ یوں وہاں یہ واردات انجام دینا گو اتنا آسان تو نہیں مگر مشکل بھی نہ ہوگا۔

اس نے پوری تیاری کی اور ''نئے عزم'' کے ساتھ شہر کے ایک مہنگے فائیو اسٹار ہوٹل کی گرین میں جا پہنچا۔

اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی کہ اس نے کم و بیش ایک گھنٹے کے ایک اندر اندر یہ کامیاب واردات کر بھی ڈالی، آخر میں وہ ایک ذرا سی غلطی کے سبب دھر لیا جاتا مگر بچ گیا، تاہم ایک قباحت اس کے سر ہوگئی۔ ایک تو وہ کیشئر جس نے آخر میں مزاحمت کرنی چاہی تھی، منصور کے پستول کی گولی سے شدید زخمی ہوگیا دوسرا وہ زینت کی نگاہوں میں آگیا تھا۔

اس وقت کسی کسٹمر کا طے شدہ پروگرام چل رہا تھا۔ ہوٹل کی لابی میں خوب رونق تھی۔ خوب مہمان تھے۔ برگر فیملی کے ممبران ہلا گلا کرنے میں مصروف تھے۔ میوزک کا پروگرام بھی ہائر کیا گیا تھا اور یہی فنکارہ زینت مائیک کے سامنے کھڑی فرمائشی گانے سنا رہی تھی۔ منصور آسانی سے تو نہیں کسی ٹرک سے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

واردات کے آخر میں وہ زینت سے ایک ایسے مقام پر ٹکرا گیا تھا جب وہ پروگرام کے دوران گولی کی آواز سن کر

دیگر لوگوں کی طرح ڈر کے بھاگی اور وہ اس سے ٹکرا گیا۔ اس کا نقاب اُتر گیا تھا۔

تب ہی دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ زینت نے چیخ ماری۔ منصور کے پاس رکنے کا کوئی چانس نہ تھا۔ وہ دوڑتا رہا اور بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً اسّی لاکھ کی رقم کیشئر سے ہتھیانے کے باوصف اسے فکر و تشویش کھا گئی تھی۔ بعد کی خبروں کے مطابق کیشئر کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کی حالت تشویش ناک تھی۔

اب زینت نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ ساری رات خوشی اور تشویش تلے سو نہ سکا اور اگلے دن بھیس بدل کر دوبارہ نکلا۔ اسی ہوٹل کا رخ کیا۔ اپنے طور پر جانچا۔ خبریں پڑھیں اور سنیں بھی۔ مختلف ٹی وی چینلز کی چلتی ہوئی نیوز بھی دیکھ لیں، جن میں ہوٹل لکی گرین میں ڈکیتی کی واردات کا تذکرہ تو تھا مگر کہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ چور کو دیکھ لیا گیا تھا۔

”تو کیا اس گلوکارہ نے اس کے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا؟“ اس نے حیرت سے سوچا تھا۔ تفتیش تو پولیس نے کی ہو گی۔ سب کے بیان بھی لیے ہوں گے۔ پھر ایسا کیوں؟ کیا وہ گلوکارہ اس سے خوف زدہ تھی یا پھر وہ اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

اسے کافی تسلی تو ہوئی لیکن پھر اسے یہ سوچ کر بے چینی ہونے لگی کہ کیا خبر بات پولیس نے چھپا دی ہو اور زینت نے انہیں سب بتا دیا ہو۔ چونکہ ڈکیتی کی یہ ایک بڑی اور اکیلے آدمی کی واردات تھی، پولیس بھی تو کم چالاک نہیں ہوتی، بعض معاملات میں۔ کیا خبر وہ اسی گلوکارہ کو ”ٹریس“ کر رہی ہو کہ کون مشکوک شخص اس سے مل سکتا ہے اور اسے چھاپ لیا جائے۔ منصور خوف اور ڈر سے سنکی بھی ہوا جا رہا تھا۔ یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے۔

لہٰذا وہ گلوکارہ کو جانچنے کے لیے اگلے ہی دن سے اس کی تلاش میں جُت گیا۔ اس کا نام اسے زینت معلوم ہوا۔

تازہ بھاگ دوڑ کے نتیجے میں اسے وہ شام پانچ بجے ایک دوسرے فائیو اسٹار گولڈ کانٹی نینٹل میں نظر آ گئی۔ (اگلی واردات کے لیے منصور اسی ہوٹل کے کیشئر کو لوٹنے کا ارادہ کر چکا تھا)

اب اس کے پاس خاصی رقم تھی۔ وہ ایک کسٹمر کی حیثیت سے ہی ”ہائی ٹی“ کے لیے داخل ہوا تھا۔ اس کے جسم پر بہترین تراش کا سوٹ تھا۔ خود بھی جوان اور وجیہہ و شکیل تھا۔ اس نے کوئی بھیس نہیں بھرا تھا اور اپنی اصل ہی صورت میں تھا۔ ورنہ لڑکی (زینت) کا ردِعمل کا کیسے پتا چلتا۔ یوں

بھی لڑکی کے سوا اسے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کیونکہ وہ واردات والی شام نقاب میں تھا، صرف لڑکی سے ٹکرانے کی صورت میں نقاب چند لمحے کو ہٹا تھا اور بس۔

بہرکیف معمول کے مطابق وہ آرکسٹرا کی ہلکی دھن میں کوئی نغمہ گنگنا رہی تھی۔ پھر جب وہ ری فریش ہونے کے لیے ایک کرسی پر جا بیٹھی تو منصور فوراً اس کی طرف لپکا۔

جو خطرہ اس کی جان کھائے ہوئے تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ بلاخوف تھیلے سے بلی برآمد کرنا ہوگی ورنہ ...... ڈر، اس کی جان لے لے گا۔

اس کا خیال تھا کہ زینت اسے دیکھتے ہی چیخنا شروع کر دے گی یا خوف زدہ تو ضرور ہو جائے گی، یوں بھی ایک طرح سے اس کا مقصد اسے دہشت زدہ ہی کرنا تھا اپنی ''دلیری'' دکھا کر کہ وہ اس کے بالکل نزدیک موت بن کے کسی وقت بھی آسکتا ہے، وغیرہ۔ کچھ ایسا تاثر اس نے دیا بھی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ زینت نے شناسائی ظاہر کی نہ ہی خوف کی ایک ذرا سی رمق بھی اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ لیکن یہ دیکھ کر منصور کے اندر پہلی بار مسرت ضرور چمکی کہ کیا خبر اسے اس کا چہرہ یاد ہی نہ رہا ہو یا پھر اس نے ڈر کے پہلے ہی ہنکل مار لی ہو۔

''ہائے، آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ زینت نے بُرا نہیں منایا اور جواب میں مسکرائی۔

''شکریہ۔''

ماحول ایسا ہی تھا وہاں کوئی بھی کسی سے بے تکلفی کے ساتھ راہ و رسم کر سکتا تھا۔

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔'' منصور نے ایک اور خطرناک قدم اُٹھایا۔ کہتے ہوئے اس نے بہ غور زینت کے چہرے پر نظریں گاڑلیں۔

''سوری! یادداشت کے معاملے میں تو میں انتہائی کوڑھ مغز ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''لیکن کچھ کچھ دیکھے ہوئے تو لگتے ہو......'' اس کا یہ آخری جملہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی رسماً کہہ دیتا ہے۔

بہت خوب، منصور نے دل میں سوچا۔ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے اس نے کیسا چٹکلا چھوڑا۔ لیکن اگلے ہی لمحے زینت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اُنگلی کا اشارہ اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

''اوہو...... یاد آ گیا۔''

منصور کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

''تمہیں آخری بار میں نے سی ویو کے ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا، کیا نام تھا......'' وہ یادداشت کھنگالنے لگی۔ ''ہاں...... سی بائیٹس جہاں کی گرل فش بہت مشہور ہے۔ ہے نا۔ تمہیں اکثر میں نے وہاں دیکھا تو ہے۔''

منصور نے گہری ہمکاری خارج کی۔ زینت یا تو چالاک بن رہی تھی یا پھر یونہی بڑ خولیاں مار رہی تھی۔ آخر یہ مجھے سمجھتی کیا ہے؟ اس نے دل میں سوچا۔ میں تو کبھی بھی وہاں نہیں گیا تھا جہاں کا یہ بتا رہی تھی۔ کیا یہ چھوکری مجھے یہ جتانے کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ مجھے پہچان تو گئی ہے لیکن وہ پولیس کے سامنے مجھے شناخت کرنے سے انکار کر دے گی؟ آخر کیوں؟ میرا اس سے کیا رشتہ ہے، ہماری پہلے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی، میں نے تو بس اسے واردات والے دن ہی لکی گرین ہوٹل میں دیکھا تھا۔ نغمہ گاتے ہوئے۔

یہ سب سوچتے ہوئے منصور نے اپنی لیدر کی جیکٹ ہولے سے تھپتھپائی۔ بھرا ہوا پسٹل اندر موجود تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے یہ باور کرانا چاہ رہی تھی کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گی لیکن جانے کیوں منصور کو یقین تھا کہ اس کے جاتے ہی وہ فوراً اپنے پرس سے سیل فون نکالے گی اور پولیس کو اس کے بارے میں مطلع کر دے گی۔ منصور کو اس کا بھی یقین تھا کہ لکی گرین ہوٹل میں اگر کسی نے اسے بغیر نقاب کے دیکھا بھی تو وہ صرف اور صرف زینت ہی تھی۔ اس نے سوچا، اگر وہ کسی طرح اس لڑکی کو کسی سنسان جگہ پر لے جائے، بالالفاظ دیگر اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لے تو اس کے خلاف یہ واحد گواہ بھی ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گا۔

تاہم ساری باتیں ایک طرف، منصور کو حیرت ہوئی تھی کہ لڑکی چالاک ہی نہیں خاصی بہادر بھی ہے۔

زینت، اس کی طرف دیکھ کر پھر مسکرائی۔ ''تم کس سوچ میں گم ہو گئے مسٹر؟''

''نہیں...... نہیں تو میں کچھ نہیں سوچ رہا ہوں۔''

جواب میں منصور کو بھی مسکرانا پڑا۔ پہلی بار اسے لڑکی کے پُراعتماد لہجے نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''لیکن تمہاری تو شکل بتا رہی ہے کہ تم کسی بہت بڑی اُلجھن کا شکار ہو، اور غالباً شاید مجھ سے کسی مدد کی توقع میں آئے ہو۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے سراسر اجنبی ہیں۔''

منصور کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ لڑکی سلسلۂ جنبانی دراز کیے جا رہی تھی، کیا وہ اسے پسند کرنے لگی ہے؟ جوان اور خوبرو تو وہ تھا ہی، تاہم خوش فہمیوں سے دور رہتا تھا، وہ

صرف پیسے کے معاملے میں خوش فہم رہتا تھا۔ سنبھل کر بولا۔
”میں نے کہا نا کچھ بھی نہیں، محض تمہارا وہم ہے۔“
منصور کے لہجے میں تھوڑی جھلاہٹ عود کر آئی، وجہ لڑکی تھی۔ پھر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے بہرحال اجنبی ہونے کے باوجود اسے ”لفٹ“ کرا دی تھی اور یہ معمولی بات نہ تھی، اسے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا۔ پھر وہی ہوا۔ لڑکی ایک دم سپاٹ لہجے میں بولی۔

”میں نے تم سے یہاں بیٹھنے کے لیے کب کہا تھا، تم خود یہاں آگئے تھے، بلا اجازت، لیکن میں نے اس حرکت کا بُرا نہیں منایا لیکن اب مجھے اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔“

منصور سنبھل گیا۔ ”سوری......! میں ذرا نروس ہوں۔ دراصل میں نے کل شام اپنی آنکھوں سے ڈکیتی دیکھی ہے جس کی وجہ سے......“ کہتے ہوئے منصور نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور گہری نظروں سے زینت پر مرتب ہونے والے ردِعمل کا مشاہدہ کرنے لگا۔

جن کا تعلق شوبزنس اور اسٹیج سے ہوتا ہے، وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے پر قادر ہوتے ہیں لیکن آنکھیں جو دل کا دروازہ ہوتی ہیں وہ پول کھول دیتی ہیں لیکن اس دھاکے پر بھی زینت نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ کل ہی تو ہوا تھا دھاکا...... وہ یا تو اپنے تاثرات دوسروں سے پوشیدہ رکھنے پر مکمل قادر تھی یا پھر وہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

اس کی اُٹھی ہوئی بھویں جھک گئیں۔ پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے سرخ لبوں پر نمودار ہوئی۔ تب ہی اچانک لڑکی نے ایک عجیب حرکت کی، جس نے منصور کو لحظہ بھر کو بوکھلا دیا۔ زینت نے میز پر رکھے ہوئے اس کے ایک ہاتھ کو آہستہ سے دبایا۔

”میں...... تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں، کیونکہ میں خود بھی کل رات ایک چھوٹے سے حادثے سے دوچار ہوئی ہوں۔ ایک شخص بُری طرح مجھ سے آن ٹکرایا تھا، میں اب تک وہ چھوٹا سا واقعہ فراموش نہیں کر سکی۔ ہاں تم بھی تو کسی ڈکیتی کا ذکر کر رہے تھے؟“

”چھوڑو اس واقعے کو۔ میں اسے فراموش کر دینا چاہتا ہوں، یہ ایک بڑا شہر ہے، کرائم بھی اسی حساب سے ہوتے رہتے ہیں۔“ منصور نے کہا۔ ”اس میں شہری بھی مرتے ہیں، راہ گیر بھی اور...... خود سنیچر بھی...... یعنی واردات کرنے والے۔“

منصور کے دل میں ایک بار پھر خیال آیا کہ کہیں خفیہ پولیس کا کوئی آدمی اس لڑکی کو چارے کے طور پر تو نہیں استعمال کر رہا، جو خود بھی کہیں قریب ہی چھپا بیٹھا، یہ سب دیکھ یا سُن رہا ہو۔

اسی وقت ویٹر آگیا۔ منصور نے زینت سے پوچھ کر کچھ اسنیکس وغیرہ کا آرڈر دے دیا، لیکن زینت نے یہ شرط رکھ دی کہ بل وہ پے کرے گی۔ منصور مسکرا دیا۔ اسے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ وہ ابھی تک شک و شبہے کا شکار تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی کوشش میں تھا کہ کوئی اور شخص بالخصوص ویٹر اس کا چہرہ پورا دیکھ نہ پائے کیونکہ اگر اسے لڑکی کو قتل کرنا بھی پڑا تو کوئی یہ بیان نہ دے کہ زینت کی لاش برآمد ہونے کے بعد کسی نے منصور کو اس کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔

اسی لیے جیسے ہی ویٹر آیا، منصور اس سے اپنا چہرہ چھپانے کی خاطر ٹوائلٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ زینت بھی اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے کسی کا ”حکم“ یا ”ہدایت“ تھی یا پھر وہ واقعی تنہائی کا شکار تھی۔ شوبزنس کے لوگ اکثر اندرونی تنہائی کا شکار رہتے ہیں۔ بہرحال، اس نے سوچا جو کچھ بھی تھا، واضح ہو جائے گا اور ہونا چاہیے تھا، تاکہ اتنی ساری حاصل ہونے والی دولت کا وہ صحیح طور مزہ لوٹ سکے، جبکہ زینت نے اس کی خوشی کو داغ دار کر دیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس کا حل نکالنا چاہتا تھا۔

”تم اچھے انسان لگتے ہو، میرا خیال ہے مجھے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا لینا چاہیے، تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ زینت چند باتیں اور چائے کی دو چسکیاں لینے کے بعد اس سے بولی تو منصور کے اندر اچانک خطرے کی گھنٹیوں کا شور بڑھ گیا۔

”سب کچھ ایک مربوط پلاننگ کے تحت ہو رہا ہے۔“ منصور نے تلخی سے سوچا۔ پولیس زینت کو اُس ”واردات“ کے خلاف استعمال کر رہی ہے۔ ورنہ کون لڑکی اتنی جلدی دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ وہ اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے، ایسا ہے تو ایسا ہی سہی، میں بھی محتاط ہی ہوں۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔ ”بلی تو تھیلے سے نکلے گی ہی۔“

”مجھے خوشی ہوگی۔“ منصور نے بھی مسکرا کر کہا۔
”ویسے پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ میں آپ کو کیا اچھا لگا؟“
وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”تم میں کوئی بات تو ہے، جس

نے میرے اندر کلک کیا ہے۔ تمہاری شخصیت میں کوئی اسرار پوشیدہ لگتا ہے۔ تم کوئی بہت ہی پراسرار آدمی ہو اور تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم عورتیں فطری طور پر تجسس پسند ہوتی ہیں۔"

منصور نے آہستہ آہستہ پھیپھڑوں میں رُکی ہوئی سانس خارج کی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کی کیفیات بھانپ ہی نہ جائے۔ پھر اس نے مسکرانے کی کوشش چاہی اور بولا۔

"واقعی؟ تو پھر تم بھی تجسس پسند ہو؟"

"بہت، بہت، زیادہ......" زینت زور سے ہنسی۔ "تم دانستہ خود کو پُراسرار بنانے کی کوشش کررہے ہو، ہیں نا؟ ایک چالاک شکاری اپنے شکار کی ہر کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔"

منصور واقعی ایک گھاگ شکاری کی طرح اس کی ایک ایک بات، اندازِ گفتگو، باڈی لینگویج سے اندازہ قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ "یوزٹو" ہورہی ہے یا پھر واقعی وہی سچ ہے جو یہ کہہ رہی ہے۔

منصور جلدی سے بولا۔ "نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس نجانے کیوں......"

"بس، آگے کچھ مت کہو۔" زینت نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر ایک دم اسے خاموش کردیا۔ "تجسس میں مبتلا رہنا بڑا ہی لذت آمیز تجربہ ہوتا ہے اور خاص طور پر کسی خوب صورت مرد کے ہاتھوں۔"

یکایک منصور کے اندر کچھ "کلک" ہوا۔ لڑکی اسے بنا رہی تھی یا پھر ویسا ہی تھا جیسا وہ کہہ رہی تھی۔ اس میں کیا شک تھا کہ منصور واقعی وجیہہ وشکیل مرد تھا۔ زینت بھی کم حسین نہ تھی۔ شوبز سے متعلق تھی، ایسی بے تکلفی عام بات ہوسکتی تھی۔ تاہم بولا۔

"کیا تم ہر مرد کے ساتھ اسی طرح فلرٹ کرتی ہو؟"

"نہیں۔" زینت نے سکون اور ملائمت آمیزی سے جواب میں کہا۔ "تم حسین نہیں ہو، لیکن خوب صورت ہو، پُرکشش ہو، تمہارے چہرے کے خدوخال نازک نہیں، تمہاری جلد چکنی، شفاف نہیں، تم کھردرے ہو۔ تمہاری ہر چیز مردانہ ہے۔ سخت، کھردرے اور مضبوط۔ تم ہر طرح سے مرد ہو اور یہی خصوصیت تمہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ مجھے نسوانی خوبیوں سے آراستہ مرد پسند نہیں۔ مرد کو بس مرد ہی ہونا چاہیے، نسائیت تو عورت میں موجود ہوتی ہی ہے۔"

منصور کو لگا جیسے وہ بھی اس لڑکی کو پسند کرنے لگا تھا، جو نسوانی حسن کا بہت عمدہ نمونہ تھی اور اب اس کی سوچ نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس کے اندر کی "تشکیک" ڈھلنے لگی۔

اسے لگا جیسے وہ خواہ مخواہ ہی کسی سائے کا تعاقب کررہا ہو۔ بلاوجہ ہی پریشان ہو۔

وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ واردات والے روز زینت اس سے ہوٹل کے ایسے گوشے میں ٹکرائی تھی جدھر نیم تاریکی سی تھی، ممکن تھا وہ اس کا چہرہ ہی نہ دیکھ پائی ہو۔ چور کو تو یوں بھی اپنے سائے سے بھی ڈر رہتا ہے۔ وہ پیہم غور کرتا رہا، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ فضول، بے مقصد ایک خوب صورت لڑکی کو زندگی سے محروم کردینا چاہتا ہے؟ ویسے بھی زینت اسے اس قسم کی لڑکی نظر نہیں آرہی تھی جو خواہ مخواہ زبان چلانے کی عادی ہو۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی اور زندگی کے ہر سانس سے لطف اندوز ہونے والی لڑکی تھی۔ اسٹیٹ فاورڈ اور ٹو دی پوائنٹ بات کرنے والی۔

اس کے بارے میں اس حقیقت سے آگاہی نے اسے پولیس سے پہلے اس تک پہنچایا تھا شاید۔ جبکہ اسے علم تھا کہ زینت کو کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ منصور کو اب یقین ہو چلا تھا کہ یہ لڑکی بالکل بے ضرر ہے اور پھر یہی وہ وقت تھا جب ایک بھاری بھرکم آدمی لابی میں داخل ہوا......

☆☆☆

وہ شخص سیدھا استقبالیہ کی طرف گیا اور دھیمے لہجے میں کلرک سے باتیں کرنے لگا۔ اسے اور اس کا اندازِ گفتگو دیکھ کر منصور چونکے بغیر نہ رہ سکا اور ایک بار پھر اس کے اندر وہی پرانی اور تشکیک بھری کھدبد شروع ہوگئی۔ اس آدمی کی وضع قطع ایسی ہی تھی جسے اپنی شناخت کے لیے کسی سرکاری دستاویز یا کارڈ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

"خفیہ پولیس۔" اس کے اندر کلک ہوا۔ وہ محتاط ہو گیا، نہ صرف اس نووارد سے بلکہ زینت سے بھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی اور اس کی جان خطرے میں نظر آئی، وہ بلادریغ اس جاسوس پولیسے کو زینت سمیت اپنے پسٹل سے ختم کرڈالے گا۔

زینت اسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ شاید منصور کی تنی ہوئی اعصابی کیفیت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ خود بھی تو اپنی اس غیرارادی اضطرابی کیفیت کو چھپا نہ سکا تھا۔

"کیا بات ہے، ایسے کیوں دیکھ رہی ہو میری طرف تم......؟" اس نے بے اختیار زینت سے پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں......" وہ بولی۔ اس کے لہجے میں اپنائیت بھری چاشنی اسے مصنوعی لگی۔ "تمہارے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

منصور کو کچھ تجربہ تو تھا کہ مردوں کی اکثریت خوب

صورت عورت کے اپنایت بھرے لہجے سے بالکل پگھل جاتی ہے اور تب وہ عورت اس مرد کی ناک میں نکیل ڈالے بغیر اسے جہاں چاہے دھکا دے سکتی ہے۔ خواہ وہ دہکتی ہوئی آگ کا تنور ہی کیوں نہ ہو لیکن منصور کا دعویٰ تھا کہ اسے کوئی عورت بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی، خواہ وہ کتنی ہی خوب صورت اور حسین ہو لیکن اس حقیقت کا اظہار اس کے منصوبے کے لیے خطرناک تھا۔

اب اسے اس امر میں ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ زینت اب تک اسے بڑی کامیابی سے بے وقوف بنا رہی تھی اور خود کو بالکل معصوم اور بے ضرر ظاہر کر رہی تھی جبکہ وہ بچھو سے بھی زیادہ زہریلی اور خطرناک تھی، مگر اس کھیل میں اسے اس کا بھرپور ساتھ دینا تھا تا کہ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہو کہ وہ اس کی حقیقت کو پا چکا تھا۔ اسے قتل کرنے کے لیے اب ضروری تھا کہ وہ اسے کسی گوشۂ تنہائی میں لے جائے۔

"تمہارے لیے کچھ اور منگواؤں؟" اس بار بھی اس کے لہجے میں بڑا خلوص تھا۔ بڑی اپنایت تھی اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اُٹھا کر منصور کی آنکھوں میں جھانکا۔ منصور کو دل میں یہ تلخ سا اعتراف کرنا پڑا کہ اگر زینت کی حقیقت اس پر آشکار نہ ہو چکی ہوتی تو وہ لمحہ، وہ انداز اسے بالکل پگھلا کر ہی رکھ دیتا۔

"نہیں شکریہ، مجھے ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔" منصور نے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ زینت اسے باتوں میں لگا کر اس سادہ وردی خفیہ پولیس والے کی طرف سے غافل کرنا چاہ رہی تھی تا کہ وہ بے خبری میں اسے آن دبوچے مگر منصور نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، وہ بدستور دُزدیدہ نظروں سے برابر اس پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔

تاہم اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس موقع پر پولیس والے نے خود کو اس پر ظاہر کیوں کر دیا تھا۔ اگر پولیس نے اسے پھانسنے کے لیے زینت کو چارے کے طور پر استعمال کیا ہی تھا تو انہیں خاموشی سے ہوٹل کے باہر تاریکی میں انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تا کہ جب وہ زینت کو قتل کرنے کے ارادے سے کہیں لے جانے کی کوشش کرے تو وہ گن پوائنٹ پر اسے دبوچ لیں۔

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ حسین گلوکارہ اس منصوبے سے قطعی لاعلم ہو اور وہ پولیس والا اسی کی طرح ہی محض اسے تلاش کرتا ہوا اس ہوٹل میں آ گیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پولیس والا ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر جا رہا ہو اور گھر جانے سے پہلے کچھ کھانے پینے کے لیے محض اتفاقیہ طور پر اسی ہوٹل میں آ گیا ہو۔ منصور کو اس پولیس والے کے سامنے رکھا ہوا گتے کا (ڈسپوزایبل) گلاس نظر آ رہا تھا جسے وہ کبھی کبھار ہونٹوں تک لے جاتا تھا۔ نجانے اس میں چائے تھی، پانی یا کافی؟ اور کیا خبر وہ سرے سے خفیہ پولیس والا ہی نہ ہو، محض انہی کے اسٹاف کا کوئی شخص ہو۔

یوں منصور ایک بار پھر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس پولیس والے یا وہ کوئی بھی تھا، کی وہاں موجودگی کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ محض شک اور بے یقینی کی بنیاد پر وہ زینت کو اب زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کی شناخت اسے پھانسی کے پھندے یا عمر قید تک تو پہنچا سکتی تھی۔ اسے اس نسوانی حسن کے پیکر کو قتل کرنا ہی پڑے گا۔ پھر وہ لکی گرین ہوٹل کے اس بدقسمت کیشئر کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے آخر میں مزاحمت کے نتیجے میں گولی بھی مار دی تھی۔ پتا نہیں وہ مر گیا تھا یا بچ گیا تھا؟ یہ معلوم کرنے کا اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا نہ کوئی ذریعہ، کیونکہ اس بارے میں اس نے کوئی خبر نہ دیکھی تھی اب تک۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہے؟"

منصور نے جیسے اس کی بات سنی ان سنی کر دی، یا دھیان ہی نہ دیا، اس کی نظریں اسی آدمی پر جمی رہیں۔ آخر اس کے اندر آنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے محض کچھ پینے پلانے یا ایسے ہی آ گیا ہو۔ یا پھر اس کی اور زینت کی تلاش میں یہاں آن پہنچا ہو۔ اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"تم ٹھیک ہو؟" زینت دوبارہ اس سے بولی۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں بالکل ٹھیک۔" منصور نے مسکرا کر کہا۔ وہ شاید اس کی یقین دہانی پر مطمئن نہیں ہوئی۔ جھک کر قدرے سرگوشی میں اس سے بولی۔

"اگر تم یہاں بہتر محسوس نہیں کر رہے ہو تو...... میرے فلیٹ میں چلو، میں اکیلی رہتی ہوں، وہاں آرام سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے تم بھی میری طرح اکیلے اور تنہا ہو۔"

اس کی بات سن کر منصور کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اسے ایکا ایکی یوں لگا جیسے کسی ماہر باکسر نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا ہو۔ وہ خود ہی اسے موقع فراہم کر رہی تھی جس کی اسے شدت سے تلاش تھی۔ بے شک اس میں اس لڑکی کی چالاکی کا بھی دخل ہو سکتا تھا، کیونکہ اتنی جلدی اور آسانی سے ایک خوب صورت لڑکی جو پروفیشنل ایک

دوسرے درجے کی ہی سہی گلوکارہ بھی ہو، اتنی جلدی "پھسلوں" نہیں ہو جاتی کہ اسے اپنے فلیٹ پر چلنے کی دعوت دے ڈالے۔ ممکن تھا وہ اسے کسی اور نگاہ سے بھی پسند کرنے لگی ہو۔ بہرحال محتاط رہنا پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔ کیونکہ شکار بھی دونوں تھے اور شکاری بھی...... شکار کون ہونے والا تھا یہ وقت بتاتا اور کیا خبر کوئی بھی شکار نہیں ہوتا۔

یہاں صاف ظاہر تھا کہ وہ منصور کو ڈاکو اور قاتل کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکی، وہ اس کے لیے سراسر اجنبی تھا اور وہ بڑی شدت کے ساتھ زندگی کی لذتوں سے بھرپور طور پر استفادہ کرنے کی قائل تھی یا پھر راہ و رسم کو ایک خاص تعلقِ خاطر والی نہج پر لانے کے لیے بے چین۔

منصور کے لیے اب سوال یہ بچا تھا کہ یہاں وہ سادہ لباس والا خفیہ پولیس اہلکار کیا کر رہا ہے؟ اگر وہ زینت کی کو تلاش یا ٹریس کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے اور اس نے زینت کو پہچان بھی لیا ہے تب بھی وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

جب زینت اسے ڈاکو کی حیثیت سے شناخت ہی نہیں کر سکی تو پورے شہر کی پولیس فورس مل کر بھی میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ منصور کے لیے یہ خیال کچھ حوصلہ افزا تھا، تاہم ایک شک اس کے ذہن میں ضرور سر ابھارنے لگا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ زینت نے اسے ڈاکو اور قاتل کی حیثیت سے شناخت کر لیا اور اس کے باوجود وہ اس قدر نڈر اور بے خوف ہو کر اسے اپنے فلیٹ پر چلنے کی دعوت دے رہی ہو؟ اس کے ذہن طباع نے اس امکان کو فوراً مسترد کر دیا لیکن یہ امکان بہرحال اپنی جگہ موجود تھا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ آسانی سے اس کی تصدیق کر سکتا تھا۔

"کیوں نہیں، مس زینت! اس سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہو سکتی، میرے پاس بائیک ہے، ہم ابھی تمہارے فلیٹ پر چلتے ہیں۔"

منصور کو معلوم تھا کہ اس کے پاس گاڑی ہو گی اور اگر وہ اسے پھانسنے کے چکر میں ہے تو کبھی اس کے ساتھ تنہا اس کی بائیک پر نہیں جائے گی، ایک بار اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھنے کے بعد وہ گویا اپنی زندگی اس کے حوالے کر دے گی، کیونکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ واقعی اس کے ساتھ اس کے فلیٹ تک پہنچ جائے گا۔ وہ راستے میں بھی اسے قتل کر سکتا تھا۔

☆☆☆

رات بہت بیت چلی تھی۔ سڑکوں پر خاصا سناٹا تھا۔ منصور کا دماغ مسلسل منصوبے اور آئندہ کے فوری لائحہ عمل کے تحت تار و پود بننے میں مصروف تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے پسٹل کی زد پر زبردستی کسی ویرانے میں لے جائے اور وہاں اسے قتل کر ڈالے۔

یہاں اگر وہ پولیس والا ان کا تعاقب کرتا تب بھی وہ اس وقت تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا جب تک زینت اس کے ساتھ موجود رہتی۔ یہ تھے وہ امکانات جن کی بنا پر زینت ہرگز ہرگز اس کے ساتھ بائیک میں نہ بیٹھتی اور اپنی گاڑی میں جانے پر اصرار کرتی۔ پھر اسے یہ سوچ کر اپنے اس خیال کی نفی بھی کرنا پڑی کہ بھلا وہ ایک فوروہیل گاڑی چھوڑ کر اس کی سستی سی بائیک پر کیونکر سوار ہوتی؟ تیسرے خیال نے پھر تردید کی کہ وہ اسے چاہنے لگی ہے۔

"گاڑی تو میری بھی موجود ہے اور میرا گھر یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں۔" زینت نے جیسے کسی قدر سرشار لہجے میں کہا۔

منصور نے بھی کچھ سوچ کر پتا پھینکا۔ "لیکن زینت! علیحدہ علیحدہ جانے میں مزہ نہیں آئے گا۔ میں بعد میں تمہیں یہاں چھوڑ دوں گا پھر تم اپنی گاڑی لے جانا۔ میرے پاس بائیک ہے۔"

"اوہ بائیک......!" زینت چہک کر بولی۔ "بائیک کا تو اپنا ہی الگ مزہ ہے، چلو ٹھیک ہے۔ میری کار تو پارکنگ میں کھڑی ہی رہتی ہے، میں کسی اور وقت آ کر لے جاؤں گی یہاں سے، یہ کوئی مسئلہ نہیں، چلیں؟"

منصور کے اندر کئی خیالات، خدشات سمیت کلبلانے لگے مگر اس نے سب پر لعنت بھیجی اور خوشی سے چور اس کے ساتھ ہو لیا۔ زینت کی نگاہوں نے بھی اس کی پریشانی عنقا اور چہرے پر مسرت کے آثار دیکھ کر کہا۔

"اب تم ٹھیک نظر آ رہے ہو، گڈ! دوستی ایسی ہی ہونی چاہیے، شک و شبہے سے پاک۔"

باہر نکلتے وقت پولیس والے نے ان کی طرف سرسری نظروں سے دیکھا، بالکل اسی طرح... جیسے کوئی کسی مسرت بھرے جوڑے کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر نکلتے دیکھا کرتا ہے۔ منصور نے کن انکھیوں سے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا تھا۔

اب اسے اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی لیکن وہ بالکل ہی غافل بھی نہیں تھا۔ بائیک اس کی سیلف اسٹارٹ تھی۔ زینت اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ بائیک اسٹارٹ ہوئی۔ اس کی بائیک میں عقب نما آئینے فٹ تھے۔ لیکن اسے راہ میں اپنے عقب سے کوئی پیچھا کرتا دکھائی نہیں دیا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد وہ بلڈنگ آگئی جس میں فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ مختصر سفر، خیر و عافیت طے پا چکا تھا۔ زینت فلیٹ کا قفل کھولنے لگی تو منصور نے حسبِ عادت چہار اطراف نظریں دوڑائیں۔ سب کچھ ٹھیک پا کر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہونے لگا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی تو وہ بس اس لڑکی کو زندگی کے ہم سفر کے طور پر قبول لے گا۔ ایک پیارا اور خوب صورت ساتھی ہونا چاہیے۔ بہت اکیلے رہ لیا۔

اس منزل میں چھ فلیٹ تھے۔ تین ایک طرف، تین دوسری جانب۔ زینت کا فلیٹ بالکل کونے میں تھا۔ اس نے لاک کھول کر دروازہ وا کر دیا اور بڑی ادا سے اسے دیکھتے ہوئے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

اس کے اندر داخل ہونے کے بعد زینت نے دروازہ مقفل کر دیا۔ منصور فلیٹ کا جائزہ لے رہا تھا جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک نشست گاہ تھی، دو بیڈ رومز۔ ایک طرف کچن لاؤنج تھا۔ خوب صورت سے ڈیوائیڈر رکھا تھا جس میں ایل ای ڈی لگی تھی۔

"تم اندر بیٹھو۔" زینت نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا لباس تبدیل کر کے تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔"

"بس، ہلکا پھلکا ہی لانا، زیادہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کھانا تو لیا ہے۔"

"نہیں، پھر بھی میرے ہاتھوں کی ایک چائے تو ہو جائے۔" وہ مسکرائی۔ منصور نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ چلی گئی۔

اسے کچھ "کھٹک" آمیز انداز کی حیرت ہوئی۔ وہ ڈرائنگ روم کی لائٹ نہیں جلا کے گئی تھی۔ کیوں؟ شاید بھول گئی ہو، اور پھر لائٹ خود جلانا کون سا مشکل فعل تھا۔

اندر آ کر وہ بٹن تلاشنے لگا۔ تب ہی یکلخت اندھیرے سمٹ کر جیسے انسانی شکل اختیار کر گئے۔ دو پولیس والوں نے اس کے دونوں بازو جکڑ لیے، پھر فوراً ہی اسے اپنی پشت پر پستول کی نال چبھتی ہوئی محسوس ہوئی، اس کے بعد کسی نے اندھیرے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، شہباز! اب سوئچ آن کر دو۔"

ڈرائنگ روم کی روشنی جلتے ہی منصور نے خود کو چار پولیس والوں کے نرغے میں دیکھا جو اسے قابو میں اور بے بس دیکھ کر بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے منصور بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا اور کیسے ہو گیا تھا کہ اس قدر محتاط رہنے کے باوجود اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی جامہ تلاشی بھی ہوئی اور کب اسے غیر مسلح بھی کر دیا گیا۔

"ہیلو، مسٹر! اکی گرین ہوٹل کو لوٹنے والے تم تھے۔" ایک پولیس والے نے کہا۔ "اگر اکرم کیشئر مر گیا تو ہمیں بھی ہمیشہ کے لیے تم سے نجات مل جائے گی۔"

تب ہی دوسرا پولیس والا ڈرائنگ روم کے اندر سے زینت کو پکار کے بولا۔ "بے فکر ہو کے اندر آ جاؤ مس زینت! اب یہ مرے ہوئے چوہے سے زیادہ بے ضرر ہے۔"

زینت کو دیکھ کر منصور غصے سے پاگل ہو گیا۔ آخرکار ایک عورت اسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہوٹل سے اُٹھ کر ٹھرکیوں کی طرح اس کے ساتھ کیوں چلا آیا۔ وہاں ہوتا تو زینت سمیت دو چار پولیس والوں کو مار کے ہی نکلتا۔

"میں تمہاری ہمت کو سلام کرتا ہوں مس زینت!" انسپکٹر کی وردی والے نے کہا۔ "تم نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے بغیر مجرم کی شناخت اور اس کا پکڑا جانا ناممکن تھا اور وہ بھی واردات کے چند گھنٹوں کے اندر اندر......"

"آپ کا منصوبہ ناکام نہیں ہو سکتا تھا انسپکٹر جاوید!" زینت نے چہک کر کہا۔ "آپ نے جال ہی ایسا پھیلایا تھا، بس آپ کے آدمی نے آنے میں تاخیر کر دی تھی، یہ بھی اسے دیکھ کر چونکا تھا، مگر میری اداکاری نے اس کا دل لبھا دیا۔ تشویش تھی مجھے کہ جلد بازی میں کہیں یہ کوئی اور خطرناک قدم نہ اُٹھا لے، لیکن جیسی آپ کی پیش گوئی تھی بالکل ویسا ہی ہوا۔"

"بلاشبہ آپ نے بہادری سے کام لیا، مس زینت! کیا آپ کو بالکل بھی خوف نہیں آیا؟" انسپکٹر جاوید جیسے کامیاب ہونے پر حظ اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"بالکل نہیں، بلکہ مجھے تو بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ہر لمحہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ جب میں اس کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھنے پر آسانی سے آمادہ ہو گئی تو یہ بالکل بے ضرر نظر آنے لگا تھا۔"

"ہاں، آپ لوگ جیسے ہی ہوٹل سے نکلے، شبیر نے ہوٹل سے ہمیں فون پر تمہاری روانگی سے مطلع کر دیا اور میں اپنے تین ساتھی سمیت یہاں آ کے گھات لگا کر بیٹھ گیا۔"

کیشئر کی جان بچ گئی تھی، لیکن عادی مجرم منصور کو عدالت نے نو سال قید بامشقت کی سزا سنا دی تھی۔

❖❖❖

آخری قسط

# قاتل مسیحا

طاہر جاوید مغل

بدلتے حالات و اطوار کے موجودہ سنگم پر یہی کہانی کہنے کا وقت ہے... ایسی گھڑیوں میں وہی کہانی کار کہانی لکھ سکتا ہے جس کا کہانی میں گہرا ایمان ہو... یہ ایمان کہ راہِ نجات ہے تو کہانی میں ہے... یہ ایمان آج کا کہانی کار کہاں سے لائے... آج کا زمانہ تو ایمان سے خالی ہے... اس کڑے وقت میں انسانیت گردوپیش سے دور کھڑی ہو کے لوگوں کی قیامت خیز چالوں کو دیکھتی ہے... طاہر جاوید مغل کے قلم سے شادابیاں ہی نہیں تلخیاں بھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتی ہیں... خصوصاً عمران اور تابش یکجا ہوں تو ہوش اڑا دینے والی ہنگامہ خیزیاں رونما ہوتی ہیں کہ رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو جائے...

## طلب و ہوس میں مبتلا ایک وحشی مسیحا کی قاتلانہ جرّاحی

چند ہی سیکنڈ بعد مایا رانی کسی تند بگولے کی طرح ساتھ والے کمرے سے برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ عقب میں اس کی دو ذاتی گارڈز تھیں۔ مایا رانی ہمیں نظر انداز کر کے دندناتی ہوئی سامنے سے گزری اور اس ہال نما پورشن میں پہنچ گئی جسے یہاں طامبورہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے گئے۔ طامبورہ میں پہنچتے ہی اس نے چبوترے کے سامنے ایک گھڑیال پر ضرب لگائی اور آتشیں آواز میں چیخی۔ ”ڈولما......ڈولما......“ مایا رانی کی آواز دور تک گونجی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک جانب سے بہت سے قدموں کی چاپ ابھری۔ سردار محافظ ڈولما لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہال نما جگہ پر پہنچ گئی۔

گھڑیال کی آواز سن کر کچھ اور مرد و زن طامبورہ کی طرف کھنچے آئے تھے پھر ان میں مجھے کوتاہ قامت جادو رائے اور مائرہ کی صورتیں نظر آئیں۔ یقیناً شور و غل کی آوازیں انہیں یہاں تک کھینچ لائی تھیں۔

مایا رانی نے جادو رائے اور میم مائرہ کی جانب دیکھا۔ اُس کا دہکا ہوا سرخ و سپید چہرہ کچھ اور دہک گیا۔

”مایا رانی کیا ہوا ہے؟“ میم مائرہ نے بھولے بھالے انداز میں پوچھا۔ یقیناً ابھی تک اسے اور رائے کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ گندھارا ان کے جس بیجا سے چھوٹ کر مایا رانی تک پہنچ چکی ہے اور سارا بھید کھول چکی ہے۔

مایارانی نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ ”تم دونوں کو نہیں تو اور کسے معلوم ہوگا کہ کیا ہوا ہے؟“

مایا کا معنی خیز انداز دیکھ کر جادو رامے اور مائرہ ایک ساتھ چونکے۔ مائرہ کا رنگ کچھ پھیکا پڑا۔ ڈولما کی کچھ اور مسلح ساتھی بھی طامبورہ میں داخل ہو چکی تھیں۔ مایارانی نے کڑک کر ڈولما کو حکم دیا۔ ”گرفتار کرلو ان دونوں کو اور ان کے ساتھیوں کو بھی۔“ مایا رانی کا اشارہ رامے اور میم مائرہ کی طرف تھا۔

ڈولما ساکت کھڑی رہی۔ اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

یکایک مایارانی کے عقب سے لمبی تڑنگی مرد نما نہال برآمد ہوئی اور اس نے ایک آٹومیٹک رائفل بڑی مہارت سے مایارانی کے سر سے لگا دی، اس کے ساتھ ہی اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ مایارانی اور بوشال ماتا (والدہ) کے چہرے حیرت کی تصویر بنے نظر آئے۔

بوشال ماتا، ڈولما سے مخاطب ہو کر گرجی۔ غالباً اس نے یہی پوچھا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ڈولما اپنا پستول نکال چکی تھی لیکن پھر بھی اطمینان سے کھڑی تھی۔ اس کے چوڑے چوکور چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ دفعتاً مایارانی کی ذاتی محافظوں میں سے ایک نے لمبی تڑنگی نہال پر حملہ کرنا چاہا۔ ڈولما نے فائر کیا۔ گولی سیدھی حملہ کرنے والی کے سر میں لگی، وہ لڑھک کر چبوترے سے گری۔ گولی کے دھاکے کے بعد طامبورہ میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔

اس سکوت میں جادو رامے نے مایارانی کی والدہ بوشال ماتا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بوڑھی گھوڑی، تیرا اور تیری بیٹی کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ایک اشارے پر تیری ہی محافظ عورتیں تیری تکا بوٹی کر سکتی ہیں۔“

میں نے دیکھا، ڈولما اور اس کے عقب میں کھڑی کئی درجن عورتیں باغی نگاہوں سے مایارانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے وہ کلہاڑیوں، کٹاروں اور برچھیوں سے مسلح ہوتی تھیں مگر آج ان میں سے کئی ایک کے پاس آتشیں ہتھیار بھی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ آتشیں ہتھیار رامے اور میم مائرہ کے ہی مہیا کردہ تھے۔

یکایک بجلی سی کوندگئی۔ مایارانی نے تڑپ کر وار کیا۔ اس کے عقب میں کھڑی لمبی تڑنگی نہال اس کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی چبوترے سے نیچے جا گری۔ اس کے ساتھ ہی مایارانی نے اپنے زرد لبادے کے اندر سے پستول نکال لیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں چلائی اور جیسے ہوا میں اُڑتی ہوئی جادو رامے کی طرف گئی۔ لگتا یہی تھا کہ وہ اسے دبوچ کر اس کے سر پر پستول رکھ دینا چاہتی ہے مگر آدھے راستے میں ہی ڈولما اس سے جا ٹکرائی۔

دونوں اوپر نیچے گریں۔ مایارانی نے گرتے گرتے جادو رامے پر سیدھا فائر کیا۔ مایارانی کے پاس وہی طلائی پستول تھا جو چند روز پہلے رامے اور مائرہ نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ پستول سے گولی کا شعلہ نکلا مگر حیرت انگیز طور پر اس فائر نے رامے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ بظاہر یہی لگا کہ نشانہ خطا ہوا ہے۔ فائرنگ کے دھماکوں سے طامبورہ کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ایک دیوار کے عقب میں کھڑی دو گارڈز نے ڈولما اور اس کے ساتھیوں پر فائر کیے تھے۔ یہ دو گارڈز یقیناً مایارانی کے ذاتی دستے کی تھیں مگر دو تین درجن کے مقابلے میں دو کی کیا پیش چل سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں آناً فاناً ماری گئیں۔ مایارانی کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ طامبورہ کے داخلی دروازے بند کر دیے گئے اور یہی وقت تھا جب اس مختصر جھڑپ کے اصل نقصان کا پتا چلا۔

عمران نے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھیں جی کیا ہوا ہے؟“

میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ایک مقامی عورت اوندھی پڑی نظر آئی۔ اس کا خون فرش پر گلکاری کر رہا تھا...... اور یہ کوئی اور نہیں، مایارانی کی والدہ بوشال ماتا تھی۔

یہی وقت تھا جب مایارانی کی نگاہ بھی اپنی والدہ پر پڑ گئی۔ وہ غیظ و غضب سے دیوانی سی ہو گئی۔ اس کی دہاڑوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ڈولما سمیت درجنوں گارڈز نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ جلد ہی مایا کو کھینچ گھسیٹ کر موقع سے ہٹا دیا گیا۔ جادو رامے اور مائرہ چبوترے پر چڑھ گئے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہاں کی مذہبی پیشوا دیوی تورما بھی ان دونوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر ویسی ہی خباثت تھی جو کچھ دیر پہلے ڈولما کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

عمران نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے کہ رامے اور مائرہ نے یہاں کی جس اہم شخصیت کو سب سے پہلے شیشے میں اتارا ہے، وہ یہی کبڑی خالہ ہے۔ اس کی عمر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں راجا داہر کے دربار میں بھی یہی جنتر منتر پڑھتی ہو گی۔“

منوہر سے یہ پتا چلا کہ آج کی خونی جھڑپ میں مرنے والوں میں مایارانی کا ایک باکر بھی شامل ہے۔ دو تین گھنٹوں کے اندر ہی پوری طرح کایا پلٹ گئی تھی۔ سب کو قید کر دیا گیا تھا۔ میں، عمران، منوہر سنگھ اور ہمارے دیگر ساتھی، اپنی گھروندا نما قیام گاہوں پر ہی موجود تھے۔ ہمیں سختی سے ہدایت تھی کہ فی الحال باہر نہ نکلیں۔ رات دس بجے کے لگ بھگ سردار محافظ ڈولما نئے طمطراق کے ساتھ ہمارے پاس آئی۔ اس نے

بتایا کہ جادو رامے صاحب نے ہم سب کو خصوصی رہائشی پورشن میں بلایا ہے۔

پانچ منٹ بعد ہم پھر اسی جگہ پر تھے جہاں سہ پہر کے وقت مایا رانی سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ بے شک اب وہ سابق رانی تھی، اس کی والدہ اور قریبی جانباز ساتھی مارے گئے تھے اور یقیناً وہ دل خراش صدمے سے گزر رہی تھی۔

سجے سجائے کمرے میں ایک آرام دہ کرسی پر جادو رامے بڑے ٹھسے سے بیٹھا تھا۔ اس کی دائیں جانب میم مائرہ تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ سنہری مائل سرخ بال ایک لیمپ کی رنگین روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ ان دونوں کے عقب میں وہ مسلح گارڈز موجود تھے جو ہمارے ساتھ ہی یہاں اس انوکھی بستی میں پہنچے تھے۔ وہ سب آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

ہمارے پہنچتے ہی جادو رامے نے تخلیے کا حکم دیا۔ ڈولما سمیت سب لوگ باہر نکل گئے۔ میم مائرہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''رامے جی کو یونہی تو جادو رامے نہیں کہا جاتا۔ جیت اور کامیابی ان کی عادت بن چکی ہے۔ جہاں جاتے ہیں، اپنا جھنڈا گاڑ دیتے ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' میں نے تائید کی۔

عمران، منوہر، جہانے اور بہروز وغیرہ بھی میری بات سے اتفاق کرتے دکھائی دیے۔ حشام سب سے آخر میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ کڑی آزمائش والے سنسنی خیز واقعے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ کسی سے آنکھ تک نہیں ملاتا تھا۔

''یہ کرشمہ کس طرح رونما ہوا رامے صاحب؟'' عمران نے خوشامدی لہجے میں پوچھا۔

''یہ سب کچھ میری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا ہے۔ حربہ وہی پرانا تھا۔ ان میں سے ایک دو لالچ کے پتلے چنے گئے اور انہیں اپنے ڈھب پر لایا گیا۔ یہاں آتشیں ہتھیار کی بے حد قدر و قیمت ہے۔ ہم نے انہیں ہتھیاروں اور دیگر چھوٹے موٹے تحائف سے خرید لیا۔''

میں نے رامے سے مؤدب انداز میں پوچھا۔ ''کیا ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جو ہتھیار دیے گئے ہیں، وہ اصلی ہیں؟''

مائرہ بلند آواز میں ہنسی۔ ''میں تمہارے سوال کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ مایا رانی اور سورگ باشی بوشال ماتا کے پسٹلو میں اصل گولیاں نہیں تھیں لیکن جو ہتھیار ہم نے یہاں اپنے وفاداروں کو گفٹ کیے ہیں، وہ اصلی گولیوں کے ساتھ ہیں۔''

''کیا محترمہ مکرمہ دیوی تورما بھی ہمارے ساتھ ہیں؟'' عمران نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

''بے شک۔'' جادو رامے کے بجائے میم مائرہ نے جواب دیا۔ ''ہمیں یہاں جو کامیابی ملی ہے، اس میں بزرگ رہنما دیوی تورما کا بہت کردار ہے۔ وہ بہت سخت ہے۔ اُسے شیشے میں اتارنا آسان نہیں تھا۔ تاہم چند دن پہلے یہاں جو کچھ ہوا تھا، اس سے ہمیں بہت مدد ملی۔

میم مائرہ نے دو لمحے توقف کر کے اپنے سنہری مائل سرخ بالوں کو بڑی ادا سے سنوارا اور بولی۔ ''دراصل شروع میں مایا رانی نے اپنے چہیتے شوہر کو بھگانے والی ہریتی کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا تھا، اس کا ہمیں فائدہ پہنچا۔ موت کی سزا پانے والی ہریتی اس دیوی تورما سے پڑپوتی کا رشتہ رکھتی تھی......''

یہ ساری گفتگو چونکہ اردو میں ہو رہی تھی لہٰذا اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ مقامی سن لیں گے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں کا ''اقتدار'' حاصل کرنے کے بعد جادو رامے اپنی دستِ راست مائرہ کے ساتھ مل کر کوئی پریس کانفرنس کر رہا ہے اور ہم اخبار نویسوں کی حیثیت سے سوالات کر رہے ہیں۔

ہما عروج نے رامے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''رامے جی! اس بندی کی ایک الجھن بھی تو دور کریں۔ اس سارے کھڑاگ کی لوڑ پڑی کیوں ہے؟ میم مائرہ نے تو کہا تھا کہ ان لوگوں سے معاملہ شاملہ طے ہو رہا ہے۔ ویکسین واسطے جو شے ہمیں چاہیے، وہ مل جائے گی۔''

''وہ نہیں ملی نا......'' مائرہ نے جواب دیا۔ ''یہ لوگ اڑ گئے تھے۔ اس بات سے ہی انکار کر رہے تھے کہ وہ کیڑا (زوب) یہاں موجود ہے۔ حالانکہ وہ موجود ہے اور اس کے ثبوت بھی ہمیں مل چکے ہیں۔''

''تو کیا اب اسے تلاش کر لیا جائے گا؟'' ہما نے پوچھا۔

''تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دیوی تورما اب ہمارے ساتھ ہے۔ اور وہ سب جانتی ہے۔ تحفے تحائف کی چمک سے اسے دھرم شرم سب بھول گیا ہے۔'' مائرہ نے وضاحت کی۔

''بلکہ ابھی تم سب لوگ اپنی آنکھوں سے اس پاؤں والے سانپ کو دیکھو گے جسے یہ زوب کہتے ہیں اور کستوری کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔'' جادو رامے نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں تبصرہ کیا۔

مائرہ نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اِن فیکٹ...... ان میں سے کچھ لوگوں کے دماغ میں یہ خناس گھسا ہوا ہے کہ زوب کی یہاں موجودگی ان کے لیے بابرکت ہے۔ وہ بچے کھچے جانوروں کی نسل ختم ہونے سے بچانا چاہتے ہیں، انہیں پال پوس رہے ہیں۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں کبڑی تورما اندر داخل ہوئی۔ اس کے عمر رسیدہ چہرے پر خباثت بھری چمک تھی۔ وہ صرف مقامی زبان بول سکتی تھی۔ منوہر سنگھ کی وساطت سے اس نے بڑی محبت کے ساتھ رائے کو مخاطب کیا اور بولی۔ ”آؤ میرے شہزادے! میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تمہاری من پسند چیز دکھاؤں۔“

من پسند چیز سے اس کی مراد یقیناً وہ زوب نامی کیڑا ہی تھا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”اللہ کی شان ہے یہ، رائے جیسے مکروہ کو شہزادہ کہہ رہی ہے۔ یہ اس لفظ ”شہزادے“ کی تاریخی توہین ہے۔ اگر کوئی سچ مچ کا شہزادہ یہاں ہوتا تو یقیناً خودکشی کر لیتا۔“

”یہ نیک کام تم بھی تو کر سکتے ہو۔ تم خود ہی تو کہتے ہو کہ مہوش حیات تمہیں شہزادہ کہہ کر بلاتی ہے۔“

”کہنے میں اور واقعی سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے چاچو جان۔“

جادو رائے اور مائرہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم بھی اٹھ گئے۔ میں نے پیچھے کھڑے حسام کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ ”کیا بات ہے حسام؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میری...... طبیعت کچھ خراب ہے۔ اگر میم مائرہ اجازت دیں تو میں آرام کرنا چاہوں گا۔“ وہ بولا۔

میں اس کی ذہنی حالت سمجھ رہا تھا بلکہ سارے ہی سمجھ رہے تھے۔ مائرہ نے اسے رکنے کی اجازت دے دی۔ ہم آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بوڑھی دیوی تورما اپنی چمکیلی لاٹھی ٹیکتی ہمارے آگے آگے چل دی۔ ہم سنگلاخ برف کی ایک طویل سرنگ سے گزرے۔ راستے میں ڈولما اور دیگر مسلح گارڈز بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم ایک ایسے مقام سے گزرے جہاں یہ سرنگ (یعنی غار کی شاخ) بے حد تنگ تھی۔ بمشکل ایک فرد پھنس کر گزر سکتا تھا۔

ہم سب باری باری اس تنگ راستے سے گزر ہی گئے۔ ہمارا تجسس بتدریج بڑھ رہا تھا۔ ہم زندہ زوب کو دیکھنے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ جلد ہی لیمپس کی روشنی میں ہمیں کچھ پنجرے نظر آئے۔ سلاخوں کے علاوہ ان پر باریک جالی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہاں ہلکی سی حیوانی بُو محسوس ہوتی تھی۔ خوفناک صورتوں والی دو پہرے دار عورتیں برچھیاں تھامے ساکت کھڑی تھیں۔ ہمیں ”چیں چیں“ کی مہین آوازیں سنائی دیں جیسے کہیں بہت سے چوہے ایک جگہ جمع ہوں۔ ہم چند قدم آگے بڑھے تو انہیں دیکھ بھی لیا۔ وہ درجنوں کی تعداد میں واقعی بہت چھوٹے چھوٹے برفانی چوہے تھے اور ایک پنجرے میں بند تھے۔ سفید رنگ کے ان چھوٹے چوہوں کو دیکھ کر منوہر سنگھ نے سرگوشی کی۔ ”میرا وچار ہے کہ یہ چوہے، زوب کے بھوجن کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔“

ہم محسوس کر رہے تھے کہ اس ساری جگہ کو مصنوعی طریقے سے گرم رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے اور پھر چند قدم آگے ہمیں وہ نایاب جانور بھی نظر آ گیا جس کے لیے جادو رائے اور مائرہ سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے اس برفستان میں پہنچے تھے۔

سرنگ کے ایک بڑے حصے کو آہنی سلاخیں اور جالیاں لگا کر بند کیا گیا تھا۔ اس حصے کے تین پورشن بنائے گئے تھے۔ تینوں میں چالیس کے قریب وہ سانپ نما کیڑے موجود تھے جو زوب کہلاتے تھے۔ ہم دیکھتے رہ گئے۔ ان کی رنگت کو ”آف وائٹ“ کہا جا سکتا تھا۔ شکل وصورت بالکل سانپ جیسی تھی مگر ان کے قریباً ڈیڑھ درجن پاؤں انہیں سانپ سے مختلف کرتے تھے۔

ہم سب سنسنی کی ایک لہر محسوس کر رہے تھے۔ جادو رائے اور مائرہ کے چہرے جوش سے تمتمانے لگے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ڈولما اور دیگر محافظ عورتوں نے خود کو ان پنجروں کے سامنے تعظیم کے انداز میں جھکایا تھا۔

کبڑی تورما اور رائے وغیرہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ منوہر سنگھ ان کے لیے مترجم کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس سے پہلے یہ فرض گندھارا ادا کرتی تھی مگر موجودہ ”کایا پلٹ“ کے بعد بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی زیرِعتاب آ گئی تھی اور فی الحال معلوم نہیں تھا کہ کہاں ہے۔

☆☆☆

زوب کی دید کے بعد ہم اپنی نئی پُرآسائش رہائش گاہ پر واپس پہنچ گئے۔ منوہر سنگھ نے ہمیں بتایا۔ ”یہ کبڑی بڑھیا، اس عمر میں بھی لالچ اور حرص کی پُڑیا ہے۔ کہنے کو تو یہ یہاں کی مذہبی پیشوا ہے لیکن ان لوگوں میں سے ہے جو دھن کے لیے دھرم کو بیچتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ یہاں پر اس ”مقدس“ زوب کی رکھوالی تھی مگر اب وہ اس ”پوتر“ کیڑے کو رائے اور مائرہ کے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ بس ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے اُس نے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”جو زوب ابھی بچے ہیں، ان کے بس پانچ جوڑے ان کے پاس رہیں گے، باقی سب رائے اور مائرہ یہاں سے پاکستان لے جائیں گے۔“

میں نے منوہر سے مایارانی کے بارے میں پوچھا، اس نے بتایا۔ ”جو کچھ میں سن رہا ہوں، اس کے مطابق وہ زندہ ہے لیکن حراست میں ہے۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ پتا نہیں کیا ہوگا

ہمارے یہاں سے جانے کے بعد ایک طرح یہاں کی کرتا دھرتا دیوی تورما ہی ہوگی۔ وہی اس بارے میں فیصلہ کرے گی...... ہو سکتا ہے کہ ڈولما کے مشورے کے ساتھ دیوی اپنے پریوار میں سے ہی کسی کو رانی بنادے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، ہم کب تک یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟" عمران نے استفسار کیا۔

"کہتے ہیں کہ برف باری کا نیا سلسلہ شروع ہورہا ہے۔ فوری طور پر تو ہم یہاں سے نکل نہیں سکیں گے، آگے کی واہگرو جانے۔"

ابھی تک ہم ماہین کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ میں اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں نے گونگے جہاناں کو بلایا اور اشارے کنایئے میں اس سے کہا کہ وہ میم مائرہ تک میرا پیغام پہنچائے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

ابھی میں جہاناں کو سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک مقامی ملازم تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کچھ کہا۔ منوہر نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ "آپ کا ساتھی حشام ٹھیک نہیں ہے۔"

ہم تینوں تیزی سے حشام کے کمرے میں پہنچے۔ وہ بستر پر اوندھا پڑا قے کر رہا تھا، پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

"حشام...... کیا ہوا؟" میں نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی، وہ پلٹ گیا اور پھر اپنا معدہ خالی کرنے لگا۔

"شاید کوئی زہریلی شے کھائی ہے اس نے۔" عمران پریشان ہوکر بولا۔

"یہ دیکھیں جی، یہ کیا پڑا ہے۔" منوہر نے ایک تپائی کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں سفید کاغذ پر کوئی نیلگوں شے دھری تھی۔ یہ نیلا تھوتھا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

جہاناں بھاگتا ہوا گیا اور میم مائرہ کو بلا لایا۔ میم مائرہ باقاعدہ طور پر ڈاکٹر تو نہیں تھی لیکن میڈیکیشن کے بارے میں شاید ڈاکٹرز سے زیادہ جانتی تھی، اس نے حشام کا معائنہ کیا اور تسلی دی۔ "اصولی طور پر معدہ واش ہونا چاہیے لیکن شاید دواؤں سے بھی کام چل جائے گا۔" اس نے کہا۔

میم مائرہ کی ہدایت پر اس کے ایک ساتھی نے حشام کے مسل میں دو انجکشن لگائے اور کچھ منہ میں بھی ٹپکایا۔

قریباً آدھ گھنٹے میں حشام کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ لگتا تھا اس نے نیلے تھوتھے کی زیادہ مقدار نہیں نگلی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑانے لگا۔ "میں اس قابل نہیں ہوں، مجھے مر جانا چاہیے...... میں تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا...... بس مجھے معاف کردو...... اگر کر سکتی ہو تو......" وہ بڑبڑاتا جارہا تھا۔

عمران نے مجھے ایک طرف لے جاکر سرگوشی میں کہا۔ "یقیناً اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔ شاید ماہین سے ملنا بھی چاہ رہا ہے۔ کیا ہم ماہین کو یہاں بلا سکتے ہیں......؟"

"تم واقعی اتنے بے وقوف ہو یا جان بوجھ کر بننے کی کوشش کرتے ہو؟"

"کیا مطلب جی؟"

"بس چپ رہو۔" میں نے جل کر کہا۔ "یہ آدھی حقیقت ہے لیکن آدھا ڈراما ہے۔ اب تک ہمیں حشام کی فطرت کو سمجھ جانا چاہیے اور اب تو اس بات کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی بھی اس کے بارے میں کوئی خوش فہمی رکھے۔"

کم و بیش ایک گھنٹے میں حشام کی طبیعت کچھ اور سنبھل گئی۔ حقیقی بات یہی تھی کہ اب میرے دل میں اس کے لیے کہیں کوئی چھوٹا سا نرم گوشہ بھی موجود نہیں رہا تھا۔ ماہین کے حوالے سے گردشِ دوراں نے اسے اور عمران کو ایک سخت ترین آزمائش سے دوچار کیا تھا اور اس آزمائش میں حشام واضح طور پر ناکام ہوا تھا۔ قدموں کی چاپ ابھری اور منوہر سنگھ نے آکر بتایا کہ میم مائرہ نے میری درخواست قبول کی ہے اور ہم ماہین سے مل سکتے ہیں۔

کئی دنوں بعد آخر یہ موقع مل ہی گیا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ عمران بھی میرے ساتھ جانے کے لیے اٹھ رہا ہے مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

"آؤ نا تم بھی؟" میں نے کہا۔

اس نے گہری سانس لی۔ "نہیں جی...... فی الحال نہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ابھی نہیں جائے گا۔ میں باہر نکلا۔ اس پُرآسائش حصے میں بھی سردی کچھ بڑھ گئی تھی۔ غار کے اس اندرونی حصے میں کئی تبدیلیاں نظر آرہی تھیں۔ فی میل اور میل محافظوں اور ملازموں کے بہت سے شناسا چہرے اوجھل ہوچکے تھے اب ان کی جگہ نئے چہرے نظر آرہے تھے۔ یقیناً جادو رامے نے دیوی تورما اور ڈولما کے ذریعے غلبہ حاصل کرنے کے بعد کافی تبدیلیاں کی تھیں۔ جو نئے فی میل اور میل محافظ تھے، ان میں سے اکثر کے پاس رائفلیں اور پستول وغیرہ نظر آتے تھے۔ یہ وہی اسلحہ تھا جو جادو رامے اپنے سامان کے ساتھ یہاں لایا تھا۔ غالباً اسے پہلے سے معلوم تھا کہ اسے تحفے تحائف کے طور پر آتشیں ہتھیاروں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ ایک جگہ مجھے رامے اور مائرہ کا انچارج گارڈ بہروز نظر آیا۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے کندھے سے جدید ساخت کی کلاشنکوف جھول رہی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے مقامی

افراد اسے تعظیم اور خوف کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ملازم کے عقب میں چلتا ہوا میں ماہین کے کمرے میں پہنچا۔ داخلی دروازے پر قالین کا بھاری پردہ تھا۔ وہ سموری لباس میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوگئی اور جیسے سسک کر گلے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

”انکل تابی! آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور تمہیں چاروں خانے فٹ دیکھ کر مزید ٹھیک ہوگیا ہوں۔“ میں مسکرایا۔ میرے انداز نے اسے حوصلہ دیا۔ اس کے اشارے پر ایک ملازمہ گئی اور دو پیالوں میں بھاپ دیتا ہوا سوپ لے آئی۔ یہ مچھلی کا سوپ تھا، اس میں گندم بھی تھی۔ اناج کو یہاں بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا۔

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”مایا رانی کے ساتھ بہت بُرا ہوا ہے۔ اس کی والدہ کو مار دیا گیا ہے، وہ خود قید میں ہے۔ کہیں جادو رامے مایا کو بھی تو......؟“

”نہیں...... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اب بھی یہاں بہت سے لوگ مایا کے حمایتی ہوں گے۔ رامے اور میم مائرہ یہاں کسی طرح کا فساد نہیں چاہیں گے۔ انہوں نے اپنا مقصد تقریباً حاصل کر لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ برف باری کے رکتے ساتھ ہی ہم یہاں سے چلے جائیں۔“

”لائف میں پہلی بار مجھے ڈر لگ رہا ہے انکل تابی، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کوئی مزید خون خرابا ہو جائے؟“

”نہیں اب کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”رامے ہماری توقع سے زیادہ عیار شخص ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ساری ڈوریاں اپنے ہاتھ میں کر لی ہیں۔ دیوی تورما اور ڈولما اس کے اشاروں پر چل رہی ہیں اور سب کچھ ان کے کنٹرول میں ہے۔“

”رامے کی اسی عیاری اور بے رحمی سے تو ڈر لگتا ہے جی۔ یہ معاف کرنے والا شخص نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب رامے اور میم مائرہ نے یہاں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں کیا، جھڑپ ہوئی تھی۔ اس جھڑپ میں مایا رانی نے رامے کو شوٹ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن پستول چلا نہیں۔“

”پستول تو چلا تھا ماہین مگر اس کی گولی اصلی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے، تم ڈر رہی ہو کہ رامے، مایا سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گا؟“

”یہ صرف میرا خوف نہیں ہے انکل مم...... میں نے اپنی آنکھوں سے بھی کچھ دیکھا تھا۔“

ماہین تفصیل بتاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ بہرحال ڈھکے چھپے انداز میں اس نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ کنٹرول حاصل کرنے والی شب رامے اس بندی خانے میں پہنچا تھا جہاں مایا رانی کو بند کیا گیا ہے۔ یہ بندی خانہ جو ایک بڑے بیرک کی شکل میں تھا، یہاں پاس ہی واقع تھا۔ رامے نے طیش کے عالم میں مایا کو بُری طرح نوچا کھسوٹا تھا اور تھپڑ مارے تھے پھر گندی گالیاں بکتا ہوا چلا گیا تھا۔

ماہین بولی۔ ”آج کل وہ ہمیشہ سے زیادہ غصے میں اور جھنجلایا ہوا ہے۔ اس کی ”وائف“ ایلی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ جو خاص قسم کا سری لنکن پان کھاتا تھا، اس کا اسٹاک اب ختم ہو چکا ہے۔ وہ نشہ بھی یہاں دستیاب نہیں جو وہ اس پان میں استعمال کرتا تھا۔ اب وہ بن پانی کی مچھلی بنا ہوا ہے۔ انکل تابی، وہ بالکل جنونی، سائیکو بندہ ہے۔ مجھے کبھی رات کو میں اس کے کمرے سے گرجنے برسنے کی آوازیں سنتی ہوں مگر ان آوازوں کے دوران میں ہی وہ کسی وقت گنگنانے بھی لگتا ہے۔ اس کی آواز اچھی ہے لیکن جو گنگناتا ہے، وہ کوئی پکے راگ قسم کی چیز ہوتی ہے...... لگتا ہے کہ اس شخص کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں۔“

”ماہین! کیا تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ مایا رانی سے بدسلوکی کرے گا؟“

”خود شاید نہ بھی کرے مگر اس نے اپنا جو گماشتہ مایا رانی پر نگران مقرر کیا ہوا ہے، اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”وہی بہروز۔ ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے اور مایا رانی کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے۔“

میں حیران ہو رہا تھا۔ ہمیں گفتگو کرتے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی مگر ماہین نے ایک بار بھی اس دل دہلا دینے والے واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ماہین! تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا، دو روز پہلے بدھ کے دن یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ مایا رانی نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق عمران اور حسام کی پرکھ کے لیے جو وحشیانہ طریقہ اختیار کیا، میں اس کی حمایت تو نہیں کر سکتا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا بہرحال وقوع پذیر ہوا...... اور اس کا نتیجہ بھی ہم نے دیکھا......“

میری بات سن کر ماہین کا خوب صورت چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایک عجیب سا گریز اس کی آنکھوں میں نمودار ہوا اور اس نے منہ پھیر لیا۔

اس کے گریز کے باوجود میں نے بات جاری رکھی۔ ”ماہین! اس واقعے کے بعد سے حسام بہت گم صم تھا۔ کل اس نے چند ملی گرام نیلا تھوتھا کھا لیا۔ طبیعت کافی خراب رہی لیکن اب کچھ سنبھل گیا ہے...... شاید...... تم سے ملنا بھی چاہتا ہے۔“ میں

جان بوجھ کر ماہین کو ٹٹول رہا تھا۔

ماہین نے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر جھکا کر چہرہ چھپا لیا۔ وہ بہت مضبوط لڑکی تھی اور چند روز پہلے وہ اپنی مضبوطی اور دلیری ثابت بھی کر چکی تھی، تاہم موجودہ لمحوں میں کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ وہ ایک دم سسک پڑی۔ بے قراری سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ چہرہ چھپائے چھپائے بولی۔ ”پلیز انکل! میں اس بارے میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی...... میں ان دونوں میں سے...... کسی کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی......اور......حشام کی تو بالکل بھی نہیں......بالکل بھی نہیں۔“

وہ روتے روتے میرے بازو سے لگ گئی۔ میں نے اس کا سر تھپکا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً باہر زوروں کی برف باری ہو رہی تھی۔ ثبوت یہ تھا کہ اس اندرونی حصے میں بھی سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ دور غار کے کسی حصے سے پالتو بھیڑیوں کی مدھم ہاؤلنگ سنائی دے رہی تھی۔

یکا یک قدموں کی چاپ سنائی دی اور میم مائرہ بھاری پردہ اٹھاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ ماہین میرے بازو سے علیحدہ ہوئی اور جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

”یہ رونے شونے کس لیے ہیں؟“ وہ ماہین کو دیکھ کر ذرا تیکھے لہجے میں بولی پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کہیں اپنی پیاری فرینڈ مایا کے لیے تو یہ موتی نہیں لٹائے جا رہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔“

وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ماہین واقعی مایا کے لیے ازحد پریشان تھی۔ میم مائرہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ڈپٹو جی! اگر کوئی ایسی بات ہے تو اس کو سمجھاؤ۔ اس کی ہمدردیاں ان وحشیوں کے بجائے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ ان کے طور طریقے ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ بڑے سفاک لوگ ہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ہم پہل نہ کرتے تو یہ لوگ ہم پر چڑھ دوڑتے۔ یہ سیکڑوں ہیں، ہماری تکا بوٹی ہو جاتی۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو میم مائرہ، یہ کسی اور بات پر پریشان ہے۔ اپنے گھر سے مسلسل دوری اسے پریشان کر رہی ہے۔“

”اگر واقعی ایسا ہے تو اچھی بات ہے۔ رائے صاحب کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اب یہ اس جنگلی مایا کے لیے کسی طرح کی ہمدردی رکھتی ہے۔“ میم مائرہ، اشک بار ماہین کو تیز تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

ملازمہ مزید گرم سوپ لے آئی تھی۔ ہم پھر دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ماہین جاننا چاہتی تھی کہ ہم کب تک اس برف کے دوزخ سے نکل پائیں گے۔ وہ واقعی بے حد پریشان تھی۔

بے شک وہ پریکٹیکل لڑکی تھی اور اپنے یوٹیوب چینل کے حوالے سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیر و سیاحت بھی کرتی رہتی تھی، مگر جس طرح وہ کئی ہفتوں سے اوجھل تھی، یقینی بات تھی کہ اس کے اہلِ خانہ اور فیملی میں بہت بے چینی پائی جا رہی ہوگی۔

ماہین نے دوبارہ حشام یا عمران کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی میں نے یہ ذکر چھیڑا...... تاہم جب میں اٹھ کر جانے لگا اور دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے آواز دے کر مجھے روکا، میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے گال کا ڈمپل گیس لیمپ کی روشنی میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ”عمران...... کے......سر کی چوٹ کا اب کیا حال ہے......؟“

”کافی زیادہ چوٹ تھی...... مرہم پٹی ہوتی رہی ہے...... اب ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا، پھر چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ”تم نے عین وقت پر جس طرح پہنچ کر اس کی مدد کی، وہ تمہارا بہت شکر گزار ہے۔“

وہ خاموش رہی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی بڑی بڑی، سیاہ آنکھوں میں نمی سی چمکی ہے۔ جیسے کچھ پگھل رہا تھا اس کے اندر۔

میں اپنے رہائشی کمرے میں واپس پہنچا تو عمران بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ماہین کی خیر خیریت دریافت کی...... پھر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ ماہین نے اور کیا بات کی۔ میں نے فی الحال خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ بس اتنا کہا۔ ”وہ تمہارے سر کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھی۔ پوچھ رہی تھی۔“

☆☆☆

سردی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ تاہم معلوم ہوا تھا کہ باہر کچھ زیادہ برف باری بھی نہیں ہو رہی۔ ٹمپریچر کا اس طرح گرنا غیر معمولی تھا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا، تیز ہوا کی وجہ سے سردی بڑھی ہوئی تھی۔ دائیں طرف لکڑی کا ایک بڑا سا سائبان تھا جس کے نیچے سے برفیلی ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی تھی۔ یہاں کئی برف پر پھسلنے والی گاڑیاں، کتوں سمیت کھڑی رہتی تھیں۔ ان گاڑیوں کو اسکیمو بائل بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے تین چار رکھوالے بھی یہاں نظر آتے تھے۔ یہاں کی معالجہ گندھارا کا شوہر بھی ان رکھوالوں میں سے ایک تھا۔ ہوا کی کاٹ تیز تھی۔ میں غار میں واپس آ گیا۔ صبح سے ہی طامبورہ کی طرف سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عمران دیکھ کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ لکڑی کے خاص قسم کے بکس تیار کیے جا رہے ہیں، یہ بکس یہاں سے زوب کو لے جانے کے لیے ہیں۔ اب دوپہر ہونے والی

تھی۔ میں ابھی ابھی اپنی روزمرہ کی جاں گسل ورزش سے فارغ ہوا تھا اور اب لیٹا ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں عمران، ہما عروج کی فرمائش پر اسے لپ ریڈنگ سکھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

اسی دوران میں گرجتے برسنے کی کچھ آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ بلاشبہ یہ جادو رامے کی ہی گونج دار آواز تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا اس کے شاندار رہائشی پورشن کی طرف گیا۔ برفانی غار کے اندر یہ آراستہ پورشن اس سے پہلے مایا رانی اور اس کی والدہ کے استعمال میں تھا۔ یہاں دیگر سہولتوں کے علاوہ باقاعدہ گرم پانی کی ٹینکی کا انتظام تھا اور یہ جگہ کافوری لیمپس اور شمعوں سے روشن رہتی تھی۔ قریب پہنچ کر پتا چلا کہ رامے اپنی نابینا رکھیل ایلی پر بگڑ رہا ہے...... ایلی نے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ جواب میں رامے گرجا۔ ”بکواس مت کرو، میں جانتا ہوں وہ کنجر...... وہ سفید سؤر ڈیرن تمہارے دماغ سے نکل ہی نہیں پا رہا۔ میرے ساتھ سوتی ہو اور ہوتی اُس کے ساتھ ہو۔ لعنت ہے تم پر...... لعنت ہے۔“

اس کے ساتھ ہی تھپڑ کی آواز آئی جو یقیناً نوجوان ایلی کے رخسار پر پڑا تھا۔ بے شک ایلی سے چند دن کے پیار محبت کے بعد رامے اپنی اصلیت پر اتر آیا تھا...... اور وہ چند دن کا بناوٹی پیار بھی صرف اس لیے تھا کہ رامے یہاں کے ماحول کے مطابق چلنا چاہتا تھا اور مایا وغیرہ کی نگاہوں میں خود کو معقول ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے کسی کا کیا ڈر ہو سکتا تھا؟

ایلی غالباً منت سماجت کر رہی تھی اور وہ مسلسل پھنکار رہا تھا۔ ماہین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اپنے مخصوص نشے کی کمی کے سبب وہ اضافی طور پر چڑچڑا اور غصیلا ہو چکا ہے۔

یکایک اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ باہر کو ابلی ہوئی آنکھوں میں سرخی تھی۔ ”یہاں کھڑے کیا سن رہے ہو؟“ وہ پھنکارا۔ ”اندر آجاؤ۔ مجھے کسی کا کوئی ڈر نہیں ہے، آجاؤ اندر۔“

میں تذبذب میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں میم مائرہ نے بھی کمرے سے جھانکا۔ ”ہاں ہاں آجاؤ، کچھ صلاح مشورہ بھی کرنا ہے تم سے۔“ وہ بولی۔

میں اندر چلا گیا۔ یہ ایک طرح سے اس پورشن کی نشست گاہ تھی۔ میرے اندر آتے ہی جادو رامے نے ایلی کو باہر جانے کی ہدایت کی۔ اس کا مرمریں رخسار طمانچے کی وجہ سے سرخ تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ دیوار کو ٹٹولتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے میم مائرہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت آمیز رقابت کی تپش تھی اور ایک طرح کی تسکین تھی۔ وہ جب بھی خوبرو ایلی کی بے بسی کا نظارہ کرتی تھی، یہ تسکین نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔

ایلی کے جانے کے بعد جادو رامے نے جلتی نظروں سے مجھے سرتاپا گھورا اور بولا۔ ”ہوسکتا ہے کہ چار پانچ روز میں یہاں سے ہماری واپسی کا سفر شروع ہو جائے، میں چاہتا ہوں اس مرتبہ یہ سفر تناؤ بھرا نہ ہو اور یقیناً تم بھی یہی چاہتے ہو گے؟“

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں، مجھے تمہاری ساری ہسٹری معلوم ہے اور اسی جانکاری کی وجہ سے میں کبھی بھی مکمل طور پر تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوا......“

”اب تک کے سفر میں آپ دونوں کو مجھ سے کیا شکایت ہوئی ہے؟“

”نہیں ہوئی...... لیکن اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تمہاری اس ساتھی لڑکی ماہین کی ٹانگ سے بارود بندھا ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ ایسا نہ ہو۔ ہم اچھے ماحول میں سفر کریں اور منزل تک پہنچیں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں رامے صاحب۔ آپ بے فکر رہیں بلکہ میں آپ کو اپنی اور عمران کی طرف سے گارنٹی دیتا ہوں۔“

”مجھے اس لڑکی ماہین کی طرف سے بھی گارنٹی چاہیے۔ اس کمینی مایا رانی سے اس کا یارانہ رہا ہے اور وہ خود بھی کوئی اَوِیں شیویں چیز نہیں ہے۔ ہم نے چند روز پہلے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ کسی کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔ شاید وہ شاگرد ہے تمہاری؟“

”نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ بہرحال میں اُس کی طرف سے بھی آپ کو مکمل اطمینان دلاتا ہوں۔“

میم مائرہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم لوگوں کا رویہ ٹھیک رہے گا تو واپس پہنچنے پر ہم تمہیں مناسب رعایتیں دے سکیں گے۔“

ابھی گفتگو جاری تھی کہ ایک محافظ نے باہر سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ جادو رامے نے اجازت دی۔ چند لمحے بعد لمبی تڑنگی مرد نما نہال ایک عورت اور مرد کو اندر لے آئی۔ عورت کے گلے میں وہی گلوبند تھا جو یہاں اکثر مردوں کے گلے میں ہوتا تھا۔ گلوبند سے ایک زنجیر منسلک تھی اور نہال عورت کو گھسیٹتی ہوئی اندر لا رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی جواں سال عورت تھی جسے میں نے چند روز پہلے اس کے تین باکروں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے باکروں (شوہروں) نے ایک شکار کیا ہوا پہاڑی بکرا اٹھا رکھا تھا۔ ایک باکر کی غلطی سے بکرا نیچے گرا تھا اور عورت کے پاؤں پر بھی چوٹ آئی تھی۔ اس کی سزا باکر کو یہ بھگتنا پڑی تھی کہ وہ سب کے سامنے تین پہر تک ایک ٹانگ پر

کھڑا رہا تھا۔ اب وہی باکر اس کے ساتھ تھا۔

جادو رامے نے غصیلے انداز میں عورت کی طرف دیکھا، پھر منوہر سنگھ کو بلایا اور اس کے ذریعے عورت کے مسکین صورت باکر سے کہا۔ ''لعنت ہے تم لوگوں کی مردانگی پر۔ کم از کم مجھ سے تو تمہاری وہ ذلت برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اب یہاں میرا اختیار چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ تم بھی ویسا ہی سلوک کرو۔ بدلہ لو اس سے۔ بے لباس کر کے کھڑا کر دو اس کو چورا ہے میں......''

باکر سرتاپا لرزنے لگا۔ انکار میں سر ہلانے لگا۔ اس نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ عورت اس کی بیوی ہے۔ عزت اور ادب کی جگہ پر ہے۔

رامے گرجا۔ ''ڈرومت، تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں یہاں جو کام بھی کر رہا ہوں، اس میں دیوی تورما چھائی کی آشیرباد شامل ہے۔ وہ بھی ایسی بے لگام عورتوں کو لگام ڈالنے کے حق میں ہے۔''

باکر باقاعدہ رونے لگا، ہاتھ جوڑنے لگا۔ کہنے لگا کہ یہ سب اس کے بس کا نہیں ہے۔ غصیلے رامے نے اٹھ کر اس کے منہ پر تھپڑ جڑا...... وہ طیش سے دیوانہ سا ہو رہا تھا۔ اس نے ڈری ہوئی عورت کو کئی غلیظ گالیاں دیں پھر اس کی گیند نما کربہہ آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ دروازے کی طرف منہ کر کے دہاڑا۔ ''بہروز خان...... بہروز خان......''

چند ہی سیکنڈ بعد دراز قد بہروز سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ اندر آیا۔ رامے نے جواں سال عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سورنی کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔ سارے کس بل نکال دو اس کے۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

بہروز تو جیسے پہلے ہی تیار تھا۔ اپنے بگ باس کا مطلب سمجھ کر اس نے خوف زدہ عورت کو گلوبند سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

میں اور منوہر سکتہ زدہ کھڑے رہے۔ یقیناً رامے اپنے غصیلے پن میں اپنے اختیارات اور اپنی موجودہ پوزیشن کا غلط استعمال کر رہا تھا۔ جو کچھ چند روز پہلے اس عورت نے کیا، یقیناً وہ بھی غلط تھا لیکن جواب رامے کر رہا تھا، وہ بھی کہاں کا درست تھا؟

ایک دن گزر گیا، دوسرے روز صبح سویرے ہما عروج میرے کمرے میں آئی۔ آج کل عمران سے اس کی گاڑھی چھن رہی تھی۔ دونوں فلموں اور ڈراموں وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کسی وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور بلند آواز میں ہنستے تھے...... تاہم فی الوقت ہما کافی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ چھوٹتے ہی بولی۔ ''ڈپٹو جی، کچھ پتا چلا تمہیں رات کو کیا چن چڑھا ہے یہاں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ اپنے لمبے بالوں کو فلمی انداز میں جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''وہ جس سانپ جیسی شے کو یہ لوگ زوب کہتے ہیں، اس نے کام دکھایا ہے۔ تین بندوں کو کاٹا ہے اس نے۔ دو تو ڈھیس پٹاس ہو گئے ہیں، ایک زخمی ہے۔''

''ڈھیس پٹاس؟ مطلب مر گئے ہیں؟''

''کچھ ایسے ویسے۔ دونوں کی لاشیں نیلی پڑ گئی تھیں۔ تیسرا جو زخمی ہوا ہے وہی ڈشکرا بہروز ہے۔ بچ تو جائے گا لیکن ابھی تو کرلاٹیں نکل رہی ہیں اس کی، درد کی وجہ سے۔''

''پر یہ ہوا سب کچھ کیسے...... اور مرنے والے کون ہیں؟''

''دونوں گارڈ تھے رامے جی کے۔ ایک کا نام وارث تھا۔ دوسرے کا اچھو۔ دراصل زوب کے پنجروں کی نگرانی کے لیے رامے جی نے اپنا خاص بندہ جمال شاہ مقرر کر رکھا تھا۔ وہی جو میم مائرہ کے ساتھ رہتا ہے اور انجکشن وغیرہ بھی لگا لیتا ہے۔ اس سے غلطی ہوئی، ایک پنجرے کا دروازہ ٹھیک طرح بند نہ ہوا، رات کو تین بڑے کیڑے باہر نکل آئے۔ وہ تو خیر گزری کہ کوئی ہمارے کمروں کے پاس نہیں آ گیا......''

یہ تو میں نے سنا تھا کہ یہ بہت زہریلا کیڑا ہے مگر اتنی جلدی اس کی زہرناکی کا واقعہ دیکھنے کو ملے گا، اس کی توقع نہیں تھی۔ میں ہما عروج اور عمران کے ساتھ طامبورہ میں پہنچا۔ دونوں لاشیں ابھی ابھی وہاں سے اٹھائی گئی تھیں، البتہ زخمی ہونے والا گرانڈیل بہروز ایک چٹائی پر موجود تھا اور تکلیف کی وجہ سے بل کھا رہا تھا۔ میم مائرہ بھی پریشان صورت کے ساتھ وہیں موجود تھی۔ اس نے بہروز کے پاؤں پر نشتر سے چیرا دیا تھا اور ایک ملازم پاؤں دبا دبا کر خون نکال رہا تھا۔

مائرہ نے ہمیں مختصراً بتایا کہ یہ سب کیسے ہوا ہے، آخر میں بولی۔ ''بہروز کی بچت یوں ہو گئی کہ اسے نسبتاً چھوٹے زوب نے آخر میں کاٹا، تب تک ویسے بھی اس کی بائٹ میں زہر کم ہو چکا تھا۔''

زہر کی خطرناکی کا اندازہ یوں ہوتا تھا کہ بالکل چھوٹے سے زخم کے باوجود بہروز ماہیِ بے آب کے مانند تڑپ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ مجھے وہ عورت یاد آئی جو رامے کے عتاب کا شکار ہوئی تھی اور جسے رامے نے بہروز کے حوالے کیا تھا، پرسوں شب وہ یقیناً بدمست بہروز کی بدسلوکی کا شکار ہوئی تھی۔ آج بہروز خود زہریلے ڈنگ کا شکار ہو گیا تھا۔ قدرت ایسے ہی چھوٹی بڑی سزاؤں اور جفاؤں کا توازن برقرار رکھتی ہے۔

طامبورہ کے ساتھ والے حصے سے رامے کی گھن گرج

سنائی دی۔ وہ کسی کو تھپڑ رسید کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس کی آتش مزاجی آج کل عروج پر تھی۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔ کھلے دروازے میں سے لمبے بالوں اور داڑھی مونچھ والا وہی شخص نظر آیا جو ہمارے ساتھ ہی لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور جس کا نام جمال شاہ تھا۔ تھپڑ اسی کو پڑے تھے مگر بات صرف تھپڑوں تک ہی نہیں رہی تھی۔ اب گونگے جہانے اور ایک تومند گارڈ نے جمال کو کندھوں سے دبوچا ہوا تھا اور رامے کا ایک ذاتی گارڈ استرے کی مدد سے جمال کا سر مونڈ رہا تھا۔ جادو رامے اس کی شان میں مسلسل ''قصیدے'' پڑھ رہا تھا اور گاہے گاہے اسے ٹھوکر بھی رسید کر دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمال کے سر کے علاوہ اس کی داڑھی مونچھ بھی صاف کر دی گئی۔ جمال کی پینٹ بری طرح پھٹی ہوئی تھی اور وہ نیم عریانی کی حالت میں تھا۔

ہمارے اب تک کے مشاہدے کے مطابق جمال، رامے کا بے حد وفادار کارندہ تھا اور بہت چوکس بھی تھا۔ غلطی کس سے نہیں ہو سکتی، اس سے بھی ہوئی تھی۔ وہ زہریلے کیڑوں کی درست نگرانی نہیں کر سکا تھا مگر اس کو جس بے دردی سے مارا پیٹا اور ذلیل کیا گیا تھا، وہ بھی قابلِ ذکر تھا۔ یقیناً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رامے کا نشہ کئی دن سے ٹوٹا ہوا تھا اور وہ سرتاپا شعلہ بنا ہوا تھا۔

اتنے دنوں بعد میں آج پہلی بار اس جمال نامی شخص کو بہت غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ گھنی داڑھی اور مونچھوں وغیرہ کے بغیر نجانے کیوں مجھے اس کی شکل کچھ دیکھی بھالی سی لگی مگر ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

جادو رامے اپنا غصہ نکال کر جا چکا تھا۔ گارڈ بھی دائیں بائیں ہو چکے تھے۔ جمال اپنے ہی عرقِ ندامت میں ڈوبا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ مجھے لاہور کے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال کا پیتھالوجسٹ کامران یاد آ گیا۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے کامران سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب ثروت جعلی دوا کی وجہ سے سخت بیمار ہوئی اور اسے جان کے لالے پڑے۔ وہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی بیچ راستے میں مجھے چھوڑ کر جا رہی تھی اور میں اسے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے اسپتالوں اور لیبارٹریوں کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا۔ انہی دنوں ماہر پیتھالوجسٹ کامران نے ایک دو اہم ٹیسٹوں میں میری خصوصی مدد کی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ کسی حد تک یاد رہ گیا تھا۔ آج یہاں رامے کے اس جمال نامی کارندے کو گھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے بالوں کے بغیر دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا تھا کہ یہ وہی کامران ہے یا پھر...... اس کا کوئی قریبی عزیز؟

میں اُس کے قریب چلا گیا۔ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر میں نے اردگرد دیکھا اور مدھم لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟''

اس نے میرے سوال پر ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔

اس نے اپنا سر ہلا کر میرے سوال کا جواب نفی میں دیا۔

''کیا تمہارا کوئی قریبی عزیز لاہور کے اسپتال میں رہا ہے؟''

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ پشیمانی و ذلت کے شدید ریلے میں تھا۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔

یہ دوسری رات کا واقعہ ہے۔ سردی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ پتا چلا تھا کہ اس وسیع غار سے باہر برفانی طوفان آیا ہوا ہے۔ بھاری بھرکم سلیپنگ بیگ اور کپڑوں کے باوجود ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہ ٹھنڈ میرے لیے نہیں تھی۔ ایک مدت ہوئی تھی کہ سردی گرمی نے مجھ پر اثر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ رات کا دوسرا پہر تھا، میں ابھی سویا نہیں تھا، یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ نیم تاریکی میں کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ چھوٹے لیمپ کی لو تھوڑی سی اونچی کی۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کلین شیوڈ اور صفاچٹ سر والا جمال میرے سامنے کھڑا تھا۔ پہلے مجھے خطرے کا احساس ہوا مگر پھر اندازہ ہوا کہ اس کا انداز دوستانہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

اس نے ٹھہرے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''میں...... آپ سے کچھ بہت خاص کہنا چاہتا ہوں، اگر ہو سکے تو اس کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر دیں۔''

میں کچھ دیر تک اس کا مغموم چہرہ دیکھتا رہا پھر اٹھ کر دروازے کو آہستگی کے ساتھ بولٹ کر دیا۔

دو تین رسمی کلمات کے بعد جمال نے انکشاف کیا۔ ''کل آپ نے میرے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل درست ہے، میں جمال نہیں احمد کامران ہوں۔ میں نے ہی آپ کی بیمار بیگم کے اہم میڈیکل ٹیسٹوں میں آپ کی مدد کی تھی۔ میں نے کئی ہفتے پہلے لاہور ہی میں آپ کو پہچان لیا تھا مگر اپنے حالات کے سبب خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ میں سب سے پہلے تو آپ کی بیگم کی وفات پر افسوس کروں گا، وہ بڑی باہمت خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی بیماری کے ساتھ اپنی طاقت سے بڑھ کر لڑائی کی۔''

''تمہارے جذبات کے لیے شکریہ...... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کہاں اسپتال کا وہ ہیڈ پیتھالوجسٹ اور کہاں جادو رامے کا ایک وفادار کارندہ...... اور پھر تمہارا وہ بھیس جس نے تمہیں بالکل کیموفلاج کر رکھا تھا؟''

میرے اس سوال کا جو جواب احمد کامران نے دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے...... قریباً ایک سال پہلے کامران کے ایک دشمن آفیسر نے کامران کو ایک نوجوان مریضہ کے ریپ اور قتل کیس میں اس بری طرح پھنسا دیا کہ اسے پھانسی کا پھندا اپنے سامنے نظر آنے لگا۔ ان مشکل ترین حالات میں جادورامے نے اسے پناہ دی اور قانون کے لمبے ہاتھوں سے بچایا۔ تاہم جادورامے کی یہ عنایت، بے غرض نہیں تھی، کامران قتل کے جھوٹے کیس سے تو بچ گیا مگر جادورامے کے کالے دھندے میں اسے رامے کے ساتھ شریک ہونا پڑا۔ جب وہ ایک بار جعلی ادویات کے کاروبار میں ملوث ہو گیا تو پھر دھیرے دھیرے اس نے خود کو رامے کی مرضی ومنشا کے مطابق ڈھال لیا۔ تاہم کل جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، اس نے اس کے دل و دماغ پر اتنی گہری چوٹ لگائی تھی کہ وہ خودکشی پر تقریباً آمادہ ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ مجھ پر کچھ اہم باتوں کا انکشاف کرے۔

اس دوران میں عمران بھی جاگ چکا تھا۔ کامران نے جو پہلا انکشاف کیا وہی دھماکا خیز تھا۔ وہ بولا۔ ''آپ جانتے ہیں رامے اور میم مائرہ یہ ساری جدوجہد کس لیے کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''وائرس کی ویکسین بنانے کے لیے، اس پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے اور پھر اسے منہ مانگے داموں پر فروخت کرنے کے لیے۔''

''لیکن...... ویکسین...... تو بن...... چکی ہے۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''اور اسے بنے ہوئے قریباً ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔''

''تو پھر...... اب کیا بن رہا ہے؟''

اس نے ڈرامائی انداز میں ہماری طرف دیکھا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اب بیماری بن رہی ہے، یعنی وائرس مکمل کیا جا رہا ہے۔''

اس کے لہجے میں موجود بے پناہ سچائی نے ہمیں سرتاپا دہلا دیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عمران نے دبی آواز میں پوچھا۔

''برادر...... کسی دوا کو تب ہی فروخت کیا جا سکتا ہے نا، جب اس کی ڈیمانڈ ہو، بیماری تو ابھی موجود ہی نہیں۔ اس ''نایاب'' ویکسین کا کیا کریں گے یہ لوگ؟ اب یہ بیماری...... میرا مطلب ہے وائرس بنانا چاہتے ہیں، اسے جنوبی ایشیا کے دو تین ملکوں میں پھیلانا چاہتے ہیں، جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔''

کامران کے لب و لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

اگلے آدھ گھنٹے میں ہمارے اور احمد کامران کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے تائید ہوئی کہ قریباً دس برس پہلے جاپانی ڈاکٹر شا نے حادثاتی طور پر یہ وائرس بنا ڈالا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے، انسانی خون میں ''کلاٹس'' بننے سے روکنے والی ایک دوا پر کام کر رہا تھا۔ یہی دوا تھی جس میں اس نے زوب نامی اس کیڑے کا زہر استعمال کیا تھا۔ بعدازاں جب وائرس وجود میں آ گیا تو ڈاکٹر شا نے دو تین برسوں میں اس کی مؤثر ویکسین بھی ایجاد کر ڈالی اور اپنا یہ سارا کام رائٹنگ فارم میں محفوظ کر دیا۔ ڈاکٹر شا کی وفات سے قبل یا بعد میں ڈاکٹر کے یہ سارے پیپرز ارب پتی ڈیرن فورڈ اور اس کی بیوی میم مائرہ کے پاس پہنچے۔ بعدازاں جب دونوں میں ایلی کی وجہ سے ناچاقی ہوئی تو کچھ پیپرز اور سی ڈیز میم مائرہ لے گئی اور کچھ مواد ڈیرن فورڈ کے پاس رہ گیا۔ اس ناچاقی اور پیپرز کی تقسیم سے پہلے میاں بیوی ویکسین تو تیار کر چکے تھے لیکن وائرس کا مکمل ''ویرئنٹ'' تیار ہونا باقی تھا۔

عمران نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور قدرے سراسیمہ آہنگ میں بولا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ دنیا بھر میں بیماریوں کے لیے دوا ایجاد کی جاتی ہے۔ یہاں یہ دونوں مجرم پارٹیاں اپنی دوا کے لیے بیماری ایجاد کر رہی ہیں۔''

آدھ پون گھنٹے بعد بے حد دل گرفتہ اور آبدیدہ احمد کامران واپس چلا گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو یہ قول دیا تھا کہ اس یخ بستہ رات میں...... اس کمرے کے اندر جو بھی گفتگو ہوئی ہے، وہ صرف اور صرف ہم تینوں کے درمیان رہے گی۔

☆☆☆

کامران سے بات ہوئے کم و بیش پندرہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ اب تک ہم یہی سمجھتے آئے تھے کہ رامے اور اس کا ٹولا ایک ایسے وائرس کی ویکسین تیار کر رہا ہے جو وجود میں آ چکا ہے...... دنیا میں کئی جگہ موجود ہے اور شاید پھیل بھی سکتا ہے۔ یہ لوگ اس کی ویکسین تیار کر کے دولت کمانا چاہ رہے ہیں مگر اب پتا چل رہا تھا کہ وائرس صرف ڈاکٹر شا کے پیپرز میں موجود تھا اور اب اسے جیتی جاگتی حقیقت بنا کر ان گنت لوگوں کی زندگیاں شدید خطرے میں ڈالی جا رہی ہیں۔

میں اور عمران اسی بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب منوہر سنگھ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا، بولا۔ ''لوجی، گندھارا بے چاری کا آخری وقت آ گیا۔ اس کی ہتھیا کی جا رہی ہے۔''

''کیا مطلب...... وہ تو امید سے ہے۔''

''ہمیں پتا نہیں چلا جی۔ چار دن پہلے بچے کا جنم ہو گیا ہے۔''

''لیکن...... اُسے یہ سزا تو مایا رانی نے سنائی تھی اور

گندھارا کی طرح مایا خود بھی بندی خانے میں ہے۔"

"لیکن اب یہ حکم دیوی تورما اور رامے صاحب نے دیا ہے۔ اسے اسی طرح پول سے باندھ کر اور تیل چھڑک کر جلا دیا جائے گا...... بلکہ سمجھو جلایا جا رہا ہے۔ سارا انتظام ہو چکا ہے۔"

رامے کے لیے ہمارا غم وغصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ہر حد پار کر رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ برداشت جواب دے جائے گی۔

ہم منوہر سنگھ کے ساتھ تیز قدم اٹھاتے غار کے دہانے پر پہنچے۔ برفانی طوفان کا زور صبح سویرے ٹوٹ چکا تھا البتہ ہلکی برف باری جاری تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ دل دہلا دینے والا منظر وہی تھا جو ہم پہلے بھی دو بار دیکھ چکے تھے۔ برف باری کے باوجود یہاں تین چار سو مرد و زن جمع تھے، تاہم ان میں بچہ کوئی نہیں تھا۔ پتھر کے ایک پول کے ساتھ دہشت زدہ گندھارا کو زنجیروں سے باندھا جا رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا...... وہ جیسے جلنے سے پہلے ہی آدھی مر چکی تھی۔

گندھارا کے اُلجھے بالوں پر برف گر رہی تھی۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتی اور لاچار نظروں سے بائیں جانب دیکھتی تھی۔ شاید اسی جانب وہ اپنے بچے کو آخری بوسے کے بعد چھوڑ آئی تھی۔ گندھارا کا شوہر (باکر) مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ یہاں تھا ہی نہیں، کسی کونے میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ اسی دوران میں تین عورتیں آگے بڑھیں اور گندھارا کے گرد لکڑیاں چننے لگیں۔

یکا یک میرے تپے ہوئے سینے کے اندر کچھ چل پڑا۔ ایک آتشیں لہر اٹھ کر پورے جسم میں پھیل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس عورت کو یوں بے بسی کی حالت میں مرنے دیا اور اس کے لیے کوئی کوشش نہ کی تو خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔ "عمران! ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

یکا یک عمران کا چہرہ بھی تمتما اٹھا اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔ میں لمبے ڈگ بھرتا جادو رامے اور کبڑی دیوی تورما کے عین سامنے جا پہنچا۔ مسلح محافظائیں کچھ چونکی ہوئی نظر آنے لگیں۔ میں نے ٹھوس لہجے میں دیوی سے گندھارا کی جان بخشی کی درخواست کی اور کہا کہ گندھارا کے بارے میں مایا رانی کی رائے پوچھی جانی چاہیے۔

نتیجہ وہی نکلا جو مجھے معلوم تھا، دیوی تورما اپنی زبان ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلانے لگی۔ پتا نہیں، کیا کیا بول رہی تھی۔ رامے کی منحوس صورت پر بھی سفاکی اور کرختگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اب لکڑیوں پر تیل چھڑکا جا رہا تھا۔ لوگ آخری مناظر دیکھنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے بھی رامے اور دیوی تورما کے ساتھ آخری کوشش کی۔ جب نتیجہ صفر نکلا تو میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا۔ میں نے قریب کھڑی ایک محافظہ کے ہاتھ سے رائفل جھپٹی اور تیل چھڑکنے والی عورت کو لات مار کر دور گرا دیا۔ ایک دم ہی جیسے چاروں طرف سنسنی کی ایک بلند لہر اچھلی اور پھیل گئی۔ میں جادو رامے کی طرف لپکا۔ مگر ہر دم چوکس ڈولما میرے راستے میں آ گئی۔ میں نے اس کے سر پر رائفل کے آہنی بیرل سے وار کیا، وہ جھک کر خود کو بچا گئی مگر اس کا جھکنا اسے میرے دائیں گھٹنے کے قریب تر لے آیا۔ گھٹنے کی طوفانی ضرب اس کے چوکور چہرے پر لگی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی، نرم برف پر جا گری۔ ایک تنومند محافظ نے مجھے عقب سے دبوچنا چاہا مگر میرے اوپر سے ہوتا ہوا اس کرسی سے جا ٹکرایا جس پر تھوڑی دیر پہلے منحوس صورت جادو رامے براجمان تھا۔ کرسی کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ رامے جان بچانے والے انداز میں بھاگتا ہوا پندرہ بیس قدم دور جا چکا تھا۔ اب اس تک پہنچنا مشکل تھا کیونکہ درمیان میں کم از کم چار گارڈز موجود تھیں۔ دوسرا آپشن میرے لیے یہی تھا کہ دیوی تورما پر جا پڑوں، وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ میں تڑپ کر اس کی طرف آیا اور عقب سے اسے دبوچ لیا۔ اس کی چمک دار لاٹھی اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری۔ میں نے رائفل اس کی کھوپڑی سے لگائی اور وارننگ دیتے ہوئے گرجا۔

یقیناً میرے الفاظ کسی کی سمجھ میں نہیں آئے مگر انداز سب کی سمجھ میں آ گیا۔ میری انگلی طاقتور ٹرپل ٹو رائفل کے ٹریگر پر تھی اور میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ تورما ان لوگوں کے لیے ایک بوڑھی مقدس گائے کی طرح تھی۔ وہ سب کے سب جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ تب میری نگاہ عمران پر پڑی۔ وہ لمبی تڑنگی مرد نما نہال سے گتھم گتھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نہال نے عمران کی ناف میں گھٹنے کی شدید ضرب لگائی اور پھر ایک طوفانی گھونسے کے ساتھ اسے خود سے دور پھینکنا چاہا مگر عمران اس سے لپٹا رہا، وہ جانتا تھا کہ نہال اس سے علیحدہ ہو گئی تو ارد گرد کھڑی مسلح گارڈز اسے چھلنی کر ڈالیں گی۔

اگلے بیس تیس سیکنڈ تک دونوں میں خوفناک معرکہ رہا۔ آخر نہال کی کنپٹی پر لگنے والی کہنی کی ضرب نے اسے ڈگمگایا اور عمران نے بلا کی پھرتی سے نہال کا ایک فٹ لمبا خنجر اس سے چھین کر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا، پتھریلے پول کے ساتھ جا لگا۔ اسی پول کے ساتھ والے پول پر گندھارا زنجیروں سے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے خون آلود چہرے والی ڈولما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگ دیوی کی تڑپتی ہوئی لاش دیکھنا نہیں چاہتے تو تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

ڈولما کچھ نہ کچھ اردو ہندی کے الفاظ سمجھتی تھی۔ اس نے میری بات لوگوں تک پہنچائی۔ نتیجہ میری اور عمران کی توقع سے کہیں زیادہ مثبت نکلا۔ یہ دو تین سو افراد تو ہوں گے، سب کے سب پتھرا کر رہ گئے۔

کبڑی بڑھیا میری گرفت میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکال رہی تھی۔ میں نے رائفل کی نال بے رحمی سے اس کی جھریوں بھری گردن میں گھسائی۔

جینے کی آرزو شاید اس میں جوانوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس نے مری مری آواز میں ڈولما کو حکم دیا کہ مجرمہ کی زنجیریں کھول دی جائیں۔

زنجیریں کھول دی گئیں۔ گندھارا کا چہرہ اب بھی برف کی طرح سفید تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ موت کے منہ سے بچ سکتی ہے۔ میں نے کہا۔ ”گندھارا، تمہارا شوہر کہاں ہے؟“

وہ بولی۔ ”ایسا مت کریں آپ، میں نے تو مرنا ہی ہے۔ یہ میرے باکر (شوہر) کو بھی مار ڈالیں گے۔“

”لیکن وہ ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ آرہا ہے۔“ عمران بلند آواز میں بولا۔

میں نے اُس جانب دیکھا جہاں پھسلنے والی کتا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک گاڑی جس کے آگے چھ تازہ دم کتے تھے، تیزی سے ہماری جانب آرہی تھی۔ اسے گندھارا کا شوہر جورم چلا رہا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ گاڑی کے پیچھے بھی کوئی تین درجن کتے بھاگے آرہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جورم نے خود ہی انہیں کھولا ہے تاکہ کسی دوسری گاڑی پر اس کا پیچھا نہ کیا جا سکے۔

چند سیکنڈ بعد جورم گاڑی سمیت ہمارے سامنے تھا۔ گندھارا کی طرح وہ بھی کسی حد تک ہندی اردو جانتا تھا۔ وہ میرے عین سامنے پہنچ کر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”جناب اگر آپ کا حکم ہو تو میں گندھارا کو بہت حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جا سکتا ہوں۔ میں یہاں کے خاص رستوں سے بڑی اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے صرف دس منٹ بھی مل گئے تو یہ لوگ مجھے پکڑ نہیں سکیں گے۔“

”ظاہر ہے۔ کیسے پکڑیں گے۔ تم سارے کتے تو ساتھ لے جا رہے ہو۔“

یکا یک اُسے جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ خیال نہیں رہا کہ آپ بھی یہاں سے نکلنا چاہیں گے۔ آ...... آپ کی اجازت ہو تو میں دوسری گاڑی بھی تیار کرتا ہوں۔“

”نہیں جورم دوسری گاڑی تیار کرنے کا وقت نہیں ہے۔ تم ایک گاڑی کے کتے چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

”لیکن جناب......“

”وقت کم ہے...... تم گندھارا کو لے کر بس نکلو یہاں سے۔“

ہانپتے ہوئے جورم نے اپنی سانس درست کر کے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ وہ ان اسکیمو بائلز یعنی برفانی گاڑیوں کا نگہبان بھی تھا حیرت انگیز طور پر چھ کتے ایک چھوٹا سا چکر کاٹنے کے بعد باقی کتوں سے علیحدہ ہو گئے۔ جورم نے ماہرانہ انداز میں نہایت پھرتی کے ساتھ ان چھ جانوروں کو ایک ہی زنجیر میں پرویا اور ایک پتھریلے پول سے باندھ دیا۔ ”چلو گندھارا! گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

وہ ابھی تک سکتہ زدہ تھی۔ شاید اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ جورم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے گاڑی میں بٹھایا۔ اس چھوٹے سائز کی گاڑی میں پانچ سے زیادہ سوار نہیں بیٹھ سکتے تھے اور یہاں ماما کا وہ بے مثال جذبہ نمودار ہوا جو ہر حال میں ماں کے سینے میں موجزن رہتا ہے۔ گندھارا کا سکتہ ٹوٹا اور وہ بُری طرح چونک کر گاڑی سے اتر آئی۔ ”میرا بچہ...... میرا بچہ“ وہ مقامی زبان میں پکاری۔ اس نے واپس غار کی طرف لپکنا چاہا...... لیکن اسی وقت ایک مقامی لڑکی دہانے کی طرف سے نمودار ہوئی۔ یہ علاج معالجے کے کام میں گندھارا کی وہی شاگرد تھی جس نے گندھارا کو تب آزاد کرایا تھا جب رائے اور مائرہ نے اسے باندھ کر ایک تاریک گوشے میں ڈال دیا تھا۔ چست لڑکی ہلکی برف باری میں بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں بھاری گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا، گندھارا کا وہی نومولود بچہ تھا۔ وہ گندھارا کے قریب پہنچی، گندھارا نے تڑپ کر بچے کو سینے سے لگا لیا، کئی بار اس کا منہ چوما، پھر اس نے اپنی اشک بار شاگرد کی طرف توجہ دی۔ چند لمحے سوچ کر اس نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ ہی گاڑی میں بٹھا لیا۔

”جلدی کرو...... نکلو۔“ میں نے پھر چلا کر کہا۔

گندھارا نے میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی یلغار تھی۔ ایک ہچکولے کے ساتھ گاڑی حرکت میں آئی اور چند ہی سیکنڈ میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”چاچو جان! مجھے ماہین کی طرف سے خطرہ ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”ساڑھے چھ فٹ قد کی نہال ابھی تک اس کے شکنجے میں تھی۔

”مجھے بھی زیادہ خطرہ ماہین کا ہے۔“ میں نے بھی عمران کی طرح انگلش کا سہارا لیا۔

"رامے غار کے اندر جا چکا ہے، مائرہ پہلے ہی وہیں پر ہے۔ ایک ہی امید ہے کہ اس نے خود کو کہیں پر چھپا لیا ہو۔" عمران نے امید ظاہر کی۔

"اس حصے میں تو چھپنے کی جگہ کوئی نہیں......" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

اسی اثنا میں منوہر سنگھ میرے سامنے آ گیا۔ بے شک وہ بھی رامے اور مائرہ کا ملازم تھا مگر ان دونوں کے بجائے وہ ہم سے زیادہ قریب ہو چکا تھا۔ موجودہ صورت حال نے اس کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش پیدا کر دیا تھا۔ اس کی نیلی پگڑی برف باری کے سبب سفید نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "منوہر! تم سات آٹھ سیٹوں والی ایک گاڑی دھکیل کر یہاں لا سکتے ہو؟"

"بالکل لا سکتا ہوں جی، بلکہ واہگرو کی کرپا سے جُتے بھی جوت سکتا ہوں۔"

"تو پھر جلدی کرو منوہر، ہم ان سب لوگوں کو زیادہ دیر نہیں سنبھال سکتے...... ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

یہی وقت تھا جب میں نے نہال کے لمبوترے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور خون رگوں میں اچھل کر رہ گیا۔ ہمارا بدترین اندیشہ، حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔ چالیس پچاس قدم کی دوری پر دہانے کے عین سامنے ماہین اکیلی اس حالت میں کھڑی تھی کہ اس کے خوب صورت چہرے پر تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ ایک برفیلے ابھار کے اوپر جادو رامے کھڑا تھا۔ اتنے فاصلے سے بھی میں اس کے مکروہ چہرے پر زہرناک مسکان دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو چھوٹی سی سیاہ چیز نظر آ رہی تھی، وہ بم کے ریموٹ کنٹرول کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ بھی مایوسی کی آماجگاہ نظر آنے لگا۔ بازی پلٹ گئی تھی۔ ہم مزید لڑنے سے پہلے ہی ہار گئے تھے۔

ڈولما نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا۔ "دیوی...... چھوڑ...... ورنہ...... ہتھیا اس...... کی......"

اس کا مطلب تھا کہ میں دیوی تورما سے الگ ہو جاؤں ورنہ رامے، ماہین کو اُڑا دے گا...... کیونکہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔

رامے جس خوفناک جھنجلاہٹ اور طیش کا آج کل شکار تھا، اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے دیوی تورما کی زندگی موت سے کچھ زیادہ سروکار نہیں تھا......

رامے اور اس کے دو ساتھی ماہین سمیت کچھ اور قریب چلے آئے تھے۔ میرے اور رامے کے درمیان چند تند تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا پھر مجھے پسپا ہونا ہی درست فیصلہ لگا۔ بہر حال ایک حوالے سے مجھے اور عمران کو اطمینان تھا۔ گندھارا کے حوالے سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ یقیناً اب تک جورم اور وہ محفوظ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ اس طرح کی برف میں پیدل تعاقب ناممکن تھا۔

میں نے کبڑی تورما کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ عمران نے بھی دراز قد نہال کو چھوڑ دیا۔ ہمیں کئی رائفلوں نے اپنے نشانے پر لے لیا۔ ہلکی برف مسلسل گر رہی تھی۔

☆☆☆

مجھے اور عمران کو یہاں کے بندی خانے میں ڈال دیا گیا۔ اب منوہر سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ منوہر سنگھ نے ہم پر انکشاف کیا کہ اس بندی خانے میں ان خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جن کو کڑی سزا دینا مقصود ہوتی ہے۔

قریباً دس ضرب پندرہ فٹ کے اس مستطیل خلا میں ایک بوسیدہ سے شکستہ قالین کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سامنے کی طرف زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں بُرا بھلا واش روم تھا جس کا دروازہ زنگ آلود لوہے کا تھا۔ برفیلا پانی قطروں کی صورت میں اس دروازے پر رینگتا رہتا تھا۔

قیدیوں کو کھانا پہنچانے کے لیے کوئی علیحدہ راستہ نہیں تھا۔ ایک پہریدار عورت جس نے شیر کی کھال والی بیلٹ پہنی ہوئی تھی سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کھانے پینے کی اشیا ہم تک پہنچاتی تھی بلکہ کسی وقت پھینک دیتی تھی۔ دروازے پر دو بھاری قفل لگے ہوئے تھے۔ جس مستطیل کمرے میں ہم بند تھے، ایسا ہی ایک چھوٹا چوکور کمرا ہمارے بالکل سامنے تھا۔ یہاں بھی ایک طرف آہنی سلاخیں لگی تھیں اور جہازی سائز کا قفل پڑا تھا۔ یہاں وہ جواں سال عورت بند تھی جو چند دن پہلے تک یہاں کی کرتا دھرتا تھی۔ یعنی مایا رانی۔ ان چند دنوں میں ہی اُس کے چہرے کی آب و تاب بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ شیرنی کی کھال کا وہ زرد لباس بھی بدل چکا تھا جو اس کی پہچان تھا۔ اب اس کی جگہ وہ ایک بھدی سی موٹی صدری پہنے ہوئے تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے منوہر، مایا کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟" میں نے سرد دیوار سے ٹیک لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے جی کہ اگر مایا بچ گی تو اس کے خلاف بغاوت کرنے والے نہیں بچیں گے جن میں ڈولما پیش پیش ہے۔" منوہر نے سرگوشی کی۔ "یا تو مایا رانی کی ہتھیا کر دی جائے گی...... یا پھر لمبے عرصے کے لیے بند کر دیا جائے گا۔"

ہمیں اس سرد بندی خانے میں قریباً چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے مگر مایا نے ہم سے ہم کلام ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس وہ ایک نمدے پر کمبل اوڑھے کروٹ لیے پڑی رہتی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت عمران کی بھی تھی۔ میں پہلی بار اسے اتنا افسردہ دیکھ رہا تھا۔

گندھارا کے بارے میں پچانوے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ اپنے شوہر اور بچے سمیت موت کے گھیرے سے نکل گئی ہے۔

سفاک صورت پہریدار عورت کی ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اب اس کی جگہ دوسری عورت نے آنا تھا۔ یہ وہی لمبوترے چہرے والی ساڑھے چھ فٹ لمبی نہال تھی، جو کل دوپہر عمران کے ہاتھوں کچھ زخمی بھی ہوئی تھی۔

پہریدار عورت سلاخوں کے سامنے سے ہٹ کر باہر گئی تو میرا دل چاہا کہ مایا رانی کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کروں۔ وہ اسی طرح دہرا کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اسی اثنا میں میری نظر مایا رانی کے عقب میں گئی۔ یہاں دیوار میں پتھر کی ایک بڑی تختی نصب تھی۔ اس پر رنگوں سے کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دھیان سے دیکھنے پر میں چونک گیا۔ بے شک رنگ مدھم ہو چکے تھے مگر منظر سمجھ میں آتا تھا۔ یہ وہی پتھر کے تین پول تھے جن سے باندھ کر قیدیوں کو سزا دی جاتی تھی۔ ایک پول کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر نیم برہنہ شخص بندھا تھا اور اس کے سینے میں ایک توانا عورت برچھی گھونپ رہی تھی۔ دوسرے پول کے ساتھ ایک عورت بندھی ہوئی تھی اور آگ میں جل رہی تھی۔ تیسرے پول کے ساتھ پھر ایک مرد کی شبیہ تھی۔ وہ بھی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا مگر وہ آگ میں نہیں جل رہا تھا۔ اس پر بھوکے بھیڑیے جھپٹ رہے تھے اور اس کے جسم کو اُدھیڑ رہے تھے۔ یہ منظر غیر معمولی طور پر دردناک تھا۔ تینوں تصویروں کے اوپر مقامی زبان میں کچھ لکھا بھی تھا۔

میری نظر کا تعاقب کر کے منوہر نے بھی اُڑے اُڑے رنگوں والی یہ پینٹنگ دیکھ لی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی جھلک دکھانے لگی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید ہمارا انجام۔'' وہ ہولے سے بولا۔

''تصویروں پر لکھا کیا ہے؟''

''جو برچھی والی تصویر ہے اس پر لکھا ہے چھوٹی موت، جو اگنی والی ہے اس پر صرف موت لکھا ہے اور بھیڑیوں والی پر بڑی موت درج ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''بڑی موت، یعنی زندہ قیدی کی بھیڑیوں کے ذریعے چیر پھاڑ کرا دینا۔''

منوہر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہم نے دیکھا ہی ہے ان لوگوں نے تبھی بھیڑیے باقاعدہ پال رکھے ہیں۔ شاید وہ ایسے ہی کاموں کے لیے ہیں۔'' پھر وہ ایک دم چونکا۔ ''میرا وچار ہے کہ ایسی ہی منحوس پینٹنگ ہمارے اس کمرے میں بھی رہی ہو گی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہم نے اپنے مستطیل کمرے میں غور کیا۔ یہاں بھی ایک برفیلی دیوار میں سفید پتھر کی سل نصب تھی تاہم کوئی پینٹنگ نظر نہیں آتی تھی۔ اب ہم نے موم بتی کی روشنی میں ذرا دھیان سے معائنہ کیا تو پتا چلا کہ وہاں بھی ایسی پینٹنگ سے بہت مدھم سے آثار موجود ہیں۔ گردشِ زمانہ نے ان دلدوز مناظر کے رنگ قریباً اڑا ڈالے تھے۔

عمران کل رات دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اب جیسے نڈھال ہو کر سو رہا تھا۔ میں نے منوہر سنگھ سے کہا۔ ''ابھی اسے ان تصویروں کے بارے میں مت بتانا۔ پہلے ہی پریشان ہے۔''

''بات ہے بھی تو پریشانی کی...... میری نگاہوں میں تو کل سے وہ کالا ریموٹ کنٹرول گھوم رہا ہے جو اس کالے شیطان رامے نے پکڑا ہوا تھا۔ مطلب یہی ہوا نا کہ اگر غلطی سے بھی ریموٹ کا بٹن دب جائے تو وہ لڑکی ایک سیکنڈ میں اپنے پران گنوا بیٹھے گی...... یہ کوئی عمر ہے مرنے کی۔''

اسی اثنا میں سامنے والی کرانما برفیلی کوٹھڑی میں مایا رانی نے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے مچی مچی نظروں سے ہماری طرف دیکھا، پھر اپنے مینڈھیوں والے بال اپنے ہاتھوں سے سنوارنے لگی...... وہ کل سے جانتی تھی کہ ہم یہاں موجود ہیں مگر ہم سے مخاطب نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اس کی وجہ وہ خونخوار شکل والی دونوں پہریدار عورتیں ہی تھیں جو باری باری سلاخوں کے سامنے موجود رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک نہال تھی۔ اب چونکہ ان میں سے کوئی نظر نہیں آ رہی تھی، مایا رانی اٹھ کر ہماری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں ہولے سے بولی۔ ''مجھے لگتا تھا کہ تم دونوں کسی نہ کسی مشکل میں ضرور پڑو گے، کیا کر دیا ہے تم نے؟''

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''وہی جو آپ کو کرنا چاہیے تھا...... بلکہ شاید آپ قید نہ ہوتیں تو کر بھی دیتیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بجھے بجھے لہجے میں بولی۔

''ہم نے گندھارا کو آگ میں جلنے سے بچایا ہے۔ یہ ظلم ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔''

مایا رانی کا چہرہ بظاہر سپاٹ رہا مگر میں نے محسوس کیا کہ

شاید یہ خبر اس کو بری نہیں لگی۔

"کیا اس کا بچہ پیدا ہو گیا تھا؟" مایا نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی۔ "اب کہاں ہے وہ؟"

مایا رانی کے سوال کا جواب میں نے پوری تفصیل سے دیا اور بتایا کہ ہم نے کس طرح گندھارا کو اس کے شوہر اور بچے سمیت فرار کرایا۔

مایا رانی گم صم سی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "مایا رانی! آپ ہم کو یہاں کی پرانی نسل کی عورتوں سے ... مختلف لگی ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے اپنے لوگوں کے لیے اس طرح کی سخت وحشیانہ سزائیں برقرار رکھی ہوئی ہیں؟...... یہ آپ کے پیچھے دیوار پر جو اڑے اڑے رنگوں والی تصویر ... کیا یہ آپ کے لیے قابلِ قبول ہے؟"

مایا رانی نے ایک گہری سانس لی۔ "میں چاہوں بھی تو یہ رسم و رواج اتنی جلدی نہیں بدل سکتے۔ اس میں بہت وقت لگے گا...... لیکن حقیقت یہی ہے کہ گندھارا کے بارے میں میرا ذہن بدل چکا تھا۔ میں اس کی موت کی سزا کو قید میں بدلنے والی تھی۔"

"مگر جب آپ کا اختیار تھا آپ نے سزا بدلی نہیں...... اب جن لوگوں کا اختیار ہے، وہ بھی آپ ہی کے انداز میں چل رہے ہیں۔ جن سزاؤں کی یہاں تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان میں سے کوئی ہمارے اور آپ کے حصے میں بھی آجائے گی۔"

وہ کسی حد تک بے پروا نظر آئی۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں نے اپنے باکر (شوہر) سکامر کی جاں گسل بے وفائی دیکھی...... پھر اپنی ماں کو بے بسی سے جان دیتے دیکھا۔ ان دونوں دکھوں سے بڑا دکھ یا تکلیف میرے لیے اور کوئی نہیں۔ میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن ہم تو اس چیز کے لیے تیار نہیں۔ رائے اور میم مائرہ ہمیں مجبور کر کے یہاں لائے تھے۔ آپ کو ابین نے سب کچھ بتایا ہوگا۔ اس کی ٹانگ سے بم باندھا گیا تھا۔ ہم یہاں سے زندہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ آپ کے رواج کے مطابق زندہ جلنا نہیں چاہتے اور نہ ہی بھیڑیوں سے خود کو نچوانا چاہتے ہیں۔"

اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "مجھے آشا ہے، تم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لو گے۔ تم ایک بہادر شخص ہو۔ مجھے نراشا ہے کہ میں تمہاری بہادری اور صلاحیتوں کے بارے میں جان نہ سکی اور تمہارے بجائے ہم سب اس بدفطرت رائے کے ناز اٹھاتے رہے۔"

"آپ شاید اپنی رقیب ہریتی کی بات کر رہی ہیں جو میرے ہاتھوں مری۔"

"ایسا ہی ہے۔ وہ بے حد خطرناک جنگجو تھی، جن دنوں وہ فرار تھی اس نے میرے کئی قریبی وفادار ساتھیوں کی جان لی۔ اسے تم نے جہنم واصل کر کے میرا کلیجا ٹھنڈا کیا...... میں جتنے دن زندہ ہوں تمہاری شکرگزار رہوں گی۔"

اسی اثنا میں قدموں کی چاپ ابھری۔ پہریدار واپس آرہی تھی۔ مایا رانی خاموش ہو گئی اور دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ آنے والی دراز قد نہال ہی تھی۔ عمران نے کل اس کی کنپٹی پر اپنی کہنی کی جو کارگر چوٹ لگائی تھی، وہ ایک نیلگوں گومڑ کی شکل اختیار کیے ہوئے تھی۔ نہال کی ایک آنکھ بھی ورم زدہ نظر آتی تھی۔ وہ جب بھی پہرے کے لیے آتی تھی ہماری طرف کینہ توز نظروں سے دیکھتی تھی اور خاص طور سے عمران کو۔ وہی اس کی کنپٹی کی بدنما چوٹ کا ذمے دار تھا۔

اس بندی خانے میں تین چار ایسے ہی بیرک کی طرح کے کمرے میں موجود تھے، بے حد سرد، کھردرے اور بغیر کسی سہولت کے۔ شام کے وقت چار پانچ قیدی عورتوں کو رائفلوں سے دھکیل کر یہاں لایا گیا۔ نہال نے انہیں گالیاں دیں اور مقامی زبان میں تلخ ترش باتیں کہیں۔

"کیا ماجرا ہے؟" میں نے اپنے ساتھی منوہر سے پوچھا۔

وہ بولا۔ "جب کسی سرکار کا تختہ الٹتا ہے تو اس طرح کی گرفتاریاں تو ہوتی ہی ہیں۔ یہ مایا رانی کی وفاداروں میں سے ہیں۔ ڈولما نے انہیں بند کرنے کا حکم دیا ہے۔"

بند کرنے سے پہلے ان چاروں پانچوں عورتوں کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ یہ جامہ تلاشی لینے والی خردماغ نہال ہی تھی۔ وہ بڑی سختی بلکہ بے حیائی کے ساتھ تلاشی لے رہی تھی۔ اس نے قیدی عورتوں کے جسموں پر اپنے چوڑے چکلے ہاتھ کو آزادانہ حرکت دی اور پھر گالیاں بکتے ہوئے انہیں برفیلی بیرکوں میں دھکیل دیا۔

"کسی وقت تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ناری ہے ہی نہیں۔" منوہر سنگھ نے سرگوشی کی۔

"شاید پوری ناری نہ پورا مرد۔" میں نے کہا۔ (دو روز بعد یہ ثابت ہوا کہ نہال واقعی ایک درمیانی اور عجیب مخلوق تھی)

جب نہال عورتوں کو بند کر چکی تو کسی نے اسے بلایا اور وہ پھر باہر چلی گئی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ دیر باہر ہی رہے گی۔ اس کے جانے کے بعد مایا رانی نے کمبل ہٹایا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سخت سردی کے سبب اس کے سرخ گلابی ہونٹ قدرے نیلے ہو رہے تھے۔ اس نے عمران کی جانب دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں ابھی تک سو رہا تھا۔ کمبل میں سے بس اس کے سیاہ چمکیلے

بال اور روشن پیشانی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ مایارانی ٹوٹی ہوئی زبان میں بولی۔ ”پتا نہیں کہ جو میں نے کیا، وہ غلط تھا یا صحیح...... مگر ایسا کرنے سے تمہارے اس ساتھی عمران کا عشق ثابت ہوا ہے۔ یہ ماہین کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ پتا نہیں کہ تم لوگوں نے اس کے جذبے کی شدت محسوس کی ہے یا نہیں مگر میں نے کرلی ہے۔“

”ماہین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ...... بہت گہری لڑکی ہے۔ چٹان کی طرح سخت...... لیکن مجھے پتا ہے، وہ اندر سے چٹان نہیں رہی۔ کچھ اور ہو چکی ہے۔“

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر مایارانی نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں تو شاید اب زندہ نہ رہ پاؤں گی مگر میری خواہش ہے کہ اگر تقدیر تم لوگوں کا ساتھ دے اور تم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ، تو ان دونوں کو ملانے کی کوشش ضرور کرنا۔“

”ابھی تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، صاف پتا چل رہا ہے کہ وہ بھوت نما جادو را مے تم دونوں کی طرف سے حد سے زیادہ ہوشیار ہے۔ مجھ سمیت دوسرے قیدیوں کو بیرک کے دروازے کھول کر کھانا دیا جاتا ہے مگر تمہارا کھانا تمہاری بیرک کی سلاخوں کے اندر سے ہی پہنچایا جاتا ہے یا پھینکا جاتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ڈر ان لوگوں کو تم سے ہے۔“ اس نے میری جانب ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔

اس نے اپنی انگلی سے کوئی چیز اتاری اور سلاخوں کے اندر سے ہمارے بیرک نما مستطیل کمرے میں پھینکی۔ یہ ایک عام سی طلائی انگوٹھی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں نے سوچ رکھا تھا کہ جو کوئی بھی ہریتی کو زندہ یا مردہ میرے پاس لائے گا، اسے قیمتی تحفوں سے لاد دوں گی۔ نراشا اس بات کی ہے کہ ہم نے ان تحفوں کا حق دار اس راکھشس رامے کو سمجھا، اب میرے پاس اس انگوٹھی کے سوا اور کچھ نہیں۔“

میں نے انگوٹھی برف کے فرش سے اٹھالی۔ ”میرے لیے یہ ان سب تحائف سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو آپ نے رامے کو دیے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے کہا۔ ”پرانی روایتوں اور کہانیوں کے مطابق، میں اس انگوٹھی کے حوالے سے آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں تو......“

اس کے نیلگوں ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”فی الحال تو میرے پاس کچھ نہیں...... اور شاید اب ایسا موقع بھی نہیں آئے گا کہ میرے پاس کچھ ہو۔“

پتلے چھریرے بدن بانس جیسے قد والی نہال لمبے ڈگ بھرتی اندر آگئی۔ مایارانی نے پھر سے کمبل اوڑھ لیا۔

اگلے دو تین روز بڑے تکلیف دہ اور پریشان کن تھے۔ ہمیں سب سے زیادہ فکر ماہین ہی کی تھی۔ عمران دانش کی خوبی یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ ہر حال میں خوش رہتا تھا۔ ہر حال میں خوش رہنے کی صلاحیت تو عمران جونیئر میں بھی تھی مگر ماہین کے معاملے میں اکثر اس کی خوش باشی ناپید ہو جاتی تھی۔ آج کل وہ زیادہ وقت چپ رہتا جیسے کچھ خاص سوچ رہا ہو۔

اردگرد جو باتیں ہو رہی تھیں، وہ منوہر کے کانوں تک پہنچتی تھیں اور اس کی سمجھ میں بھی آتی تھیں اور ان سے پتا چلتا تھا کہ گندھارا کے سلسلے میں ہماری قربانی رائگاں نہیں گئی۔ وہ اپنے نومولود بچے اور شوہر سمیت کسی محفوظ مقام پر پہنچ گئی ہے۔

جب بھی موقع ملتا، مایارانی اکثر مجھ سے اور عمران سے باتیں کرنے لگتی۔ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کی نگاہوں میں آپوں آپ ایک پسندیدگی کی سی کیفیت ابھر آتی۔ ایک دن عمران نے پوچھا۔ ”اگر آپ آزاد ہوتیں تو کیا کرتیں؟“

وہ بلاتوقف بولی۔ ”سب سے پہلے تمہیں اور ماہین کو شادی پر مجبور کرتی۔ جیون بہت مختصر ہے۔ اس میں جو چیز مل رہی ہو، اسے پانے میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

عمران نے موضوع بدلا۔ ”مایارانی! ایک سوال پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں؟“

”میں اب مایارانی نہیں صرف مایا ہوں۔ مجھ سے آگیا لینے کی ضرورت نہیں۔“

عمران بولا۔ ”کہا جاتا ہے کہ سکا مرکی بے وفائی کے بعد آپ کو مرد ذات سے نفرت ہو چکی ہے؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”لیکن...... میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم...... ایک مرد کے لیے آپ کے جذبات تھوڑے سے مختلف ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی عمران نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ ان کی احسان مند ہوں۔ بس اتنا ہی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے گفتگو کا رخ پھر ماہین کی طرف موڑ دیا اور اس کے لیے اپنی شدید تشویش اور فکرمندی کا اظہار کرنے لگی۔

اسی دوران میں میم نائرہ نمودار ہوئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پینٹ اور دبیز چرمی جیکٹ میں تھی۔ اس کے عقب میں گونگا جہاناں کسی سرکاری ملازم کی طرح چلا آرہا تھا۔ اس کے کندھے پر پستول کا سیاہ ہولسٹر تھا۔ نائرہ کے ہاتھوں میں چند کاغذ تھے۔

اس نے بتایا کہ ان کاغذات کا تعلق میرے اور عمران کے مقدمے سے ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ کون سا مقدمہ تو وہ رواں انداز میں بولی۔ "تم پر تین نہایت سنگین الزامات ہیں۔ جب تم پاکستان میں تھے تم نے ایبٹ آباد میں ڈاکٹر شاریہ کو اتنا دہشت زدہ کیا کہ وہ برہنگی کی حالت میں بھاگی اور سیڑھیوں سے گر کر جاں بحق ہوئی۔ اسی واقعے میں رائے جی کا دستِ راست چاولہ بھائی بھی تمہارے ہاتھوں جان سے گیا۔ دوسرا الزام تم نے لاہور میں ڈاکٹر شاریہ کی بہن ڈاکٹر عامرہ کو دورانِ علاج اس بُری طرح دیوار سے پٹخا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی فریکچر ہوگئی اور وہ مفلوج ہو کر دائمی مریضہ بن گئی۔ تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لاہور میں ہی رائے صاحب کی وفادار ملازمہ افروزہ کو قتل کر کے پانی کے ٹینک میں پھینکا۔"

"کیا یہ صرف الزامات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کل تک تھے لیکن آج یہ ثابت ہو چکے ہیں اور جرم بن چکے ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے وہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "ان تینوں ثابت شدہ جرائم کے لیے رائے جی نے تمہیں سزائے موت سنائی ہے۔"

چند سیکنڈ تک ایک سناٹا سا رہا۔ میم مائرہ کے برطانوی نژاد چہرے پر ایسی سختی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تب وہ عمران کی طرف متوجہ ہوئی۔

"عمران! تم پر بھی اسی نوعیت کے تین چار الزامات ہیں...... بلکہ تھے...... جو اب ثابت ہو چکے ہیں، ہم تم دونوں کو صرف ان جرائم پر سزا دے رہے ہیں جو مکمل طور پر ثابت شدہ ہیں۔"

تب اس نے ان جرائم کی تفصیل بتائی۔ جس کے مطابق عمران کے ہاتھوں پر کم از کم پانچ افراد کا خون تھا اور پھر اس نے عمران کے لیے بھی سزائے موت کے الفاظ استعمال کیے۔

منوہر سنگھ پر الزام تھا کہ اس نے گندھارا کے فرار میں ہمارا ساتھ دیا۔ میم مائرہ کے مطابق منوہر سنگھ کا کیس زیرِ غور تھا اور اس کا حتمی فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ہم واقعی کسی خاتون جج کے روبرو کھڑے ہیں اور وہ ہمیں ہمارا انجام بتا رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ جادو رائے اور اس کا دستِ راست چاولہ ایسے ہی انداز میں اپنے مخالفین کی جان لیتے تھے۔ جیل جیسے ماحول میں سزائے موت کا سا منظر پیدا کرنا یقیناً رائے کا شوق تھا اور اپنے معتوب کو پل، پل موت کی طرف سرکتے دیکھ کر اس کے انتقامی جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ رائے کی ایک شکار انیلا آغا نامی جرنلسٹ کی سزائے موت میں ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

میم مائرہ سفاک لہجے میں بولی۔ "اگر تم دونوں کسی اور جگہ ہوتے تو تمہیں سیدھے سادے انداز میں گولی ماری جاتی یا پھندا لگایا جاتا۔ مگر تم یہاں لداخ کے اس برف زار میں ہو۔ کہتے ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ تمہاری سزا یہاں کے رواج کے مطابق یہاں کے رنگ ڈھنگ کی ہوگی۔" اس کے ساتھ ہی میم مائرہ نے شیطانی نگاہوں سے پتھر کی اس سل کی طرف دیکھا جہاں مقامی سزاؤں کی منظر کشی کی گئی تھی۔ تین پول اور تین مجرم۔ میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ زہرناک لہجے میں بولی۔ "تمہیں انہی سزاؤں میں سے کوئی ایک سزا دی جائے گی۔ اس کا فیصلہ بھی رائے صاحب ہی کریں گے۔"

☆☆☆

جس روز رائے کی طرف سے میم مائرہ نے ہمیں سزا سنائی، اُس روز سے ہمارے لیے ایک دلدوز ماحول تخلیق کر دیا گیا۔ ہمیں بعین یہی لگنے لگا کہ ہم سزائے موت کے مجرم ہیں۔ ہمارا کھانا قدرے بہتر کر دیا گیا۔ ہمیں ایک ایک اضافی کمبل بھی پہنچا دیا گیا۔ منوہر سنگھ کے لیے حالانکہ ابھی کوئی اعلان نہیں ہوا تھا مگر اس کے لیے بھی یہ سہولتیں فراہم کر دی گئیں۔ دوسرے روز چوکور چہرے والی تنومند ڈولما دو چھوٹے غالیچے لیے نمودار ہوئی اور انہیں تہ کر کے سلاخوں کے اندر سے ہم تک پہنچایا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری عبادت کے لیے...... تم اپنے دھرم کے مطابق اپنی بخشش کے لیے دعا وغیرہ مانگ سکتے ہو۔ تمہارے پاس اب تین چار دن سے زیادہ کا وقت نہیں ہے۔"

زمانے گزر رہے تھے جب میں نے اور میرے یار عمران دانش نے خوف کھانا چھوڑ دیا تھا...... ہمیں ڈرانے والے جانتے تھے کہ ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور کچھ ایسی ہی طبع عمران جونیئر کی بھی تھی۔ اس کا بھی یقین تھا کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ اگر عمران کو اس وقت ماہین کا غم لاحق نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے اور منوہر کو انڈین ایکٹروں کے لطیفے سنانے سے بھی باز نہ آتا۔ ماہین کی پریشانی نے اسے بے طرح جکڑا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے...... مسلسل...... اب بھی وہ ایسے ہی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرے سے تکلیف کے آثار ہویدا تھے۔

صبح کے وقت نہال کی ساتھی پہریدار ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ وہ بھی بہت کرخت چہرہ رکھتی تھی لیکن آج کچھ گم صم دکھائی دی۔ میں نے منوہر سے کہا۔ "اس سے پوچھو، کوئی خاص بات ہے؟"

منوہر کے سوال کے جواب میں وہ بولی۔ "تم دونوں کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔"

منوہر نے کہا۔ ”موت سے بُری خبر کیا ہوتی ہے اور وہ ہمیں مل چکی ہے۔“

”بڑی موت، زیادہ بُری خبر ہے۔ تم دونوں کے بارے میں بڑی موت کا فیصلہ ہوا ہے۔ پرسوں دوپہر سے پہلے اس فیصلے پر عمل ہو جائے گا۔“

میری نگاہ پتھر کی اس تختی کی طرف چلی گئی جس پر مٹے مٹے رنگوں والی قدیم تصویر موجود تھی۔ تیسرے پول کے ساتھ ایک بدنصیب شخص بندھا ہوا تھا اور بھوکے بھیڑیے اسے زندہ نوچ رہے تھے۔

پہریدار اور منوہر سنگھ کے درمیان ہونے والا مکالمہ، سامنے والی کوٹھڑی میں مایا رانی نے بھی سن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اندوہ کے بادل چھا گئے تھے۔

مایا رانی نے پہریدار سے استفسار کیا۔ ”تمہیں یہ خبر کہاں سے ملی ہے؟“

وہ ذرا مؤدب انداز میں بولی۔ ”یہ خبر کئی لوگوں کو معلوم ہو چکی ہے۔ باقاعدہ طور پر یہاں بھی پہنچ جائے گی۔“

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے میم مائرہ گونگے جہاناں کے ساتھ پھر نمودار ہوئی۔ اس نے ہمارے سامنے الفاظ کی صورت میں جو انگارے اگلے ان سے تصدیق ہوئی کہ شیطان صفت رامے نے ہمارے لیے ”بڑی موت“ کی سزا ہی چنی ہے۔

میم مائرہ نے مزید کہا۔ ”منوہر سنگھ کو بھی سزائے موت دی گئی ہے۔ لیکن اس سزا کو یہاں ”چھوٹی موت“ کہا جاتا ہے، یعنی سینے میں برچھی گھونپ کر سزا پر عمل درآمد کرنا...... بہرحال اس بُری خبر کے ساتھ منوہر سنگھ ولد دربار سنگھ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔ وہ اس سزا پر نظرِ ثانی کی ایک اپیل کر سکتا ہے۔“

غالباً رامے ابھی سوچ رہا تھا کہ منوہر کو مارے یا نہیں۔ ہماری پارٹی میں واحد شخص منوہر ہی تھا جو مقامی زبان سمجھ سکتا تھا۔ وہ واپسی کے سفر میں بھی جادو رامے اور میم مائرہ کا مددگار ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اپنا مطلب نکالنے کے بعد رامے اسے بھی اپنے قاتلانہ غضب کا نشانہ بنا ڈالتا۔

میم مائرہ نے اپنے سنہری مائل سرخ بالوں کو ہلکورا دے کر پیشانی سے ہٹایا اور پتھریلے لہجے میں بولی۔ ”کل سہ پہر کو تمہاری آخری ملاقات ہے جس جس سے ملنا چاہتے ہو، رات تک آگاہ کر دو۔“ اس کے بعد وہ ایڑیوں پر گھوم کر باہر نکل گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جادو رامے کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی ایذا رسانی سے لذت کشید کرنے لگ گئی ہے۔

☆☆☆

ہمارے بندی خانے کی کڑی نگرانی جاری تھی۔ نہال اور ایک دوسری پہریدار دو شفٹوں میں ڈیوٹی دے رہی تھیں۔ تاہم درمیان میں کہیں گونگا جہاناں یا رامے کا کوئی اور کارندہ بھی ایک دو گھنٹوں کے لیے ان دونوں پہریدار عورتوں کی جگہ لے لیتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دو پہریدار عورتیں آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اور عمران کو دوہرے استرے والی موٹی صدریاں (جیکٹس) دی تھیں تاکہ ”مرنے سے پہلے“ کی یہ راتیں ہم نسبتاً آسانی سے گزار سکیں۔ پرانی صدریاں جو بہت بوسیدہ بھی ہو گئی تھیں۔ ہم سے واپس لے لی گئی تھیں۔ بعد میں مایا رانی نے دل گرفتہ انداز میں انکشاف کیا کہ دستور کے مطابق یہ صدریاں بھیڑیوں کو سنگھائی جائیں گی تاکہ وہ اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکیں۔ مایا کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

شام کے کچھ ہی دیر بعد میں نے پہلی بار رامے کے انچارج گارڈ بہروز کو بھی دیکھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا آیا اور تضحیک آمیز نگاہوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ دردناک موت کو قریباً چالیس گھنٹے کی دوری پر دیکھ کر ہمارے ”حالات“ کیا ہیں۔

ہم پر نگاہِ غلط انداز ڈالنے کے بعد وہ مایا رانی کی کوٹھڑی کی جانب دیکھنے لگا۔ کچھ دن پہلے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بہروز کی طرف سے مایا رانی کے ساتھ کچھ غلط ہو سکتا ہے۔ غالباً جادو رامے اپنے اس اونچے لمبے سانڈ کو ایسے کاموں کے لیے استعمال کرتا رہتا تھا۔ اس کا ثبوت ہم دیکھ ہی چکے تھے۔ اپنے باکرے سے ناروا سلوک کرنے والی عورت کو رامے نے سزا کے طور پر بہروز کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اس سے بھی زیادہ بُرے سلوک کا شکار ہو۔ انصاف کا یہ جاہلانہ طریقہ قابلِ صد لعنت تھا۔ بہرحال بہروز کو بھی اپنے کیے کی سزا فوراً ہی ملی تھی۔ اگلے روز ہی وہ زہریلے زوب کے ڈنک کا شکار ہوا تھا۔ دو افراد مرے تھے۔ بہروز کی جان تو بچ گئی تھی مگر دو دن تک اسے خوفناک اذیت برداشت کرنا پڑی تھی۔ میں اور عمران دیکھ رہے تھے اس کی آنکھیں کچھ اندر دھنس گئی تھیں اور گہری پیلی تھیں۔ اس کے جسم کے کھلے حصوں پر گہرے سرخی مائل زرد دھبے نظر آ رہے تھے۔ چند ہی دنوں میں وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔

اب بھی مایا رانی کی طرف دیکھتے ہوئے بہروز کی زرد آنکھوں میں حریصانہ چمک نظر آتی تھی، تاہم اب وہ جسمانی طور پر اس قابل ہی نہیں تھا کہ ٹھیک سے چل بھی سکے۔ دو منٹ کھڑے رہنے سے ہی اس کا سانس پھولنے لگا تھا، وہ واپس چلا گیا۔

عمران نے کہا۔ ”ہم زوب کے لیے سانپ نما کا لفظ

استعمال کرتے رہے ہیں مگر اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ سانپ بچھو وغیرہ سے کہیں زیادہ زہریلا ہے۔"

"رامے سے بڑھ کر تو نہیں ہوگا۔" منوہر نے برفیلی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں سامنے پتھر کی تختی پر تھیں جہاں بھوکے بھیڑیوں والی تصویر کے موہوم خدوخال دکھائی دیتے تھے۔

"کچھ نہیں ہوگا منوہر سنگھ۔" عمران نے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے چاچو کو خدانخواستہ کسی ایسی حالت کا شکار ہوتے ہوئے دیکھوں۔" (آج اس کا موڈ کچھ بہتر تھا)

میں نے کہا۔ "میں بھی نہیں چاہتا کہ میرا بھتیجا اور عمران دانش کا بیٹا کسی ایسی اذیت کا شکار ہو لیکن تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ تم کیا کر سکتے ہو؟"

"دماغ میں ہانڈی پک رہی تھی جی...... تھوڑی بہت پک گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اچانک ذہن میں خیال آیا کہ عمران دانش کی طرح اس کے اس فرزند سے بھی جانور بہت جلد مانوس ہوتے تھے۔ میں پچھلے چھ مہینوں میں ایسے ایک دو منظر دیکھ بھی چکا تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ عمران کی یہ خاص صلاحیت ویسی نہیں جیسی عمران دانش میں تھی۔ اس کو تو ہم نے شیر، چیتے تک کو مطیع کرتے دیکھا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" عمران کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے بھیڑیوں والی مٹی مٹی، مدھم تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیں تم کوئی خیالی پلاؤ تو نہیں پکا رہے؟"

"کیا مطلب؟"

"یہ خاص سدھائے ہوئے بھیڑیے ہیں۔ ایسا سوچنا بھی بےوقوفی ہوگی کہ وہ تم سے یا ہم سے کوئی رعایت کریں گے۔"

وہ ہولے سے مسکرایا۔ "یہ تو میں بھی دیکھ چکا ہوں کہ وہ سخت نافرمان قسم کی مخلوق ہے اور میں نے کوئی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میں انہیں یا کسی دوسرے خطرناک جانور کو روک سکتا ہوں۔"

"تو پھر کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟"

"لپ ریڈنگ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "مجھے کچھ معلوم ہوا ہے۔"

میں اور منوہر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی بتانا ٹھیک نہیں ہے جی...... مجھے تھوڑا وقت دیں۔"

میرے اور عمران کے لیے جادو رامے نے سزائے موت کا جو ماحول تخلیق کیا تھا، وہ لحہ بہ لحہ گمبھیر ہوتا چلا گیا۔ اگلے روز صبح کے وقت ہم سے ہماری من پسند غذا کے بارے میں پوچھا گیا اور یہ بھی یاد دلایا گیا کہ ہم دونوں اپنے جن ساتھیوں سے آخری ملاقات کرنا چاہتے ہیں، ان کے نام دیں...... تاکہ سہ پہر کے وقت ملاقات کرائی جا سکے۔ جس وقت یہ سوال پوچھا جا رہا تھا۔ عمران بڑے اطمینان سے ایک طرف بیٹھا تھا۔ زہریلے انداز میں سلاخوں کے پار دیکھ کر مجھ سے سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "آخری ملاقات کے لیے ایشور یا رائے کا نام لکھ دوں تو کیسا رہے؟ نہ وہ کالا کلوٹا ابھیشک اسے آنے دے گا، نہ ہمیں سزا ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "مذاق کرنے کی کوشش تو کر رہے ہو مگر چہرہ بتا رہا ہے کہ تشویش تمہاری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے پاس بس آج کا دن ہی ہے۔"

منوہر سنگھ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور دہرا کمبل لپیٹ کر سردی کو بھگانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

نہال آج ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اب گونگا جہاناں نگرانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ طاقتور اے کے 57 رائفل اس کی گود میں تھی اور وہ ہماری سلاخوں سے دور محفوظ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اونگھ بھی لیتا ہے۔ مایا رانی سامنے والی کوٹھری میں کمبل اوڑھے کروٹ لیے سو رہی تھی۔ اس کا رات والا کھانا بھی سلاخوں کے پاس ہی پڑا تھا۔

عمران اب کچھ بےچین نظر آنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب کچھ بتانے کے موڈ میں ہے۔ وہ کچھ دیر تک ہماری مستطیل بیرک نما کوٹھری کے نیم تاریک کونے میں کچھ ٹٹولتا رہا، پھر تیزی سے میری اور منوہر کی جانب آیا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔" وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" میں اور منوہر قریباً ایک ساتھ بولے۔

"وہاں راستہ ہے۔" اس نے نیم تاریک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک پتھر ہے جو ویسے ہی دھرا ہے۔ اسے کوشش کر کے اٹھایا جا سکتا ہے۔" عمران کی آواز میں جذباتی لرزش تھی۔

میں نے چونک کر سلاخوں کے پار دیکھا۔ لمبی تڑنگی نہال واپس نہیں آئی تھی۔ صرف گونگا بہرا جہاناں موجود تھا، اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے عمران کی بات پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

"وہاں زمین کے نیچے راستہ ہے...... لیکن...... آپ ابھی

بیٹھے رہیں۔" اس نے تیزی سے کہا...... اور منوہر کو بھی بٹھا دیا۔ گونگا جہاناں خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ دائیں طرف والی بیرک سے ان عورتوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، جنہیں مایارانی سے وفاداری کی پاداش میں پکڑا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب گونگا جہاناں اٹھ کر دوسری طرف گیا تو عمران نے مجھے اور منوہر کو اشارہ کیا، ہم اٹھ کر بیرک کے نیم تاریک گوشے کی طرف بڑھے۔ مجھے عمران کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ عمران بالکل کونے پر پہنچ کر رک گیا۔ ایک چوکور پتھر پر اپنا پاؤں مار کر بولا۔ "یہ ہے وہ پتھر...... لیکن اسے اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاسکتا۔"

"ہلایا کیوں نہیں جاسکتا۔" منوہر نے پوچھا۔

"کیونکہ اس کے نیچے کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے جھنجلا کر سرگوشی کی۔

عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انکشاف کیا۔ "جہاناں گونگا بہرا نہیں ہے...... وہ سب کچھ سن سکتا ہے۔"

یہ تہلکہ خیز انکشاف تھا...... مگر میری سمجھ میں آ گیا اور جب سمجھ میں آ گیا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں نے عمران کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے ابھی تھوڑی دیر میں یہ لوگ ہماری اس بیرک میں داخل ہو جائیں گے۔"

"اور یہی وقت ہمارے لیے قسمت آزمانے کا ہوگا۔" عمران نے جواب دیا۔

اب بات کچھ کچھ منوہر کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ہیجان نظر آنے لگا۔ ہمارے ساتھ یہاں وہی سلوک ہو رہا تھا جو خطرناک ترین...... ان گھڑ درندوں سے ہوتا ہے۔ آہنی دروازے پر دو دو جہازی سائز کے قفل تھے۔ ہماری آہنی سلاخوں سے حتی الامکان دور رہا جاتا تھا اور کھانا بھی تقریباً پھینکا جاتا تھا لیکن اب حیران کن طور پر یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ بیرک کا دروازہ کھولا جاتا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ہم سوچ رہے تھے۔ یکا یک بھاگتے قدموں کی آواز ابھری۔ ہٹی کٹی ڈولما قریباً پندرہ فی میل اور میل گارڈز کے ساتھ دروازے پر نمودار ہوئی۔ پہریداروں کی دہاڑوں سے فضا گونج اٹھی۔ مایارانی سمیت سب جاگ گئے اور سلاخوں سے لگ کر ہماری بیرک کی طرف دیکھنے لگے۔ بڑے بڑے آہنی قفل کھولنے سے پہلے، ہمیں گن پوائنٹس پر ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا اور گھٹنوں کے بل کرنے کے بعد اوندھا لیٹنے کا حکم دیا گیا۔ منوہر سنگھ نے بات نہیں مانی تو ڈولما نے بلا جھجک اس کے گھٹنوں کے بالکل پاس فائر کیے۔

میں نے اشارہ کیا اور منوہر بھی میری اور عمران کی طرح یخ بستہ فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ دروازہ کھول کر ڈولما، اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ دندناتی ہوئی اندر گھسی اور یہی ایک موقع تھا ہمارے حرکت میں آنے کا...... اور ہم آ گئے۔ میں اور عمران ایک ساتھ اٹھے، میں سیدھا ڈولما پر آیا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کر گھمایا اور دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی رائفل کا بیرل تھام لیا۔ یہ سیکنڈ کے دسویں حصے کا کھیل تھا، ڈولما کی انگلی نے بے ساختہ ٹریگر دبایا...... تب تک بیرل کا رخ آہنی سلاخوں کی طرف ہو چکا تھا۔ سیون ایم ایم کی گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور ڈولما کے کئی ساتھیوں کو چاٹ گئی۔

ڈولما نے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر چوٹ لگانا چاہی مگر اس کا واسطہ ماضی کے مہان فائٹر جیکی باروندا کے شاگرد سے پڑا تھا۔ میں نے نہ صرف چہرہ بچایا بلکہ اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے سر کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ اب یقیناً ایک لاش تھی۔ میں نے اس لاش کو ڈھال کی صورت اپنے سامنے رکھا اور اس کی سیون ایم ایم کا رخ اس کی ساتھیوں کی طرف کر دیا۔ شعلے چمکے اور دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔

میں نے دیکھا عمران "گونگے" جہاناں سے برسرپیکار تھا۔ مجھے پہلی بار جہانے کی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہوا۔ یکا یک اس نے عمران کو اپنی ٹانگوں پر اچھالا اور وہ جیسے ہوا میں اُڑتا ہوا بیرک سے باہر جا گرا۔ یہ ایک لحاظ سے اس کے لیے اچھا ہی ہوا کہ ایک رائفل اس کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ تڑپ کر ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ تنومند ڈولما میری ڈھال تھی اور کئی مزید گولیاں اس کے جسم میں داخل ہو چکی تھیں۔ میں اسے گھسیٹتا اور فائر کرتا ہوا عمران کے پہلو میں آن بیٹھا۔

"منوہر کو گولی لگ گئی ہے۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ منوہر سنگھ لہولہان تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس کی پگڑی کھل چکی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ بھی دیوار کی اوٹ لیے ہوئے تھا۔ "منوہر ٹھیک ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

وہ زبردستی مسکرایا۔ "ابھی تک تو ٹھیک ہوں...... آگے داہگرو جانے۔"

میں نے ڈولما کے بے جان جسم کو دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ ہم پر تین اطراف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ غار کی کسی قریبی شاخ میں بھیڑیوں کی آوازیں تہلکہ خیز تھیں۔

"عمران اس سے پہلے کہ مزید گارڈز آ جائیں، یہاں

سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' میں نے کہا۔
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ماہین اور ہما کو محفوظ کرنا چاہیے۔''
منوہر نے بھی تائید کی۔ اس نے اپنے پیٹ کو ایک جانب سے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ماہین کو کہاں رکھا گیا ہے...... ایک طرح سے سب سے زیادہ خطرے میں وہی تھی۔ ریموٹ کنٹرول کے بٹن پر ایک ہلکا سا دباؤ اس کے کومل جسم کے چیتھڑے اُڑا سکتا تھا۔ یہ ریموٹ کنٹرول راما، مائرہ یا بہروز کسی کے پاس بھی ہو سکتا تھا۔ میں اور عمران بھاگتے ہوئے اس گھروندے نما کمرے میں داخل ہوئے جہاں ماہین مقید تھی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ بستر خالی پڑا تھا۔ گھروندے کی گول چھت کے نیچے منظر کچھ ایسا تھا جس نے ہمیں بے طرح چونکا دیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے یہاں سخت قسم کی دھینگا مشتی ہوئی ہے...... نہال...... لمبی تڑنگی مرد نما عورت بستر کے قریب اس حالت میں پڑی تھی کہ اس کی شہ رگ کسی تیز دھار آلے سے کٹی ہوئی تھی اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ فرش کے نمدے پر اس کا لہو دور تک پھیلا تھا۔ اس کے مردہ چہرے پر کئی ضربات بھی دکھائی دے رہی تھیں جو یہاں ہونے والی مارا ماری کا بین ثبوت تھیں۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے ماہین کچھ ہی دیر پہلے اس کو مار کر یہاں سے نکل گئی ہے۔''
''مگر وہ کہاں جا سکتی ہے۔ جہاں بھی ہوگی بم اس کے ساتھ ہوگا۔'' عمران نے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔
یہی وقت تھا جب ایک بار پھر ہم پر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ ہم بھی مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر جواب دینے لگے۔ تب میری نظر ساتھ والے کمرے میں گئی۔ یہ ایک طرح سے اس کمرے کا داخلی راستہ تھا۔ یہاں بھی ایک عورت زخمی حالت میں پڑی تھی۔ اس کے سینے پر بھی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ عمران نے اسے ٹانگ سے گھسیٹ کر گھروندے کے اندر کر لیا۔
''ہو سکتا ہے کہ اس پر بھی ماہین نے ہی وار کیا ہو۔'' عمران نے کہا۔
''منوہر اس سے کچھ پوچھو۔'' میں نے سیون ایم ایم رائفل سے سنگل فائر کرتے ہوئے کہا۔
عمران بھی اپنی رائفل سے گاہے بگاہے فائر کر کے حملہ آوروں کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران کو جو رائفل ملی تھی، اس کے ساتھ ایمونیشن والا بیگ بھی تھا اور یہ بہت مثبت پوائنٹ تھا۔
منوہر سنگھ جو خود بھی زخمی تھا، زخمی عورت سے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا۔ وہ بس خون تھوک رہی تھی اور منہ میں منمنا رہی تھی۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ گولیاں اب خطرناک زاویوں سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم ان لمحوں میں بھی عمران کے چہرے کی طمانیت و بشاشت بڑی حد تک برقرار تھی اور مجھے عمران دانش کی یاد دلا رہی تھی۔
اسی دوران میں خطرناک زاویے سے آنے والی دو گولیاں اس زخمی عورت کو چاٹ گئیں جس سے منوہر کچھ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔
''کچھ بتایا اس نے؟'' عمران نے کھڑکی کے گول سوراخ میں سے ایک چھوٹا برسٹ چلاتے ہوئے پوچھا۔
منوہر نے جو جواب دیا، اس سے پتا چلا کہ وہ زیادہ کچھ تو نہیں جان سکا...... لیکن یہ اندازہ اسے ہو گیا ہے کہ مرد نما عورت...... یا عورت نما مرد نہال نے ماہین کے ساتھ بند کمرے میں دست درازی کی کوشش کی اور نتیجے میں ماہین اس سے بھڑ گئی اور اس کا گلا کاٹ کر نکل گئی۔ ابھی چند لمحے پہلے مرنے والی مقامی گارڈ بھی ماہین ہی کی زد میں آئی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ماہین نے کیا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جب جان اور آبرو پر بن جائے تو انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے۔
یہ سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ میں نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہلے سے شک تھا کہ یہ نہال نامی بلا، ماہین کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرے گی......''
عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''گندھارا کے فرار کے وقت اسے میرے ہاتھوں زک اٹھانا پڑی تھی۔ مجھے بھی یہی ڈر تھا۔''
عمران کا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ دو گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی عقبی دیوار میں پیوست ہو گئیں۔ بہت سی پتھریلی برف اچھل کر ہمارے چہروں سے ٹکرائی۔
''عمران!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
وہ بھی دیدے گھما کر رہ گیا۔ زخمی منوہر سنگھ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا اور خاص طور سے مجھے...... جیسے سوچ رہا ہو کہ ان سنگین ترین حالات میں بھی میں اطمینان کے ساتھ عمران سے مکالمہ کر رہا ہوں۔ لڑنا مرنا میری ہابی بن چکا تھا اور اب ثروت کے دنیا سے جانے کے بعد تو مجھے کچھ اور بھی آزادی محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ موجودہ لڑائی تو مجھے کچھ اور بھی زیادہ کشش کر رہی تھی کیونکہ اس لڑائی سے ثروت کی بے وقت موت کے انتقام کا راستہ بھی نکلتا تھا۔ ثروت جوودا کے نام پر قاتل زہر کا شکار ہوئی۔

☆☆☆

اب سہ پہر ہونے والی تھی...... ہمیں اس گنبد جیسی چھت والے برفانی کمرے میں محصور ہوئے چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہو چکا تھا مگر ہم نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی۔ ہم بڑی احتیاط اور کفایت شعاری کے ساتھ فائر کر رہے تھے۔ یقیناً ہمیں گھیرنے والے بھی جانتے تھے کہ ہمارے پاس محدود ایمونیشن ہے۔ وہ ہماری گولیاں ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

منوہر سنگھ کا بہت سا خون ضائع ہو چکا تھا مگر وہ اپنی ہمت برقرار رکھے ہوئے تھا، کسی وقت لگتا تھا کہ اس کی سانس اُکھڑنے لگی ہے مگر پھر سنبھل جاتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے شیطان صفت جادورامے کسی قریبی گھروندے میں موجود تھا۔ وہ ہم پر بہت گرج برس کر گیا تھا اور ہمیں ہتھیار ڈالنے کی آخری وارننگز دی تھیں۔ بہرحال ایک بات بڑی اچھی طرح سمجھ میں آچکی تھی اور یہ بڑی مثبت بات تھی۔ ماہین ان لوگوں کے پاس نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو وہ اب تک اسے ہمارے سامنے لا چکے ہوتے اور بلیک میلنگ کا راستہ ہموار کر چکے ہوتے۔ غالب امکان یہی تھا کہ مرد نما نہال کو جان سے مارنے کے بعد وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی ہے اور اب غالباً اتنے فاصلے پر ہے کہ وہ ریموٹ کنٹرول جو اس کی جان لے سکتا تھا، بے کار ہو چکا ہے۔

عمران نے گولیاں گنتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس صرف تیس رہ گئی ہیں، چار پانچ میگزین میں ہیں۔“

”میرے پاس چھ ہیں۔“ میں نے کہا۔

منوہر کا پستول کب کا خالی ہو چکا تھا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“ عمران نے اپنی نگاہیں سامنے مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان لوگوں نے ابھی تک حشام اور ہما کو یرغمالیوں کے طور پر استعمال نہیں کیا؟“

”میرے لیے بھی یہی بات زیادہ پریشانی کی ہے۔“

عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں کی خاموشی گمبھیر تھی۔ یہ خدشہ بلکہ شدید خدشہ اپنی جگہ موجود تھا کہ اس خونی ہنگامے اور بھاگ دوڑ میں ان دونوں کی جان جا چکی ہو...... یہ بہت اندوہ ناک خیال تھا مگر بے محل نہیں تھا۔

ایمونیشن کے لحاظ سے دیکھا جاتا تو ہم مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا نکال سکتے تھے، مگر منوہر سنگھ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، گھیرا بھی تنگ ہو رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کسی بھی وقت مستقل میل اور فیل میل گارڈز ایک بھرپور حملہ کر دیں گے۔ ڈولما اور نہال کی موت نے انہیں غضب ناک کر دیا تھا۔

آگے کیا ہوگا؟ فی الحال کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ خود کو سرخ تپتی بھیڑیوں سے زندہ بچانے کے بجائے مقابلہ کرتے ہوئے مرنا زیادہ سہل ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنی پروا نہ ہونے کے برابر تھی...... مگر جب عمران کی طرف دیکھتا تھا تو میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ عمران دانش کی صورت میرے سامنے آجاتی تھی۔ اس کی شیریں آواز اور اس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے تھے...... اپنی کمی پوری کرنے کے لیے اسے تمہارے پاس بھیجا ہے...... بس تیری تھوڑی سی توجہ اور تربیت کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھنا یہ تیرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو جائے گا۔ ساری پرانی یادیں تازہ کر دے گا۔

مگر لگ رہا تھا کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میرے وہ بھیانک اندیشے ایک بار پھر پوری شدت

## سردار جی کی عقل مندی

ایک سردار ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ محلے والے ڈھول کی اونچی آواز سے تنگ ہو رہے تھے۔ ایک ہمسایہ بھنگڑا ڈالنے والے کے گھر گیا اور پوچھا۔

”سردار جی...... کیہہ گل اے، ایہہ بھنگڑا کس خوشی وچ پارے او؟“

سردار جی نے ناچتے ناچتے جواب دیا۔ ”ساڈے بھائی بہادر سنگھ...... فوت ہو گئے نیں، ایس واسطے!“

ہمسائے نے حیران ہو کر کہا۔ ”سردار جی...... اک تہاڈا بھرا مریا اے، اتوں تسی بھنگڑا پارئے او؟ ایہہ کوئی خوشی دا ویلا اے؟“

سردار جی نے کہا۔ ”بھرا جی...... ساڈے واسطے تے ایہہ خوشی دا موقع اے!“

ہمسائے نے حیرت سے پوچھا۔ ”اوہ کس طراں؟“

دیکھو جی...... پوری دنیا کہندی اے سکھ بے وقوف ہندے نیں او ہنا دا دماغ نئیں ہوندا...... بھائی صوری دماغ دے کینسر نال مرے نیں...... اج پہلی واری ثابت ہو گیا اے کہ سکھاں دا وی دماغ ہوندا اے...... ورنہ کینسر نہ ہوندا، تسی جاؤ ساناں بھنگڑا پاندیو!“

تھرپارکر سے سائیں داد کی شوخیاں

سے اُبھر آئے جو مجھے بتاتے رہتے تھے کہ عمران دانش نے اسے میرے پاس بھیج کر غلطی کی ہے۔ وہ بھی باپ کی طرح مجھے جدائی کا غم دینے والا ہے۔

آہ...... اگر ایسا ہو گیا تو میں یہ کیسے برداشت کر پاؤں گا...... کیسے؟ اگر واقعی اس برف زار میں آس شیطان کی آنت جیسے وسیع وعریض غار میں ان سفاک لوگوں کے درمیان موت ہی ہمارا مقدر ہے تو پھر مجھے پہلے مرنا چاہیے۔

اسی دوران میں قریب آتے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے عمران کو اوپر تلے دو برسٹ چلانا پڑے۔ ایک لاش تو گری مگر حملہ آور بالکل قریب آ گئے۔ تین گولیاں میں نے بھی چلائی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں ہمارا قیمتی ایمونیشن نصف کے قریب رہ گیا تھا۔ مخالف سمت سے آنے والا ایک پورا برسٹ اس بستر میں پیوست ہو گیا جس پر ماہین سوتی رہی تھی۔ آئل لیمپ چکنا چور ہو کر بستر پر گرا اور بستر دھوئیں کے ساتھ سلگنا شروع ہو گیا۔ منوہر کی سانس پہلے ہی اکھڑ رہی تھی، دھوئیں نے اسے تقریباً قریب المرگ کر دیا۔ حملہ آوروں کی وحشی چنگھاڑیں بتا رہی تھیں کہ اب یہ مزاحمت زیادہ دیر چلنے والی نہیں۔ میں نے سوچا۔ کاش ان لمحوں میں مجھے شیطان صفت جادورامے کی شکل نظر آ جائے اور میں اپنی سیون ایم ایم کی آخری تین گولیاں اس کے ہانڈی جیسے کھوپڑے میں اتار دوں۔ وہ کھوپڑا جس میں دنیا کا نہایت سازشی اور عیارترین مغز بھرا ہوا تھا۔

مگر وہ مجھ سے بہت دور تھا اور موت کی پرچھائیاں بہت قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ کیا ثروت کا انتقام بھی ادھورا رہ جائے گا...... میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا...... اور قریباً یہی لمحات تھے جب مجھے کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے اردگرد کچھ بدل رہا ہے...... کچھ بدلنے والا ہے۔ فائرنگ اچانک ہی نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ اور طرح کی آوازیں اور آہٹیں ابھرنے لگیں۔ اب فائرنگ کی آوازیں غار کے دہانے کی طرف سنائی دینے لگی تھیں اور یہ بہت شدید آوازیں تھیں۔

”لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔“ عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے منوہر کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔“ میں نے رائے ظاہر کی۔

بستر اور دیگر اشیا اب جلنا شروع ہو گئی تھیں۔ برف کی گول چھت سے پانی کے قطرے ٹپکنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی والی رائفل بھی عمران کو تھما دی۔ جھک کر منوہر کو کندھے پر اٹھایا اور ہم ایک سرنگ جیسی راہداری سے گزر کر طامبورہ والی کشادہ جگہ کی طرف آ گئے۔ ایسے میں ہمیں ایک دو لاشیں بھی پھلانگنا پڑی تھیں۔ یہی وقت تھا جب دستی بموں کے تین چار دھماکے سنائی دیے اور فائرنگ میں مزید شدت آ گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کوئی دوسرا گروہ ہے جس نے یہاں ہلّا بولا ہے۔

مجھے ایک محافظ لاش کے پاس سے بھری ہوئی ٹرپل ٹو رائفل اور اس کے دو لوڈڈ میگزین مل گئے۔ ہم نے منوہر کو ایک نمدے پر لٹایا اور خود بڑی اچھی جگہ پر پوزیشن لے لی۔ منوہر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس کی جیکٹ خون سے تربتر تھی۔

”کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟“ عمران نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ کوئی باغی دھڑا......“ مگر فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میری نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی تھی جس کے یہاں موجود ہونے کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ شخص ان حملہ آوروں میں سے تھا جو ابھی یہاں پہنچے تھے...... وہ ایک دیوار کی اوٹ سے نکلا تھا اور اس نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تھی...... میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ ارب پتی ڈیرن فورڈ کا ذاتی جاپانی گارڈ تھا۔ میں اسے بخوبی پہچانتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیرن فورڈ جسے رامے اور مائرہ لاہور کی نامعلوم عمارت میں مقید چھوڑ آئے تھے، کسی طرح وہاں سے رہائی پا گیا ہے اور سیکڑوں میل دور یہاں لداخ آن پہنچا ہے......

میں نے عمران کو اس بارے میں بتایا۔ وہ بھی ششدر نظر آیا۔ اگلے قریباً پانچ منٹ میں وہاں گھمسان کا رن پڑا اور ہمارا یہ شک بھی بالکل درست ثابت ہو گیا کہ ارب پتی ڈیرن فورڈ بنفسِ نفیس یہاں موجود ہے۔ یہاں جو تہلکہ خیز شوٹ آؤٹ ہوا اس میں ہم نے بھی ڈیرن اور اس کے ساتھیوں کا ساتھ ہی دیا۔ قریباً دس منٹ تک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجتی رہی۔ پھر صاف پتا چلا کہ نووارد غالب آ گئے ہیں۔ جادورامے اور میم مائرہ کو شکست ہو گئی ہے...... اس شکست کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ یہاں کی سردار محافظ ڈولما یہ لڑائی شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ہلاک ہو چکی تھی۔

چند منٹ بعد فائرنگ بالکل تھم گئی۔ ڈیرن فورڈ کے جاپانی گارڈ سمیت اس کے کئی دیگر ساتھیوں نے بھی دیکھا تھا کہ ہم نے دس منٹ کی اس تابڑتوڑ فائرنگ میں جادورامے کا نہیں بلکہ ان کا ساتھ دیا ہے۔ فائرنگ رکتے ہی ہم نے منوہر سنگھ کو فوراً ایک مقامی طرز کے چوبی اسٹریچر پر ڈالا اور غار کے اس حصے کی طرف لپکے جہاں میم مائرہ نے ضرورت کی ادویات کا اسٹاک کر رکھا تھا۔ احمد کامران بھی وہیں پر نظر آیا کرتا تھا۔ لیکن جب ہم اپنے مریض کو لے کر وہاں پہنچے تو کامران پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔ دو

گولیاں اس کی کمر میں لگی تھیں اور وہ ایک دس بارہ سالہ مقامی بچے کی لاش کے پاس ہی اوندھا پڑا تھا۔

ادویات بے شمار تھیں مگر ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ان میں سے کون سی دوا یا کون سے انجکشنز ہمارے ساتھی کی جان بچانے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

"کیا کیا جائے عمران؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

میں نے چونک کر ہنس مکھ منوہر سنگھ کی طرف دیکھا۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ جا چکا تھا۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ اس کی نبض ٹٹولی اور پھر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

"مجھے حشام اور ہما بھی کہیں نظر نہیں آ رہے؟" عمران نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"چلو ڈھونڈیں۔" میں نے جواب دیا۔

کہنے کو تو میں کہہ رہا تھا کہ "چلو ڈھونڈیں......" مگر پتا نہیں کیوں، یہ لگ رہا تھا کہ شاید ان کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً رامے اور مائرہ پہلے ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے اور عمران کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیتے۔ ہم دوبارہ غار کے مرکزی حصے کی طرف بڑھے تو میں نے خوش پوش ڈیرن فورڈ کو اپنے گارڈز کے جلو میں طامبورہ کی طرف آتے دیکھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ یہ سیاہ سوٹ اس کے لمبے قد پر جچتا تھا۔ درمیانی عمر میں بھی اس امریکی کا جسم چھریرا تھا اور ہلکی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک لشکارے مارتی تھی۔ وہ یک ٹک ہماری طرف دیکھنے لگا۔ یہ عمران اور میں ہی تھے جنہوں نے اسے راولپنڈی کے ایک گورا قبرستان سے خوبرو ایلی سمیت اغوا کیا تھا اور رامے کے پاس پہنچایا تھا۔

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر انگلش میں بولا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ اپنے اغوا کار سے میری ملاقات، ایسے اور ان حالات میں ہوگی۔"

"مجھے بھی امید نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "ایلی کہاں ہے؟"

"وہ یہیں پر ہوگی، لیکن ہمیں اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ ہم تو خود رامے اور مائرہ کے قبضے میں تھے۔ وہ ہمیں جان سے مارنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔"

اسی اثنا میں ایک جانب سے بلند آواز میں چلّانے کی نسوانی آواز آئی۔ ہم نے گھوم کر دیکھا۔ یہ نابینا ایلی تھی۔ اسے ڈیرن کے ایک سفید فام گارڈ نے سہارا دے رکھا تھا۔ یقیناً وہ یہاں پر ڈیرن کی آمد سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ پکار رہی تھی۔ "ڈیرن...... ڈیرن" اور رو رہی تھی۔ ڈیرن اس کی طرف لپکا اور اسے گلے سے لگایا۔ غالباً ڈیرن کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ ایلی کو آنکھوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔

میں نے دیکھا طامبورہ کے آس پاس بھی کئی لاشیں موجود تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر ڈولما کے ساتھیوں اور رامے مائرہ کے گارڈز کی تھیں۔ ان لاشوں میں سے ایک لاش قابلِ ذکر تھی۔ یہ کبڑی تورما چھائی کی لاش تھی۔ وہ لکڑی کے بنے ہوئے ایک چوڑے چکلے دیوتا (بت) کے پیچھے جان بچانے کے لیے چھپ گئی تھی۔ وہ اسے کیسے بچاتا، وہ تو خود لکڑی کا تھا۔ لائٹ مشین گن کا ایک پورا برسٹ اس میں سے گزرا تھا اور چند گولیاں تورما چھائی کے حصے میں بھی آ گئی تھیں۔ تورما، جس میں جینے کی خواہش نوجوانوں سے بھی زیادہ تھی، مردہ پڑی تھی۔ اسی اثنا میں ایک جانب سے خوش قامت مایا رانی نمودار ہوئی۔ دو سفید فام گارڈز اس کے دائیں بائیں تھے۔ وہ بھی بندی خانے سے باہر آ چکی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "ماہین کہاں ہے؟"

"اس کا کچھ پتا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لگتا یہی ہے کہ وہ شاید...... یہاں سے بھاگ نکلی ہے......"

"اور وہ تمہارے ساتھی، حشام وغیرہ......؟"

"ان کا بھی ابھی کچھ پتا نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

مایا رانی بے قراری سے بولی۔ "معلوم ہوا ہے کہ وہ راکھشس رامے اور مائرہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہیں بچنا نہیں چاہیے۔"

عین اسی لمحے یہی بات ڈیرن فورڈ نے بھی انگلش میں کہی۔ "وہ باسٹرڈ رامے اور مائرہ یہاں نہیں ہیں۔ وہ فرار ہو گئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ساتھیوں کو ان کی تلاش کے لیے مختلف ہدایات دینے لگا۔

مایا رانی یقیناً ہم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے یہاں آ کر سارا پانسا پلٹا ہے۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے ڈیرن اور اس کے درجنوں مسلح ساتھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تاہم وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فی الوقت سب سے اہم کام مفرور جادو رامے کی تلاش ہے۔ اس نے فوراً اپنے ذاتی دستے کے ارکان کو حکم دیا کہ وہ تلاش کے سلسلے میں سفید فام گارڈز کی مدد کریں۔

اسی دوران میں طامبورہ کی جانب بھیڑیوں کی ہولناک آوازیں گونجنے لگیں۔ مایا رانی کے چار وفادار ملازم قریباً آٹھ عدد بھیڑیوں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ان جانوروں کے رنگ سرخی مائل تھے۔ ان کی زنجیریں ملازموں کے ہاتھوں میں

تھیں۔ مایا رانی کی ہدایت کے مطابق ایک اونی ٹوپی اور قدرے میلی جرابوں کے دو جوڑے بار بار بھیڑیوں کی تھوتھنیوں کے ساتھ لگائے گئے تو بے چین بھیڑیے کچھ اور بے چین ہونے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہ اشیا رامے کی ہیں اور ان کی بُو باس اس کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے۔ یہ عمل کچھ دیر جاری رہا، پھر رکھوالے بھیڑیوں کو لے کر ایک جانب چلے گئے۔

وقتی طور پر حشام اور ہما کا خیال چھوڑ کر میں نے عمران کو ساتھ لیا اور دوڑتا ہوا غار کے دہانے کی طرف آیا۔ ہر طرف بارود کی بُو محسوس ہوتی تھی۔ غار سے باہر مطلع ابر آلود تھا مگر شام کا اندھیرا ابھی کافی دور تھا۔ ہم اس چار دیواری کی طرف آئے جہاں دن کے وقت برف پر پھسلنے والی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان میں سے ایک بالکل ریڈی تھی۔ کتے بھی جتے ہوئے تھے۔ ہم کوئی وقت ضائع کیے بغیر ایک گاڑی پر چڑھے اور کتوں کو ہنکا کر احاطے سے باہر لے آئے۔

ایسی گاڑیوں کو چلانا عموماً زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ کتے اور رینڈیئرز وغیرہ سدھے ہوئے ہوتے ہیں اور مشاق بھی...... وہ راستوں سے بھی بڑی اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ عمران نے باگیں تھام کر منہ سے ٹخ ٹخ کی مخصوص آواز نکالی اور کتے حرکت میں آگئے۔

اگلے قریباً دو ڈھائی گھنٹے سخت بھاگ دوڑ کے تھے۔ سردی رگوں میں خون جما رہی تھی اور ہم برف زار میں مفرور رامے اور اس کی عیار پارٹنر مائرہ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ یقیناً اور لوگ بھی ان کی تلاش میں تھے۔ اطلاع یہ تھی کہ وہ بھی ایک گاڑی پر ہی فرار ہوئے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ ہم غار سے سات آٹھ کلومیٹر دور آچکے ہیں۔'' عمران نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔

''اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے ہمیں پلٹنا ہوگا' ورنہ راستہ بھول سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

یکایک ایک برفیلے ٹیلے کے عقب میں دور تک گئی ہوئی برف کی سفید چادر کے اوپر مجھے ایک سیاہ نکتہ سا نظر آیا۔ میری نظر کا تعاقب کر کے عمران نے بھی یہ نکتہ دیکھا اور پھر لگام کو حرکت دی۔ چھ عدد تیز رفتار کتوں نے اشارہ پاتے ہی اپنا رخ موڑا اور اس جانب بڑھے۔ عمران کے ساتھ جانوروں کی لگاوٹ محسوس کی جانے والی چیز تھی۔ ہمیں ان کتوں کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے ہی بیتے تھے مگر ایسا لگنے لگا تھا کہ وہ مہینوں سے اس کے ساتھ مانوس ہیں۔ چند ہی منٹ میں ہم ایک سنسان نشیب میں موجود تھے۔ ہمیں یہاں جو چیز نظر آئی، وہ برف میں بری طرح پھنسی ہوئی ایک گاڑی تھی۔ اسے کھینچنے والے کتے بھی شاید زور لگا لگا کر تھک چکے تھے، اب خاموش کھڑے تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہی رامے اور مائرہ والی گاڑی ہے۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھ کر ہی کہیں دائیں بائیں ہو گئے ہوں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا اور اس کے ساتھ ہی نشست کے نیچے سے ٹرپل ٹو رائفل نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔

عمران تیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک جگہ برف پر قدموں کے مدھم نشان نظر آئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گاڑی کو یہاں پھنسے ڈھائی تین گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ گاڑی میں ایک بڑی ٹارچ موجود تھی۔ عمران نے ٹارچ روشن کی اور ہم گاڑی سے اتر آئے۔ کتے بری طرح ہانپ رہے تھے۔ میں نے انگلی رائفل کے ٹریگر پر رکھ لی تھی اور عمران ٹارچ کے روشن دائرے کی مدد سے برف پر قدموں کے نشان ڈھونڈ رہا تھا۔ ''یہ دیکھیں جی۔'' اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ دو بندوں کے پاؤں کے نشان ہیں...... اور ان میں سے ایک بندی لگتی ہے۔''

''اگر یہ واقعی رامے اور مائرہ ہیں تو ممکن ہے کہ گاڑی پھنسنے کے بعد آس پاس ہی کہیں چھپ گئے ہوں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

ہم بڑی احتیاط سے پھنسی ہوئی گاڑی کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ یہی وقت تھا جب بلندی پر ایک شعلہ چمکا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر کر پھنسی ہوئی گاڑی کے ایک کتے کو لگی۔ وہ دردناک آواز نکال کر تڑپنے لگا۔ دوسرا فائر ہونے سے پہلے میں اور عمران برق رفتاری سے گاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔ کوئی چنگھاڑا اور اوپر تلے دو اور فائر ہوئے جو گاڑی کی باڈی میں لگے۔ یہ ماؤزر کے فائر تھے اور بلندی سے ہو رہے تھے۔ میں نے ٹرپل ٹو سے دو جوابی فائر کیے۔ مخالف سمت سے ایک اور فائر آیا۔ عمران کی قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بال بال بچا۔ پھر ''ٹرچ ٹرچ'' کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ گولی چلانے والے شخص کا ماؤزر خالی ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو غصیلی چنگھاڑ سنائی دی تھی، اس نے قریباً ثابت کر دیا تھا کہ گولی چلانے والا جادو رامے ہی ہے۔

اچانک ہمیں اس کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ خود کو ایک برفیلے ابھار کے پیچھے چھپا رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کے پاس صرف یہی چار گولیاں تھیں۔'' میں نے عمران کے کان میں کہا۔

پھنسی ہوئی گاڑی کا ایک کتا مر چکا تھا، باقی خوف زدہ ہو کر اچھل کود رہے تھے۔ میں اور عمران ان کے پاس سے

گزرے اور جادو رامے کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب نیم تاریکی میں بلندی پر دو اور ہیولے دکھائی دیے۔ یہ دونوں عورتیں لگتی تھیں۔ عمران نے طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ ان ہیولوں کی طرف پھینکا۔ ہم ششدر کھڑے رہ گئے۔ بلندی پر میم مائرہ تو نظر آ ہی رہی تھی مگر جس کی موجودگی نے ہمیں حیران کیا، وہ ماہین تھی۔ وہ میم مائرہ سے سات آٹھ قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ اب برفیلے ابھار کے قریب کوتاہ قد جادو رامے کا ہیولا بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس بس ایک ماؤزر ہی تھا جو خالی ہو چکا ہے۔ اب اس کے ہاتھ خالی تھے...... لیکن نہیں...... اس کے پاس وہ مہلک ترین ہتھیار موجود تھا جو ہمارے ہر حوصلے کو زنجیر کر کے ہمیں بے دست و پا کر سکتا تھا۔

وہ بلندی پر کھڑے کھڑے گرجا۔ ”ریموٹ میرے ہاتھ میں ہے، ایک قدم بھی آگے بڑھاؤ گے تو اس حرامزادی کے ٹکڑے ہوا میں اچھال دوں گا۔“ اس کے لہجے میں وحشت اور دیوانگی تھی۔

میں اور عمران اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ ہمارے اور اس شیطان صفت شخص کے درمیان پندرہ بیس قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا...... مگر جو دھمکی وہ دے رہا تھا، وہ ہماری روح کو چھلنی کر رہی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ تین چار گھنٹے پہلے یہاں ایک سنگین اتفاق ہوا تھا۔ جہاں دونوں بھگوڑوں یعنی رامے اور مائرہ کی گاڑی پھنسی تھی۔ ماہین بھی وہاں کہیں آس پاس ہی موجود تھی اور چھپی ہوئی تھی۔ وہ نہتی تھی۔ اس کا اور رامے کا کسی طرح سامنا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے گن پوائنٹ پر کر لیا تھا۔

جادو رامے کی ریڈیو آرٹسٹ جیسی خوب صورت آواز مکروہ الفاظ میں لپٹ کر گونجی۔ ”رائفل پھینک دو اور دس قدم پیچھے ہٹ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ، ورنہ یہ چھوکری جا رہی ہے۔“

پھر اچانک وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ مکروہ صورت والے رامے کی ساری توجہ ان لمحوں میں ہماری طرف تھی...... اچانک ماہین بجلی کی طرح حرکت میں آئی اور دس پندرہ قدم کے فاصلے پر کھڑی میم مائرہ پر جا پڑی۔ دونوں اوپر نیچے گریں...... ماہین نے مائرہ کو عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میم مائرہ جسمانی طور پر بہت توانا اور چوکس تھی...... لیکن ماہین اس سے چمٹ کر رہ گئی۔ جادو رامے بوکھلایا ہوا نظر آیا۔ بے شک ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا لیکن یہ وہ لمحے تھے جب وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ کم از کم فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ پا رہا تھا۔ وہ بلاسٹ کرتا تو اس کی پارٹنر مائرہ بھی ساتھ ہی جاتی۔ ایسے ہی لمحے جیت ہار کے لیے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ میں اپنی ٹانگوں میں موجود پوری طاقت کے ساتھ جادو رامے کی طرف لپکا...... اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی رائفل بھی سیدھی کر لی تھی۔ چھ سات قدم طے کرنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ گولی چلا دوں۔ گولی رامے کے پہلو میں لگی اور وہ پیچھے کی طرف گرا۔ عمران مجھ سے بھی پہلے رامے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ اس پر جا پڑا۔ پوری قوت سے رامے کا بازو مروڑ کر اس نے ”قاتل ریموٹ“ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا...... اور پھر اس کے منحوس...... بڑی ہانڈی جیسے کھوپڑے پر مکوں کی بارش کر دی۔ چند لمحوں کے تذبذب نے رامے جیسے گھاگ شخص کو عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔

دوسری طرف ماہین اور میم مائرہ گتھم گتھا تھیں۔ میم مائرہ کا جسم کسی ایتھلیٹ کی طرح ٹھوس اور طاقتور تھا۔ اب میم مائرہ نے پلٹ کر ماہین کی دبلی پتلی گردن دبوچ لی تھی۔ یہ ایک خطرناک ”نیک لاک“ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک ماہین نے اپنے بھاری لبادے کے اندر سے کوئی شے نکالی اور گھما کر میم مائرہ کے پہلو میں گھونپ دی (دراصل یہ وہی ہلالی خنجر تھا جو ماہین نے فرار ہوتے وقت نہال پر اور ایک تبتی پہریدار عورت پر استعمال کیا تھا) میم مائرہ نے دردناک آواز میں چلا کر ماہین کی گردن چھوڑ دی۔ ماہین نے اپنی دونوں ٹانگوں کی ضرب سے اسے خود سے دور کر دیا۔ میں اب اسے گن پوائنٹ پر رکھ سکتا تھا مگر وہ اتنی بدحواس ہو چکی تھی کہ اس نے پھر اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ تاریکی کے سبب وہ ٹھیک سے دیکھ نہ پائی۔ اس کا پاؤں رپٹا اور وہ دائیں طرف جانے کے بجائے بائیں طرف پھسل گئی۔ اس طرف کوئی چالیس فٹ گہری تنگ برفیلی کھائی تھی۔ وہ قلابازیاں کھاتی ہوئی گری۔ نیچے پتھر جیسی برف کے ساتھ اس کا جسم ٹکرانے کی صدا بڑی خوفناک تھی۔ یہ صدا بتا رہی تھی کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔

عمران نے فٹ بال جیسے گول اور گینڈے جیسے خطرناک جادو رامے کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ وہ آتش مزاج شخص اپنی مزاحمت ترک نہیں کر رہا تھا۔ عمران کے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش کے ساتھ ساتھ وہ غلیظ گالیاں بھی بک رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے ریموٹ کنٹرول کے سیل اس میں سے نکالے پھر ڈھلوان اتر کر گاڑی کے پاس پہنچا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس پر ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں اندر سے چمڑے کی ایک بل دار رسی نکال لایا اور اوپر جا کر ہاتھ پاؤں چلاتے جادو رامے کے ہاتھ موڑ کر پشت پر باندھ دیے۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں اور جسم سے خنزیر جیسی حیوانی بو اٹھتی تھی۔ وہ اب بھی اپنی ٹانگیں چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی کا زخم اس کے بائیں کندھے پر باہر کی طرف آیا تھا۔ تیز برفانی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی جو ہمارے جسموں کو سن کر رہی تھی۔

یکا یک ہوا کے دوش پر تیر کر آنے والی ایک دور افتادہ آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ہانپی ہوئی ماہین بھی اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس آواز کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے جیسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے میم مائرہ کو پچھاڑ لیا ہے۔ جسم منجمد ہونے کے باوجود میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یہ خونخوار تبتی بھیڑیوں کی آواز تھی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف لپک رہے تھے۔

''یہ...... بھیڑیے؟'' ماہین نے میری طرف دیکھ کر خوف زدہ آواز میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ رائے کی تلاش میں ہیں اور اسی کی طرف آرہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

بات عمران کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بھی میری طرح غار کا وہ منظر دیکھا تھا جب مایا رانی نے ان پالتو بھیڑیوں کے غول کو ہمارے سامنے جادو رائے کی اونی ٹوپی اور جرابیں وغیرہ سنگھائی تھیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر لرزاں آواز میں بولا۔ ''لیکن کچھ بھی ہے جی...... یہ درندے ہیں ہماری طرف بھی تو آسکتے ہیں۔''

عمران کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ میں نے ماہین کا بازو پکڑا اور ہم ڈھلوان پر تقریباً پھسلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچ گئے۔ کتوں نے بھی شاید بھیڑیوں کی آمد محسوس کر لی تھی وہ سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ میں نے رائفل سونت کر گاڑی میں پوزیشن لے لی۔ آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ جادو رائے چند میٹر کی دوری پر برف کے اوپر پڑا تھا۔ وہ اب بھی ہم پر دہاڑ رہا تھا اور صلواتیں سنا رہا تھا اور پھر بالکل ویسا ہی ہوا جیسا ہمارے ذہنوں میں آرہا تھا۔ خونخوار بھیڑیے برق رفتاری سے قریب آتے گئے۔

''یہ اس کو مار دیں گے؟'' ماہین نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''بہتر ہے کہ مار دیں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اور پھر ہم نے دو ٹارچوں کی روشنی میں وہ منظر دیکھا جسے دیکھنے کے لیے لوہے کا جگر درکار تھا...... اور وہ آگاہی بھی درکار تھی جو ہم ''درندہ صفت رائے'' کے حوالے سے رکھتے تھے۔ بھوکے بھیڑیے جو تعداد میں آٹھ سے کم نہیں تھے، جادو رائے پر جا پڑے۔ وہ اس کو زندہ نوچنے لگے...... ادھیڑنے لگے...... ہاں یہی تو وہ سزا تھی جو رائے اور میم مائرہ نے ہم دونوں کے لیے تجویز کی تھی...... بڑی موت کی سزا۔ مقام بدل گیا تھا۔ سزا پانے والا بدل گیا تھا مگر ''جلاد'' وہی تھے اور سزا بھی وہی تھی۔ جادو رائے کی آہ و بکا فلک شگاف تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنے گوشت کے لوتھڑے خونی جانوروں کے منہ میں دیکھ رہا تھا۔ برف پر تڑپتا تھا اور دہائیاں دیتا تھا۔ اس کی ساری ذہانت، جادوگری اور عیاری، قدرت کے اس بے رحم انصاف کے آگے صفر تھی۔ میں رائفل استعمال کر سکتا تھا، دو تین جانوروں کو مار سکتا تھا باقی پسپا ہو سکتے تھے مگر میں کیوں کرتا ایسا؟ میری نگاہوں کے سامنے ان لاتعداد لوگوں کے چہرے تھے جنہوں نے دواؤں کے نام پر زہر پیا تھا اور سسک سسک کر جانیں دی تھیں اور ان میں سے ہی ایک ثروت بھی تھی۔ تیز طوفانی ہوا میں جلد ہی اس کی آخری پکاریں دم توڑ گئیں۔ ماہین نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ عمران نے بھی دھیان دوسری طرف کر لیا تھا، مگر میں آخر تک ٹارچ تھامے ''بڑی موت'' کا منظر دیکھتا رہا۔

ہوا کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ ''شاید طوفان آرہا ہے۔'' عمران نے کہا۔

اب برف کی تیز بوچھاڑیں بھی شروع ہوگئی تھیں۔ شاید موسم کی یہی کیفیت تھی جس کے سبب بھیڑیوں نے جادو رائے کو مارنے کے بعد کسی اور طرف توجہ نہیں دی۔ فلیش لائٹ جیسی ٹارچ کی روشنی میں بھیڑیوں کی تھوتھنیاں سرخ نظر آرہی تھیں۔ اگر وہ ہماری جانب آتے تو ٹرپل ٹو رائفل بخوبی ہمارا دفاع کر سکتی تھی...... میں نے رائفل ان کی طرف سونت رکھی تھی۔ تاہم انہوں نے ہمیں کوئی ایسی زحمت نہیں دی۔ اور کچھ دیر بے قراری سے وہاں چکرانے اور جبڑے چلانے کے بعد اچانک ہی غار کی سمت میں واپس چل دیے۔

طوفان کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے اردگرد برف کی تہیں نظر آنے لگی تھیں۔ دونوں گاڑیوں کے کتے اس صورتِ حال میں عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ ''ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''مگر یہ پھنسی ہوئی گاڑی کے کتے؟'' عمران نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''ان کی بندشیں کاٹ دیتے ہیں۔ یہ خود ہی ٹھکانا تلاش کر لیں گے۔''

ماہین والے ہلالی خنجر سے ہم نے یکے بعد دیگرے وہ بندشیں کاٹ دیں جو کتوں کو گاڑی سے جوڑے ہوئے تھیں۔ بندشوں سے آزاد ہوتے ہی پانچوں کتے ایک جانب بھاگ نکلے۔ چھٹا جادو رائے کی چلائی ہوئی گولی سے ہلاک ہو چکا تھا۔ اس کا خون برف کی نئی پرتوں کے نیچے اوجھل ہو چکا تھا۔

ماہین کی کمزور آواز نے مجھے چونکایا۔ ''انکل تابی! لگتا ہے یہ دوسری گاڑی بھی نکل نہیں سکے گی۔''

میں اور عمران اپنی گاڑی کی طرف پلٹے۔ ٹارچ کے روشن

دائروں میں نظر آیا کہ شاید ماہین ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں ہم نے سرتوڑ کوشش کی مگر ہم کچھ کر سکے اور نہ کتے ہی گاڑی کو اس کی جگہ سے ہلا سکے۔ طوفان کے بے پناہ شور میں عمران کی ٹھٹھری ہوئی آواز ابھری۔ ''مجھے تو لگ رہا ہے کہ گاڑی کچھ اور پھنس گئی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گاڑی اب واضح طور پر ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ برف بوچھاڑوں کی طرح تھی اور اس کی شدت ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ ''اب کیا کرنا ہے؟'' عمران نے ہوا کے بے پناہ شور میں چلاّ کر پوچھا۔

''گاڑی کو اس حالت میں یہاں نہیں چھوڑ سکتے...... کتے مرجائیں گے۔'' میں نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر ان کو بھی آزاد کردیں؟'' عمران نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اگلے دو تین منٹ میں ہم نے ان کتوں کی بندشیں بھی کاٹ ڈالیں اور وہ چند لمحے چکرانے کے بعد ایک سمت میں بھاگ نکلے۔ یہاں کھوہ وغیرہ تو کہیں نظر نہیں آرہی تھی...... مگر ماہین نے بتایا کہ پاس ہی چھپنے کے لیے ایک جگہ موجود ہے۔ ہم نے بلندی کی جانب بے حد دشواری سے تیس چالیس قدم کا فاصلہ طے کیا اور برف میں موجود ایک ایسی دراڑ میں داخل ہو گئے جس کے اوپر قدرتی طور پر برف کا ہی ایک سائبان سا بن گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ پچھلے چند دن یہی ماہین کی پناہ گاہ رہی ہے۔

ہم تینوں ہانپ گئے تھے مگر ماہین کچھ زیادہ ہی ہانپی تھی۔ وہ جب سانس اندر کھینچتی تھی تو ایک سیٹی جیسی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ دراڑ کے چھجے تلے آنے کے بعد ہم برف اور ہوا کی براہ راست کاٹ سے کسی حد تک محفوظ ہو گئے...... مگر سردی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرا ڈھیٹ جسم اتنی سردی محسوس کررہا ہے تو عمران اور ماہین کا کیا حال ہوگا؟

ہوائیں شوریدہ سر ہوتی چلی جارہی تھیں۔ عمران کی کپکپاتی آواز ابھری۔ ''لگتا ہے کہ آج یہ ہوائیں کرہ ارض کی ساری کی ساری برف یہیں پر گرا کر دم لیں گی۔''

اس آدھی چھت والی دراڑ میں آنے کے بعد طوفان کا شور قدرے کم محسوس ہونے لگا تھا۔ ہوا کی سیدھی مار بھی نہیں تھی۔ یہاں ماہین کی بس ایک اونی شال موجود تھی۔ وہ آدھی شال نیچے بچھا کر آدھی اوڑھ لیتی تھی اور اس قاتل سردی سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ پورے پانچ دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ خالی پیٹ برفیلی سردی کا مقابلہ اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیمار ہوگئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''ماہین! اس بدبخت رائے...... اور مائرہ سے تمہارا سامنا کیسے ہوا؟''

وہ قدرے نحیف آواز میں بولی۔ ''آج سہ پہر مجھے کچھ آہٹیں محسوس ہوئیں اور کتوں کی آوازیں آئیں۔ میں نے یہاں سے نکل کر بڑی احتیاط سے نیچے جھانکا۔ مگر بیڈلک...... کہ میم مائرہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ تب ان کی گاڑی پھنس چکی تھی اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کررہے تھے......''

ماہین کی باقی کی بات ہماری سمجھ میں آگئی۔ ظاہر ہے کہ ماہین نہتی تھی اور بپھرے ہوئے جادو رائے کے پاس ماؤزر تھا...... اور صرف ماؤزر ہی نہیں تھا، وہ چھوٹا سا منحوس ریموٹ بھی تھا جو ماہین کو اڑا سکتا تھا۔ وہ ماہین پر غالب آگئے جب اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم ان کی پھنسی ہوئی گاڑی تک پہنچے تو وہ دونوں اسی آدھی چھت والی دراڑ میں ماہین کے ساتھ موجود تھے۔

ماہین...... مایا رانی اور ہمارے دیگر ساتھیوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین نظر آرہی تھی۔ میں نے اسے مختصراً غار کا سارا احوال بتایا۔ بندی خانے سے ہمارے نکلنے سے لے کر ڈیرن فورڈ کی آمد تک...... اور خونریز لڑائی سے لے کر مایا رانی کی رہائی تک میں نے سب کچھ اس کے گوش گزار کردیا۔ وہ یہ سن کر حیران ہوئی کہ قوی ہیکل جہاناں جسے ہم آج تک گونگا سمجھتے رہے تھے، حقیقتاً گونگا بہرا نہیں تھا...... وہ دراصل ایک مخبر کے طور پر رائے کے گروہ میں موجود تھا۔ آخر میں عمران کی کامیاب چال کے سبب یہی جہاناں ہماری رہائی کا سبب بھی بنا تھا۔

''حسام اور ہما صاحبہ کا کچھ پتا نہیں؟'' ماہین نے پوچھا۔

''نہیں ابھی تک تو نہیں...... لیکن عین ممکن ہے کہ انہوں نے خود کو کہیں غار میں ہی چھپا رکھا ہو۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

رائے کی موت کے مناظر بار بار ہماری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ شاید یہ حرص اور لامحدود لالچ کا انجام تھا۔ کیا نہیں تھا اس شخص کے پاس مگر زیادہ سے زیادہ کی ہوس نے بالآخر اس شخص کو اذیت ناک موت سے دوچار کیا تھا۔ اس کی ساری دولت اور طاقت ایک طرف پڑی رہ گئی اور بھیڑیوں نے اسے زندہ چیر ڈالا۔ تاریخ گواہ ہے کہ رائے جیسے لوگوں کا مقدر یہی ہوتا ہے۔

ماہین درمیان میں بیٹھی تھی، میں اور عمران اس کے دائیں بائیں تھے۔ ہوائیں نشیب و فراز سے سر پٹخ رہی تھیں اور برف کی یورش ناقابلِ بیان تھی۔ میں نے اپنی بھاری بھرکم جیکٹ اتاری اور زبردستی ماہین کے کندھوں پر ڈال دی۔ حقیقت یہی تھی

کہ میں ان دونوں سے بہت کم سردی محسوس کر رہا تھا۔ ہم تینوں نے دراڑ کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

وقت کو آگے سرکانے کے لیے ماہین نے کہا۔ "جب میں مایا رانی کے پاس تھی، مجھے اس امیر کبیر ڈیرن اور میم مائرہ کے بارے میں کافی باتیں پتا چلی تھیں۔ یہ باتیں مجھے ایک روز نابینا ایلی نے ہی بتائی تھیں۔ ڈیرن اور میم مائرہ کی میرج دراصل میم مائرہ ہی کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔ مائرہ اچھی عورت نہیں تھی۔ بے وفائی کی شروعات اسی کی طرف سے ہوئی تھی۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے مارک نامی ایک نوجوان سے ناجائز ریلیشن بنا لیا تھا۔ بات بگڑتی چلی گئی۔ انہی دنوں ڈیرن فورڈ نے ایلی کو اپنی گرل فرینڈ بنایا۔ بعد میں ڈیرن اور میم مائرہ کے درمیان طلاق ہوگئی اور میم مائرہ جاتے جاتے ڈاکٹر شا کے بہت سے کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اپنے طور پر سارے کاغذ لائی تھی لیکن قریباً آدھے ڈیرن فورڈ کے پاس ہی رہ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ویکسین نہ تو مائرہ اور رامے بنا سکے اور نہ ہی ڈیرن فورڈ......"

رات کا اندھیرا گہرا اور ظالم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے ایک ٹارچ آن کر کے اپنے درمیان رکھی ہوئی تھی اور اپنے آپ میں سمٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "ماہین ایک انکشاف ہمارے پاس بھی ہے۔"

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ ساری بھاگ دوڑ ویکسین بنانے کے لیے نہیں "بیماری" بنانے کے لیے ہو رہی ہے...... یعنی وائرس، اس کی ویکسین تو بری بھلی بن ہی چکی ہے...... بلکہ ڈاکٹر شا ہی بنا گیا تھا۔"

ماہین تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔

رشتوں کی یہ کیسی تکون تھی۔ اس تکون نے تین چار عالمی مجرموں کے گھناؤنے راز فاش کیے تھے۔ ڈیرن اور مائرہ کی شادی ٹوٹنے کا آغاز یقیناً مائرہ ہی کی طرف سے ہوا تھا۔ مائرہ کے جس بوائے فرینڈ مارک کا نام ابھی ماہین لے رہی تھی، اس کا نام میں لاہور میں مائرہ کی زبان سے بھی سن چکا تھا۔ جب میں ایک ان پڑھ مزدور کی حیثیت سے مائرہ کے آفس میں فرش پر بیٹھا تھا اور وہ فون پر مارک نام کے اس بندے سے کھل کھلا کر انگلش میں باتیں کر رہی تھی۔ میم مائرہ کا یہ جرم یوں اور بھی سنگین ہو جاتا تھا کہ اس نے اپنی رقیب نوجوان ایلی سے بدلہ لینے کے لیے اسے اپنے جنونی پارٹنر رامے کے ہاتھوں اندھا کروایا اور اس کی رکھیل بنا ڈالا۔

اب وہی مائرہ اپنے تمام تر لعنتی ارادوں سمیت یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر برفیلی کھائی میں مردہ پڑی تھی اور طوفان اس پر برف کی پرتیں چڑھاتا چلا جا رہا تھا۔

ماہین کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بے شک ڈیرن اور ایلی بھی جرائم پیشہ لوگ ہی ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایلی، جادو رامے کے ہتھے چڑھنے کے بعد سے مسلسل آنسوؤں میں غرق رہی ہے۔

میری دبیز جیکٹ کے باوجود ماہین اپنے آپ میں سکڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سانس بھی خراب تر ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کچھ دیر اور گزر جاتی تو شاید ہم منجمد ہو جاتے۔ میرے دل سے ماہین اور عمران کی سلامتی کے لیے دعا نکل رہی تھی...... مگر شاید یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہی نہیں تھا۔ پانچ دس منٹ مزید گزرے پھر ایک ایسی گڑگڑاہٹ سنائی دی جس نے ہمیں دہلا دیا۔ یہ طوفان کے شور سے بالکل مختلف آواز تھی۔ ایک شدید ارتعاش محسوس ہوا اور اچانک ہمیں لگا کہ ہم برف کی قبر میں دفن ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

ہمیں برف کی قبر میں اب قریباً آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ دراصل یہ ایک بڑا ابرف کا تودہ تھا جو "ایوالانچ" کی صورت میں پھسل کر نیچے آیا تھا اور اس دراڑ کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ برف کی جو تہ اس دراڑ پر چڑھی تھی، اس کی موٹائی کم و بیش پانچ فٹ تھی۔ یہ واقعی برف کی قبر تھی۔ اس میں بس دو تین شگاف رہ گئے تھے جہاں سے ہوا پُرہول آوازوں کے ساتھ برف کی بوچھاڑوں سمیت اندر آتی تھی۔ منوہر سنگھ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ علاقہ دنیا کے سرد ترین علاقوں میں شامل ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس کا ٹمپریچر منفی 25 درجے تک بھی پہنچ جاتا ہے مگر جو ٹمپریچر اس وقت اس برفیلی قبر کے اندر موجود تھا، وہ شاید اس سے بھی کم تھا۔ کمزور و بیمار ماہین تو رہی ایک طرف، عمران تک کا جسم نیلا پڑنے لگا تھا۔ میں حتی الامکان اپنی غیر معمولی برداشت کا امتحان لیتا رہا تھا مگر اب مجھے اپنی ہمت بھی کم پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

باہر نکلنے کی کوئی صورت بچی ہی نہیں تھی اور برفانی طوفان کسی منتظر شکاری درندے کی طرح ہمارے سروں پر دہاڑ رہا تھا۔ اب باہر یقیناً صبح ہو چکی تھی مگر اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ دن رات میں کچھ خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ قریباً ایک دو گھنٹے پہلے طوفان کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہوئی تھی لیکن اب پھر برفانی ہوائیں شدت سے سر پٹخنے لگی تھیں۔

کیا کوئی ہماری مدد کو آ سکے گا...... یا پھر چند گھنٹوں کے اندر یکے بعد دیگرے ہمیں یہیں پر جان دینا ہوگی؟ یہ وہ سوال تھا

جو برف کی نکیلی قلم کی طرح میرے ذہن میں پیوست تھا۔
ماہین قریباً نیم بے ہوش تھی۔ میں نے اس کا زرد سفید گال تھپتھپایا۔ ”ماہی...... ماہی، ہمت کرو...... خود کو سنبھالو...... جلد ہی موسم بہتر ہو جائے گا۔“
وہ خشک ہونٹوں کے ساتھ کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ جیکٹ میں پہلے ہی اسے پہنا چکا تھا، اب بھاری اونی سویٹر بھی اتار کر اس کی منجمد ٹانگوں پر پھیلا دیا۔ عمران بھی اس کے پہلو میں بے سدھ لیٹا تھا، اس نے دوبارا اپنی جیکٹ کی زپ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ یقیناً وہ بھی میری طرح ماہین کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ماہین کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر عمران کے چہرے پر کرب کے سائے گہرے ہونے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کیے کیے اپنی اونی ٹوپی اتاری، اپنے دستانے اتارے...... اور اشارے سے مجھے کہا کہ میں یہ ماہین کو پہنا دوں۔ وہ بے چاری منفی ٹمپریچر کے قاتل جبڑوں میں تھی۔ ان چھوٹی موٹی اشیا سے اس کی کچھ خاص مدد ہونے والی نہیں تھی۔ گاہے گاہے اس کی سانس سینے میں بے طرح اُلجھنے لگتی تھی۔ شگافوں سے آنے والی برف کی بوچھاڑیں گاہے بگاہے ہم پر آ رہی تھیں۔ عمران نے اپنے نیلگوں ہاتھ سے ماہین کی دودھیا کلائی کو چھوا۔ اس کی نبض ٹٹولی۔ ”ماہی...... ماہی...... ہوش کرو...... پلیز ہوش کرو۔“ وہ غنودہ سرگوشی میں بولا۔
ماہین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دو منٹ ایسے ہی گزرے، پھر وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑائی۔ ”تم کیوں آئے تھے یہاں...... تم وہیں رہتے...... جہاں کے تھے۔ تم نے...... تم نے کیوں میرا سکون برباد کیا...... کیوں...... کانٹوں میں گھسیٹا مجھے؟“ ماہین کا مخاطب یقیناً عمران تھا...... اور وہ جیسے خود ہی بے پناہ سردی کی مہلک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔
”میں نے کچھ نہیں کیا ماہین...... اور اگر کیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔“
ماہین نے غالباً عمران کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح ساکت پڑی رہی۔ ”تم کیوں ہو ایسے...... تم کیوں ہو......؟ تم میری جان لے لو گے...... تم مجھے مار ڈالو گے...... تم چلے کیوں نہیں جاتے...... گم کیوں نہیں ہو جاتے؟“
”چلا جاؤں گا...... گم ہو جاؤں گا...... تم جیسا کہو گی۔“ وہ تسلی دینے والے لہجے میں بولا۔
تاہم لگتا یہی تھا کہ وہ غشی کی سی حالت میں ہے...... صرف بول رہی ہے۔ سن کچھ نہیں رہی۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے گہرے زرد کومل رخسار پر ایک آنسو پھسل کر وہیں جم گیا تھا۔

طوفان کی دھاڑیں پھر بلند ہو گئی تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شگاف بھی بند ہونے جا رہے ہیں۔ ٹارچ کی روشنی ہماری نبضوں ہی کی طرح مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ماہین کی نحیف بڑبڑاہٹ پھر ابھری۔ ”ایسا مت کرو...... ایسا مت کرو...... پلیز یہ ٹھیک نہیں...... وہاں بہت ٹھنڈ ہے...... اچھا...... اچھا رکو۔“
ایک طویل وقفے کے بعد وہ پھر بڑبڑائی۔ لہجہ کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ”مجھے لے چلو عمران...... بہت دور...... یہاں سے بہت دور...... جہاں کوئی نہ ہو...... بس کوئی نہ ہو......“
اس کی سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔ عمران نے اس کا سر چوما۔ میں نے اسے بانہوں میں بھینچ کر اپنے جسم کی بچی کھچی حرارت اس کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ٹارچ بجھ گئی۔ اندازہ ہوا کہ چھت کے شگاف بھی برف سے ڈھک چکے ہیں، کیونکہ اب تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ نیکیاں پلٹ کر انسان کی طرف آتی ہیں۔ کہتے ہیں بھلائی کبھی رائگاں نہیں جاتی...... اور یہ بھی کہتے ہیں کہ قدرت کا حساس ترازو کبھی غلط نہیں تولتا۔ ذرّے کے ہزارویں حصے کے وزن کا حساب بھی رکھتا ہے۔
میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایک ایسے برفاب کنویں میں ڈوبتا جا رہا تھا جہاں برف ہی کے اژدہے میرے جسم سے لپٹے تھے اور مجھے بھینچ رہے تھے اور کنویں کی تہ میں کہیں آگ جل رہی تھی، مگر وہ آگ بھی یا دھوکا تھا۔ کیا ریگزار میں پانی کے سراب کی طرح برف زار میں آگ اور حرارت کا سراب بھی ہوتا ہے؟ میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا، کیا میں مر رہا ہوں؟
پھر ایکا ایکی مجھے لگا کہ برفیلے کنویں کی تہ میں آگ روشن تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی روشنی کنویں میں پھیل رہی ہے۔ برف کے اژدہے اپنی جان لیوا گرفت ڈھیلی کر رہے ہیں۔
تب ایک انسانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ اس دنیا کی آواز تھی یا کسی اور دنیا کی؟ میں نے بے حد مشکل سے اپنے منوں وزنی پپوٹوں کو اٹھایا۔ یقیناً ان پپوٹوں پر بھی برف کی تہ تھی۔ دراڑ کی چھت پر ایک بڑا شگاف نظر آ رہا تھا۔ اس شگاف میں سے ہلکا نیلا آسمان دکھائی دیتا تھا اور ایک چہرہ بھی...... یہ کس کا چہرہ تھا؟ یہ گندھارا کا چہرہ تھا الداخ کی وہی قابل ترین معالجہ جسے ہم نے موت کے ستون سے علیحدہ کر کے زندگی کی جانب بھگایا تھا۔
کون کہتا ہے نیکیاں پلٹ کر نہیں آتیں۔ نیکیاں اور

بھلائیاں کسی نہ کسی صورت ہماری طرف ضرور لوٹتی ہیں...... اور ایک بھلائی...... ایک بھلائی، شاید لوٹ آئی تھی۔

میں نے ٹھٹک کر اپنے پہلو میں دیکھا۔ میرے دونوں پیارے ساکت و جامد پڑے تھے۔ برف میں ڈھکے ہوئے اور برف ہی کی طرح سفید۔ میں حتے آخر تک ان دونوں کو ڈھانپے رکھا تھا۔

میں نے عمران کو بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ ”عمران...... عمران...... ہوش کرو...... عمران......“

وہ ساکت رہا...... مگر اس کے جسم میں ہونے والی ایک خفیف حرکت نے مجھے آگاہ کیا کہ اس نے ابھی زندگی کی سرحد پار نہیں کی۔

تب میں نے دہشت زدہ نظروں سے ماہین کو دیکھا۔ اس کا جسم اکڑ چکا تھا۔ میں نے اسے بھی جھنجوڑا۔ کئی بار پکارا...... مگر لگا کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ میں نے دستانہ اتار کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا...... وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ میں اسے جھنجوڑنے لگا۔

عمران نے بھی اپنی جسمانی قوت جمع کی تھی اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسی اثنا میں گندھارا اور اس کا شوہر، شگاف کے اندر سے پھسلتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ گندھارا جھپٹ کر ماہین کی جانب گئی، اس کی نبض ٹٹولی۔

گندھارا کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی۔ تب وہ اپنی شکستہ اردو میں ہم پر گرجی۔ ”تم...... تم دونوں باہر نکلو...... جلدی کرو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ ماہین کے بالائی جسم کے کپڑے اتارنے لگی۔ گندھارا کے کسی ساتھی نے لکڑی کی سیڑھی اندر لگا دی تھی۔ میں تو کسی نہ کسی صورت باہر نکل آیا مگر عمران کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اسے گندھارا کے شوہر جورم نے سہارا دے کر باہر نکالا اور برف پر بچھے نمدے پر لٹایا۔ دراڑ کے اردگرد گندھارا کے قریباً چار ساتھی موجود تھے۔ جن میں اس کی وہ نوعمر شاگرد بھی تھی جو اس کے ساتھ ہی رامے، مائرہ اور کبڑی دیوی تورما کے شکنجے سے بچ کر نکلی تھی۔

گندھارا کی ہدایت پر اس کی شاگرد نے گندھارا کا ادویات والا چھوٹی سی تھیلا اٹھایا اور شتابی سے سیڑھی اتر کر دراڑ میں چلی گئی۔ وہ قیامت کے لمحے تھے۔ ایسے لمحے بہت گراں ہوتے ہیں...... گزرنے میں نہیں آتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، نتیجہ کیا نکلے گا؟ باہر کا طوفان تو تھم چکا تھا لیکن اندر جو طوفان تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ کل دوپہر ہم غار میں واپس پہنچ گئے تھے۔ عمران کی حالت ابھی اچھی نہیں تھی۔ اس کا زیریں جسم اب بھی سردی کی مار سے متاثر تھا۔ چلنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ہلکا بخار بھی چل رہا تھا۔ میم مائرہ کی لاش کھائی کی برف میں دفن ہو چکی تھی۔ اسے وہاں سے نکالنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ جادو رامے کی لاش کے کچھ حصے بکھرے ضرور ملے تھے، جنہیں وہیں کہیں برف میں دفنا دیا گیا تھا۔ اس کی آخری پکاریں ابھی تک میرے کانوں میں گونجتی تھیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مرتے وقت بھی وہ گالیاں ہی دے رہا تھا۔ اس بدبخت نے اپنی بدصورتی کو ہر خوب صورتی کا دشمن بنا رکھا تھا جن میں عورتیں سرفہرست تھیں۔ آخر میں عورتوں سے اس کی یہ دشمنی ”محبت کی طلب“ میں بدل گئی تھی۔ لیکن یہاں بھی اس کے جنون نے سفاکی کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ صنفِ مخالف کی محبت اور خود سپردگی پانے کا جو ”بہترین“ راستہ اس کی سمجھ میں آیا وہ یہی تھا کہ اس کی ہم نشیں عورت اسے دیکھ ہی نہ پائے۔

(وہ غلط تھا اور گمراہی کے عروج پر بھی...... اور اس کا ثبوت اس کا وہ جڑواں بھائی تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ نوے فیصد رامے سے مشابہ ہے لیکن بیرونِ ملک بیوی بچوں کے ساتھ ایک نارمل بلکہ قابلِ رشک زندگی گزار رہا ہے)

یہاں واپس آ کر ہمیں جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس کے مطابق دونوں اسکیمو بائلز گاڑیوں کے وہ گیارہ کتے زندہ غار میں واپس آ گئے تھے جنہیں ہم نے مہیب طوفان سے رہائی دلائی تھی۔

طامبورہ نامی کشادہ ہال میں مایا رانی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اسی شان اور دبدبے کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ ”لاش کا کیا کرنا ہے؟“ مایا نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں مجھ سے پوچھا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ بے شک سردی ہے لیکن اسے زیادہ دیر رکھا بھی تو نہیں جا سکتا۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

”ہاں بزرگ یہی کہتے ہیں کہ آتما بے چین رہتی ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ سب کچھ انسان کی توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔ قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ لڑائی کے دوران میں ہم نے منوہر سنگھ کو بچانے کی کتنی کوشش کی تھی، مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ بے شک چند ہی دنوں میں وہ ہمارے بہت قریب آ گیا تھا۔ ایک نہایت ہمدرد اور مددگار دوست۔ اب ہمیں اس کے بے جان جسم کو اس کے دھرم کے مطابق رخصت کرنا تھا۔

اسی دوران میں طامبورہ کے داخلی راستے کا پردہ ہلا اور

گندھارا، نحیف ونزار ماہین کو سہارا دیتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ دائیں طرف سے اس کی شاگرد نے ماہین کو تھام رکھا تھا۔ ماہین کا رنگ ابھی تک کورے لٹھے جیسا تھا۔ آنکھوں کے گرد نیلگوں حلقے تھے۔ مگر اس کے رخسار کے خوب صورت ڈمپل نے ابھی تک اپنی دلکشی پوری طرح نہیں کھوئی تھی۔

گندھارا نے اسے بڑی احتیاط سے ایک آرام کرسی پر نیم دراز کر دیا۔ مایارانی نے محبت سے اس کا ماتھا سہلایا۔ ہاتھ چوما اور اپنے عقیدے کے مطابق طامبورہ کی مقدس آگ میں سے چند انگارے ایک طشتری میں نکلوا کر اس کے قریب رکھوائے۔

اسی دوران میں خوش پوش دراز قد ڈیرن فورڈ اجازت لے کر اندر آ گیا اور مایارانی کے پاس ہی ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ دلچسپی سے ماہین کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگلش میں مجھ سے کہا۔ ”یہ ایک کرشمہ ہے، سنا ہے کہ اس کا جسم منجمد ہو چکا تھا۔“

”تقریباً ایسا ہی تھا...... قدرت نے گندھارا کے وسیلے سے اسے بچایا ہے۔ یہ یہاں کی بہترین معالجہ ہے اور کئی نسلوں سے ان کا یہی پیشہ ہے۔“

”مگر یہ معالجہ تم لوگوں تک پہنچی کیسے؟“

میں نے کہا۔ ”اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں غار میں پانسا مکمل طور پر پلٹ چکا ہے اور مایارانی دوبارہ اختیار اپنے ہاتھ میں لے چکی ہے۔ یہ یہاں واپس آ گئی اور طوفان مکمل طور پر تھمنے سے پہلے ہی کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ہماری تلاش میں لگ گئی۔“

”سنا ہے، اس نے اس خوب صورت لڑکی کی جان بچانے کے لیے زوب کے خطرناک زہر کو دوا کے طور پر استعمال کیا ہے؟ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔“

”بے شک استعمال کیا ہے مسٹر ڈیرن۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن ماہین کو زہر کھلایا نہیں گیا بلکہ اس زہر سے تیار کردہ ایک خاص قسم کے آئل کو ماہین کے منجمد جسم پر اپلائی کیا گیا اور میرے خیال میں تو یہ ایک بہانہ تھا، قدرت کو اس بچی کی زندگی منظور تھی۔ ورنہ اس کی نبضیں تقریباً ڈوب چکی تھیں۔“

مایارانی نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے حسبِ معمول شکستہ ہندی میں کہا۔ ”زوب وہ عجیب جانور ہے جو برف میں مکمل جم جانے کے کئی گھنٹے بعد بھی حرارت ملنے پر زندہ ہو جاتا ہے...... اس کا زہر بے حد قاتل ہے مگر گندھارا کی مہارت نے اسے تریاق کی شکل دی۔“

میں نے ڈیرن کے لیے مایارانی کی بات کا ترجمہ انگلش میں کیا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ مقامی رواج اور عقیدے کے مطابق ”مقدس“ آگ کی حرارت دینے کے بعد مایارانی نے ماہین کو واپس اس کے کمرے میں بھجوا دیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ مایارانی یہاں دوبارہ بااختیار تھی، مگر اس کے باوجود جگہ جگہ ڈیرن کے مسلح عینک پوش سفید فام گارڈز اور انڈین شوٹر نظر آتے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں، ان کے مطابق مایارانی اور ڈیرن کے درمیان ایک ڈیل ہوئی تھی۔ اس ڈیل کے مطابق مایارانی کو یہاں اپنا اختیار واپس مل گیا تھا۔ اس کے بدلے مایا کو اس بات پر راضی ہونا پڑا تھا کہ وہ زوب کے صرف دو جوڑے یہاں رکھ کر باقی سب ڈیرن کو دے دے گی۔

شام کے وقت منوہر سنگھ کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ اس کی باقاعدہ ارتھی جلائی گئی تھی۔ میں اور عمران خود کو کافی دل گرفتہ محسوس کر رہے تھے۔ اس موقع پر حشام بھی موجود تھا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ حشام کے بارے میں ہمارے بدترین خدشات غلط ثابت ہو گئے تھے۔ وہ زندہ سلامت تھا۔ جب میں اور عمران بندی خانے سے فرار ہوئے اور ہماری لڑائی شروع ہوئی تو حشام نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو غار کے عام باشندوں کی بستی کے اندر ایک قصاب کے خالی گھر میں چھپا لیا۔ وہ قریباً چوبیس گھنٹے تک وہاں محفوظ رہا اور پانسا پلٹنے کے بعد باہر آیا۔

باقی رہ گئی ہما عروج تو اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ غار کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی جو کیروسین آئل کی وجہ سے مزید بھڑکی تھی۔ کئی لاشیں اس میں کوئلہ ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ غار سے بھاگنے کی کوشش میں، ہما ارد گرد کی کسی دراڑ یا کھائی میں جا گری ہو۔ بعد ازاں شدید برفانی طوفان نے اسے دفن کر دیا ہو۔ کئی امکانات تھے۔ بہرحال کچھ دیگر افراد کی طرح اس کی تلاش بھی جاری تھی۔

رات کو اکیلے میں میری اور ڈیرن فورڈ کی ملاقات ہوئی۔ ہم غار کے آراستہ حصے کے ایک نیم گرم کمرے میں موجود تھے۔ شمع دان روشن تھا۔ دور کہیں غار کے کسی حصے میں مقامی میوزک کی آواز تھی۔ ڈیرن وسکی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں بہت سی اَن کہی باتیں تھیں۔ ابھی ابھی نابینا ایلی اس کے پہلو سے اٹھ کر گئی تھی۔ وہ اسی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ کچھ بھی خرید سکتا تھا...... شاید ایلی کی بینائی بھی...... بلکہ یقیناً وہ ایسا کر سکتا تھا۔ ڈیرن نے میرا شکریہ بھی ادا کیا کہ میرے توسط سے اسے اور ایلی کو یہ خبر ملی تھی کہ ایلی کی رقیب اور دشمنِ اول میم مائرہ اب اس دنیا میں نہیں۔

لیکن جو کچھ بھی تھا، ڈیرن ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ اس کی بے پناہ دولت نے بھی جرائم کے بطن سے ہی جنم لیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر کھوئے کھوئے انداز میں گویا ہوا۔ ''یقیناً تم جان چکے ہو کہ اب تک کی جو بھاگ دوڑ بھی تم نے دیکھی ہے...... وہ زوب کے لیے تھی...... اور یہ ویکسین بنانے کے لیے نہیں بلکہ وائرس بنانے کے لیے تھی۔''

''مسٹر ڈیرن! تم ''تھی'' کا لفظ کیوں استعمال کررہے ہو۔ یہ بھاگ دوڑ اب بھی ہے۔ تم یہاں سے زوب لے کر جارہے ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ویکسین بنانے کے لیے نہیں۔''

اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''نہیں مسٹر تابش! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا...... پچھلے چند ماہ نے مجھے بہت زیادہ...... ہاں بہت زیادہ بدل دیا ہے۔ ایلی کی جدائی نے میری کایا کلپ کی ہے۔ میں اب یہ سب چھوڑ کر کسی خاموش جزیرے میں بسنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ شاید میری دس نسلوں کی ضرورتوں سے بھی زیادہ ہے۔''

میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے وہسکی کا ایک اور بدبودار گھونٹ بھرا اور شمع دان کو تکنے لگا۔ ''مسٹر ڈیرن!'' میں نے کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر یہ زوب کیوں لے جارہے ہو اپنے ساتھ؟''

''میں جانتا تھا، تم یہ پوچھو گے۔'' وہ مسکرایا۔ ''یہ ایک نایاب کیڑا ہے...... فارماسوٹیکل کی دنیا میں اس کے اور بھی کئی حیران کن استعمال ممکن ہیں...... ہمیں اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے یہ بحث طلب موضوع بدلا۔ ''سنا ہے پرسوں تم واپس جارہے ہو۔ یہاں سے پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر تمہارے دو عدد ''ایم آئی 10'' ہیلی کاپٹر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یہاں سے لے جانے کے لیے کھڑے ہیں؟''

اس نے عجیب انداز میں کہا۔ ''تم بھی تو ہمارے ساتھی ہی ہو۔ میں اپنا اور ایلی کا اغوا تمہیں معاف کرچکا ہوں۔ ظاہر ہے یہ سب اس باسٹرڈ مائرہ اور جادورامے کے سبب ہوا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں اور میرے تینوں ساتھی تمہارے ساتھ جائیں گے؟''

''بالکل میں ایسا ہی چاہوں گا۔ ہمارے پاس ہیلی کاپٹرز میں پانچ چھ مزید افراد کی گنجائش موجود ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ہماری آمد پر یہاں جو شوٹ آؤٹ ہوا تھا، اس میں تم نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ تم اس تعاون کے حق دار ہو۔ ویسے بھی میں جی دار لوگوں کی قدر کرتا ہوں...... اور وہ تمہارا نوجوان ساتھی، کیا نام ہے اس کا آمرین؟''

''آمرین نہیں عمران۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ہاں، اس کی وہ لپ ریڈنگ والی صلاحیت بھی کمال ہے۔ اس صلاحیت کو بھی اچھے طریقے سے کام میں لایا جاسکتا ہے......''

ان موضوعات پر کچھ مزید گفتگو ہوئی پھر میں نے پوچھا۔ ''کیا ہم فضائی راستے سے پاکستان جائیں گے؟''

''یہی سمجھ لو...... اس حوالے سے تمام قانونی تقاضے پورے ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

☆☆☆

عمران اب چلنے پھرنے کے قابل تھا اور کچھ کھا پی بھی رہا تھا۔ ماہین بھی قدرے بہتر تھی۔ ماہین کی ٹانگ سے وہ چھوٹا سا طاقتور بم علیحدہ کرنا کوئی آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ مگر میں اور عمران کسی نہ کسی طور کر گزرے تھے۔ اب وہ منحوس بم اس کے روز و شب کو عذاب میں مبتلا نہیں رکھ سکتا تھا۔

ہما عروج کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ مجھے اس حوالے سے تشویش تھی۔

ہم اس برفیلے دوزخ سے واپسی کے لیے تیار ہورہے تھے۔ رات کو مایا رانی نے ہمیں ایک پُرتکلف ڈنر دیا۔ اس ڈنر کا سب سے اہم تکلف گندم کی روٹی اور یخنی والے چاول تھے اور یہ دونوں چیزیں یہاں تقریباً نایاب تھیں۔

ڈنر کے بعد مایا رانی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ہم نے دیر تک باتیں کیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنے بزرگوں کے فرسودہ عقائد سے باہر نکلے۔ کڑی وحشیانہ سزاؤں کو ختم کرنے کا راستہ اپنائے۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق میں توازن برقرار کرے۔ مقدس زوب اور مقدس اگنی جیسے بہت سے توہمات، حقائق کے خلاف ہیں۔ ان سے بتدریج چھٹکارا پایا جائے۔

اس کی مہربانی ہی تھی کہ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کچھ الفاظ اس کے پلّے نہیں پڑتے تھے ان کے لیے مجھے متبادل لفظ استعمال کرنا پڑے۔

آخر میں، میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''مایا! تم سکامر کی بے وفائی کا بدلہ پوری مرد جاتی سے اور خود سے مت لو۔ اس حادثے کو ذہن سے نکال دو۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ مسکرائی۔ ''چلو، تمہارے کہنے پر نکال دیا۔'' میں نے پہلی بار اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک مختلف کیفیت دیکھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اتنی جلدی مان گئی ہو؟''

”کیسے یقین آئے گا؟“ وہ ہنسی۔ ”کیا تمہیں اپنا بابا کر بننے کی پیشکش کردوں؟“ پھر ایک دم اس نے چونک کر کہا۔ ”جب تم بندی خانے میں تھے، میں نے تمہیں ایک انگوٹھی دی تھی؟“

میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

”نہیں، میں یہ واپس نہیں لوں گی۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔ پھر ایک لمبے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری کہی ہوئی باتوں پر غور کروں اور ان کو سنجیدگی سے لوں تو پھر...... تم یہ انگوٹھی پہن لو۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ میں بھی مسکرایا۔

”کچھ نہیں ہوگا...... کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن تم کبھی نہ کبھی ہم سب کو یاد تو کرلیا کرو گے۔“

اس کے ملیح چہرے پر پہلی بار ایک گداز سا نظر آرہا تھا۔ میں نے انگوٹھی پہن لی۔

”یہی وقت تھا جب ایک کھڑکی دھماکے سے کھلی......

ایک چنگھاڑ سنائی دی اور کوئی اندھا دھند مایا پر جھپٹا۔ یہ کوئی اور نہیں قوی ہیکل گونگا تھا...... جو دراصل گونگا نہیں تھا۔ یہ خدشہ درست نکلا تھا کہ یہ موذی یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔

اس کے ہاتھ میں کوئی دو فٹ لمبی چمکیلی کٹار تھی۔ اس کا وار طوفانی تھا۔ مایا رانی نے بمشکل سر جھکا کر اپنی گردن بچائی۔ جہانان نے اتنی ہی پھرتی سے دوسرا وار مجھ پر کیا جو میری موٹی جیکٹ کو چیرتا ہوا گزر گیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنون تھا۔ مرنا اور مار دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مایا پر دوسرا وار کرتا، میں نے اس کی کلائی تھامی اور اس کے پیٹ میں گھٹنے کی ضرب لگائی۔ اس نے مجھے جوابی گھٹنا رسید کیا۔ قریباً تیس چالیس سیکنڈ تک میرے اور اس کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ مایا سمجھ گئی تھی کہ میں حملہ آور کو خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔ وہ ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ ان تیس چالیس سیکنڈ میں اس آراستہ کمرے کا کباڑا ہو کر رہ گیا۔ لیکن آخر میں جہاناں کا بھی کباڑ ہوا۔ میرے سر کی ضربات نے اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا تھا۔ کٹار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ جیت نہیں سکتا تو اس کٹار کو اس نے بڑی وحشت کے ساتھ اپنا گلا کاٹنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی توانا گردن سے خون کا فوارہ نکلا اور وہ کٹے شہتیر کی طرح اوندھے منہ قالین پر گرا۔ کئی پہریدار عورتیں بھرا مار کر کمرے میں گھس آئی تھیں مگر اب ان کے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ اوندھا پڑا تھا اور قالین اس کے خون کو جذب کر رہا تھا۔ بظاہر یہ شخص رائے کا گونگا فورمین تھا مگر حقیقت میں اس کا خاص الخاص مخبر تھا۔

مایا رانی کمرے کے ایک کونے میں ساکت کھڑی تھی...... عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

دو روز بعد ہم اس وسیع و عریض غار اور اس میں بسے ہوئے لوگوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ یہ نسبتاً ایک شفاف اور چمکیلا دن تھا۔ برف کے سفید نشیب و فراز کے اوپر نیلگوں آسمان جھکا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں پتھریلی برف پر منعکس ہوکر منظر کو مزید روشن کررہی تھیں۔

رخصت ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہمیں ایک اور سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس سوال کا تعلق ہماری ساتھی ہما عروج سے تھا۔ ایک مقامی رازداں شخص نے انکشاف کیا تھا کہ ہما عروج نے یہاں ایک قبول صورت مقامی نوجوان زیارت سے رومانی تعلقات پیدا کرلیے تھے۔ وہ یہاں کے پالتو بھیڑیوں اور کتوں کے تین رکھوالوں میں سے ایک تھا۔ پچھلے ہفتے جب میں اور عمران بندی خانے سے فرار ہوئے اور لڑائی شروع ہوئی تو زیارت نے ہما کے لیے شدید خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے یہاں سے نکال لیا۔ وہ ہنگامی طور پر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

ڈھیس پٹاس، ہما عروج کا تکیہ کلام تھا اور غار میں ہونے والی ڈھیس پٹاس کے عین موقع پر ہی وہ ہوشیاری کا مظاہرہ کر کے نکل گئی تھی۔ وہ اور اس کا مسلمان پریمی لداخ یا کارگل وغیرہ کی طرف نہیں بلکہ ویرانے کی طرف نکلے تھے۔

جب تک زندگی باقی رہتی ہے، گم ہو جانے والوں سے ملنے کی امید بھی باقی رہتی ہے۔ مجھے اور عمران کو بھی امید تھی کہ ہما عروج سے کبھی نہ کبھی پھر ملاقات ہوگی۔

وقتِ رخصت ڈیرن فورڈ اور ایلی سمیت ہم پانچ بڑی برفانی گاڑیوں پر سوار تھے۔ ایک علیحدہ گاڑی صرف ان مخصوص پنجروں کے لیے تھی جن میں زہریلے زوب اور ان کی خوراک سفید چوہے بڑی حفاظت سے بند تھے۔ حشام اور عمران ایک نشست پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میں اور ماہین تھے۔ ماہین نے ایک بار بھی حشام کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں تو میں نے مڑ کر غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ وہاں مایا رانی قبیلے کے درجنوں معزز باشندوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہ الوداعی انداز میں کچھ بول رہے تھے۔ مایا رانی کے پہلو میں اس کا لمبا تڑنگا اکلوتا باکر کھڑا تھا...... اور اس نے محبت سے باکر کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میں نے اور عمران نے مایا کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ہاتھ ہلانے کا رواج شاید یہاں نہیں تھا...... وہ بس مسکرا کر رہ گئی اور سر کو اثباتی انداز میں حرکت دی۔

اب ہمارا رخ کوئی پندرہ کلومیٹر دور اس مقام کی طرف تھا جہاں دو

"آئی ایم" ہیلی کاپٹر ہمارے منتظر تھے۔

☆☆☆

واپسی کے سفر کی مکمل رُوداد بتائی جائے تو یہ طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ دونوں ہیلی کاپٹرز نے لداخ کے اس برف زار سے پرواز کی جس ہیلی کاپٹر میں میرے علاوہ عمران، حشام اور ماہین تھے اسی میں ڈیرن، ایلی، ڈیرن کا جاپانی گارڈ اور کچھ دیگر قریبی ساتھی بھی موجود تھے۔ زوب کے پانچ پنجرے بھی بڑی احتیاط سے اسی ہیلی کے زیریں حصے میں رکھے گئے تھے۔ جو اسلحہ وغیرہ یہ لوگ لائے تھے، اس کا بیشتر حصہ بھی ہیلی کے لگیج پورشن میں رکھ دیا گیا تھا۔ دوسرا ہیلی کاپٹر کچھ آگے جا کر ہم سے علیحدہ ہو گیا، ہمارے والے ہیلی نے "تاجکستان" کے اوپر سے پرواز کی اور پھر افغانستان کی فضائی حدود استعمال کرتے ہوئے رات نو بجے کے لگ بھگ بالکل ویران پہاڑوں میں پاکستانی بارڈر کے قریب کہیں اتر گیا۔ چاروں طرف لق ودق بے آب و گیا بلندیاں تھیں۔ دور دور تک کہیں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک ہموار سطح پر اترنے کے بعد ہیلی کاپٹر کے انجن بند کر کے ساری لائٹس آف کر دی گئیں۔

پروگرام کے مطابق اب افغان بارڈر فورس کے تین ارکان نے ہمیں حفاظت کے ساتھ سرحد پار کرانا تھی۔ بارڈر کی دوسری طرف کچھ ہی فاصلے پر ایک لینڈ روور جیپ مع ڈرائیور ہمارے لیے موجود تھی اور اس نے ہمیں کہیں ٹل یا کوہاٹ کے علاقے میں ڈراپ کر دینا تھا۔ یقیناً امیر وکبیر ڈیرن نے ان سہولت کاروں کو منہ مانگے دام دیے تھے۔

ماہین کچھ ڈری ہوئی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اطمینان رکھو۔ ڈیرن کی حیثیت اس وقت ہمارے ساتھی اور دوست کی ہے۔"

"لیکن کیا واقعی وہ دوست ہے؟" عمران نے جوابی سرگوشی کی۔

ڈیرن کی نشست ہم سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے عمران کو زبان بندی کا اشارہ دیا۔

وقتِ رخصت ڈیرن نے مجھ سے باقاعدہ معانقہ کیا۔ ہولے سے بولا۔ "فی الوقت تمہارے ملک کی پولیس اور ایجنسیاں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ ابھی تو پاکستان نہیں آسکوں گا۔ مگر جلد ہی کہیں نہ کہیں ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ میں تم جیسے لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کسی وقت کوئی بھی ضرورت ہو تم فوراً مجھ سے "ہاٹ لائن" پر بات کر سکتے ہو۔"

ہاٹ لائن کا لفظ اس نے اس بیش قیمت سیٹلائٹ فون کے لیے استعمال کیا تھا جو لداخ سے روانگی سے پہلے اس نے مجھے تحفے میں دیا تھا اور صرف مجھے ہی نہیں، یہ فون اس نے عمران کو بھی گفٹ کیا تھا۔ الوداعی گفتگو کے بعد ہم نے ڈیرن اور نابینا ایلی سے ہاتھ ملائے جو ڈیرن کے کندھے سے لگی خاموش کھڑی تھی۔

تینوں سہولت کار پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے دو بارڈر فورس کی وردیوں میں تھے اور ایک شلوار قمیص اور پگڑی میں تھا۔ اس نے بھاری گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ ان تینوں نے ہمیں بخوبی وہ نادیدہ لائن عبور کرا دی جسے درمیانی سرحد کہا جا سکتا تھا۔ ہم ایک ڈھلوان پر چڑھے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک نیم پختہ راستہ اور اس پر کھڑی لینڈ روور جیپ دکھائی دی۔ دروازے کھلے تھے۔ ہم درمیانی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ شلوار قمیص والے سہولت کار نے بتایا تھا کہ ہم چونکہ ذرا جلدی پہنچ گئے ہیں اس لیے پٹھان ڈرائیور کے آنے میں بیس تیس منٹ لگیں گے۔

جیپ کے اندر داخل ہوتے ہی ہوا کی شدید کاٹ اور سردی میں کمی محسوس ہوئی۔ حشام مسلسل خاموش تھا۔ اس نے پورے سفر میں بس دو چار بار ہی زبان کھولی تھی۔ ماہین سے تو اس نے غالباً آنکھ تک نہیں ملائی تھی۔ لگتا تھا کہ مایارانی کی انوکھی آزمائش نے اس کے پلے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

عمران بھی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس نے نشیب میں دور کھڑے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا جو اَب غالباً دوبارہ پرواز کی تیاری میں تھا۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ "کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ ڈیرن فورڈ جو کہہ رہا ہے، وہ درست ہے۔ وہ اس نایاب جانور کو اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرے گا جس کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ میرا مطلب ہے وائرس کی تخلیق؟"

"نہیں عمران! مجھے مکمل یقین نہیں ہے۔ رامے، میم مائرہ، بوزو کی اور ڈیرن جیسے سب لوگ دولت کو خدا مانتے ہیں۔ ڈیرن تھوڑا سا مختلف ضرور ہے مگر ہے وہ بھی اسی قبیل سے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

عمران اور ماہین نے ایک ساتھ حیرت سے میری طرف دیکھا۔ عمران بولا۔ "تو پھر آپ نے ایسا کیوں کیا...... میرا مطلب ہے کہ اس ساری بھاگ دوڑ اور خون خرابے کا کیا حاصل...... جب ڈیرن یہ زوب اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔"

"وہ ساتھ لے کر نہیں جا رہا عمران۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"مم...... میں کچھ سمجھا نہیں؟"

اب عمران اور ماہین کے علاوہ حشام بھی میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے وہ سیاہ رنگ کا چھوٹا سا لیکن طاقتور ریموٹ نکالا جو اس سے پہلے رامے اور مائرہ کے

پاس تھا اور وہ اس کے "ڈراوے" سے ہر وقت ہمارا دم خشک رکھتے تھے۔ میں نے ریموٹ عمران کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ اس بات کی گارنٹی ہے کہ زوب والے پنجرے ڈیرن فورڈ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

"آ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ماہین کی ٹانگ سے جو طاقتور بارودی ڈیوائس اٹیچ کیا گیا تھا، وہ اس وقت سامنے اس ہیلی کاپٹر کے بیچ پورشن میں ہے۔ وہاں کافی ایمونیشن بھی ہے جس میں کوئی دو درجن ہینڈ گرینیڈز بھی ہیں...... اور تمہیں پتا ہی ہے زوب والے پانچوں پنجرے بھی بیچ پورشن میں ہی ہیں......"

عمران کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ کئی سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "تو کیا...... آپ...... بلاسٹ کرنے جا رہے ہیں؟"

"دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے؟" میں نے اطمینان سے کہا اور جیکٹ کی اندرونی جیب سے وہ قیمتی سیٹلائٹ فون نکال لیا جو ارب پتی ڈیرن فورڈ نے ہمیں تحفے میں دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے پر آہستہ آہستہ گھومنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے ڈیرن فورڈ کا نمبر ملایا۔ فوراً رابطہ ہوا۔ "ہیلو، خیریت ہے مسٹر تابش!" دوسری طرف سے امریکن لہجے میں پوچھا گیا۔

"ایسی کوئی خاص خیریت نہیں ہے مسٹر ڈیرن!" میں نے جواب دیا۔ "تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جب پھر ضرورت پڑے رابطہ کر لینا...... رابطے کی ضرورت جلدی پڑ گئی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تمہارے...... ہیلی...... میں بم ہے ڈیرن!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میرے دل میں تمہارے اور ایلی کے لیے تھوڑی سی ہمدردی موجود ہے۔ اس لیے میں تمہیں صرف تین منٹ دے رہا ہوں۔ اپنے ساتھیوں سمیت ہیلی سے نکل جاؤ...... صرف تین منٹ، اس کے بعد اپنی موت کے تم خود ذمے دار ہو گے۔"

"یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ ہکلایا۔ میرے لہجے نے اسے لرزا دیا تھا۔

"تمہارا ٹائم شروع ہوتا ہے اب...... تین منٹ مطلب 180 سیکنڈ۔" میں نے فون بند کر دیا۔

وہ بے حد سنسنی خیز لمحے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔

"تم تاریں جوڑ کر جیپ اسٹارٹ کرو۔"

عمران اس کام میں کائیاں تھا۔ اس نے ایک منٹ میں جیپ اسٹارٹ کر لی۔ یہی وقت تھا جب ہم نے نیم تاریکی میں دیکھا کہ ڈیرن اور اس کے مسلح ساتھی افراتفری میں ہیلی کاپٹر سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ نہ صرف باہر نکلے بلکہ لڑکھڑاتے ہوئے سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ زوب نایاب حشرات الارض میں سے تھا، لیکن نہایت زہریلا اور خطرناک...... اور اس کی سب سے بڑی خطرناکی یہی تھی کہ وہ کسی ایسے وائرس کی تخلیق کے لیے استعمال ہو سکتا تھا جو ایک وبا کی صورت دنیا کو موت کی ایک نئی یلغار کے حوالے کر دیتا...... تین منٹ پورے ہوتے ہی میں نے سیاہ ریموٹ کا COVER ہٹا کر سرخ بٹن دبا دیا۔ ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ پہلے ایک چھوٹا بلاسٹ ہوا، پھر ایک فلک شگاف دھماکے نے نصف ہیلی کاپٹر کے پرخچے اُڑا دیے اور باقی حصہ آگ کا گولا بن گیا...... میرے اشارے پر عمران نے جیپ کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ ہم نوے درجے کا موڑ کاٹ کر ٹھیک ٹھاک رفتار سے ڈیورنڈ لائن سے دور ہٹنے لگے۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے دور نکل جاتے، اتنا ہی بہتر تھا۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے کے ناہموار سفر کے بعد ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے اور پھر پختہ سڑک پر تیز رفتاری سے خرلاچی اور پاراچنار کی طرف بڑھنے لگے۔ عمران نے کہا۔ "ایک سوال مسلسل دماغ میں گھوم رہا ہے۔ آپ بتائیں گے؟"

"پوچھو۔" میں نے جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا جہاں اب چاند کی ٹھٹھری ہوئی روشنی تھی۔

"ہم نے سب زوب ختم کر دیے۔ لیکن زوب کے دو جوڑے تو ابھی تک وہاں مایارانی کے قبیلے کے پاس موجود ہیں۔"

"وہ نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "غار سے ہماری روانگی سے آدھ گھنٹا پہلے وہ دونوں جوڑے بھی ڈیرن کے پاس پہنچ چکے تھے۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے، ایک مقامی عورت نے بہت بھاری رشوت کے عوض یہ دو جوڑے عین وقت پر ڈیرن کو پہنچا دیے تھے۔"

عمران اور ماہین حیرت سے میری جانب دیکھنے لگے۔

"ڈیرن فورڈ جیسے لوگ اجارہ دار ہوتے ہیں عمران۔ ڈیرن کو بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ زوب کے یہ آخری دو جوڑے یہاں رہیں اور کوئی اور طلب گار ان تک پہنچ جائے۔"

"یعنی مایارانی سے بھی دھوکا ہوا۔" ماہین منمنائی۔

"میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا ماہین...... ان لوگوں کو اپنے فرسودہ عقیدوں کے جال سے نکلنے میں مدد ملے گی۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زوب کی موجودگی میں ان کے علاقے میں کوئی بڑا برفانی طوفان نہیں آ سکتا۔ چند روز پہلے اس مفروضے کو ہم نے اپنی نگاہوں کے سامنے غلط ہوتے دیکھا تھا...... اور پتا نہیں ایسے کتنے توہم ہیں ان لوگوں کے۔"

”یعنی اب زوب ناپید ہے؟“ عمران نے طویل سانس لی۔

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

یہی وقت تھا جب حسبِ توقع سیٹلائٹ فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف ڈیرن فورڈ ہی تھا۔ مجھے معلوم تھا اس نے بہت ماتم کرنا ہے۔ میں نے کال ریجیکٹ کی پھر ایک وائس میسج اس کے لیے ریکارڈ کروایا۔ ”ڈیرن فورڈ! جو ہوا اسے بھولنے کی کوشش کرو، کیونکہ اس کو ریورس نہیں کیا جاسکتا...... اور ہاں دوسروں کو بے وقوف سمجھنا بھی چھوڑ دو۔ اور ایک وارننگ بھی تمہیں دینا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جلد یا بدیر تمہارا دل دوبارہ پاکستان میں گھسنے کو مچلے۔ یہ بھول نہ کرنا۔ صرف پولیس اور ایجنسیاں ہی نہیں، اس مرتبہ تم مجھے بھی اپنے راستے میں کھڑا پاؤ گے، گڈ نائٹ۔“

میسج بھیج کر میں نے فون آف کر دیا۔

صبح کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی ہم آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ آٹھ دس میل آگے جا کر ہمیں لب سڑک ایک صاف ستھرا چھپر ہوٹل نظر آیا۔ بھوک شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور جیپ وہاں روک دی۔ ”حشام! چلو آؤ کچھ کھا لیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، میں یہاں ٹھیک ہوں۔“ اس نے نخوت سے چھپر ہوٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اپنے بیگ میں سے اُن امپورٹڈ بسکٹس کا ایک ڈبا نکال لیا جو وہ ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ ہم تینوں ہوٹل کے سامنے بچھی چارپائیوں پر آبیٹھے۔ اب دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ قریب ہی ایک بڑی لگژری جیپ میں سے بڑے سے پگڑ والے کوئی پیر صاحب نکلے تھے۔ درجنوں لوگ ان کے اردگرد جمع تھے۔ ان کے ہاتھ چوم رہے تھے، انہیں ہار پہنا رہے تھے۔ میں نے سوچا، کوئی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا۔ کسی کو معلوم نہیں، ہم کن تکالیف اور مصائب کو جھیل کر یہاں تک پہنچے ہیں...... اور یہ سب کچھ ہم نے کیوں جھیلا ہے؟ وہ کون سی آفت تھی جو قدرت نے ہم ناچیز بندوں کے وسیلے سے ٹالی ہے۔ ثروت، کمسن ندیم اور لاہور کے پٹھان لڑکے جیسے اَن گنت لوگ کس ”قاتل مسیحا“ سے محفوظ ہوئے ہیں۔ ہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا اور ہمیں اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ چھپر ہوٹل کے سامنے سے اٹھتے ہوئے سفید دھوئیں کے اوپر نیلا آسمان تھا...... ہاں نیلا آسمان تو تھا۔

چائے، مکھن کا پراٹھا اور ہوم میڈ بسکٹس ہمارے سامنے آئے تو ماہین نے ایک چھوٹے بسکٹ کے سوا اور کچھ نہ لیا۔ میں نے کہا۔ ”اگر کچھ لینا نہیں ہے تو گاڑی سے نکل کر سردی میں کیوں آئی ہو؟“

”بس وہاں بیٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ وہ عجیب انداز میں بولی۔

اس کا انداز ہمیں سب کچھ سمجھا رہا تھا۔

ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی، اس کے لمبے بال ہوا میں اُڑتے رہے۔ پھر وہ عمران کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولی۔ ”عمران شکریہ۔“

”کس بات کا؟“

”کوئی ایک بات ہو تو کہوں۔“

”کچھ اور بھی کہنا ہے تو کہہ دو۔“ میں نے چائے کی چُسکی لیتے ہوئے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ ”نہیں انکل تابی...... اور کچھ نہیں۔“

مجھے لگ رہا تھا کہ آج پہلی بار ماہین کو اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ وہ میرے اور عمران کے ساتھ بیٹھی ہے اور حشام ہمیں دیکھ رہا ہے۔

خاموشی ذرا طویل ہوئی تو عمران کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اٹھ نہ جائے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”اچھا ماہین! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیونکہ لڑکیاں، لڑکیوں کی نفسیات اچھی طرح سمجھتی ہیں۔“

وہ سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”ایک لڑکی ہے جو سوتے میں بڑبڑاتی ہے...... اور میرے دوست سے محبت کا اظہار کرتی ہے، لیکن جاگتے میں ایک لفظ بھی بول کر نہیں دیتی۔ بالکل بیگانی بنی رہتی ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟“

”م...... میں سمجھی نہیں۔“ وہ اُلجھ کر بولی۔

”اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ میں کسی دن اس لڑکی سے تمہیں براہِ راست ملواؤں گا۔ آپ کا کیا خیال ہے چاچو جان؟“ اس نے میری طرف دیکھا۔

”جیسا تم مناسب سمجھو۔“ میں نے کہا۔ ”اور ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر سڑک کی طرف نکل گیا۔ کھڑا ہو کر ان شمالی پہاڑوں کے پار دیکھنے لگا جہاں دور کہیں ایک برفستان میں سرخ بالوں والی میم مائرہ دفن تھی اور اس درندہ صفت کے چیتھڑے دفن تھے جس کا نام جادورامے تھا اور جس نے اپنی بدصورتی کا انتقام ساری دنیا سے لینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

وہی معاشرے ترقی کی منازل طے کرتے ہیں جو ہر صورت اپنے کام اور ذمّے داری کو اولیت دیتے ہیں... کرسمس کے تہوار پر اپنے کاموں سے دور خوش خرام لوگوں کی پُرجوش سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں مگر کوئی ایسا بھی تھا جو ذمّے داری کے دباؤ کے باعث بے چین و مضطرب تھا۔

مجرم کا فرار اور اس کی تلاش کے لیے کی جانے والی بھاگ دوڑ کا دلچسپ احوال

# چھٹی

مظہر سلیم ہاشمی

کرسمس میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ مرد و زن اپنے بچوں کے ساتھ بلاتخصیص تہوار منانے کے لیے لندن کی سڑکوں پر گھوم پھر رہے تھے۔

ہجوم اتنا تھا کہ دھیمے مزاج کے حامل لوگ بھی دھکم پیل پر مجبور ہو گئے تھے۔ جہاں کسی دکان پر سیل لگی تھی وہاں پر چیزوں کے حصول کے لیے باقاعدہ لوگوں کو گتھم گتھا ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ پر واقع سُپر اسٹور 'اومنیوس' پر صورتِ حال سب سے زیادہ خراب تھی۔

سورج ڈھلنے کو آیا تھا لیکن اسٹور سے باہر ابھی تک رش لگا ہوا تھا۔ روشنیاں مگلتی کھڑکیوں کے باہر اندھیرا چھانے لگا تھا اور روئی کے نرم گالوں کی طرح برف گر رہی تھی۔ اسٹور میں لگے اسپیکر سے کرسمس کی مناسبت سے گیت نشر ہو رہے تھے۔ اندر کا حال خریداروں سے بھرا ہوا تھا جو اپنے پیاروں کے لیے تحائف کی خریداری میں ایک دوسرے کو دھکیلتے پھر رہے تھے۔ رنگ و نور کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ اتنے لوگوں کے ہجوم کے باعث وہاں بہترین ہواداری کا نظام ہونے کے باوجود ایک ہمک سی پھیلی تھی۔

پانچویں فلور پر ٹوائے لینڈ کے داخلی راستے پر ہی سنہرے بالوں والی ایک دوشیزہ ٹھہری ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ موجود لمبے قد کے حامل وجیہہ اور بھاری وجود والے جوان پر اُس کی محبت بھری نگاہوں میں اب جلال دکھائی دینے لگا تھا۔ ان کے ہمراہ چھوٹا بچہ اُس کے مزاج کی پروا کیے بغیر اوپر نیچے اچھل رہا تھا تا کہ اپنا ہاتھ چھڑا کر کھلونوں کی جانب لپک سکے۔

''اُف خدایا...... تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے بوب؟ چھٹی لے کر آنے کے باوجود تم میری جانب توجہ دینا بھول ہی گئے ہو۔'' لڑکی آخر بول اٹھی۔

سپرنٹنڈنٹ سراغرساں رابرٹ پولارڈ نے ایک لمحے تک کوئی جواب نہ دیا۔ اگرچہ وہ چھٹی پر تھا لیکن دماغی طور پر ابھی بھی اسکاٹ لینڈ یارڈ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھا جن کے ذمے وہ ایک اہم کیس چھوڑ آیا تھا۔

یہ چھٹی لینے کا مقصد اپنی منگیتر ایلسا راسن کو 'اومنیوس' پر شاپنگ کرانے کے ساتھ ساتھ اُس کے چھ سالہ بھتیجے ٹامی کو ٹوائے لینڈ کی سیر کرانا بھی تھا۔ فی الحال وہ اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام دکھائی دے رہا تھا۔

''بوب......'' ایلسا ایک بار پھر تنک کر بولی۔ ''ایسا لگتا ہے تم ہماری کمپنی میں بور ہو رہے ہو؟''

''مجھے اچانک ہی خیال آیا ہے۔'' بوب ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آفس سے نکلتے وقت میں ڈیوٹی روم کو مطلع کرنا بھول گیا ہوں کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟''

''بس......؟'' ایلسا کے لہجے میں حیرت بسی تھی۔ ''اتنی سی بات کے لیے تم اتنی دیر سے کھوئے کھوئے پھر رہے ہو؟''

''اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہر کسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ڈیوٹی روم کو مطلع کر کے ہی اپنی سیٹ سے جائے۔''

طشتری جیسی آنکھوں والا چھوٹا ٹامی یہ سن کر اچھلنے لگا۔

''اسکاٹ لینڈ یارڈ...... یاہو...... اسکاٹ لینڈ یارڈ۔'' وہ اپنی مستی میں شور کرنے لگا۔

''تم تو خاموش ہو جاؤ ٹامی۔'' ایلسا چڑ کر بولی پھر اچانک اپنا لہجہ نرم کیا۔ ''ورنہ انکل بوب تمہیں سانتا کلاز سے ملاقات کے لیے لے کر نہیں جائیں گے۔''

ٹامی یکلخت ہی خاموش ہو گیا۔ وہ اگرچہ صرف چھ سال کا تھا لیکن اسے یہ لگتا تھا کہ سانتا کلاز والی باتیں صرف قصے کہانیاں ہی ہیں۔ وہ صرف سوچ کر رہ گیا لیکن کہا کچھ نہیں کیونکہ کرسمس کے اتنے قریب وہ اپنی بے یقینی کا اظہار کر کے کھلونوں سے محروم رہنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

''تو بوب یہ ڈیوٹی روم میں کال کر کے جانا کیا واقعی اتنا زیادہ اہم ہے؟'' وہ سوال کرنے کے ساتھ ساتھ بوب کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہی تھی جس نے اب بھی اثبات میں سر ہلا کر جواب دینا مناسب سمجھا تھا۔

اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بوب جب سے آیا تھا، ذہنی طور پر کہیں اور ہی تھا۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ شاید ٹامی کی موجودگی اُسے کھل رہی ہے لیکن اب وہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی بوب کام کے بارے میں سوچتا ہوا اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ اپنی منگیتر کی خوشی کو یکسر نظر انداز کر دے۔

''تو پھر اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سپاہی کیسے ہیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی ایلسا کے لہجے میں تلخی کا عنصر نمایاں ہو گیا۔ ''کیا وہ لوگ بھی کرسمس مناتے ہیں؟''

ایلسا کا انداز بوب کے صبر کا پیمانہ لبریز کرنے کے لیے آخری پتھر ثابت ہوا۔ اُس کے اندر کا سراغرساں افسر یہ لہجہ برداشت نہ کر سکا تو وہ اپنی بھاری آواز میں بولا۔

''اسکاٹ لینڈ یارڈ میں کرسمس کے گیت گانے والا ماحول نہیں ہوتا ہے ایلسا۔'' اُس کی آواز کھلونا ٹرینوں پر بھی بھاری پڑ رہی تھی۔ ''اس وقت میرے ساتھیوں کی توجہ ایک بہت ہی اہم کیس پر مرکوز ہے۔ ہم سب اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اس کیس کو حل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔''

''کیا کسی کا مرڈر ہو گیا ہے انکل بوب؟'' ٹامی نے چہک کر سوال کیا۔

''نہیں چھوٹو...... کسی کا قتل نہیں ہوا۔ لیکن جو بھی ہوا ہے، وہ قتل سے کم بُرا نہیں ہے۔'' بوب نے رسان سے جواب دیا۔

''ارے واہ......'' ٹامی یہ کہتے ہوئے اتنی زور سے اُچھلا کہ ایسا لگا جیسے ہوا میں پرواز کر رہا ہو لیکن ایلسا نے اُس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

''بوب...... بچے کو تو تنگ مت کرو۔'' ایلسا بے صبری سے بولی۔

''میں نے کیا کیا؟'' بوب حیرانی سے بولا۔ ''میں تو خود حیران ہو رہا ہوں کہ یہ کیسا کیس ہے؟ پولیس کے شاہدین کے مطابق ان کی نظروں کے عین سامنے لندن کے دو بالکل مختلف علاقوں سے دو الگ لوگوں کا ایک ہی وقت میں پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہو جانا کسی معمے سے کم تو نہیں۔''

ٹامی...... انکل کی بات پر توجہ نہیں دینا۔'' ایلسا تیزی سے بولی۔ ''یہ مذاق کر رہے ہیں۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔'' بوب نے منہ بنایا۔ ''شارٹی اور کرنل کے نام سے مشہور دو مجرم ایسے غائب ہو گئے ہیں جیسے انہیں زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ دو لاکھ پاؤنڈ مالیت کے ناتراشیدہ ہیرے بھی اپنے ساتھ لے کر غائب ہوئے ہیں۔ اب ہمیں یہ سمجھ نہیں آرہی کہ وہ کیسے غائب ہو گئے ہیں؟''

''ٹامی، انکل کی کسی بات کا اعتبار نہ کرنا۔'' ایلسا تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ ''تمہیں تو پتا ہے نہ کہ یہ آفس کی باتیں ہمارے ساتھ نہیں کرتے۔''

اُس نے ٹامی کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے اور بوب کے بیچ میں کر لیا۔ وہ اس وقت ٹوائے لینڈ کے مرکز میں پہنچ چکے تھے جہاں بچوں کا شور کان پھاڑ دینے والا تھا۔ بوب نے سوچا کہ اگر وہ اس شور و غوغا میں بولے تو شاید ہی اپنی آواز سن پائے گا۔

وہ دونوں ٹامی کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے ایک نسبتاً کم شور والے گوشے میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک جادوگر ایک بڑی سی کھوپڑی کو بولنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کھوپڑی نے پہلے تو چند سرگوشیاں اور سیٹیاں بجائیں اور پھر اس کے حلق سے ایک نغمہ بلند ہوا۔

ایلسا کھوپڑی کے نغمے سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اُس نے ٹامی کو بھی اس تماشے میں مگن دیکھا تو بوب کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

''اُس مجرم کو تم کرنل کیوں کہتے ہو؟''

''کیونکہ وہ ایک کرنل جیسا دکھائی دیتا ہے۔ ادھیڑ عمر، ملٹری کٹنگ والے بال اور ہمیشہ ایک آنکھ پر آئی گلاس لگا کر رکھتا ہے۔ اگر اُس نے آئی گلاس نہ بھی پہنا ہو تب بھی وہ اپنی ایک آنکھ دبا کر اشارے کرتا رہتا ہے...... ایسے۔'' بوب نے آخری جملے کے بعد ایلسا کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''زیادہ چالاک نہ بنو......'' ایلسا قدرے شرماتے ہوئے بولی۔ ''ایسے کرتے ہوئے تم بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے۔''

''تو کرنل کون سا اچھا لگتا ہے؟'' بوب نے اس کی بات کا جواب ایک قہقہے سے شروع کرتے ہوئے دیا۔ ''ہاں وہ ایک پُراعتماد شخص ہے لیکن اس حرکت کی وجہ سے ہجوم میں بھی آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ ایک پُراعتماد ٹھگ ہے اور اُس نے اپنی چکر بازی چلا کر کسی کو دو لاکھ پاؤنڈ کے ہیروں سے محروم کر دیا ہے؟'' ایلسا نے پوچھا۔

''نہیں...... اُس احمق نے زندگی میں پہلی بار اپنی عقل استعمال کرنے کے بجائے تشدد کا راستہ اختیار کیا ہے۔'' بوب نے بتایا۔

''کیا اُس نے کسی کو قتل کر دیا ہے؟'' ایلسا نے ایک جھرجھری لی۔ ''کسی کا گلا کاٹ دیا ہے کیا؟''

ایلسا نے اس دوران ٹامی کو دیکھا جو ابھی تک کھوپڑی کا گانا سننے میں مگن تھا۔ بوب کی طرف اُس کی نظریں گئیں تو وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

''نہیں...... اتنا بھی دردناک انجام نہیں ہوا ہے کسی کا۔''

''تب پھر ہوا کیا ہے؟'' ایلسا اب پوری طرح اس کیس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کیونکہ اس کی آواز میں بے چینی نمایاں تھی۔

''اسپائنگ اسٹریٹ میں ریجنٹ کارنر پر کئی سال سے ایک ہیروں کے تاجر، وان بیلے کی دکان ہے۔ وہ اکثر ناتراشیدہ ہیروں کو ایک چمڑے کے بیگ میں رکھتا ہے اور یہ بیگ اس کی جیب میں موجود رہتا ہے۔ اب تک اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا اس لیے وہ پُرسکون انداز میں ہیرے اپنی جیب میں ڈال کر پھرتا رہتا تھا۔'' بوب تفصیل سے جواب دے رہا تھا لیکن ایلسا اُسے ٹوکے بغیر نہ رہ سکی۔

''پھر اب کیا ہوا؟''

''صبح سوا دس بجے کے لگ بھگ وان بیلے کو ایک فون کال موصول ہوئی کہ کچھ غیرملکی خریدار آئے ہیں۔ یہ کرنل کی جانب سے پھیلایا گیا ایک جال تھا جس میں وہ پھنس گیا۔ جیسے ہی وہ نیچے پہنچا کرنل اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس اُسے لوٹنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ بریف کیس ہاتھ میں اٹھائے وہ

کوئی بزنس مین لگ رہا تھا۔ اس حلیے میں کسی پہریدار نے اُسے مشکوک سمجھنے کی زحمت نہیں کی۔ داخلی دروازے پر ہی اُس نے وان بیلے کو ایک زوردار مُکا رسید کر کے بے ہوش کیا اور لیڈر بیگ لے کر فرار ہو گیا۔"

"کیا......؟ پیدل ہی بھاگ گیا؟" ایلسا نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن بوب تب تو اسے آسانی سے پکڑا جانا چاہیے تھا۔"

"ایسا نہیں ہوا...... کرسمس کی وجہ سے سڑکوں پر بہت زیادہ رش تھا۔" بوب نے اس کی بات کی تردید کی۔ "وہ بہ آسانی فرار ہو جاتا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ دو پولیس کانسٹیبلوں کی نظر میں آ گیا۔ انہوں نے اسے بیگ چھیننے کے بعد فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کرنل نے جیسے ہی انہیں دیکھا وہ آکسفورڈ سرکس کی جانب جانے والی بس میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ ایک کانسٹیبل تو اس کے پیچھے لگ گیا جبکہ دوسرے نے فوراً ہی یارڈ میں فون کر کے واردات کے بارے میں مطلع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ دو منٹ کے اندر اندر ایک پولیس اسکواڈ کی کار اُس بس کے آخری اسٹاپ پر پہنچ گئی تھی۔ کرنل بس کے پائدان پر ہی تھا اور کار کو دیکھ کر نیچے کود گیا۔ ہمارے دو آدمیوں نے اس کا پیچھا کیا لیکن رش کی وجہ سے اسے پکڑنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ "اینی مون" نامی اسٹور میں گھس گیا۔ وہاں اس کا پکڑا جانا یقینی تھا لیکن پھر وہ وہاں موجود ایک ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا اور جب تک ہجوم کو دھکیلتے ہوئے پولیس والے اس تک پہنچتے، وہ غائب ہو چکا تھا۔"

"کیا مطلب غائب ہو چکا تھا؟" ایلسا بھونچکا رہ گئی۔

"غائب مطلب جب پولیس والے فون بوتھ تک پہنچے تو کرنل کا وہاں کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔"

"فون بوتھ کے اندر ہی......"

"بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا۔"

"لیکن یہ تو ناممکن ہے۔"

"تم صحیح کہہ رہی ہو لیکن فی الحال یہ ناممکن کام ممکن ہو چکا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اینی مون اسٹور بالکل اس اومنیوس اسٹور کی بغل میں واقع ہے۔"

ایلسا جادوگر کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ان کے سامنے موجود جادوگر نے اب کھوپڑی کی زبانی ایک نیا گیت سنانا شروع کر دیا تھا۔ آواز اچھی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پیشہ ور گلوکار گانا گا رہا ہو۔ اس لمحے میں تامی، بوب اور ایلسا تینوں ہی ٹوائے لینڈ میں جاری شور وغوغا سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

"مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ ہیرے ناتراشیدہ تھے۔" بوب نے ایک بار پھر اپنے ذہن میں اُمنڈنے والے خیالات کو الفاظ کی شکل دی۔ "عام کنکروں کی طرح سرمئی سے دکھنے والے اور جب تک ان کو تراش کر پالش نہ کیا جائے تب تک کرنل کے پاس ان کا کوئی مصرف نہیں ہے۔"

"اوہ......" ایلسا سر ہلا کر رہ گئی۔

"تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ ایک ہیرے تراشنے والی شخصیت سے رابطہ کیا۔" بوب نے بتایا۔ "مجرمانہ ریکارڈ کی وجہ سے ہم جانتے تھے کہ وہ کس سے رابطہ کر سکتا ہے۔"

"یہ یقیناً وہی بندہ ہوگا جس کا تم نے پہلے نام لیا تھا...... شارٹی؟" ایلسا نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"بالکل......" بوب نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی۔ "لیکن شارٹی کوئی بندہ نہیں ہے...... وہ ایک عورت ہے۔"

"عورت......؟" ایلسا نے تامی کو آگے کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کی لہریں جلوہ گر ہو گئی تھیں۔

"ہاں کیوں نہیں......؟" بوب نے تیزی سے کہا اور تامی کو واپس پیچھے کیا۔ "وہ کرنل کی محبوبہ ہے۔ وہ آس پاس کے علاقوں میں ہی رہتی ہیں۔ واردات کے بارے میں فون کال آتے ہی دو خواتین پولیس اہلکاروں کو اس کی نگرانی کی ذمّے داری سونپ دی گئی تھی۔ ہم اسے گرفتار نہیں کر سکتے تھے لیکن......"

"کیوں گرفتار نہیں کر سکتے تھے؟" ایلسا نے بوب کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اوہو ایلسا بات پوری تو سن لیا کرو...... جب شارٹی نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تو پھر اُسے کس بنا پر گرفتار کرتے؟"

"اوہ......" ایلسا نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اصل میں اب یہ بات معلوم کرنی تھی کہ کرنل شارٹی سے کب اور کہاں ملتا ہے...... اگر وہ ہیرے اُسے فراہم کرتا تو ہم ان دونوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیتے۔"

"پھر......؟" ایلسا نے پوچھا۔

''خواتین پولیس اہلکار شارٹی کے گھر کے باہر ہی تعینات تھیں۔ جب شارٹی گھر سے نکلی تو اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پارسل تھا۔ وہ شروع سے ہی واقف تھی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ کرنل اور اس کی محبوبہ نے ابتدا سے ہی یہ ساری منصوبہ بندی کر رکھی تھی کہ اگر اُن کا پیچھا کیا جاتا ہے تو کیسے اپنے تعاقب کاروں سے پیچھا چھڑانا ہے۔'' بوب نے بتایا تو ایلسا نے سر ہلا کر سمجھنے کا اقرار کیا۔

''شارٹی بیس اکیس سال کی براؤن بالوں والی ایک جوان عورت ہے۔ اُس کے قدموں کی رفتار بہت تیز تھی۔ ہماری پولیس والیاں جب تک اس کے قریب پہنچتیں، وہ ایک بیوٹی پارلر کم میک اَپ اسٹور میں داخل ہوگئی۔ پولیس والیاں جب تک وہاں پہنچیں شارٹی ایک فون بوتھ میں گھس چکی تھی۔''

بوب نے یہ کہنے کے بعد ایک وقفہ دیا۔

''اب یہ مت کہنا کہ وہ بھی غائب ہوگئی۔'' ایلسا کے انداز میں بے یقینی در آئی تھی۔ اُسے اب لگنے لگا تھا کہ بوب بس اس کا دھیان بٹانے کے لیے کوئی ماورائی کہانی سنا رہا ہے۔

جادوگر کھوپڑی کی مدد سے مسلسل گانے سنوار رہا تھا۔

''بظاہر یہی لگتا ہے کہ اپنے پارسل کے ساتھ وہ بھی فون بوتھ میں ہی غائب ہوگئی۔'' بوب نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

ایلسا کا گلابی چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ تیزی سے مڑی اور جھٹکے سے ٹامی کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

''مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا۔'' وہ بولی۔ ''یہاں بھی رش ہے...... دیکھو ذرا اس ہجوم کو۔''

''کیا دیکھوں؟'' بوب نے قدرے بے بسی سے کہا۔

''اتنی زیادہ بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ دیکھو ذرا یہاں کوئی شخص کیا اچانک سے غائب ہوسکتا ہے؟'' ایلسا نے تیزی سے کہا۔ ''یہاں ان چلتے پھرتے لوگوں میں کوئی اُڑن چھو ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر موجود کوئی 'فون بوتھ' میں سے ہی غائب ہوگیا۔''

''کیا کہا جاسکتا ہے؟'' بوب بولا۔ ''دو مختلف لوگ ایک ہی انداز میں غائب ہوئے ہیں۔ پولیس نے ان جگہوں کو پوری طرح گھیرے میں لیا ہوا تھا اور وہ لوگ کسی خفیہ راستے سے بھی فرار نہیں ہوئے۔ ہم نے ایک ایک کونا کھنگال لیا تھا لیکن وہ نہیں ملے۔ حتیٰ کہ ہم نے ایک ایک گاہک کو روک کر سوالات کیے تھے لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی نکلا۔ ایسے میں تو یہی کہنا بہتر لگتا کہ وہ کسی جادو کے زور پر غائب ہوگئے ہیں۔''

''کیا اسٹاف ممبرز سے بھی پوچھ گچھ ہوئی؟'' ایلسا نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''ان سے تو سب سے پہلے ہی پوچھ تاچھ ہوئی تھی۔ اسٹور اور بیوٹی پارلر دونوں ہی صبح نو بجے کے لگ بھگ کھلتے ہیں۔ ان کے منیجرز نے جو حاضری رجسٹر پیش کیے ہیں، اُن سے بھی یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر ہی موجود تھے۔ ہم نے علاقے میں ان سے متصل اسٹورز میں بھی یہی کارروائی کی۔ ہماری پھرتی کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ہیروں کو اِدھر اُدھر کر پاتے۔'' بوب نے تفصیل بتائی اور پھر پورے یقین سے بولا۔

''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ وہ دونوں اسٹور سے نکلے ہی نہیں اور وہاں کہیں غائب ہوگئے۔''

ایلسا نے غائب ہونے والی بات پھر سے سنی تو غصے سے تپ گئی۔

''چلو ٹامی......'' وہ ایک بار پھر اپنے بھتیجے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ وہ تینوں کسی مالا میں پروئے موتیوں کی ایک لڑی کی طرح ہجوم میں سے جگہ بناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ''انکل بوب نے یہ غائب والا عجیب مذاق شروع کر دیا ہے۔ میں اس حرکت پر ان سے آئندہ بھی بات نہیں کروں گی۔''

''رکو ذرا...... صبر کرو۔'' بوب نے ان دونوں کو روکتے ہوئے کہا۔

ایلسا ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ بوب سمجھ گیا تو ٹامی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ہمیں اس طرف جانا ہے۔ آؤ ٹامی آج تمہاری سانتا کلاز سے ملاقات کرائیں۔''

ایک جانب سرنگ نما راستہ بنا ہوا تھا، جہاں مختلف رنگوں کی روشنیوں اور قمقموں سے پورے ماحول کو جگمگایا ہوا تھا۔ بچے یہاں پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کیونکہ آگے کی سمت میں رش لگا ہوا تھا۔

ایک جانب بڑے سے کارڈ بورڈ پر سرخ حروف تہجی کا استعمال کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''فادر کرسمس صبح گیارہ بجے سے شام چھ بجے تک موجود رہیں گے۔''

بوب نے تین ٹکٹ خرید لیے تاکہ سرنگ سے گزر کر

ہال میں داخل ہو سکے جہاں پر وہ فادر کرسمس یعنی سانتا کلاز سے ملاقات کر سکیں۔ ہال کی خوب صورتی سے سب ہی متاثر نظر آرہے تھے۔ وہاں کی سجاوٹ لاجواب تھی۔ کارڈ بورڈ کی مدد سے پریوں اور بادلوں کا دلکش امتزاج پیش کیا گیا تھا۔

ٹامی اور ایلسا اس خوب صورتی سے محظوظ ہو ہی رہے تھے کہ یکلخت ہی بوب ٹھٹک کر رک گیا۔ اُس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ اچانک ہی اس کا بدن اکڑ گیا تھا اور وہ سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

سامنے ہی ایک اسٹیج سا بنا ہوا تھا جس پر چڑھنے کے لیے دو سیڑھیاں تھیں۔ وہیں پر ایک تخت نما کرسی پر سانتا کلاز براجمان تھا جس سے بچے سرگوشیوں میں تحائف کی فرمائش کرتے تھے اور وہ باری باری انہیں گود میں اٹھا کر فرمائشیں پوری کرتا تھا۔

سانتا کے سامنے ایک میز پر گفٹ پیپر میں لپٹے ہوئے تحائف کا انبار تھا۔ بوب کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹی سی بارہ تیرہ سالہ بچی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سانتا کے پاس پہنچ گئی۔ موٹی فر کی جیکٹ میں وہ بہت دبلی پتلی لگ رہی تھی۔ سفید ٹوپی میں سے اس کے گھنگریالے بالوں کی لٹیں نکلتی ہوئی شانوں تک آرہی تھیں۔ اُس نے شرماتے ہوئے سانتا کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہو...... ہو...... ہو......“ سانتا نے اُس کی فرمائش سن کر اپنے مخصوص انداز میں ایک قہقہہ لگایا۔

وہ میز سے کوئی عام تحفہ اٹھا کر دینے کے بجائے جھکا جیسے کچھ خاص تلاش کر رہا ہو۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سے گفٹ باکس نکال کر بڑی محبت سے چھوٹی بچی کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی اور اُس کے ساتھ ہی داہنی آنکھ پھڑک کر ایسے بند ہوئی جیسے آئی گلاس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہو۔

”انکل بوب......“ ٹامی یکلخت ہی پُرجوش انداز میں بولا۔ ”آپ نے دیکھا فادر کرسمس ویسے ہی آنکھ دبا رہے ہیں جیسا آپ نے کرنل کے بارے میں آنٹی ایلسا کو بتایا تھا۔“

مگر سپرنٹنڈنٹ سراغرساں رابرٹ پولارڈ عرف بوب اس کی بات سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے ٹامی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور برق رفتاری سے قطار کو توڑتا ہوا آگے بڑھا۔

دوڑتے ہوئے اُس نے وہاں ٹھہرے بچوں کا تو خیال کیا لیکن ان کے والدین اس کے بھاری وجود کی زد میں آکر اِدھر اُدھر ہونے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ دبی دبی آوازیں بھی احتجاج میں بلند ہوئیں لیکن بوب پروا کیے بغیر ہی اسٹیج کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ وہ چھلانگ لگا کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔

”پیاری بچی...... میرے خیال میں اس تحفے کا خیال اپنے دل سے نکال ہی دو۔“ بوب نے چھوٹی لڑکی سے کہا جو سانتا کلاز کے ہاتھوں سے گفٹ باکس لینے کے لیے پُرجوش دکھائی دے رہی تھی پھر وہ آہستہ آواز میں سانتا کلاز سے مخاطب ہوا۔

”ہیرے میرے حوالے کر دو کرنل...... اور شارٹی تم......“

چھوٹی لڑکی جو درحقیقت شارٹی تھی، اس کی معصوم آنکھوں میں شدید حیرت در آئی تھی۔

”یہ...... یہ پولیس والا ہے کرنل۔“ وہ سرگوشی میں سانتا کلاز سے مخاطب ہوئی۔

بوب نے اس کی بات پر توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کا دماغ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ اپنا تجزیہ پیش کرنے لگا۔ ”جب کسی مرد کو شارٹی کہا جاتا ہے تب وہ چھوٹے قد کا ہوتا ہے...... لیکن اگر کسی عورت کو شارٹی کہا جائے تو وہ تو بالکل ہی بونی ہوگی۔ میرے اندازے کے مطابق سنہرے بالوں کی وگ اور چھوٹی بچیوں والے کپڑے تمہارے پارسل میں ہی تھے اور تم نے ڈریس شاپ میں لباس تبدیل کر لیا۔ پولیس ایک عورت کو ڈھونڈتی رہی اور تم بارہ سالہ بچی بن کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئیں۔“

انتظار میں ٹھہرا ہجوم اس ٹاکرے میں ہونے والی گفتگو تو نہیں سن پا رہا تھا لیکن ان میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ دوسری جانب بوب اب کرنل سے مخاطب تھا جس نے گفٹ باکس والے معلق ہاتھ کو پیچھے کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”لیکن تمہارے بارے میں ہم سے واقعی کوتاہی ہو گئی کرنل۔ ہم نے دوسرے اسٹور کے ساتھ ساتھ اس اسٹور والوں کو بھی چیک کیا تھا لیکن سب اسٹاف نو بجے اپنے کام پر موجود تھا۔ یہ تو ابھی میں نے باہر لگے سائن بورڈ سے اندازہ لگایا کہ تم سانتا کلاز بنے تو ہو لیکن تمہاری ڈیوٹی گیارہ بجے شروع ہوتی ہے۔ تم وان بیلے کو لوٹنے کے بعد بہ آسانی اپنے اس عارضی کام پر پہنچ سکتے تھے۔ تم نے پہلے سے ہی اپنا

سانتا کلاز والا لباس فون بوتھ میں چھپا رکھا تھا اور پولیس جب پہنچی تو وہ تمہاری تلاش میں تھی جبکہ تم کرسمس بابا بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے رہتے ہوئے بھی اوجھل ہو گئے۔ تم نے بہت بڑا رسک لیا لیکن تمہاری اس ہمت نے ہی تمہیں کامیاب کرا دیا۔"

سانتا کلاز کے حلیے میں کرنل نے گفٹ باکس والا ہاتھ نیچے کرلیا۔

"شارٹی یہ باکس مجھ سے لے کر فرار ہو جاؤ۔" کرنل کی آواز مدھم لیکن پرعزم لہجہ لیے ہوئے تھی۔ "اگرچہ بچوں کی کرسمس خراب ہو جائے گی لیکن میں اس پولیس والے کو تگنی کا ناچ نچا دوں گا۔"

"ہاہاہا...... ایسا سوچنا بھی مت۔" بوب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کرنل یقیناً تم بہت بڑے مجرم اور ٹھگ ہو گے لیکن یہ غلط فہمی اپنے دماغ سے نکال دو کہ تم مجھے زیر کر پاؤ گے۔"

"دو کے مقابلے میں تم اکیلے ہو۔" اب کی بار شارٹی نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"شارٹی یہ کرسمس کا تہوار ہے۔ تمہیں میں بھاگنے کا موقع دے سکتا ہوں۔" بوب نے اس کے چیلنج کی پروا کیے بغیر کہا۔

"کرلو جو بھی کرنا ہے...... میں کرنل کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔" شارٹی کے معصوم چہرے پر ایسی باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ پر اپنی آزادی کی پیشکش سن کر اس کے لہجے میں ایک نئی امید پیدا ہونے کا تاثر واضح تھا۔

"باکس مجھے دے دو......" بوب کرنل سے مخاطب ہوا۔ "اگر اس میں ہیرے ہیں تو شارٹی کسی جرم کی اب تک مرتکب نہیں ہوئی۔ وہ یہاں سے چلی جائے تو بعد میں کوئی پولیس والا اسے بالکل بھی تنگ نہیں کرے گا۔"

کرنل کے داڑھی میں چھپے چہرے پر تذبذب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کی آنکھیں اندرونی کشمکش کی غماز تھیں۔ وہ شارٹی سے بے پناہ پیار کرتا تھا اور اپنی خاطر اسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرسکتا تھا۔

"کرنل ایسا مت کرنا۔" شارٹی نے اس کے بدلتے تاثرات دیکھ کر تیزی سے کہا۔ "میری خاطر خود کو گرفتار مت کروانا۔"

"تم نے شارٹی کو ہیرے دے دیے تو تم دونوں ہی مجرم بن جاؤ گے اور اس خوشی کے تہوار پر......" بوب اپنی بات مکمل کرنے سے قبل ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ "مجھے اور خود کو تم کسی آزمائش میں نہ ہی ڈالو تو اچھا ہے۔"

بوب نے اب اپنا ایک ہاتھ اپنے پہلو میں لگے ہولسٹر میں اُڑسے پستول پر رکھ لیا تھا جس کی جھلک کرنل بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ بوب کے پاس پستول کی موجودگی نے کرنل کو فیصلہ کرنے میں مدد فراہم کر دی تھی۔ اُس نے شکست خوردہ انداز میں اپنے ہاتھ میں پکڑا باکس بوب کے حوالے کر دیا۔

اُس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی جیسے ایک بہت بڑی پریشانی سے آزاد ہو گیا ہو۔ پھر وہ اپنی بلند سانتا کلاز والی آواز میں بولا۔

"خواتین و حضرات! یہ صاحب اس خاص گفٹ باکس کو حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ بے چین تھے اس لیے میں نے یہ انہیں دے دیا۔"

عوام کو ابھی تک اصل صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہوا تھا اس لیے انہوں نے ہنستے ہوئے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

"یہ تحفہ تو ان صاحب نے لے لیا لیکن اس پیاری سی لڑکی کو بھی ہم خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔" سانتا نے اپنے سامنے پڑی میز سے ایک تحفہ اٹھا کر شارٹی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "خیر خیریت سے جاؤ...... میں اور تم پھر ملیں گے۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز رُندھ گئی تھی۔

شارٹی وہاں سے چلی گئی جبکہ کرنل ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"محبت بھی انسان سے کیا کیا کرواتی ہے......" کرنل نے کہا تو بوب سر ہلاتے ہوئے اس کی تائید کیے بغیر نہ رہ سکا۔

اسے اب شام چھ بجے تک سانتا کلاز کے ساتھ اپنی چھٹی والے دن بھی ڈیوٹی کرنی تھی تاکہ معصوم بچوں کی کرسمس خراب نہ ہو۔ اگرچہ زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا لیکن ایلسا کے ساتھ وعدہ کی گئی چھٹی برباد ہو گئی تھی۔ کرنل کو پکڑنے کی خوشی اپنی جگہ لیکن ایلسا کے غصے کا تصور کر... کے ہی اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

بچے قطار در قطار سانتا کلاز کی جانب بڑھنے لگے جن میں ٹامی بھی شامل تھا۔ البتہ ایلسا کی نگاہیں بوب پر ہی جمی تھیں۔

"کتنا ہینڈسم ہے نا میرا ہیرو...... اور بہادر بھی۔" اس کے ذہن میں بس یہی خیالات چکرا رہے تھے، وہ چھٹی ضائع ہونے پر بالکل بھی غم زدہ نہیں تھی۔

❖❖❖

# تماشا

عمران قریشی

ضرورت ایجاد کی ماں ہے... اور کہانیاں اسی قسم کی ضرورت سے جنم لیتی ہیں... انسان کی ذات کسی گرفت میں آنے نہیں دیتی... شعوری لاشعوری فریب کاریوں سے بے تعلق نہیں رہتی اور مختلف روپ اختیار کرکے بھول بھلیوں میں دھکیل دیتی ہے... ایسی ہی ایک گمشدہ کہانی جس کے کرداروں کی اصلیت دریافت کرنا لذتِ کارِ زیاں ثابت ہو رہا تھا...

اس صداقت وحقیقت کا انکشاف جولیوں سے کوسوں دور تھی......

اُس کا حلق سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ ماتھے پر بال پسینے کی وجہ سے چپک گئے تھے اور سانس دھونکنی کے مانند چل رہا تھا۔ پاؤں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی زمین پر گرنے کے بعد بے ہوش ہو جائے گا۔ اسے زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ ایک چھوٹا سا کچا راستہ کچھ آگے جانے کے بعد خوب صورت کوٹھی کے گیٹ پر اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ وہ کوٹھی اس کی منزل تھی۔ ہائی وے سے کوٹھی تک کا فاصلہ پانچ منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا لیکن ریگستان کی گرمی نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اسے شدت کی پیاس
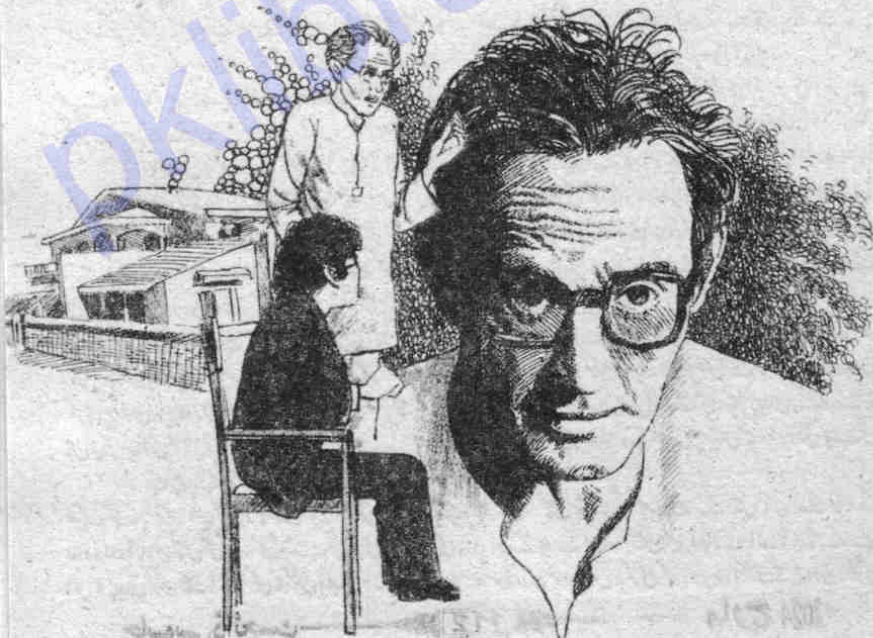
محسوس ہو رہی تھی اور جب اس نے کوٹھی کے گیٹ پر لگی گھنٹی بجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اندر کہیں پانی گرنے کی خوشگوار آواز سنائی دی۔ دراصل یہ کوئی مستقل ریگستان نہیں تھا۔ ہائی وے کے پاس کا کچھ علاقہ خشک اور گرم ریت سے بھرپور تھا۔ اس سے آگے چند قصبے تھے اور پھر بہت بڑا شہر تھا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ یعنی وہاں پانی کے علاوہ بجلی بھی موجود تھی۔ پانی شاید وافر مقدار میں تھا۔ کیونکہ ٹینکی بھرنے کے بعد نیچے گر رہا تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر ڈاکٹر جعفر حسین کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ نام کے نیچے ڈگریاں لکھی تھیں۔ وہ نفسیات کا ڈاکٹر تھا۔ گیٹ کے ساتھ والی دیوار سے انگوروں کی بیل نیچے جھانک رہی تھی اور آہنی گیٹ سے نکلنے والی تپش اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً گیٹ بھٹی سے نکلنے والے لوہے کے مانند گرم ہو رہا تھا۔ اس کے قریب کھڑے ہونا مشکل ہونے لگا تو وہ کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ تب اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک دروازہ کھل نہیں گیا۔ جس ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا اس کا چہرہ غصے کے باعث آگ بگولا ہو رہا تھا۔ عمر پچاس سے کچھ اوپر تھی اور حلیے سے نوکر دکھائی دیتا تھا۔

گیٹ کھولنے کے بعد وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ”تم نے گھنٹی کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ انگلی کو ہٹانا ہی بھول گئے۔ کوٹھی میں سب بہرے نہیں رہتے۔“ پھر نبیل کا حلیہ دیکھ کر وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ کپڑے ریت سے بھرے ہوئے، چہرے پر تھکاوٹ، ہونٹ خشک اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

”میرا نام نبیل اسلم ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں بہت دور سے ڈاکٹر جعفر حسین سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ برائے مہربانی مجھے اندر لے چلو، باہر گرمی بہت ہے۔“

نوکر نے انکار میں سر ہلایا۔ ”وہ اس وقت کسی سے بھی نہیں مل سکتے، یہ ان کی اسٹڈی کا وقت ہے۔ تم شام کو آنا۔“

نبیل استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”میں واپس نہیں جا سکتا... اگر چلا گیا تو پھر واپس آنا مشکل ہوگا۔ غضب کی گرمی پڑ رہی ہے اور یہاں اردگرد کوئی آبادی بھی نہیں ہے میں کہاں جاؤں گا؟“

نوکر کے چہرے پر سوچ کی لکیریں پیدا ہوئیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس مختصر ریگستان میں ڈاکٹر کی کوٹھی کے علاوہ اور آبادی نہیں تھی اور جس شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اس کا پیدل کوٹھی تک آجانا بھی ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔

چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس نے نبیل کو گیٹ کے پاس کھڑے رہنے کے لیے کہا اور خود اندر چلا گیا۔ لیکن وہاں کھڑے رہنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے نبیل کوٹھی کے اندر آگیا۔ اس کے سامنے سرسبز لان تھا۔ جس میں انگوروں کی بیل کے علاوہ چند درخت لگے ہوئے تھے۔ اردگرد کی کیاریوں میں پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے اور ان کے درمیان... پتھروں سے آراستہ مختصر آبشار تھی جو اس وقت خشک پڑی تھی لیکن موٹر لگانے پر پانی اوپر سے نیچے گرنے لگتا تھا۔ یہی پانی پودوں اور گھاس کو زندگی بخشتا تھا۔ لیکن نبیل نے اس خوب صورت منظر کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ وہ سائے کی تلاش میں تھا۔ دھوپ اسے پگھلائے دے رہی تھی۔ لان سے آگے برآمدہ تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ اس نے بند دروازے کو کھولا تو سامنے وسیع و عریض سٹنگ روم مہنگے ترین فرنیچر سے آراستہ دکھائی دیا اور خوش کن بات یہ تھی کہ وہاں اے سی لگا ہوا تھا۔ جس کی فرحت بخش اور یخ بستہ ہوا نے نبیل کے جسم میں جان ڈال دی اور وہ قریبی صوفے پر ڈھے گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے باتوں کی آوازیں سنائی دیں پھر کوئی حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

”دیکھیے جناب یہ اندر آگیا ہے۔ میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ آپ اس وقت مل نہیں سکتے ہیں لیکن یہ مانا نہیں۔“ آواز نوکر کی تھی اور شاید اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد نوکر نے اسے کاندھے سے تھام کر کھڑا کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر دہاڑا۔

”بس اب رہنے دو۔ وہ تمہاری غفلت کی وجہ سے اندر آیا ہے۔ تمہیں گیٹ کو بند کر کے آنا چاہیے تھا۔“

نوکر نے اسے چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”اس کی حالت بہت خراب دکھائی دے رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ پیدل ریگستان عبور کر کے آیا ہے۔ تم فوراً اس کے لیے مشروب لے کر آؤ۔“

نوکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نبیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت قابلِ رشک تھی۔ عمر پچاس کے قریب۔ قد لمبا، جسم پتلا دبلا اور آنکھوں پر نفیس شیشوں والی عینک لگی ہوئی تھی۔

نبیل شرمندگی بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں بغیر اجازت اندر آنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہوئی۔ کوٹھی

کا گیٹ انگارا بنا ہوا تھا۔ اس لیے میں بے اختیار اندر آ گیا۔''

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر اسے بغور دیکھتے رہنے کے بعد قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ نبیل نے سٹنگ روم کا جائزہ لیا۔ دیواروں کے چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ... شیشے کی نفیس میز رکھی ہوئی تھی۔ چھت پر بیش قیمت فانوس لٹک رہا تھا داخلی دروازے کے بائیں جانب سیڑھیاں دوسری منزل کی جانب جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ جبکہ بائیں جانب شاید کچن کا دروازہ تھا۔ جسے کھول کو نوکر اندر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ٹھنڈی یخ بوتل پکڑی ہوئی تھی۔ نبیل نے بے تابانہ نگاہوں سے بوتل کی جانب دیکھا۔ نوکر بہت آہستہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی سستی نبیل کو ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیر کے مانند نوکر کی جانب بڑھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ بوتل جھپٹی اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا۔ ڈاکٹر اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نبیل نے خالی بوتل نوکر کے ہاتھوں میں تھمائی اور میز پر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں تمہاری پیاس نہیں بجھی۔ خادم حسین ایک بوتل اور لے آؤ۔'' نبیل نے ممنونیت سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ خادم حسین کچن کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر بولا۔

''اب مجھے بتاؤ کہ تم اتنی دور مجھ سے ملنے کے لیے کیسے آ گئے اور تمہیں یہاں میری موجودگی کے متعلق کس نے بتایا؟''

نبیل بے تابانہ نگاہوں سے کچن کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کے متعلق پیاس بجھ جانے کے بعد بتاؤں گا اور جہاں تک آپ کی یہاں موجودگی کی بات ہے تو مجھے اس کے متعلق آپ کے کلینک سے معلوم ہوا۔''

ڈاکٹر غصیلے لہجے میں دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں میری موجودگی کے متعلق منور بخش نے بتایا ہے تو پھر شہر جاتے ہی میں اسے نوکری سے فارغ کر دوں گا۔ میں یہاں کام کرنے کے لیے نہیں آتا ہوں۔ میرا مقصد چند دن آرام کرنے کا ہوتا ہے۔''

نبیل کے کچھ کہنے سے قبل کچن کا دروازہ کھول کر نوکر اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں بوتل پکڑی ہوئی تھی۔ نبیل اس دفعہ اپنی جگہ سے اٹھا نہیں۔ تاہم ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''میرے لیے اس دوزخ کے مانند ریگستان میں ٹھنڈے پانی کی بوتل کی دستیابی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اگر ایک بوتل مزید مل جائے تو آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ نوکر نے بوتل اس کے ہاتھ میں تھما دی اور مڑ کر واپس کچن کی جانب جانے لگا تو ڈاکٹر نے اسے ایک اور بوتل لانے کے لیے کہہ دیا۔ نبیل نے دوسری بوتل بھی حلق میں انڈیل لی پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پوچھا۔

اس آگ برساتے ریگستان میں آپ کی موجودگی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہاں اردگرد کوئی آبادی نہیں اور آپ نے کوٹھی کو دلہن کی طرح سجا رکھا ہے۔''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''ایک آدم بیزار انسان کے لیے ریگستان سے بڑھ کر مناسب جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی ہے۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے چھٹیاں گزارنے کے لیے اس کوٹھی کو سہولتوں سے بھر دیا ہے۔ خادم حسین اس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور میں چھٹیوں کے دوران اپنی اسٹڈی مکمل کر لیا کرتا ہوں۔'' کچن کا دروازہ کھلا اور خادم حسین تیسری بوتل لے کر اندر داخل ہوا۔ نبیل کا خشک گلا کافی حد تک تر ہو گیا تھا۔ خادم حسین نے بوتل اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

ڈاکٹر بولا۔ ''اب بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو، اگر بیمار ہو، تو پندرہ دنوں کے بعد شہر میں مجھ سے ملاقات کر لیتے۔''

نبیل نے آدھی بوتل کو ختم کرنے کے بعد بتایا۔

''میری حالت بہت خراب ہے اور میں مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ چند دنوں کے بعد شہر آنے والے ہیں لیکن مجھ سے انتظار نہیں ہوا اور میں یہاں چلا آیا۔ میری گاڑی ہائی وے کے پاس کھڑی ہے۔ میں آپ سے مختصر ملاقات کے بعد شہر چلا جاؤں گا۔''

ڈاکٹر بولا۔ ''یہ وقت میری اسٹڈی کا ہے۔ میں اس دوران کسی سے ملتا نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ تم اتنی دور سے ملاقات کے لیے آئے ہو... اس لیے تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ مجھے جلد از جلد اپنی بیماری کے متعلق بتاؤ اور یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔''

نبیل نے باقی ماندہ بوتل حلق میں انڈیلنے کے بعد سٹنگ روم کے سامنے والی دیوار پر لگے ہوئے اے سی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اسے کچھ اور تیز کر دیا

جائے تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ مجھ سے گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ حالانکہ سٹنگ روم کا ماحول مناسب ہے۔ لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرا جسم اب بھی پسینے سے تر ہو رہا ہے۔''

ڈاکٹر نے میز پر پڑے ہوئے ریموٹ کنٹرول کو اٹھایا اور اس کا رخ اے سی کی جانب کرتے ہوئے اس کی رفتار کو تیز کر دیا۔ نبیل کو اطمینان کا احساس ہوا تو سکون کا سانس لیتے ہوئے بولا۔

''غالباً میں نے آپ کو اس کے متعلق نہیں بتایا کہ فوری فیصلہ کرنے کے دوران مجھے بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دراصل میرے دماغ کو سوچنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور اگر میں پہلے فیصلہ کرلوں تو سوچنے کی مہلت ملنے کے بعد مجھے تاسف کا احساس ہوتا ہے اور اس وقت میرے پاس فیصلے کو رد کر دینے کے سوا اور کوئی راستہ موجود نہیں رہتا۔ ایسا کتنی ہی دفعہ ہوا ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد میں نے آرٹس لینے کا فیصلہ کیا اور بعد میں جب مجھے غلطی کا احساس ہوا تو میرا ایک سال اس غلطی کی نذر ہو گیا۔ ازدواجی زندگی کی شروعات کرنے کے لیے جب میں نے لڑکی تلاش کرنا شروع کی تو پہلی ملاقات میں ہی مجھے فرحین پسند آگئی۔ میں نے فوراً رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ یہاں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرے آگے پیچھے بات چیت کرنے والا کوئی نہیں۔ میرا ذاتی کاروبار ہے جسے میں اکیلا سنبھالتا ہوں۔ چلیں میں آپ کو اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتاتا ہوں۔ میرا گاڑیوں کا شوروم ہے۔ اگر آپ کو مناسب حالت میں اچھی قیمت کے ساتھ کسی بھی قسم کی گاڑی دستیاب ہو تو میرے شوروم میں بلاجھجک آجایئے گا۔ میں آپ کے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔''

ڈاکٹر نے غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ٹوکا۔ ''دیکھو میرے پاس وقت بہت کم ہے اور تم بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہو۔ صرف خلاصہ بیان کرو کہ تمہیں بیماری کیا لاحق ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔''

نبیل معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں لیکن جو بھی آپ کو بتا رہا ہوں اس کا تعلق براہِ راست میری بیماری سے ہے۔ کچھ عرصہ قبل جب میرے پاس گاڑیوں کا شوروم نہیں تھا۔ تب میں بہت بڑی کمپنی کی چلتی ہوئی پروڈکٹ کا ڈیلر تھا۔ دوستوں یاروں نے مجھے بتایا کہ اس سے زیادہ اچھا اور مناسب کام گاڑیوں کی خرید و فروخت کا ہے۔ اس لیے میں نے چلتا ہوا کاروبار چھوڑ کر گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دیا۔ میں آج بھی گزشتہ کاروبار کو چھوڑنے پر نالاں ہوں۔ وہ اس سے زیادہ بہتر تھا اور میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ سے ملاقات کے بعد مجھے ایک گاڑی کی خرید و فروخت کے لیے ریگستان سے آگے واقع شہر کی طرف جانا ہے۔ اس لیے میں مدعے کی طرف آتا ہوں۔ انہی غلط فیصلوں نے مجھے حلقۂ احباب میں رسوا کر کے رکھ دیا۔ فرحین کا رشتہ میرے دوستوں نے تلاش کیا تھا۔ میں اسے پہلی ملاقات میں ہی دل دے بیٹھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کی فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ میں نے ملاقات کے دوران اپنی پسند کے متعلق اس کی ماں کو بتایا کہ مجھے نرگسی کوفتے بہت پسند ہیں اور آدھے گھنٹے کے دوران فرحین نے نہایت لذیذ کوفتے تیار کر کے میرے سامنے رکھ دیے'' ڈاکٹر نے بیزار نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تو پھر تمہاری شادی اس سے ہوئی یا نہیں۔ تم بات کو مختصر کرنے کے بجائے لمبا کر دیتے ہو، میں نے کہا نا کہ تفصیل میں مت جاؤ، مختصراً سب کچھ بتاؤ۔''

نبیل سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میرا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی مجھے بالآخر دھتکار دیں گے۔ پھر بھی میں سچائی کو چھپاؤں گا نہیں اور بلا تامل بتاؤں گا۔ چند ملاقاتوں کے بعد جب ہم دونوں کی محبت اپنے عروج کو پہنچ گئی تب اچانک ہی فرحین کی چھوٹی بہن ثمرین بیرونِ ملک سے واپس آگئی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو مجھے ایک دفعہ پھر اپنے غلط فیصلے کا احساس ہوا۔ وہ فرحین سے زیادہ خوب صورت اور پڑھی لکھی تھی۔ میں نے شاید آپ کو پہلے نہیں بتایا کہ فرحین زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اور یہ میری غلط فہمی تھی کہ اس سے بڑھ کر کوئی خوب صورت نہیں تھا۔ ثمرین کی خوب صورتی کے سامنے اس کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی۔ اس لیے میں نے چند دنوں کی سوچ بچار کے بعد رشتے سے انکار کر دیا۔ فرحین کے والدین نے انکار کی وجہ دریافت کی تو میں نے ثمرین سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بس اس کے بعد میں آپ کو مزید کیا بتاؤں مجھے کتنی ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوستوں، یاروں نے بھی لعنت ملامت کی۔ رشتہ تو ہاتھوں سے گیا میری ساکھ بھی متاثر ہوگئی اور دو تین جگہوں سے انکار ہونے کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔'' ڈاکٹر کو اب کسی حد تک سامنے بیٹھے ہوئے نفسیاتی مریض میں دلچسپی محسوس

ہونے لگی تھی۔اس لیے پہلو بدلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تو پھر کیا تم نے شادی نہیں کی؟ میرے خیال میں اس وقت تمہاری عمر تیس سے پینتیس سال کے درمیان تو ضرور ہوگی اور اچھی خاصی شخصیت کے بھی مالک ہو۔کاروبار بھی اچھا ہے۔ایسے صاحب حیثیت مردوں کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہوتی۔"

نبیل نے مسکراتے ہوئے بتایا۔"انکار تو فرحین کے والدین نے بھی نہیں کیا تھا۔اگر ثمرین درمیان میں نہ آتی تو رشتہ ہو ہی گیا ہوتا۔میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں مناسب فیصلہ جلد بازی کے دوران نہیں کرسکتا۔میرے دوستوں نے رشتہ میرے سر پر تھوپنے کی کوشش کی اور میں نے سوچے سمجھے بغیر ہاں کردی۔بعد میں مجھے احساس ہوا کہ خوب صورتی کے علاوہ مجھے پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ چاہیے اور فرحین زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔اس لیے میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ثمرین میں دلچسپی کا اظہار سب کے سامنے کر دیا اور یہ اظہار باعث ذلت بنا۔تاہم وقتی طور پر بدظن ہونے کے بعد جب مجھے کچھ عرصے کے بعد تنہائی کا احساس ہوا تو ایک دفعہ پھر میں نے رشتہ ڈھونڈنے کا آغاز کیا۔اس دفعہ بھی دوستوں نے ساتھ دیا۔میں نے انہیں اس بات سے آگاہ کر دیا کہ اس دفعہ لڑکی خوب صورت ہونے کے علاوہ پڑھی لکھی بھی ہونی چاہیے اور کچھ ہی دنوں کے بعد انہوں نے......سحر ممتاز کی تصویر ہاتھوں میں تھمادی۔خدا کی پناہ......میں دل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا۔میں نے آج تک جتنی بھی لڑکیاں دیکھی تھیں، ان میں کوئی بھی سحر کی ہم پلہ نہیں تھی۔وہ گریجویشن کرچکی تھی اور پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کررہی تھی۔میں نے اس دفعہ فوراً ہامی نہیں بھری۔مجھے پچھلی دفعہ کی ذلت اب بھی یاد تھی۔اس لیے میں نے پہلی ملاقات کے دوران سحر کی ماں جن کا نام طاہرہ بیگم تھا اور بہت ہی رعب دار شخصیت کی مالک تھیں، انہیں باور کرایا کہ میں وقتاً فوقتاً سحر سے چند ملاقاتیں کروں گا، اگر انہیں کوئی اعتراض ہو تو مجھے پہلے ہی بتادیں۔"

ڈاکٹر نے بات کو درمیان سے کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر میرے خیال میں سحر کی کوئی اور بہن بھی ہوگی جو اس سے زیادہ خوب صورت ہونے کے علاوہ پڑھی لکھی بھی زیادہ ہوگی۔جسے دیکھنے کے بعد تمہیں اپنے فیصلے پر تاسف ہوا ہوگا۔دیکھو میں تمہیں یہاں ایک بات بتادوں، اس دنیا میں خوب صورتی کی کوئی کمی نہیں۔اس لیے یہ سوچ بے وقوفی کے زمرے میں آتی ہے کہ کسی بھی لڑکی سے زیادہ اور کوئی خوب صورت نہیں ہوسکتا۔"

نبیل مسکراتے ہوئے بولا۔"جیسا آپ سوچ رہے ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا... بلکہ اس دفعہ تو اس سے بہت بڑھ کر ہوا۔اگر آپ کو گراں گزرے تو میں اس کے لیے پہلے ہی معافی مانگ لیتا ہوں۔سحر، طاہرہ بیگم کی اکلوتی لڑکی تھی۔اس کا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔اس لیے میں مطمئن ہو گیا۔وہ خوب صورت اور پڑھی لکھی بھی تھی۔اس لیے میری تمام خواہشات پوری ہوگئیں۔میں نے اس سے ملنے ملانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ہم اکثر شام کو ساحل سمندر چلے جایا کرتے تھے اور گھنٹوں ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔اسے آئسکریم بہت پسند تھی۔یہاں سے ہم دونوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔مجھے آئسکریم سے نفرت ہے۔جب سحر نے آئسکریم کھانے کی فرمائش کی تو میرا منہ بن گیا۔اس نے فوراً اندازہ لگالیا کہ میں آئسکریم نہیں کھلوانا چاہتا ہوں تب میرے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے آئسکریم کھائی جس کی پے منٹ میں نے نہیں کی۔اس نے بل کی ادائیگی خود کی۔"

ڈاکٹر اس کی بات... کاٹتے ہوئے بولا۔"حالانکہ بات بہت معمولی سی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہت بُری لگی ہوگی اور تم نے رشتے سے انکار کردیا ہوگا؟"

نبیل نے انکار میں سر ہلا دیا۔"نہیں، چند دن ہمارے درمیان ملاقات نہیں ہوئی۔اس کے بعد اس نے مجھ سے معافی مانگ لی۔میں نے بھی اس کی غلطی کو نظر انداز کردیا اور ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔وہ مجھے ہر لحاظ سے بہتر محسوس ہورہی تھی اور شاید میں اس سے شادی بھی کرلیتا۔اگر درمیان میں زہرہ بیگم نہ آجاتیں۔"

ڈاکٹر چونک اٹھا۔"یعنی ایک دفعہ پھر رشتے سے انکار۔یقیناً وہ سحر اور ثمرین سے زیادہ خوب صورت ہوگی اور شاید پڑھی لکھی بھی ہوگی تو پھر برخوردار میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم شادی نہ کرنا۔یہ کسی بھی لڑکی کی زندگی سے کھیلنے کے مترادف ہوگا۔تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں جو رشتہ بھی پسند آتا ہے وہ تمہارے لیے حرفِ آخر نہیں ہوتا اور بعد میں جب تمہیں اس سے زیادہ اچھا رشتہ دستیاب ہوتا ہے تو پہلے والا تمہیں حقیر دکھائی دینے لگتا ہے۔"

نبیل سنجیدہ لہجے میں بولا۔آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔دراصل میں اپنی فطرت کو جانچ نہیں پارہا تھا۔مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں چاہتا کیا ہوں؟ آیا مجھے خوب صورتی چاہیے تھی یا پھر بہترین تعلیم یافتہ ساتھی کی ضرورت تھی۔یہ دونوں

خصوصیات سحر میں موجود تھیں لیکن مجھ پر چند ملاقاتوں کے بعد حقیقت آشکار ہوئی کہ مجھے تو ان کے علاوہ کچھ اور بھی چاہیے تھا اور پھر اس دن قسمت نے میرے ساتھ جو کھلواڑ کیا اس کے بعد میں نے شادی سے ہی توبہ کر لی۔'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر خادم حسین اندر داخل ہوا۔ نبیل نے چونک کر اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھا لیکن وہاں مشروب کی بوتل نہیں تھی۔ اسے کچھ مایوسی ہوئی لیکن جب خادم حسین نے کھانے کے متعلق ڈاکٹر سے دریافت کیا تو ڈاکٹر کے بجائے نبیل نے خوشی سے بھرپور لہجے میں اسے کھانا لانے کے لیے کہہ دیا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے، تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔

خادم حسین نے ڈاکٹر کی جانب دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ ''جناب کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگاؤں یا پھر یہیں لے آؤں۔''

ڈاکٹر نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔ ''یہیں لگا دو۔ ڈائننگ ٹیبل تک کون جائے گا۔'' خادم حسین سر اثبات میں ہلاتے ہوئے واپس کچن کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ نبیل نے پیٹ بھر کر کھایا۔ اس دوران کسی بھی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔ خادم حسین جب برتن سمیٹنے کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو نبیل نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں کھانے کے بعد سبز چائے پیتا ہوں۔ اب ڈاکٹر سے پوچھنے کے لیے نہ بیٹھ جانا۔ فوراً چائے لے آؤ۔'' اس دفعہ ڈاکٹر کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے۔ نبیل نے فوراً جان لیا کہ بات اسے گراں گزری ہے اس لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی فیس کے ساتھ اس کی ادائیگی کر دوں گا۔ درحقیقت میں علاج کی نیت سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر آپ اس ریگستان میں نہ ہوتے تو شاید ہماری ملاقات آپ کے کلینک پر ہوتی۔ تب کھانے کی نوبت نہ آتی۔''

ڈاکٹر بے اختیار مسکرا دیا پھر خادم حسین کو چائے لانے کے لیے کہنے کے بعد تفہیمی نگاہوں سے نبیل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب جلد اپنے مسئلے کے متعلق بتاؤ۔ تمہاری وجہ سے مجھے اسٹڈی کو بھی خیرباد کہنا پڑا ہے۔''

نبیل نے گلا کھنکھارتے ہوئے سلسلے کو وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ ''سحر عادتوں کے لحاظ سے بہت اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ چند ہی دنوں کی ملاقاتوں کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ وہ میری ہر بات ماننے کے لیے بہ خوشی آمادہ ہو جاتی تھی۔ اس نے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ معاملہ بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور جلد ہی ہماری شادی پر پہنچنے کے بعد تکمیل پذیر ہونے والا تھا۔ اگر ایک دن سحر کریم آباد جانے کی ضد نہ کرتی۔ آپ کریم آباد کے متعلق جانتے ہیں؟''

ڈاکٹر نے انکار میں سر ہلایا۔

''میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' نبیل بولا۔ ''یہ شہر سے کچھ دور ہل اسٹیشن ہے۔ چونکہ پُرفضا مقام ہے۔ اس لیے وہاں زیادہ تر بوڑھے افراد رہائش پذیر ہیں۔ ان میں ٹی بی کے مریضوں کی تعداد زیادہ ہے۔ سحر کی نانی کو بھی یہی مرض لاحق تھا اور وہ وہاں اپنے آبائی گھر میں رہ رہی تھیں۔ بہت ہی اچھی اور پُرخلوص عورت تھیں۔ میری اور ان کی ملاقات گھنٹا بھر کے لیے ہوئی۔ انہوں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے کاروبار سے متعلق چند ضروری کام درپیش تھے اس لیے میں نے معذرت کر لی۔ مکان سے باہر نکلتے ہوئے وہ سانحہ وقوع پذیر ہوا جس کی وجہ سے مجھے ایک دفعہ پھر جلد فیصلہ کرنے کی غلطی کا احساس ہوا۔ میری گاڑی مکان کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میں جب گاڑی میں بیٹھنے لگا تو سحر کی نانی کے ساتھ اس کی خالہ بھی مجھے الوداع کرنے کے لیے دروازے پر آ گئیں۔ میری اور ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں نانی کے پاس گھنٹا بھر بیٹھا تھا اس دوران وہ مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آئی تھیں اور اب بھی سحر کی نانی کے قریب لاتعلق کھڑی تھیں۔ آپ کو شاید یہ بات ناگوار گزرے گی لیکن میں چھپاؤں گا نہیں۔ ہرچند کہ وہ سحر کی خالہ تھیں اور ان کی عمر اچھی خاصی تھی لیکن مجھ پر ان کی شخصیت نے وہی اثر کیا جو ثمرین سے ملاقات کے دوران ہوا تھا۔''

ڈاکٹر کو اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ نبیل نفسیاتی مریض ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ پاگل پن کی حدود میں قدم رکھ چکا ہے اور اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا جاتا تو جلد ہی اسے پاگل خانے بھجوا دیا جاتا۔ اس لیے فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''تو تمہیں اس دفعہ سحر کی خالہ سے محبت ہو گئی جو یقیناً تمہاری ماں کے برابر تو ضرور ہو گی؟''

نبیل نے بتایا۔ ''بات محبت کی نہیں بلکہ فطرت کو جاننے کی ہے اور سحر کی خالہ کو دیکھنے کے بعد مجھے بخوبی معلوم ہو گیا کہ مجھے خوب صورت اور تعلیم یافتہ ساتھی کے علاوہ

تجربہ کار اور جہاندیدہ عورت کی بھی ضرورت تھی۔ جیسے سحر کی خالہ تھی۔ ان کا نام زہرہ بیگم تھا اور ان کی صورت سحر کی ماں سے بہت ملتی تھی۔ اس ملاقات کے دوران ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہم خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ ہو۔ میں آگے کی بات چیت کے دوران ہوسکتا ہے کہ انہیں تم کہہ کر مخاطب کروں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

ڈاکٹر نے کاندھے اچکائے۔ ''مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اعتراض تو سحر کو یا پھر اس کی ماں کو ہونا چاہیے۔ کیا تم نے ان سے بات چیت کی؟''

نبیل نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں، ان سے بات چیت کی تو نوبت ہی نہیں آئی اور میں بات چیت کے قابل بھی نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی کے آگے کچھ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر میری گاڑی میں اے سی نہ لگا ہوتا تو شاید میں علاج کے لیے ریگستان میں کبھی بھی نہیں آتا۔ یہ میری مرضی کے خلاف ہے۔ بہرحال سحر کی نانی کا گھر جہاں واقع تھا۔ اس کے اردگرد کے تمام پلاٹ خالی تھے۔ میں نے جب واپس جانے کے لیے گاڑی کو موڑا تو مکان کے گرد چکر لگا کر اسے سڑک کی طرف لانے کا ارادہ کیا اور جب مکان کے پچھلی جانب آیا تو زہرہ بیگم کو دروازے پر اپنا منتظر پایا۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیے۔ وہ دروازے سے نکل کر میری گاڑی کے قریب آگئیں۔ میں نے شیشے کو نیچے کیا تو وہ معذرت بھرے لہجے میں بولیں۔

''میں معافی چاہتی ہوں کہ تم سے ملاقات کے لیے کمرے میں نہ آسکی۔ مجھے تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ میں نے چند دن پہلے تمہاری تصویر دیکھی تھی۔ اس تصویر میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں تمہارے خیالوں میں کھو کر رہ گئی۔ میں یہاں اپنے دل کی کیفیت کھل کر بیان نہیں کر سکتی ہوں۔ اگر ہوسکے تو مجھ سے ملاقات کے لیے دوبارہ آنا۔ لیکن اس دفعہ مکان کے پچھلے دروازے سے آنا۔ میں تمہارا شدت کے ساتھ انتظار کروں گی۔'' ان کی بات درمیان میں رہ گئی۔ سٹنگ روم کا ماحول موبائل کی گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ نبیل نے چونک کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''تمہارا موبائل ہے، میرا بیڈروم میں رکھا ہوا ہے۔''

نبیل نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد کال ریسیو کی۔ پھر دوسری جانب کی بات سننے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے جلد آنے کی کوشش کرنا، میں ریگستان کے درمیان ... واقع ڈاکٹر جعفر حسین کی کوٹھی میں موجود ہوں۔ تمہیں میری گاڑی تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ یہاں پہنچ کر مجھے کال کر لینا۔ میں ہائی وے کی طرف چلا آؤں گا۔'' اس نے جواب سنے بغیر کال منقطع کر دی۔ ڈاکٹر نے تفہیمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں آپ سے ملاقات کے علاوہ ریگستان سے آگے گاڑیوں کی خرید وفروخت کے لیے بھی جا رہا ہوں۔ وہاں میرا اسسٹنٹ موجود ہے۔ وہ مجھے پک کرنے کے لیے یہاں آنے والا ہے۔ شاید اسے ایک گھنٹا مزید لگ جائے۔ تب تک میں آپ کے پاس ہی رہوں گا۔''

ڈاکٹر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ پندرہ دنوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے جب ریگستان میں آتا تھا تو اپنے ساتھ لگا بندھا کھانے پینے کا سامان لے کر آتا تھا۔ زیادہ سامان لانے کی صورت میں واپس شہر لے جانے میں اسے کوفت محسوس ہوتی تھی۔ اسے چند دنوں کے دوران اپنی اسٹڈی مکمل کرنا ہوتی تھی۔ اس لیے وہ کسی سے ملتا نہیں تھا۔ نبیل نے نہ صرف ایک دن کے دوران اس کی اسٹڈی کو درہم برہم کیا تھا۔ بلکہ بجٹ کو بھی کافی حد تک متاثر کیا تھا۔ اب اگر وہ ایک گھنٹا مزید وہاں رہتا تو اس کے قیلولے کا وقت بھی برباد ہو جاتا۔ اس لیے جان چھڑانے والے لہجے میں بولا۔

''میں تمہارے مرض کو کافی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ اس لیے تمہیں چند ہدایات دے کر رخصت کرتا ہوں۔ تم اپنی زندگی کو محدود کر دو۔ زیادہ ملنا جلنا تمہارے لیے بہتر نہیں۔ چونکہ تمہارے پروفیشن میں سوشل ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اپنی جگہ اسسٹنٹ کو دے کر تم کچھ دنوں کے لیے آرام کی غرض سے کسی ہل اسٹیشن چلے جاؤ۔''

نبیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن مجھے ہل اسٹیشن کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ کبھی شہر سے باہر جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آپ میری رہنمائی کر دیجیے۔'' پھر وہ تنقیدی نگاہوں سے سٹنگ روم کے درودیوار کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی کوٹھی بھی مناسب ہے۔ میرے خیال میں آپ کے جانے کے بعد باقی ماندہ سال خالی پڑی رہتی ہوگی۔ مجھے تو صرف ایک ماہ کے لیے درکار ہے۔''

ڈاکٹر آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں

نفسیات کا ڈاکٹر ہوں۔ کوئی پراپرٹی ڈیلر نہیں ہوں۔ میں تمہیں کب سے برداشت کر رہا ہوں۔ تم نے میرا تمام دن برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر پندرہ منٹ کے اندر تم نے اپنی بیماری کے متعلق نہ بتایا تو میں تمہیں کوٹھی سے باہر نکال دوں گا۔"

نبیل معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ "میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں۔ اگر میری وجہ سے آپ کا وقت برباد ہوا ہے تو میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ بیماری کے متعلق میں آپ کو خود کیسے بتا سکتا ہوں۔ اس کا فیصلہ تو آپ واقعہ سننے کے بعد کریں گے۔"

ڈاکٹر اس دفعہ نرم لہجے میں بولا۔ "میرے دن کی ترتیب وقت کی تقسیم کے مطابق ہوتی ہے اور تم نے تمام تقسیم کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ جلد از جلد واقعے کو بیان کرو۔"

کچن کا دروازہ کھول کر خادم حسین اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں شیشے کی نفیس ٹرے پکڑی ہوئی تھی جس کے اوپر دو نازک شیشے کی پیالیوں میں سبز چائے دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دونوں پیالیاں میز پر رکھیں اور واپس جانے لگا تو نبیل نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"سنو، کیا مجھے یہاں قریب سے سگریٹ مل سکتی ہے۔ مجھے شدت سے طلب محسوس ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہڑبڑا کر بولا۔ "میں اپنی سگریٹ کی ڈبی ہمراہ لانا بھول گیا ہوں۔ خیر، کوئی بات نہیں گزارا کرلوں گا۔"

خادم حسین کمرے سے باہر چلا گیا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد نبیل دوبارہ واقعے کی جانب آتے ہوئے بولا۔

"سحر کی خالہ زہرہ بیگم اچھی خاصی خوب صورت اور صحت مند عورت تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں۔ ان کا میری جانب راغب ہونا غیر معمولی بات تھی۔ تاہم ایسے کتنے ہی واقعات وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ جن میں نوعمر نوجوان کو بوڑھی عورت سے عشق ہوا اور ان دونوں نے شادی کی۔ مجھے جس بات نے حیرت میں مبتلا کیا۔ وہ یہ تھی کہ دلچسپی کے اظہار میں پہل زہرہ بیگم نے کی۔ عموماً عورتیں ایسے معاملات میں پہل نہیں کرتیں۔ اور پھر ایک دو دن کے بعد میں نے زہرہ بیگم سے ملاقات کا ارادہ کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر کریم آباد کے اس مکان کی طرف آ گیا جو زہرہ بیگم کا آبائی مکان تھا۔ مکان کے دروازے کے سامنے پہنچنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ زہرہ بیگم نے مجھے پچھلے دروازے کو استعمال کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس لیے میں گاڑی موڑ کر پچھلے دروازے کی طرف آیا۔ تمام پلاٹ خالی پڑے تھے اور وہاں درختوں کا ایک سرسبز جھنڈ بن گیا تھا جس میں جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں نے گاڑی کو جھنڈ کے اندر چھپا دیا اور اسے لاک کرنے کے بعد جب مکان کے دروازے کی طرف آیا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ دروازے کے پاس میری منتظر تھیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ چونکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ اس لیے میں بعض اوقات انہیں احترام سے پکارنے کے لیے آپ کا لفظ استعمال کرتا ہوں اور کبھی کبھی روانی میں تم کہہ کر بھی مخاطب کر لیتا ہوں۔ آپ درگزر کر دیجیے گا۔ درحقیقت وہ میرے دل و دماغ پر قابض ہو چکی تھیں اور میں سحر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "تو کیا تم نے زہرہ بیگم سے شادی کی اور کیا وہ اب تمہاری بیوی ہے یا پھر اسے بھی تم نے اپنی زندگی میں آنے والی دوسری عورتوں کی طرح رد کر دیا؟"

نبیل نے بتایا۔ "میں اس سے شادی کیا کرتا، اس نے تو میری بولتی ہی بند کر دی اور میں اس سے ملاقات کے بعد دوبارہ شادی کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ تاہم وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس ملاقات کے متعلق بتائے دیتا ہوں۔ وہ مکان کے پچھلے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ نجانے اسے میری آمد کے متعلق کیسے معلوم ہوا۔ میں جب اس کے قریب گیا تو وہ مجھے مکان کے اندر لے آئی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک کمرا تھا جس میں چند کرسیاں اور متروک شدہ سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔"

وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں تمہاری خاطر مدارت نہیں کر سکتی، اگر کسی کو ہماری ملاقات کے متعلق معلوم ہو گیا تو کہرام مچ جائے گا۔ امی کا کمرا یہاں سے دور ہے لیکن سحر کن سوئیاں لیتی پھر رہی ہے۔ اگر اس نے ہمیں دیکھ لیا تو آئندہ مشکل ہو جائے گی۔"

میں نے سرگوشی بھرے لہجے میں پوچھا۔ "ہمیں ملاقات کے لیے چھپ کر ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے، یہ ایک سرسری سی ملاقات ہی تو ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "اتنے

بھولے نہ بنو۔ میں تمہاری دلی کیفیت کو آنکھوں کے ذریعے پڑھ سکتی ہوں تو کیا تم نہیں پڑھ سکتے ہو۔ سحر کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ وہ اب ہمارے درمیان.... نہیں آسکتی۔ تم میرے رویے کو حیرت بھری نگاہوں سے نہ دیکھو اور مجھے غلط بھی نہ سمجھنا یہ سب ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بس یوں جان لو کہ تم وہ ہو جسے میں کبھی بھی بھلا نہیں سکی اور اب تمہارے ملنے کے بعد تمہیں دوبارہ کھونے نہیں دوں گی۔ میرے پیچھے آؤ۔'' وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور قریبی دروازے کی طرف چلی آئی۔ میں بھی اس کے پیچھے دروازے تک آگیا جسے تالا لگا ہوا تھا۔ زہرہ بیگم نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا گچھا نکالا اور ان میں سے ایک چابی کا انتخاب کرنے کے بعد تالے کو کھولنے لگی۔ وہ فوراً ہی کھل گیا۔ انہوں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرنے کے بعد اندر داخل ہو کر لائٹ کا بٹن تلاش کرنے لگیں۔ جلد ہی کمرا بلب کی زرد روشنی سے منور ہو گیا۔ وہ خواب گاہ تھی۔ کمرے کے درمیان.... پرانے طرز کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس کے قریب مسہری پڑی تھی۔ دیواروں پر پردے لگے ہوئے تھے اور ایک دروازہ مکان کے صحن کی جانب کھلتا تھا۔ وہ مسہری کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔ پھر بیڈ کے پیچھے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ ''اس تصویر کی جانب دیکھو۔''

نہ جانے کیوں میں نے اسے نظرانداز کر دیا تھا حالانکہ وہ نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ وہ میری تصویر تھی اور میرے ساتھ زہرہ بیگم بھی کھڑی تھیں۔ تصویر میں وہ میری ہم عمر دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کا حسن لاجواب تھا۔ میں نے انہیں نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''یہ تم نہیں ہو بلکہ میرا شوہر شکیل احمد ہے۔ جو شادی کے دو سال بعد ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ تم خود دیکھ سکتے ہو کہ اس میں اور تم میں کتنا فرق ہے۔ شاید رتی برابر بھی نہیں۔ میں نے جب پہلی دفعہ تمہیں سحر کے ہمراہ دیکھا تو میں چونک اٹھی۔ سحر کی ماں نے بھی مجھے اس مشابہت کے متعلق بتایا۔ امی بھی تمہیں دیکھ کر حیران رہ گئیں اور اسی لیے انہوں نے مجھے تم سے ملنے کے لیے منع کر دیا۔ جب تم سحر کے ہمراہ امی سے ملنے کے لیے آئے تو میں نے تمہیں پہلی دفعہ دروازے میں سے چھپ کر دیکھا اور دل تھام کر رہ گئی۔ تم میں اور شکیل احمد میں غضب کی مشابہت پائی جاتی تھی۔ مجھے گزرا ہوا وقت یاد آگیا جب جوانی کے دنوں میں

شادی کے بعد ہم دونوں ٹرین کی پٹریوں پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بے خودی کے عالم میں بہت دور تک چلے جایا کرتے تھے اور ہمیں منع کرنے والا وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ایسی ہی مدہوشی کے دوران جب ہم دونوں پٹری پر چلے جا رہے تھے تو اچانک ہی پیچھے سے ٹرین چلی آئی اور پھر......؟'' نبیل ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے چپ ہو گیا۔

ڈاکٹر نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم چپ کیوں ہو جاتے ہو، آگے بتاؤ کہ کیا ہوا۔ بلاوجہ کا تجسس پیدا کرنے کی کوشش نہ کرو۔''

نبیل دوبارہ بولا۔ ''شکیل احمد ان دنوں میرا ہم عمر تھا۔ نوجوانی کے دنوں میں بے پروائی کا دور دورہ ہوتا ہے اسے

معلوم ہی نہ ہوسکا۔ ٹرین کب ان دونوں کے قریب آگئی۔ انجن کی گڑگڑاہٹ نے ان دونوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ڈرائیور کب سے ہارن بجار ہا تھا لیکن وہ دونوں بے خودی کے عالم میں آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ جب انجن سر پر پہنچا تو شکیل احمد نے ہڑبڑا کر پیچھے دیکھا اور ٹرین کو مکمل رفتار سے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر زہرہ بیگم کو پٹریوں کے دوسری جانب دھکیل دیا لیکن اپنے آپ کو بچا نہیں سکا۔ ٹرین اس کے جسم پر چڑھ گئی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد زہرہ بیگم پاگل ہو گئیں۔ ان کا علاج کیا گیا اور ہماری ملاقات سے چند دن قبل ہی وہ صحت مند ہو کر واپس آئی تھیں۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "تو پھر کیا تم دونوں کی شادی ہوئی؟ اس ملاقات کے دوران بھی اس نے شادی کا اظہار نہیں کیا تھا؟"

نبیل نے موبائل پر وقت دیکھا۔ ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ اس کے پاس صرف آدھا گھنٹا باقی بچا تھا۔ چار بجے اس کے اسسٹنٹ نے کوٹھی کی طرف آنا تھا اور ابھی تک ڈاکٹر اس کے مرض سے آگاہ نہیں ہوسکا تھا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "ہماری شادی کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ واقعہ بیان کرتے ہوئے زہرہ بیگم چہرے کو دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ میں نے بے اختیار ہو کر انہیں اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ انہوں نے اعتراض نہیں کیا۔ کچھ دیر روتے رہنے کے بعد وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئیں اور بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہماری ازدواجی زندگی کے وہ دو سال یادگار بن کر رہ گئے۔ پہلے سال ہمیں اولاد نہیں ہوئی۔ دوسرے سال میں حاملہ ہو گئی تھی اور شاید میرا چوتھا مہینا چل رہا تھا۔ پٹریوں سے نیچے گرتے ہوئے میں نے لاکھ کوشش کی کہ پیٹ کے بل نہ آؤں لیکن ناکام ہو گئی۔ مجھے فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن پیٹ میں سانس لیتے ہوئے بچے نے جلد ہی دم توڑ دیا۔ مجھ پر جو قیامت گزری اس نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرا علاج ہوا اور میں جلد ہی ٹھیک ہو گئی۔ تاہم مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ تم واپس آؤ گے۔ میں اکثر گھر والوں سے چھپ کر ٹرین کی پٹریوں کی طرف چلی جایا کرتی تھی۔ ایک دو دفعہ میں نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ لیکن ٹرین کی رفتار زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ٹرین کو بروقت روک لیا گیا

اور پھر آخر کار مجھے طاہرہ بیگم کا فون موصول ہوا اور انہوں نے مجھے تمہارے آنے کی خوش خبری سنادی۔ تم اندر جھانک کر دیکھو۔ تمہیں وہاں شکیل احمد دکھائی دے گا۔" وہ چپ ہو گئیں اور میں نے تنقیدی انداز میں خود ..... کا جائزہ لیا۔ میں یہاں اس بات کا برملا اظہار کرتا ہوں کہ بعض اوقات میں اپنے وجود سے بے پروا ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں وہ نہیں ہوں۔ جسے لوگ جانتے ہیں بلکہ میں وہ تھا جس کی حقیقت سے سب لوگ لاعلم تھے اور وہ دراصل شکیل احمد کا وجود تھا۔

میں نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی زہرہ بیگم سے پوچھا۔ "اب تم کیا چاہتی ہو، جو کہو گی میں بلاتامل کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ یک دم مسکراتے ہوئے بولیں۔ "مجھے تم سے کچھ زیادہ نہیں چاہیے۔ بس میرے ساتھ ان پٹریوں پر چلو۔ جن پر میں شکیل احمد کے ساتھ بہت دور تک چلی جایا کرتی تھی۔" میں نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے گھڑی پر وقت دیکھا۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ میں چھ بجے تک وہاں رہ سکتا تھا۔ ہم دونوں مکان سے باہر آگئے۔ انہوں نے مین دروازے کی طرف جانے کے بجائے پچھلی جانب سرسبز کھیتوں کا رخ کیا۔ شروع میں کچھ زمین بنجر اور ویران تھی لیکن جب کھیت شروع ہوئے تو لہلہاتا ہوا سرسبز منظر آنکھوں کو بھلا لگنے لگا۔ کھیتوں کے درمیان .... سے ٹرین کی پٹری بل کھاتی ہوئی دور جارہی تھی۔ ہم اس پر آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے دونوں جانب امرود اور مالٹوں کے باغ تھے۔ جن میں مالی کام کر رہے تھے۔ زہرہ بیگم میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے آگے بڑھتی چلی گئیں۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھیں۔ انہیں خدشہ لاحق تھا کہ ٹرین مجھے کچل نہ دے اور ہم دونوں ایک دفعہ پھر جدا نہ ہو جائیں۔

میں نے ان کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "اگر گھر والوں کو آپ کی یہاں موجودگی کے متعلق علم ہو گیا تو وہ آپ کو ڈھونڈتے ہوئے پٹریوں کی طرف آسکتے ہیں اور اگر ہماری چوری پکڑی گئی تو ہم دونوں کو زندہ درگور کر کے رکھ دیں گے۔"

انہوں نے بے پروائی کے انداز میں کاندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے ان کی پروا نہیں۔ شکیل احمد کے مرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کمرے تک محدود کر لیا اور سب سے ملنا ترک کر دیا۔ میرے کمرے کے ساتھ ہی چھوٹا سا کچن بنا ہوا ہے۔ میں وہاں کھانا بناتی ہوں اور

کھانے کے بعد شکیل احمد کی یادوں میں گم ہو جاتی ہوں۔ پہلے پہل انہوں نے میرے کمرے میں آنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے انہیں منع کیا تو انہوں نے ملنا ترک کر دیا۔ اب میں ہوں اور شکیل احمد کی یادوں کا سلسلہ ہے۔ لیکن اب تم آ گئے ہو، تو یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔" پٹریوں نے گھوم کر باغوں کے درمیان ... آگے بڑھنا شروع کیا اور پھر کچھ آگے جانے کے بعد کریم آباد ریلوے اسٹیشن کی عمارت آ گئی۔ جہاں پلیٹ فارم پر دو بینچ لگے ہوئے تھے۔ ان کے قریب دو کمرے تھے۔ جن میں سے ایک ٹکٹ چیکر کا تھا اور دوسرا ملازمین کے لیے تھا۔ یہاں گاڑیاں رکتی نہیں تھیں۔ اس لیے بکنگ کے لیے اگلے اسٹیشن پر جانا پڑتا تھا۔ ہم اسٹیشن کے سامنے سے ہو کر آگے چلے آئے۔ پھر وہ جگہ سامنے آ گئی جہاں وہ اندوہناک واقعہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ یہاں پٹری ایک دفعہ پھر گھوم کر آگے بڑھی تھی۔ اس لیے پیچھے سے آنے والی ٹرین کے متعلق اس وقت معلوم ہوتا تھا جب وہ سر کے پاس نمودار ہوتی تھی۔ زہرہ بیگم اس جگہ پٹریوں کے درمیان بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر کرب کے تاثرات تھے۔ وہ رُندھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"میں روزانہ شام کو یہاں آ جاتی ہوں۔ اس پٹری کے پاس پہلے ایک بینچ پڑا ہوا تھا۔ جسے چند دن پہلے یہاں سے ہٹا لیا گیا تھا۔ میں اس پر بیٹھ کر بیتے دنوں کو یاد کرتی تھی اور مغرب سے پہلے واپس چلی جایا کرتی تھی۔ میرے پاس اس کے علاوہ اپنے غم کو کم کرنے کا اور کوئی حل نہیں تھا۔ مجھے یہاں آ کر سکون محسوس ہوتا تھا لیکن اب تم آ گئے ہو، تو میرے غموں کا مداوا ہو گیا ہے۔"

میں ان کے قریب پٹری پر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی کیفیت کو محسوس کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ بھی ایسے چند واقعات ... پیش آ چکے ہیں جن کی وجہ سے دل ٹوٹ کر رہ گیا ہے اور میں بہت مایوس ہوا۔ بہر حال میں جلد آپ کو اپنا لوں گا۔ سحر سے بات چیت ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ بات پکی نہیں ہوئی۔ میں اسے ختم کیے دیتا ہوں۔"

زہرہ بیگم سپاٹ لہجے میں بولیں۔ "میں دو دنوں کے بعد یہاں سے دور چلی جاؤں گی۔ مجھے وراثت میں امی کی جانب سے چھوٹی سی زمین کا ٹکڑا ملا ہے جس پر مزارعے کام کرتے ہیں اور مجھے اتنا منافع مل جاتا ہے جس میں بہ آسانی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ تم میرے چلے جانے کے بعد بات چیت کو آگے بڑھانا۔ ورنہ تمام نزلہ میرے اوپر گرے گا۔ میں جہاں جا رہی ہوں، وہاں کا ایڈریس تمہیں دے دوں گی۔" نبیل ایک دفعہ پھر چپ ہو گیا اور ڈاکٹر طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری بیماری کو سمجھ گیا ہوں۔ تم دراصل دو شخصیتوں کے مالک ہو۔ اور دونوں کی پسند ناپسند مختلف ہے۔ تمہیں ان دونوں میں سے ایک کا خاتمہ کرنا ہو گا اور دوسرے کا انتخاب کرنے کے بعد اسے اپنی فطرت کا حصہ بنانا ہو گا۔ یہ نفسیاتی پہلو کا مشکل ترین حصہ ہے۔ تاہم ناممکن نہیں ہے۔ تم اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لا کر ایسا بہ خوبی کر سکتے ہو۔ جب تمہاری ایک شخصیت ختم ہو جائے گی تو دماغ میں اتنی یکسوئی پیدا ہو جائے گی کہ تم کسی بھی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو اس پر مستحکم کر سکو گے۔"

نبیل بیزار لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ نے واقعہ پورا نہیں سنا۔ میرے پاس وقت بھی کم بچا ہے۔ میرا اسسٹنٹ کچھ ہی دیر میں آنے والا ہے۔ اس لیے میں واقعے کو مختصر کیے دیتا ہوں۔" اس دوران اس نے سبز چائے پی لی تھی اور اب اسے دوبارہ شدت کے ساتھ کولڈ ڈرنک کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم وہ اس کا اظہار کر کے ڈاکٹر کو مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گویا ہوا۔

"ہم سرِ شام پٹریوں سے ہوتے ہوئے مکان کی طرف آ گئے۔ میں اندر نہیں گیا اور نہ ہی اس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں نے گاڑی کو درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے باہر نکالا۔ زہرہ بیگم دروازے کے پاس بُت بنی کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر اب بے چینی کے تاثرات نہیں تھے۔ وہ کافی حد تک مطمئن دکھائی دیتی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ مکان چھوڑ کر جانے والی بات میں صداقت نہیں تھی۔ وہ انہوں نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے گھڑی تھی لیکن میں نے دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا کہ میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا اور شادی انہی سے کروں گا۔ اس دن میں نے سحر سے ملاقات نہیں کی اور واپس شہر آ گیا۔ اگلے ہفتے مجھے سحر کی والدہ کا فون موصول ہوا... انہوں نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ سحر کی نانی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ کریم آباد جا رہی ہیں۔ میں نے بھی ان کے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا اور گاڑی نکال کر ان کے گھر آ گیا۔ سحر پہلے ہی کریم آباد میں تھی۔ اس لیے میں طاہرہ بیگم کو ہمراہ لے کر کریم آباد چلا آیا۔ ہم نے جب مکان میں قدم رکھا تو جنازہ تیار تھا۔

صرف طاہرہ بیگم کی آمد کا انتظار کیا جارہا تھا۔ انہوں نے ماں کا چہرہ دیکھا اور دہاڑیں مار کر رونے لگیں۔ وہاں محلے کی چند عورتیں بھی موجود تھیں۔ سحر بھی میت کے پاس کھڑی تھی لیکن زہرہ بیگم وہاں نہیں تھیں۔ میرے دل میں اچانک خیال پیدا ہوا کہ وہ مکان کو چھوڑ کر جا چکی ہیں لیکن اگر چلی گئی تھیں تو ماں کی موت کا سن کر انہیں واپس آ جانا چاہیے تھا۔ طاہرہ بیگم اتنی دور سے ماں کی موت کا سننے کے بعد چہرہ دیکھنے کے لیے آگئی تھیں۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ زہرہ بیگم نہیں آئی تھیں۔ جنازہ دفنانے کے لیے اٹھا لیا گیا۔ ان کے مکان کے قریب اور کریم آباد ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی چھوٹا سا قبرستان تھا۔ انہیں وہاں دفنا دیا گیا اور ہم مکان کی طرف واپس آگئے۔ یہ اسی رات کی بات ہے۔ سحر کی والدہ اور میں درمیانی کمرے میں بیٹھے تھے۔ میرے دماغ میں اب بھی یہ سوالیہ نشان موجود تھا کہ زہرہ بیگم ماں کی میت کو دیکھنے کے لیے کیوں نہیں آئی تھیں۔ آخر کار میں نے مجبور ہو کر طاہرہ بیگم سے پوچھنے کا ارادہ کیا۔ ان کی دماغی کیفیت اس سوال کے لیے اس وقت موزوں نہیں تھی۔ اس لیے میں نے براہ راست پوچھنے کے بجائے وراثت میں حصے داروں کے نام پوچھنا موزوں جانا۔ تاہم اب سوچتا ہوں تو یہ سوال بھی اخلاقی دائرے سے باہر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس وقت تو میری آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس لیے پوچھ لیا۔ طاہرہ بیگم نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا پھر بیزار لہجے میں بتانے لگیں۔

”وراثت میں اس مکان کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ چند زمینیں تھیں جو مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکنے کی بنا پر بنجر ہوگئیں۔ تب بحالت مجبوری انہیں فروخت کرنا پڑا۔ مکان امی نے میرے نام کر دیا۔ زمینوں کا ایک مختصر ٹکڑا فروخت ہونے سے بچ گیا۔ وہ انہوں نے سحر کے نام منتقل کر دیا ہے۔“

میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”سحر بتا رہی تھی کہ آپ کی ایک بہن بھی ہے جس کا نام زہرہ بیگم ہے۔ وہ کہاں ہے؟“

طاہرہ بیگم سرد آہ بھرتے ہوئے بولیں۔ ”اس کا انتقال تو کافی سال پہلے ہوگیا تھا۔ اب تو اس کی میت بھی مٹی میں مل چکی ہوگی۔“

میں حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ اگر وہ مرگئی تھی تو مجھ سے ملنے والی عورت کون تھی۔ جس نے مجھے مکان کے پچھلے دروازے کی جانب آنے کی دعوت دی تھی۔ طاہرہ بیگم روانی میں بولتی چلی جارہی تھیں۔ ”درحقیقت اس کی اندوہناک موت نے ہی امی کی کمر کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ورنہ زمینوں کی دیکھ بھال وہ اکیلے ہی کرلیا کرتی تھیں۔ زہرہ کی وفات کے بعد انہوں نے زمینوں کی دیکھ بھال میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ میں شہر سے یہاں آ نہیں سکتی تھی۔ سحر کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ..... اس لیے آخر کار زمینوں کو فروخت کرنا ہی پڑا۔“

میں نے پوچھا۔ ”غالباً ان کی موت ٹرین کی پٹریوں پر واقع ہوئی تھی؟“

”ہاں۔“ انہوں نے سرد آہ بھرتے ہوئے بتایا۔ ”اسے بچپن ہی سے ٹرین کی پٹریوں کے پاس واقع مالٹے کے باغوں کے درمیان گھومنا پسند تھا اور شادی کے بعد وہ اس مرض کو بھلا نہیں سکی۔ حیرت تو ہمیں اس بات پر ہوئی کہ اس کے شوہر کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ وہ دونوں پٹریوں پر چلتے ہوئے بہت دور چلے جایا کرتے تھے اور ایک دن اسی دوران اسٹیشن والے موڑ سے اچانک ہی ٹرین نے نمودار ہو کر ان دونوں کو کچل کر رکھ دیا۔ جب ان کی لاشوں کو گھر لایا گیا تو کہرام مچ گیا۔ جوان لاشوں کے علاوہ ایک ننھے وجود کی موت بھی واقع ہوئی تھی۔ چند دن پہلے ہی تو زہرہ حاملہ ہوئی تھی اور کتنی ہی دعاؤں اور منتوں کے بعد ہوئی تھی۔ سب کچھ اچانک ہی ختم ہو کر رہ گیا۔“ طاہرہ بیگم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

تب میں نے دوبارہ پوچھا۔ ”شکیل احمد شاید مکان کے پچھلے پورشن میں رہتا تھا۔ اگر وہ گھر داماد نہ بنتا تو شاید یہ دلخراش واقعہ وقوع پذیر نہ ہوتا۔“

طاہرہ بیگم بولیں۔ ”وہ یہاں رہنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن امی کے پاس کسی کو تو ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے ہمارے اصرار پر رہنے کے لیے یہاں آگیا۔“

میں نے خواہش کا اظہار کیا۔ ”کیا میں ان کا کمرا دیکھ سکتا ہوں؟“

انہوں نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اسے دیکھ کر کیا کرو گے۔ وہ زہرہ بیگم اور شکیل احمد کی موت کے بعد سے بند پڑا ہوا ہے۔ شاذونادر ہی صفائی کے لیے کھولا جاتا ہے۔ اگر ضد کرتے ہو تو میں تمہیں دکھائے دیتی ہوں۔ امی نے مرنے سے قبل مکان کی چابیاں سحر کو دے دی تھیں۔“ وہ اٹھ کر اندرون کمرے کی طرف چل دیں۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ پچھلے کمروں کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا۔ جسے تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے کھول دیا۔ اس

دروازے کے آگے ایک گیلری تھی اور گیلری کے آخر میں ایک اور دروازہ تھا۔ جسے کھولنے کے بعد ہم اس خواب گاہ میں آگئے جہاں میری اور زہرہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے پلنگ کے پیچھے لگی ہوئی اس تصویر کی جانب دیکھا جس میں شکیل احمد اور زہرہ بیگم مکان کی چھت پر کھڑے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر اب شکیل احمد اور میرے چہرے میں رتی برابر بھی مشابہت نہیں پائی جاتی تھی۔ تاہم زہرہ بیگم کا چہرہ پہلے جیسا ہی تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری اور زہرہ بیگم کی ملاقات خواب کے دوران ہوئی ہو۔ لیکن میں طاہرہ بیگم کے ساتھ جیتی جاگتی حالت میں کمرے کے درمیان... کھڑا تھا اور یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ ہم واپس مکان کے اندر آگئے اور اگلے دن میں دونوں ماں بیٹی سے رخصت لے کر شہر آگیا اور اس سے اگلے ہفتے میں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ مجھے سحر کی شکل میں زہرہ بیگم کا بھوت دکھائی دیتا تھا۔ میں اس کے ساتھ تمام زندگی کیسے گزار سکتا تھا۔"

نبیل کے خاموش ہونے پر ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہاری آپ بیتی ختم ہوگئی ہو تو میں دوائیں لکھ دوں۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ان گولیوں کو کھانے سے تمہیں نیند آئے گی اور جب تمہارے دماغ کا بوجھ ختم ہو جائے گا تو تم بہتر محسوس کرو گے۔" اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ اور نبیل کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کی بجلی آف ہوگئی۔ یقیناً اے سی بھی بند ہوگیا۔ کیونکہ اسے یکدم گرمی لگنے لگی۔ اس نے عجلت کے عالم میں کال ریسیو کی۔ دوسری جانب اس کا اسسٹنٹ تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ہائی وے کے قریب اس کی گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔ نبیل نے اسے گاڑی کو اپنی گاڑی کے ساتھ ٹوچین کرنے کے لیے کہا اور موبائل بند کرتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"صبح ہائی وے کے قریب میری گاڑی خراب ہو گئی۔ تب اس کا اے سی بھی بند ہوگیا۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو فون کیا۔ تو اس نے بتایا کہ مطلوبہ مقام تک آنے میں اسے تین سے چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ اگر میں یہ تین چار گھنٹے گاڑی میں بیٹھ کر گزارتا تو یقیناً سانس بند ہوجانے کی بدولت مر جاتا۔ اس لیے میں نے گاڑی سے باہر نکل کر اردگرد نگاہ دوڑائی تو مجھے آپ کی شاندار کوٹھی دکھائی دی اور میں کوٹھی کی جانب آگیا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ میرا اسسٹنٹ ہائی وے پر میرا انتظار کررہا ہے۔"

ڈاکٹر غصیلے لہجے میں بولا۔ "تو تمہیں کوئی مرض لاحق نہیں اور تم صرف تین چار گھنٹے گرمی سے بچنے کے لیے یہاں چلے آئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم نے میرا کتنا نقصان کیا ہے؟ میری اسٹڈی کا تمام وقت برباد ہوکر رہ گیا ہے۔" اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ خادم حسین نے جنریٹر آن کردیا۔ اس سے اے سی نہیں چل سکتا تھا۔ تاہم پنکھا چلنے لگا اور اس کی ٹھنڈی ہوا نے نبیل کے چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کرنا شروع کردیا۔

نبیل دوبارہ معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں نے جو بھی کیا، گرمی کی شدت سے مجبور ہوکر کیا۔ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو شاید آپ بھی یہی کرتے۔ اُمید کرتا ہوں، آپ مجھے معاف کردیں گے۔ میکلوڈ روڈ پر میرا گاڑیوں کا شوروم ہے۔ اگر آپ وہاں آئے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں آپ کی دل کھول کر خاطر مدارت کروں گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے، انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔" وہ صوفہ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

تب ڈاکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "اور وہ جو لمبا چوڑا واقعہ تم نے تین گھنٹوں کے دوران سنایا۔ اس کے متعلق بھی بتاتے جاؤ کہ وہ سچ پر مبنی تھا یا پھر تمہارے دماغ کی اختراع تھی۔"

نبیل نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "ایسی بہت سی کہانیاں میرے دماغ کے پردے پر وقتاً فوقتاً نمودار ہوتی رہتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تاہم میں نے انہیں کبھی بھی اہمیت نہیں دی۔ یہ میرے دماغ میں آتی ہیں اور خود ہی واپس چلی جاتی ہیں۔ آپ بھی اس پر توجہ نہ دیجیے۔" وہ سٹنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے دہاڑتے ہوئے خادم حسین کو آواز دی۔ وہ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں کچن سے نکل کر سٹنگ روم میں آگیا۔ ڈاکٹر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آج کے بعد اگر کوئی مجھ سے ملنے کے لیے کوٹھی کی طرف آیا اور تم نے دروازے کو کھلا چھوڑ دینے کی غلطی کی تو میں فوراً ہی تمہیں نوکری سے فارغ کردوں گا۔ اب باہر جاؤ اور کوٹھی کے گیٹ کو تالا لگا دو۔ خدا کی پناہ! ریگستان میں بھی لوگ ملاقات کے لیے آجاتے ہیں۔"

خادم حسین ہڑبڑائے ہوئے انداز میں سٹنگ روم سے باہر نکل گیا اور ڈاکٹر اٹھ کر خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ اس کا تمام دن برباد ہوگیا تھا۔

❖❖❖

قسط نمبر 21

# دہر

حسام بٹ

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحر بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصد حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزار فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامت صغریٰ کا پیغام برثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس میں ماں ہلاک ہوگئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کر دیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید وبند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی بپتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنا دیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگا لیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمد خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہوگیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہوگیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہوگئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار رحیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست نما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو اٹھا غفیل کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے

بحری جہاز پر پایا۔ بعدازاں ڈیوڈ نے ایک مرتب پھر جاسم سے پراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ قاہرہ پہنچادیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہر ٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جن زادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دوران سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ جاسم اس صورت حال سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورت حال کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جسٹس حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی بازیاب کرا چکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلور کوئن کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف حتمی کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کر چکا تھا۔ ڈیوڈ اور حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جسٹس حسنی کے وِلا تک پہنچ چکے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہائی کورٹ کے سینئر جج کو سپردِ عذاب کرنے والے اس بدماغ اُجڈ شخص نے بات اپنے انداز میں مکمل کی، سیل فون کو آف کر کے اپنی جیب میں رکھا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ایک گھنٹے کے بعد میں استنبولی بڈھے کو دوبارہ فون کروں گا۔ تمہیں کیا لگتا ہے، وہ جج کا بچہ ہمیں جاسم کے بارے میں بتا دے گا؟''

''شکور! مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہماری بات مانے گا۔'' شکور کے ساتھی منصور نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں وہ واقعتاً جاسم کے پتے ٹھکانے سے واقف نہیں ہے......''

''تو پھر سمجھ لو، اس کی موت پکّی ہے!'' شکور نے بے ہوش کامل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سفاکی سے کہا۔ ''میں ایک گھنٹے سے زیادہ اسے زندہ رہنے کی مہلت نہیں دے سکتا۔ اب اس کی قسمت کہ بیدار ہونے کے بعد مرے یا پھر......!''

شکور نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو منصور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''تمہارے اندازے کے مطابق، اسے کب تک ہوش آجائے گا؟''

''ہم نے اس کی گردن میں جو انجکشن لگایا ہے، اس کا اثر کم از کم دو گھنٹے تک رہتا ہے۔'' شکور نے بتایا۔ ''لیکن کامل کوئی عام انسان نہیں۔ تم نے اس کا اعتماد اور بہادری تو دیکھ ہی لی ہے۔ یہ کتنی جی داری سے اس ''ہیلتھ اسپا'' میں گھسا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، ایک گھنٹے کے بعد کسی بھی وقت اس کے حواس کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

''اور تب تک؟'' منصور نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ شکور نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''انتظار...... صبر آزما اور اعصاب شکن انتظار۔ جب تک اس کے خیر خواہ جج سے فائنل بات نہ ہو جائے، ہم اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ نہیں کر سکتے!''

ادھر شکور کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو وہاں ''سر'' کا لفظ چمک رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر منصور کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چند قدم دور جا کر کال اٹینڈ کرتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔

''یس باس!''

دوسری طرف موجود شخص کا نام حاتم تھا۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''شکور! تمہاری جانب کیا حالات ہیں؟ مجھے کامل کے بارے میں بتاؤ، اس نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟''

شکور نے فدویانہ انداز میں اپنے باس کو صورتِ حالات سے آگاہ کرنے کے بعد جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''باس! کامل پوری طرح ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ آپ کے حکم کی روشنی ہی میں اس کے ساتھ سلوک کیا جائے گا۔''

''تم نے طلال حسنی کو ایک گھنٹے کا وقت دیا ہے لہٰذا یہ مدت پوری ہونے تک کامل کو کڑی نگرانی میں بلکہ گن پوائنٹ پر رکھو۔ اس کی بے ہوشی کو دیکھ کر کوئی غفلت اور کوتاہی نہیں ہونا چاہیے!'' حاتم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

کہا۔ ''جاسم کے تمام ساتھی حد درجہ وفاداری اور آہنی اعصاب کے مالک ہیں۔ ہم نے استنبول میں اپنے مزید چند ساتھیوں کو کھو دیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ جج تمہیں جاسم کے بارے میں کچھ بتائے!''

''اِن حالات میں میرے لیے کیا حکم ہے......؟''

''حکم تو اوپر سے آتا ہے!'' حاتم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور ہم سب کو بے چون چرا اس کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ اگر کامل کی بے بسی اور لاچاری سے بھی ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو پھر اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے!''

''سمجھ گیا باس!'' شکور نے توانا لہجے میں کہا۔

کامل کو اپنے دام میں لانے والے وہ دونوں افراد اس وقت ''گِگ ہیلتھ اسپا'' کے اندرونی حصے میں موجود تھے اور کامل ان کی نظروں کے سامنے بے حس و حرکت فرش پر پڑا تھا۔ جب حاتم کی کال آئی تو شکور، منصور سے تھوڑے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ ان دونوں میں شکور، منصور سے سینئر تھا اسی لیے حاتم ہمیشہ شکور ہی سے رابطہ کیا کرتا تھا۔ وہ دونوں اسے اپنا باس سمجھتے تھے۔ وہ کافی عرصے سے حاتم کے ساتھ کام کررہے تھے اور ان کی جان کاری سفر کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ ان کا باس حاتم کسی غیر ملکی طاقتور ہستی ڈیوڈ کا خاص نمائندہ تھا جو کراچی کے معاملات کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ دونوں کبھی ڈیوڈ سے ملے نہیں تھے تاہم اس کی پُراسرار صلاحیتوں کی سنسنی خیز کہانیاں گاہے بہ گاہے ان تک پہنچتی رہتی تھیں۔ وہ دونوں ''گِگ ہیلتھ اسپا'' کو ایک ''سیف ہاؤس'' کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ویسے گِگ اسپا دنیا والوں کے لیے ایک ہیلتھ اسپا ہی تھا۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ جس کامل کو پورے کراچی میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں، وہ خود چل کر اس اسپا میں آجائے گا اور وہ بھی اپنی شناخت کو چھپائے بغیر......!

''گِگ ہیلتھ اسپا'' کراچی کے پوش علاقے کے ایک بنگلے میں اپنی خدمات کو ''جاری و ساری'' رکھے ہوئے تھا۔ یہ اسپا دن کے گیارہ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جی آئی جی (گِگ) کے پسِ پردہ کون سا گھناؤنا کھیل کھیلا جارہا تھا۔ ڈیوڈ نے جاسم کو رئیلیٹی ٹی وی کی پیشکش کرنے کے لیے جو خط بھیجا تھا، اس کے پیچھے اسی اسپا کا نام اور ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ جاسم، ناجیہ کے ساتھ یہاں آیا بھی تھا مگر اسپا والوں نے کسی ڈیوڈ کو پہچاننے یا اسپا کے ساتھ اس کے کسی تعلق سے صاف انکار کردیا تھا۔ بہرکیف، یہ واقعہ کامل کے علم میں تھا اور آج اس نے ایک خاص مقصد سے ادھر کا رخ کیا تھا۔

شکور اور منصور، حاتم کو اپنا باس اور ڈیوڈ کو حاتم کا آقا سمجھتے تھے لیکن موجودہ حالات پہلے والے نہیں تھے۔ ڈیوڈ کو جاسم والے معاملے سے الگ کردیا گیا تھا اور اب اس ایشو کو تین سینئرز، تین مختلف شہروں میں دیکھ رہے تھے۔ استنبول مسٹر جیکب کے سپرد کردیا گیا تھا۔ تبوک مسٹر اولیور کی نگرانی میں تھا اور کراچی کی کمان مسٹر نارمن کے ہاتھ میں تھمادی گئی تھی۔ اسی کمان سے مسٹر نارمن نے پہلا تیر کامل کے شادمان ٹاؤن والے بنگلے پر چلایا تھا جس کے نتیجے میں کامل کے تین جاں نثار عتیق، اعجاز اور رستم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ شکور اور منصور کی طرح کامل بھی اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ ڈیوڈ کا کراچی والا نیٹ ورک اس وقت مسٹر نارمن کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ حاتم تک کو اس ہنگامی تبدیلی کی خبر نہیں تھی۔ اس نے شکور کو ایک گھنٹے کی مہلت صرف اس لیے دی تھی کہ شاید کسی کی زبان سے جاسم کی تازہ ترین لوکیشن کا سراغ مل جائے۔ شکور کا طلال حسنی سے رابطہ کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جاسم کے حوالے سے کوئی بھی چھوٹی بڑی خبر حاتم اور اس کے معتمدین کے لیے نہایت ہی سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے کامل کو ایک گھنٹے تک بے ہوشی کی حالت میں زندہ رکھنے کا رسک لے لیا تھا ورنہ ہائی کمان کی جانب سے تو جاسم کے تعلق داروں کے لیے ''شوٹ ایٹ سائٹ'' کے احکامات صادر ہوچکے تھے......!

''باس نے کیا کہا ہے؟'' منصور نے اپنے سینئر شکور سے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، کامل کے بارے میں......!''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وہی جو ہم نے سوچا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم اپنے فیصلے پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ دعا کرو کہ استنبولی جج کوئی ایسی خبر سنادے جو ہماری ترقی میں پہیے لگا دے ورنہ اس بدبخت کو تو ہر صورت مرنا ہی ہے......!''

شکور، منصور سے دعا کی درخواست کررہا تھا حالانکہ وہ دونوں شیطانی عزائم کی تکمیل میں مصروف تھے۔ بہرحال، کوئی انسان اچھا ہو یا برا، اس سے دعا مانگنے کا حق نہیں چھینا جاسکتا کیوں کہ دعا کو قبول یا رد کرنے والی ذاتِ پاک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور... بے شک! وہ دلوں کے بھید اور نیتوں کے بھاؤ اچھی طرح جانتا ہے......

''اس کو ختم کرنا ہماری پیشہ وارانہ مجبوری ہے کیوں کہ اوپر سے یہی حکم ہے۔'' منصور نے ترحم آمیز نظر سے کامل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اس کی دلیری نے مجھے متاثر کیا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے اس کی موت کا دکھ ہوگا!''

''کیا تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی ہم دردی پیدا ہو رہی ہے؟'' شکور نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے یار......!'' منصور جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس، میرے دماغ میں جو تھا، وہ میں نے کہہ دیا۔ جاسم اور اس کا ہر خیرخواہ ہمارا دشمن ہے۔ میں تو اس کی جی داری کا ذکر کر رہا تھا۔ ایسا جگرا بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، اس حقیقت سے تو تم بھی انکار نہیں کرسکتے......!''

''ہاں، یہ تو ہے......'' شکور نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنی گن منصور کی جانب بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''تم اس پر نگاہ رکھو، میں واش روم سے ہوکر آتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے بھی چوکنا نہیں......''

''سمجھ گیا!'' منصور نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اس معاملے میں بھول چوک کی بھلا گنجائش ہی کہاں ہے؟''

منصور اور شکور یہی سمجھ رہے تھے کہ حد سے زیادہ بہادری اور خوداعتمادی کے مظاہرے نے کامل کو اس مشکل میں ڈال دیا تھا جب کہ حقیقت اس کے بالعکس تھی۔ مُراد دادا کا وہ شاگردِرشید ایک منجھا ہوا گھاگ شکاری تھا۔ وہ اس اسپا میں شکار ہونے نہیں، بلکہ شکار کرنے کی غرض سے داخل ہوا تھا اور وہ بھی پوری تیاری کے ساتھ......!

اس مشن کی شروعات اس وقت ہوئی جب کامل ایس پی احسان الحق سے ایک بھرپور ملاقات کرنے کے بعد اس کے آفس سے باہر نکلا تھا۔ وہ جیسے ہی آکر اپنی گاڑی میں بیٹھا، اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر نظر آرہا تھا۔ کسی فوری خیال کے تحت کامل نے وہ کال پک کرلی تھی۔

''ہیلو!'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔

''السلام علیکم!'' ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''کیا کامل صاحب بات کررہے ہیں؟'' اس عورت نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔

''وعلیکم السلام!'' کامل نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''جی میں کامل بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں اور آپ کو میرا نمبر کس نے دیا ہے؟''

اس وقت کامل جو سم کارڈ استعمال کررہا تھا، وہ اس نے کل ہی خریدا تھا۔ شادمان ٹاؤن والے واقعے کے بعد سے اسے ایک نئے نمبر کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ اس سم کارڈ کے لیے اس نے ایک نیا بیسک سیل فون بھی خرید لیا تھا۔ بہرحال، اس نے اپنے اہم نمبرز کو مذکورہ سم کارڈ میں اسٹور کرلیا تھا۔ ویسے اس کا دوسرا سیل فون بھی زیرِاستعمال تھا۔ اس کے لیے حیرت کا سبب یہ تھا کہ جو نمبر اس نے ابھی کسی کو دیا ہی نہیں، اس پر کسی خاتون کی کال کیسے آگئی اور...... مذکورہ عورت اس کے نام سے بھی واقف تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں آیا کہ کسی اجنبی عورت کے سامنے اسے اپنے کامل ہونے کی تصدیق نہیں کرنا چاہیے تھی۔ بہرحال، یہ بے احتیاطی تو ہوچکی تھی، اب اسے خوب صورتی سے نبھانا تھا!

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دس ویں حصے میں اس کے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے اس خاتون کا جواب آگیا۔ ''میرا نام تحسین فاطمہ ہے۔ آپ کا نمبر مجھے جس ہستی نے دیا ہے، میں اس کے لگژری اپارٹمنٹ میں رہنے آئی ہوں۔ کیا آپ آج کسی وقت مجھ سے ملنے تین تلوار کے نزدیک واقع ایک ہائی رائز کے ففتھ فلور پر آسکتے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ ایک اہم معاملے پر آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں......''

''آپ کو تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں اور مجھے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' کامل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں ایک گھنٹے میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔''

تحسین فاطمہ نامی اس عورت نے تین تلوار اور کلفٹن برج کے قریب والی ہائی رائز بلڈنگ کے ففتھ فلور اور کسی ہستی کا جس طرح ذکر کیا تھا، اس سے کامل کو یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اسے ناجیہ اور اس کے لگژری اپارٹمنٹ کے بارے میں بتارہی تھی لیکن ایک سوال مسلسل اس کی سوچ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا کہ اس کا یہ نیا کانٹیکٹ نمبر تحسین فاطمہ یا اس متذکرہ ہستی یعنی ناجیہ تک کیسے پہنچا تھا......؟

اپنے سرپرست اور دل بولے باپ غفار داؤد کی موت کی خبر سن کر جب ناجیہ ہنگامی حالات میں استنبول سے کراچی آئی تھی، اس کے دل و دماغ میں قیامتِ صغریٰ بپا تھی۔ تدفین کے بعد جاسم کی، اس سے تفصیلی بات ہوئی تھی اور جاسم نے اسے ایک معقول مشورہ دیا تھا۔

''ناجیہ! ایثار تمہیں ایک محفوظ مقام پر پہنچادے

گی۔" جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا تھا۔ "ہم اس وقت جس نوعیت کے حالات سے گزر رہے ہیں، ان کی روشنی میں تو یہی نظر آرہا ہے کہ شاید ہی کبھی تمہارا دوبارہ کراچی آنا ہو۔ سمجھ داری کا تقاضا یہی ہے کہ تم کراچی چھوڑنے سے پہلے اس اپارٹمنٹ کو سیل آؤٹ کردو......!"

"اس اپارٹمنٹ کے ساتھ میری بڑی گہری جذباتی وابستگی ہے۔" ناجیہ نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ "میں یہاں رہوں یا نہ رہوں مگر پاپا کی اس آخری نشانی کو کبھی فروخت نہیں کروں گی۔ میرا یہاں سے جانا تو وقت کی ضرورت نے لازم ٹھہرایا ہے۔ میں نے یہ اپارٹمنٹ اپنی بھروسے کی ایک فیملی کو کرائے پر دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میری ان لوگوں سے بات بھی ہوگئی ہے......"

ناجیہ کی اس دوٹوک گفتگو کے بعد جاسم کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ ناجیہ اس کی زندگی میں شامل ایک اہم ہستی تھی بلکہ وہ جاسم کی ذات کا اٹوٹ انگ تھی۔ جاسم نے ہمیشہ ناجیہ کی خواہشات کا احترام اور جذبات کی قدر کی تھی اور...... مذکورہ اپارٹمنٹ سے ناجیہ کی جذباتی وابستگی والا معاملہ تو انتہائی نازک اور حساس نوعیت کا تھا!

کامل کو اس کے نئے نویلے کانٹیکٹ نمبر پر فون کرنے والی تحسین فاطمہ، ناجیہ کی اسی بھروسامند فیملی کی سربراہ تھی جسے اس نے اپنا اپارٹمنٹ کرائے پر دیا تھا۔ مذکورہ خاتون کی عمر پچاس کے آس پاس تھی اور وہ محکمۂ تعلیم میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھی۔

اس ہائی رائز رہائشی بلڈنگ میں کامل پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ وہ ایک گھنٹے بعد حسبِ وعدہ ناجیہ کے اپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ تحسین فاطمہ نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کامل کی تواضع کا ارادہ ظاہر کیا تو کامل نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"میم! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ایک تو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ناشتا کیا ہے، دوسرے مجھے کہیں جانا بھی ہے لہٰذا برائے مہربانی آپ مجھ سے وہ بات کریں جس کے لیے فون کر کے مجھے یہاں بلایا ہے۔"

"اوکے......!" تحسین فاطمہ نے معتدل انداز میں کہا اور اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔

وہ آدھے منٹ میں واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں دو لفافے دبے ہوئے تھے جن میں سے ایک "اے فور" سائز کا تھا جب کہ دوسرا "سی ڈی" والا مستطیل۔ مذکورہ دونوں لفافے کامل کی جانب بڑھاتے ہوئے تحسین فاطمہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ لفافے آج صبح کوئی ریسیپشن پر دے گیا تھا۔ چھوٹے لفافے پر میرا نام لکھا ہوا تھا اس لیے میں نے اسے کھول کر پڑھ لیا۔ بڑا لفافہ آپ کے نام ہے، اسے میں نے آپ کی امانت سمجھ کر بند ہی رہنے دیا ہے۔ ویسے چھوٹے لفافے کے مضمون میں مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ والے لفافے میں کیا بند ہے۔ آپ ان دونوں لفافوں کو کھول کر دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ ریسیپشن والا لالہ جیسے ہی مجھے یہ لفافے دے کر گیا، میں نے آپ کو فون کر دیا تھا۔"

تحسین فاطمہ کے لب و لہجے اور گفتگو کے انداز سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ کسی وضع دار، محترم اور معتبر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ناجیہ کو اس پر بھروسا تھا تو تحسین فاطمہ واقعتاً اس مقام کی حق دار تھی۔

کامل نے دونوں لفافوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان پر صرف مکتوب الیہ کے نام درج تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی عام یا خاص ڈاک سے نہیں آئے تھے۔ یہ ایک "بائی ڈیلیوری" تھی۔ ان لفافوں کو دیکھ کر کامل کے ذہن میں، چند روز پہلے والا وہ لفافہ تازہ ہوگیا جس کے اندر سے ایک سفید رومال برآمد ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کے پاپا غفار داؤدا اور ان کے دوست سرمد صدیقی کو قتل کروانے کے بعد اس رومال کے ذریعے امن، دوستی اور خیر سگالی کا خاموش پیغام بھجوایا تھا۔ اگر کسی کو سفاکی، درندگی، سنگ دلی، بے شرمی اور کمینگی کا کوئی شاہ کار دیکھنے کا شوق ہو تو وہ دجال کے کسی بھی پیروکار سے ملاقات کرلے۔ یہ سارے خصائلِ خبیثہ ایک ہی ذاتِ غلیظہ میں نظر آجائیں گے۔ یہ کوئی سنی سنائی یا پڑھی بتائی پر مبنی رائے نہیں ہے بلکہ اس دعوے کو راقم الحروف کا ذاتی تجربہ جانیں......!

چھوٹے لفافے کے اندر سے جو پرچہ نکلا، اس کا مضمون کچھ اس طرح تھا...... "تحسین فاطمہ! بڑے لفافے میں اس اپارٹمنٹ کے تمام اوریجنل ڈاکیومینٹس اور کامل صاحب کے نام کا پاور آف اٹارنی رکھا ہوا ہے۔ کامل صاحب میرے بڑے بھائی کی جگہ ہیں۔ میں اس خط کے آخر میں ان کا رابطہ نمبر بھی لکھ رہی ہوں۔ آپ نے یہ لفافہ بہ حفاظت کامل بھائی تک پہنچانا ہے۔ باقی جہاں تک اپارٹمنٹ کے کرائے کا معاملہ ہے تو وہ آپ نے میرے اکاؤنٹ میں نہیں، بلکہ اپنے پاس جمع کرنا ہے۔ کامل بھائی کو جب بھی فرصت ملے گی، وہ اپنے کسی بندے کو بھیج کر

اماؤنٹ کلیکٹ کرلیا کریں گے...... خیر اندیش، ناجیہ!''

کامل نے تحسین فاطمہ کے نام کا خط اسے واپس کرتے ہوئے مؤدب لہجے میں پوچھا۔ ''میم! کیا آپ نے میرا یہ نمبر اپنے سیل فون میں فیڈ کرلیا ہے یا پھر......!''

''نہیں...... میں نے اسی لیٹر کو سامنے رکھ کر آپ کو کال کی تھی۔'' کامل کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ابھی میں نے اسے سیو نہیں کیا۔''

''اچھی بات ہے۔'' کامل نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس نمبر کو اعداد و غلط جان کر اس لیٹر، اپنی یادداشت اور سیل فون میں سے ڈیلیٹ کردیں۔ تھوڑی دیر میں، میں آپ کو اپنا ریگولر نمبر سینڈ کردوں گا۔ آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ان شاء اللہ! پھر ملاقات ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''اب میں چلوں گا......''

''آپ میرے پاس پہلی مرتبہ آئے ہیں اور کچھ کھائے پیے بغیر جارہے ہیں......'' تحسین فاطمہ نے خفت آمیز اضطراری لہجے میں کہا۔ ''مجھے کچھ ٹھیک محسوس نہیں ہورہا......!''

''پھر کبھی سہی...... ان شاء اللہ!'' کامل نے شائستہ انداز میں کہا۔ ''فی الحال میں جلدی میں ہوں......''

''کم از کم اس ڈاکیومینٹس والے لفافے کو تو کھول کر دیکھ لیں......!''

''اس کی ضرورت نہیں ہے میم!'' کامل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ایک چھوٹی بہن نے اپنی بااعتماد دوست کے توسط سے، بڑے بھائی کو جو کچھ بھی دیا ہے، اسے کھول کر چیک کرنا مقدس، نازک اور حساس رشتوں کی توہین ہے......!''

کامل کی پنچ لائن نے گویا تحسین فاطمہ کے حواس پر حیرت و استعجاب کا پہاڑ اوندھا ڈال دیا تھا......!

کامل اس ہائی رائز بلڈنگ سے باہر نکلا تو اس کی سوچ میں ڈیوڈ کے نام کی منحوس گونج تھی۔ اس شیطان نے نہ صرف غفار داؤد اور سرمد صدیقی کی زندگیوں کے چراغ گل کرائے تھے بلکہ وہ شادمان ٹاؤن والے بنگلے پر ٹوٹنے والی خون ریز قیامت کا بھی (کامل کے مطابق) ذمے دار تھا۔ اس اندوہ ناک واقعے میں اگرچہ کامل نے بھی دل کھول کر اپنے مخالفین کا صفایا کیا تھا لیکن عتیق اور اعجاز جیسے جاں نثار دوستوں اور وفادار محافظ رستم کی موت کا صدمہ اسے رہ، رہ کر یاد آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل و دماغ میں نفرت، انتقام اور منہ توڑ جواب دینے کی خواہش ایک بپھرے ہوئے چیختے! چنگھاڑتے درندے کا روپ دھار لیتی تھی۔ اس کی نیت، ڈیوڈ اور اس کے دجالی سیٹ اپ کی ایسی کم تیسی کرنے کے لیے مچل مچل جاتی تھی۔

انہی گھائل اور منتقم خیالات کی گردش نے اس کے اندر نیم خوابیدہ وحشی حیوان کو جھنجھوڑ کر بیدار کردیا۔ اس نے بڑے عزم سے ایک فیصلہ کیا...... ڈیوڈ کی ''چیر پھاڑ'' کا فیصلہ۔ جب کسی وحشی درندے کو جھنجھوڑ کر جگایا جائے تو توڑنا، پھوڑنا اور بھنبھوڑنا لازم ٹھہرتا ہے۔

جاسم کی زبانی اس نے ''بگ ہیلتھ اسپا'' کی کہانی سن رکھی تھی اور ڈیوڈ سے اس کا خفیہ تعلق بھی کامل کے علم میں تھا۔ ازیں علاوہ چند روز قبل ڈیوڈ کا گونگے چٹھی رساں والا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ کامل کے ایک بااعتماد ساتھی عتیق مرحوم نے اس گونگے کا تعاقب کر کے یہ پتا چلالیا تھا کہ اس کی نال بھی اسی اسپا کے اندر دبی ہوئی تھی۔ ناجیہ نے بھی اپنے اس شک کا اظہار کیا تھا کہ جو بندہ اس پر خفیہ نظر رکھے ہوئے تھا، اسے اس نے ان لوگوں کے درمیان دیکھا تھا جنہوں نے ڈیوڈ کے حکم پر اسے اغوا کرلیا تھا تاکہ جاسم کو دباؤ میں لاکر ری ایلیٹی ٹی وی پروگرام کا حصہ بنایا جاسکے گا۔ کل ملا کر نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ساری بغل بچہ گلیاں گھوم پھر کر ایک ہی چوراہے پر نکلتی تھیں اور اس چوراہے کا نام تھا...... ڈیوڈ!

کامل نے اس ''چوراہے'' کو ''چوبارے'' پر چڑھانے کا تہیہ کرنے کے بعد ایس پی احسان الحق کو فون لگایا۔ تیسری گھنٹی پر اس کی کال اٹینڈ کرلی گئی۔ ایس پی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''ہاں بھئی! کیا خبریں ہیں؟''

''سر! پولیس ڈیپارٹمنٹ کا مورال بلند کرنا چاہتا ہوں۔'' کامل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''فون پر بات کرنا محفوظ نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے اپنے پندرہ بیس قیمتی منٹ دے سکتے ہیں؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' ایس پی نے پوچھا۔

''سی ویو کی طرف......'' کامل نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''سر! کیا آپ کافی پسند کرتے ہیں؟''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اس وقت درخشاں آیا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہاں سے نکلوں گا۔ بتاؤ، کہاں کافی پلارہے ہو؟''

''ہائپر اسٹار میں......!''

''او کے...... میں سمجھ گیا، تمہارے ذہن میں کون سا

سٹنگ پوائنٹ ہے۔'' ایس پی نے معتدل انداز میں کہا۔

''میں آرہا ہوں......''

لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں، نیم تاریک اور پُرسکون ماحول والی ایک خوش ذائقہ کافی شاپ میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایس پی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارے رازدارانہ انداز کو دیکھ کر لگتا ہے کہ معاملہ خاصا سنگین اور سیریس ہے!''

''آپ کا اندازہ درست ہے سر!'' کامل نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے میں آپ کو تفصیلات سے آگاہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس آپریشن کی حکمتِ عملی پر بات ہوگی۔''

''ٹھیک ہے!'' ایس پی نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ آیندہ پندرہ منٹ میں کامل نے احسان الحق کو اپنے منصوبے کی بریفنگ دے دی اور اس بیان کے آخر میں کہا۔

''سر! جاسم اور دجالی تنظیم کے مابین جاری جنگ کے بارے میں آپ کو میں نے آج صبح کھل کر بتا دیا تھا۔ ڈیوڈ اسی ابلیسی تنظیم کا ایک اہم مہرہ ہے اور وہ مقامی جرائم پیشہ افراد کی مدد سے کراچی کا نیٹ ورک آپریٹ کررہا ہے۔ میں نے جس ہیلتھ اسپا کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کی لوکیشن بھی آپ کو سینڈ کردی ہے......''

''ہاں!'' کامل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایس پی نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''تمہاری بھیجی ہوئی لوکیشن مجھے مل گئی ہے۔''

''میرے شادمان ٹاؤن والے بنگلے پر گزشتہ روز جو خونیں کھیلا گیا، اس کے لیے میں ایک فیصد شعیب چاچا اور ننانوے فیصد ڈیوڈ کو ذمّے دار سمجھتا ہوں۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ڈیوڈ کی دشمنی جاسم سے ہے۔ جب جاسم اسے جوتا مار کر نکل گیا تو اس نے مُعاندت کا رخ جاسم کے قریبی لوگوں کی طرف پھیر دیا ہے اور میں چپ بیٹھنے والا نہیں ہوں......!''

''تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟'' ایس پی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہارے کسی انتقامی کارنامے سے پولیس کا مورال کیسے بلند ہوگا......؟''

''میں نے آج رات ایک 'مڈ نائٹ وینچر' کے بارے میں سوچا ہے سر!'' کامل نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ''بلکہ یہ میرا اور آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا ''جوائنٹ وینچر'' ہوگا۔ میں اس اسپا کے اندر اور آپ کی تیار کردہ ٹیم اسپا کے باہر۔ میں اندر کا کام نمٹانے کے بعد باہر موجود ٹیم کے لیڈر سے رابطہ کروں گا۔ وہ لوگ اندر آکر اپنا کام نمٹالیں گے۔ میرا نام کہیں نہیں آئے گا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ''واہ وا'' ہوجائے گی۔ ایک بات تو طے ہے کہ اس اسپا کے اندر ڈیوڈ تو ہمارے ہاتھ نہیں لگے گا مگر میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں سے پولیس کو اتنا کچھ مل جائے گا کہ آیندہ کئی روز تک پرنٹ، الیکٹرونک اور سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ تذکرہ آپ ہی کے ڈیپارٹمنٹ کا ہوگا۔ میں آپ کو سورس لائن بھی بتا دیتا ہوں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔

''کوئی شب بیدار راہ گیر مذکورہ اسپا کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس نے اسپا والے بنگلے کے اندر فائرنگ کی آواز سنی۔ اس شخص نے نزدیک سے گزرنے والی ایک پٹرولنگ موبائل کو اس کے بارے میں بتایا۔ پولیس نے اس بنگلے پر چھاپا مارا اور بلاہ، بلاہ، بلاہ......!''

''کہانی تو اچھی ہے لیکن اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ تم پولیس والوں کو نہایت ہی نکما سمجھتے ہو......!'' ایس پی نے تیکھی نظر سے کامل کی طرف دیکھا۔

''ایسی بات نہیں ہے سر!'' کامل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا بہت احترام کرتا ہوں۔''

''جن کا احترام کیا جاتا ہے انہیں گھر کے باہر نہیں کھڑا کیا کرتے......'' ایس پی نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جب تم اس آپریشن کو ''جوائنٹ وینچر'' کہتے ہو تو پھر پولیس کے جوان تمہارے ساتھ اس بنگلے کے اندر کیوں نہیں جاسکتے؟''

''سر! میں آپ کا پوائنٹ سمجھ رہا ہوں مگر اپنا پوائنٹ آپ کو سمجھا نہیں پارہا ہوں......'' کامل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اسی لیے ہم ایک پیج پر نہیں آپارہے ہیں۔ شاید اس کا سبب، ہمارے کام کرنے کے انداز میں فرق ہے۔ کوئی بات نہیں سر۔ اس معاملے کو یہیں پر ٹھپ دیتے ہیں۔ ویسے آپ نے صبح مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا......!''

کامل کی شاکی نظر کے جواب میں ایس پی نے ترنت پوچھا۔ ''تم کس وعدے کی بات کررہے ہو؟''

''مجھے فری ہینڈ دینے کا وعدہ......!''

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔'' ایس پی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں یہ بھی نہیں بھولا ہوں کہ اس وعدے کے ساتھ ہی تمہاری کڑی سرویلینس کی شرط بھی جڑی ہوئی تھی!''

''میں نے اپنی سرویلینس سے کب منع کیا ہے سر!'' کامل نے کہا۔ ''اسپا کے اندر اپنے اکیلے جانے کی بات میں نے ایک خاص مقصد سے کی ہے۔''

''اور وہ خاص مقصد کیا ہے؟'' ایس پی چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''میں سب جاننا چاہتا ہوں۔''

''بات بہت سیدھی اور سامنے کی ہے سر!'' کامل نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''آج کل تو ایک پان، سگریٹ اور پھل و سبزی فروش نے بھی اپنی دکان میں سیکیورٹی کیمراز لگا رکھے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں، پورے کراچی میں پھیلے ہوئے طاغوتی نیٹ ورک کو آپریٹ کرنے والے ڈیوڈ کے آدمی کیا ان حفاظتی تدابیر سے غافل ہوں گے؟ ہرگز نہیں......!'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے چند لمحات کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس ہیلتھ اسپا والا بنگلا اندر اور باہر سے پوری طرح بگ ہوگا...... مطلب، آڈیو اور وڈیو دونوں قسم کی ریکارڈنگ کا بندوبست...... اور ڈیوڈ کے لوگ کسی کنٹرول روم میں بیٹھ کر ہر غیر معمولی جنبش کو نوٹ کر رہے ہوں گے۔ ایسے میں، میں اکیلا تو کسی بھی بہانے اسپا کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن اگر مجھے پولیس کی معیت بھی حاصل ہوئی تو یہ کام بہت مشکل ہو جائے گا بلکہ یہ مشن شروع کرنے سے پہلے ہی ناکام یاب ہو سکتا ہے۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ پولیس کو اندر جانے میں کسی دقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ کبھی بھی پولیس کے سامنے مزاحمت نہیں کریں گے لیکن اس صورت میں میری ریڈ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ ہمیں ان مجرموں کے خلاف جو بھی مواد چاہیے، وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکے گا۔ امید ہے، آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے سر......!

''تمہارا منصوبہ دم دار ہے کامل!'' ایس پی نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ، تم نے اپنے ذہن میں کیا حکمت عملی تیار کر رکھی ہے؟''

''اس ہیلتھ اسپا کے سامنے ایک بنگلے میں ''بزنس مینجمنٹ'' سکھانے اور پڑھانے والا ایک معروف انسٹیٹیوٹ ہے۔ مذکورہ بنگلے کی دیوار کے ساتھ آخری حصے میں اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے کیوں کہ وہاں درختوں کی بہتات ہے اور اس طرف اسٹریٹ لائٹس کا مناسب بندوبست نہیں ہے۔'' کامل نے ایس پی احسان الحق کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں اپنے ایک معتمدِ خاص شاکر علی کے ساتھ لگ بھگ پونے گیارہ بجے اس تاریک مقام پر پہنچ جاؤں گا جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ اسپا کا اسٹاف گیارہ بجے آف کر کے وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد مین گیٹ پر ایک مسلح سیکورٹی گارڈ رہ جاتا ہے۔ اسپا کے اندرونی حصے میں ڈیوڈ کے کتنے لوگ موجود ہوں گے، ان کی تعداد کے بارے میں، میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں البتہ، اس اسپا کے اندرونی معاملات سے نمٹنے کی آپ کو یقین دہانی ضرور کروا سکتا ہوں!'' لمحاتی توقف کر کے کامل نے ایک متعدل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میری بلیک منی پجیرو، درختوں کے ''سائے'' تلے پارک ہوگی اور شاکر علی جیپ کے اندر موجود رہے گا۔ وہ دراصل میرا بیک اَپ ہے۔ بنگلے میں مجھے اکیلے ہی داخل ہونا ہے۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں، شاکر علی میری مدد کرنے کے لیے ریڈ الرٹ رہے گا۔ اسپا کے ریگولر اسٹاف کے جانے کے بعد میں مناسب موقع دیکھ کر اندر گھس جاؤں گا۔ اس کے بعد کے حالات تو اندر جا کر ہی پتا چلیں گے۔ آپ اس آپریشن کے لیے پولیس کی جو بھی ٹیم ترتیب دیں گے، اس کے لیڈر کو اسپا کے نزدیک ہی رہ کر میری کال کا انتظار کرنا ہوگا......!''

''ٹھیک ہو گیا......!'' ایس پی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جاننا چاہوں گا کہ اس خطرناک ایڈونچر کے لیے تمہیں کس قسم کے اسلحے کی ضرورت ہوگی؟''

''آئی ایم سوری سر......!''

''سوری کا کیا مطلب ہے؟'' ایس پی نے اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا......!''

''سر! میں کسی بھی مشن میں، کسی بھی قسم کا کوئی ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔'' کامل نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''البتہ میرا ساتھی شاکر علی، منی پجیرو کے اندر پوری طرح مسلح ہوگا۔''

''کامل! تم قدم، قدم پر مجھے متاثر کر رہے ہو......!'' ایس پی نے توصیفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا کبھی تم نے پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن کرنے کے بارے میں سوچا...... اس ڈیپارٹمنٹ کو تمہارے جیسے نڈر اور پُرعزم

افراد کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے......!''

''سر! یونیفارم کے اندر انسان کے ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اس کا دماغ بھی ہزار ہا پابندیوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات کا دائرہ سکڑ جاتا ہے اور تعیلات کا میدان تاحدِ نگاہ پھیل جاتا ہے اور...... میں ٹھہرا پیدائشی آزادہ رو اور آزاد منش۔ سو، یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا اس لیے کبھی اس طرف میرا دھیان نہیں گیا۔''

ایس پی نے کامل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''اور یونیفارم کے بغیر......؟''

''آج رات وہی تو کرنے جا رہا ہوں سر......!'' کامل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اگر یہ سنگت مجھے راس آ گئی تو اس سلسلے کو آگے بھی بڑھایا جاسکتا ہے!''

''آئی ہوپ سو......!'' ایس پی نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے اس تجربے کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا۔ تم بہت کام کے آدمی ہو......!''

کامل نے ایس پی کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ''کافی وِدھ ایس پی'' کا سیشن ختم ہو گیا۔

☆☆☆

کامل طبعاً ایک مہم جو انسان تھا۔ اس پر مرحوم مراد علی کی کڑی حربی تربیت نے اسے مہم جوئی کے راستے میں آنے والی ہر قسم کی چھوٹی بڑی مشکلات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کر دیا تھا۔ مراد دادا تو اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا لیکن اس کی تربیت، کامل کے وجود میں رچ بس کر جاوید ہو گئی تھی۔ دادا کے سکھائے سارے داؤ پیچ اور گُر اس کی یادداشت میں محفوظ تھے۔ دادا نے کامل کو ایک خاص قسم کی پھکی (سفوف) کا نسخہ بھی تفویض کیا تھا۔ دراصل تین چیزوں...... اینٹی سلیپنگ، اینٹی وینم اور ڈیلٹا کورٹف کو ہم وزن لے کر تیار کیا جانے والا ایک سفوف تھا جس کا استعمال انسان کو مختلف نوعیت کی سمیات اور مضرات سے محفوظ رکھتا تھا۔ کامل جب بھی کسی مشن پر روانہ ہوتا تھا تو ایک گھنٹا پہلے وہ اس پھکی کی مخصوص مقدار نیم گرم پانی کے ساتھ لے لیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ یہ ''خوراک'' لینا نہیں بھولا تھا۔

''کنگ ہیلتھ اسپا'' کا اسٹاف رخصت ہوا تو کامل ''ایکشن'' کے لیے تیار ہو گیا۔ شاکر علی کو ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ منی پجیرو سے باہر نکل آیا اور محتاط روی سے اسپا کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ اس نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ اسپا کے گیٹ کے نزدیک موجود کلاشنکوف بردار سیکیورٹی گارڈ کو یہ اندازہ نہ ہو کہ وہ کس طرف سے آیا تھا۔

''السلام علیکم!'' گارڈ کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''یہ اسپا کب بند ہوا؟''

''صاحب! یہ تو روزانہ رات گیارہ بجے بند ہو جاتا ہے۔'' گارڈ نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد بتایا۔ ''اب تو سارے لوگ جا چکے۔ آپ کل دن میں گیارہ بجے آنا اور اپنا کام کروالینا......''

''کنگ'' درحقیقت ''میل اور فیمیل'' دونوں کی ضروریات کو پورا کرنے والا اسپا تھا جس کے اسٹاف میں حسین و جمیل خواتین اور کسرتی بدن کے مالک وجیہہ حضرات شامل تھے۔ یہاں پر درجن بھر خدمات فراہم اور مہیا کی جاتی تھیں جن میں پیڈی کیور، مینی کیور، فیشل اور کئی طرح کے گفتنی و ناگفتنی مساج بھی شامل تھے!

''میں اس طرح کے کسی کام کی غرض سے یہاں نہیں آیا ہوں۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا نام کامل ہے۔ میں جاسم کا دوست ہوں۔ مجھے ڈیوڈ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

کامل نے اپنی آواز کو قدرے بلند رکھا تھا تاکہ سیکیورٹی کیمراز کے علاوہ اگر کہیں حساس مائک بھی نصب ہوں تو اس کی بات اندر موجود لوگوں تک بہ آسانی پہنچ جائے۔

''یہاں پر ڈیوڈ نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔'' گارڈ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''جو لوگ ادھر کام کرتے ہیں، وہ سب بھی جا چکے۔ دیکھ رہے ہو نا...... یہ گیٹ بند ہے اور اب میں بھی بنگلے کے اندرونی حصے میں جا رہا ہوں۔''

''میں نے کب کہا کہ ڈیوڈ اس بنگلے میں رہتا ہے۔'' کامل نے گارڈ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈیوڈ تو ایک نادیدہ قوت ہے جسے کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے ملاقات کر سکتا ہے۔ میں تو ڈیوڈ کے بندوں سے ملنے آیا ہوں جو اس وقت بنگلے کے اندر موجود ہیں۔ میں انہیں جاسم کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں......''

اگر انسان حاضر دماغ رہ کر ڈھنگ سے چال چلے تو اسے کامیابی ضرور ملتی ہے۔ کامل کی آزمائی ہوئی یہ ترکیب صد فیصد بار آور ثابت ہوئی تھی۔ اِدھر اس کی بات ختم ہوئی، اُدھر اس کی سماعت میں سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نئے سیل فون کو اس نے جیب کے اندر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت اس کی جیب میں ریگولر استعمال والا سیل فون تھا مگر ابھی گھنٹی کی

جو آواز سنائی دی تھی، وہ کامل کے نہیں، بلکہ اس گارڈ کے سیل فون کی تھی۔

"ہیلو سر......!" گارڈ نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔

دوسری جانب شکور تھا۔ "فدا حسین!" اس نے گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "اس بندے کو اندر آنے دو مگر اکیلے نہیں۔ میں زاہد کو ریسپشن پر بھیج رہا ہوں۔"

"او کے سر...... ٹھیک ہے سر......!" گارڈ نے فرماں برداری سے کہا۔

کامل، دوسری طرف بولنے والے شخص کی آواز کو سن نہیں سکا تھا لیکن اس کا مشاہداتی تجربہ بتاتا تھا کہ اس کی کوشش رنگ لے آئی تھی۔ گارڈ نے معتدل انداز میں کہا۔

"آپ دو منٹ رکو۔ میں آپ کو اندر بھیجتا ہوں۔"

"یہ اسی بندے کا فون تھا نا، میں جس سے ملنے آیا ہوں......!" کامل نے گارڈ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ "میں جانتا تھا، وہ بنگلے کے اندر موجود ہے۔"

گارڈ نے کامل کی بات پر غور کرنے کے بجائے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "صاحب...... میں تو حکم کا غلام ہوں۔ مجھ سے جو کہا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرنا ہی میری ڈیوٹی ہے۔ میں تو اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں...... بس!"

"تم حکم کے غلام ہو اسی لیے بلا سوچے سمجھے حکم کے بادشاہ کی خدمت میں لگے رہتے ہو۔" کامل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "حکم کے بادشاہ کی بغل میں حکم کی بیگم بھی ہوتی ہے۔ کیا کبھی تمہاری اس سے ملاقات ہوئی۔ میرا مطلب ہے، بلیک کوئین سے......؟"

کامل نے وقت گزاری کے لیے جو لطیف مذاق کیا تھا، وہ کسی پیچیدہ پہیلی کے مانند گارڈ کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ قبل اس کے کہ سیکورٹی گارڈ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہتا، بنگلے کا گیٹ کھلا اور ایک درمیانے قد کے نصف گنجے، سانولے شخص نے باہر جھانکا۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی کامل نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی نقلی گونگا تھا جو چند روز پہلے ڈیوڈ کا، سفید رومال والا لفافہ لے کر ناجیہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا۔ اس واقعے کے وقت کامل استنبول میں جاسم کے ساتھ شعیب چاچا والے "انقلابی" مشن میں مصروف تھا۔ کراچی آتے ہی اس نے ناجیہ والی ہائی رائز اپارٹمنٹس بلڈنگ کے سی سی ٹی وی کیمراز کی ریکارڈنگ کو چیک کیا تھا اور اس نقلی گونگے کے قد کاٹھ اور شکل کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا تاہم کامل کو اپنے حواس اور اعصاب پر کامل قابو تھا۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے!

ہاف گنجے نے محتاط انداز سے دائیں بائیں دیکھا پھر کامل کی طرف چہرہ گھما کر سپاٹ آواز میں کہا۔

"آجاؤ......!"

کامل اس کے پیچھے چل دیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے گیٹ بند کر کے اندر سے لاک کیا اور ریسپشن والے پورشن میں ایک کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ اے کے فورٹی سیون (کلاشنکوف) پر اس کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس خطرناک گن کو بے دریغ استعمال کر سکتا تھا۔ کامل نے گارڈ کی خطرناکی کو نظر انداز کیا اور "گونگے" کی تقلید میں ریسپشن والے کورڈ ایریا سے نکل کر کھلی فضا میں آ گیا۔

رِنگ ہیلتھ اسپا کم و بیش دو ہزار مربع گز رقبے والے بنگلے کے اندر واقع تھا۔ ریسپشن والے حصے کے آگے ایک کشادہ گراسی لان تھا۔ اس کے بعد اصل عمارت شروع ہوتی تھی جہاں مختلف کمروں اور ہالز وغیرہ میں متمول لیڈیز اینڈ جینٹلمین کی خوب صورتی اور آسودگی کا مکمل بندوبست تھا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص تو اس اسپا کے اندر قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے چونچلوں کا کیڑا اسی وقت انسان کے دماغ میں کلبلاتا ہے جب اس کے والٹ کے اندر کرنسی نوٹوں کے بجائے کریڈٹ کارڈز ایک لائن سے سجے ہوں۔

ڈیوڈ کے خط کے جواب میں جاسم اس ہیلتھ اسپا کے ریسپشن سے آگے نہیں بڑھ پایا تھا کیونکہ ریسپشنسٹ شیبا نے شعبۂ مساج کی ان چارج میڈم صوفیہ سے پوچھ کر اسے بتا دیا تھا کہ کسی ڈیوڈ کا اس ہیلتھ اسپا سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن یہ قصہ اب پرانا ہو چکا تھا اور اس وقت معاملات خطرناک مرحلے میں داخل ہو چکے تھے......!

کامل کے اندازے کے عین مطابق، وہ بنگلا پوری طرح سیکیورٹی کیمراز کی آنکھوں کے سامنے عیاں تھا۔ گویا...... کیمرے کی آنکھ سب کچھ دیکھ رہی تھی کیونکہ وہاں پر ہونے والی تمام مکروہ سرگرمیاں خبیث الاخبث یک چشم دجال کے ابلیسی عزائم کی نمائندگی کرتی تھیں۔

گراسی لان کے پہلو میں، پختہ روش پر چلتے ہوئے کامل نے مصنوعی گونگے سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

''زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بس، اپنے کام سے کام رکھو......!''

''او کے غصیلے بھائی صاحب!'' کامل نے مزاح کے انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''تم نے اپنی زبان کا آپریشن کب کرایا؟''

''کک...... کیا مطلب......؟'' وہ یکا یک رک گیا اور حیرت آمیز اُلجھن سے کامل کو تکنے لگا۔

کامل نے اُس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتے استعجاب کو مرتسم و منجمد کرنے کی غرض سے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک ہنگامی فیصلہ کیا۔ اس کا دایاں ہاتھ بجلی کی سرعت سے حرکت میں آیا اور کھلی ہتھیلی کی ایک مہلک چوپ حیران و پریشان نقلی گونگے کی گردن کے ایک مخصوص حصے پر پڑی۔

مدِمقابل نصف ٹکلا حلق سے ''اُوں'' تک کی آواز نکالے بغیر اناج سے بھری ہوئی کسی بوری کے مانند ''دھپ'' سے پختہ ٹریک پر گرا اور گرتے ہی اتنا عقیل ہوگیا۔ دو گھنٹے سے پہلے اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہاں، البتہ...... صورِاسرافیل اسے وقت سے پہلے بیدار کرسکتا تھا۔

''تم نے دیکھا......!'' کنٹرول روم میں موجود منصور نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اس بدبخت نے ہمارے ساتھی پر حملہ کرکے اسے بے ہوش کردیا ہے۔ مجھے اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے!''

''ہم کون سے یہاں ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائے بیٹھے ہیں......!'' منصور کے ساتھی شکور نے زہرخند لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم پہلے اس کی بے خبری میں خاص انجکشن کا استعمال کریں گے۔ جب وہ بے ہوش ہوجائے گا، اس کے بعد سوچیں گے، آگے کیا کرنا ہے......!''

اور پھر کامل جیسے ہی اسپا کے اندرونی حصے میں داخل ہوا، تاریکی میں چھپے ہوئے شکور نے اس کی گردن میں ایک انجکشن ٹھوک دیا اور کامل لڑکھڑا کر زمین بوس ہوگیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کامل کو دشمنوں کی طرف سے ایسے کسی بزدلانہ اوچھے وار کی امید نہیں تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ ایسی کسی بھی صورتِ حالات کے لیے پوری طرح تیار ہوکر آیا تھا۔

کامل کے بدن میں اترنے والی سریع الاثر خواب آور دوا نے اسے فوری طور پر بے ہوش تو کردیا تھا لیکن اس کے خون میں موجود چمت کارک پھکی کے دافع البلیات و سمیات اثرات نے چشم زدن میں اپنا کام شروع کردیا تھا۔ پھکی کے تینوں عناصر نے بھرپور کام کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں، ٹھیک پانچ منٹ کے بعد کامل کے حواس بحال ہوگئے۔

ان پانچ منٹ میں، کامل کی بے ہوشی کے دوران میں وہ لوگ ڈنڈا ڈولی کرکے اسے ایک کشادہ ہال میں لے آئے تھے اور کسی فضول شے کے مانند اس کے بے حس و حرکت جسم کو بے دردی سے فرش پر پھینک دیا تھا۔ کامل کے حواسِ خمسہ نے جب کام کرنا شروع کیا تو اس کی سماعت میں ایک غصیلی آواز نے حاضری دی۔ کوئی بدتمیز شخص فون پر کسی کو خوف ناک دھمکیاں دے رہا تھا۔ جب اس کی گفتگو میں کامل، جاسم اور استنبولی بڈھے جیسے نام شامل ہوئے تو صورتِ حالات کامل پر عیاں ہوگئی۔ وہ اگرچہ ہوش میں آچکا تھا لیکن اپنے دشمنوں کے عزائم سے کماحقہ، آگاہی حاصل کرنے کی غرض سے وہ بے ہوشی کا ناٹک کرتے ہوئے بے سدھ فرش پر پڑا رہا تھا۔

کامل کی یہ ترکیب خاصی سودمند ثابت ہوئی۔ اسے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ شکور نے اسی کے سیل فون سے طلال حسنی کو کال کرکے جاسم کے تبادلے کی بات کی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ منصور اور شکور ڈیوڈ کے ایک خاص بندے حاتم سے احکامات لیتے تھے۔ حاتم ان دونوں کے لیے باس کی حیثیت رکھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ شکور ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ استنبول فون کرنے والا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک کامل کی جان کو ان دونوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اور یہ مہلت اس کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ وہ بے ہوشی کی اداکاری کرتے ہوئے کسی موقع کا منتظر تھا...... اس کی مراد اس وقت برآئی جب شکور اپنی گن منصور کو تھما کر واش روم کی طرف چلا گیا۔ کسی ایکشن کے لیے یہ بڑے سنہری لمحات تھے۔

کامل نے محتاط انداز میں اپنی آنکھوں کو نیم وا کرکے گردوپیش کے ماحول کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ کا ٹارگٹ دراصل گن بردار منصور تھا جو اس سے محض تین فٹ کے فاصلے پر، ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں ضرور تھی مگر اس نے کامل کو اپنے نشانے پر نہیں لے رکھا تھا۔ شاید کسی بے ہوش شخص کی جانب سے اسے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہورہا تھا اور یہی اس کی بھول تھی۔

''تمہارے ساتھی نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے

منصور!'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس گن کے اندر خالی کلپ ہے......!''

منصور نے چونک کر کامل کی طرف دیکھا۔ کامل اپنا ڈائیلاگ بولنے کے بعد پہلے کی طرح بے حس وحرکت ہو گیا تھا۔ منصور نے ٹٹولنے والی نظر سے کامل کو گھورا اور پھر خود کلامی والے انداز میں بڑبڑایا۔

''یہ تو مُردوں کی طرح فرش پر پڑا ہے۔ شاید میرے کان بج رہے ہیں۔ شکور مجھ سے دھوکا کیوں کرے گا؟''

کامل نے منصور کے دماغ میں شک کا بیج بو دیا تھا لہٰذا وہ سوچے بنا نہ رہ سکا۔ ''مجھے گن کے میگزین کو چیک کرنا چاہیے......'' اس نے مذکورہ گن کو تھپتھپایا۔ ''ویسے ہی کافی ہلکی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، میرے کان نہ بجے ہوں......شکور واقعتاً میگزین میں گولیاں بھرنا بھول گیا ہو اور میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہو......!''

کامل بظاہر مندی آنکھوں کے ''بیچ'' میں سے منصور کے چہرے کے تاثرات کا ''جائزہ'' لے رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کا ڈائیلاگ ضرور اثر دکھائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ منصور نے کامل کی طرف سے توجہ ہٹا کر گن کا کلپ باہر نکال لیا اور اگلے ہی لمحے وہاں کا ماحول بدل گیا۔

کامل نے کمر کے بل پر اپنی دونوں ٹانگوں کو، ہیلی کاپٹر کے پنکھے کے مانند ہوا میں حرکت دی اور ہینڈ اسپرنگ لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے اور منصور کے درمیان محض دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ منصور نے کلپ کو گن سے باہر نکال لیا تھا چنانچہ وہ کامل پر فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ کامل نے اسے سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کا بالکل موقع نہیں دیا اور ایک زوردار کک اس کے کندھے پر رسید کر دی۔

یہ ایک سائڈ پش کک تھی۔ منصور گن سمیت پیچھے کو الٹ گیا اور وہ بینچ بھی جہیز کی طرح اس کے ساتھ ہی ''گئی'' تھی لہٰذا پہلے منصور اور بینچ کا تصادم ہوا، اس کے بعد وہ دونوں ہال کے چکنے فرش سے ٹکرا کر دور تک پھسلتے چلے گئے۔ اس ڈبل ٹکراؤ نے رات کے سناٹے میں اچھی خاصی آواز پیدا کر دی تھی اور یہ آواز، واش روم میں موجود شکور تک نہ پہنچے، یہ ممکن نہیں تھا۔

''منصور! یہ کیسی آواز تھی؟'' شکور نے اپنے ''ماحول'' کے اصولوں کی پروا کیے بغیر تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم ٹھیک تو ہو......کیا کامل ابھی تک بے ہوش ہے؟''

ان اضطراری سوالات کے جوابات دینے کے لیے منصور کا ہوش و حواس میں ہونا ضروری تھا مگر اس کا بدن تو ہنگامی طور پر، اسکیٹ بورڈ کے بغیر ہی ''اسکیٹنگ'' کرتے ہوئے نہ صرف سامنے والی دیوار کے نزدیک پہنچ چکا تھا بلکہ اس کا سر مذکورہ دیوار کو ایک خوف ناک ٹکر بھی ''رسید'' کر بیٹھا تھا اور اس گستاخی پر دیوار نے اسے جو ''رسید'' دی تھی، اس نے منصور کی مت مار دی تھی۔ وہ فرش پر پڑا دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے، تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

قبل اس کے کہ منصور کی یہ لاغر سی کراہیں، واش روم میں بیٹھے شکور تک پہنچ کر اسے باہر کی گڑبڑی سے آگاہ کر دیتیں، کامل بجلی کی سی تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور اپنے ہیوی بوٹ کی ایک طوفانی ٹھوکر اس کی ناک پر رسید کر دی۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ڈکرانے لگا۔

کامل، منصور کی ایسی ہی دردناک چیخیں شکور تک پہنچانا چاہتا تھا تاکہ وہ بیرونی حالات کو ہلکا نہ لے اور ہلکا ہوئے بغیر ہی واش روم سے باہر نکل آئے۔

کامل کی چال کامیاب رہی۔ واش روم کے اندر فلش ٹینک کی مخصوص گڑگڑاہٹ ابھری۔ پانی کے آوازدار بہاؤ کے ساتھ ہی شکور کا استفسار بھی سنائی دیا۔

''لگتا ہے، اس کمینے کو وقت سے پہلے ہوش آ گیا ہے۔ تم اتنی زور سے چیخ کیوں رہے ہو۔ کیا کامل نے تم پر حملہ کر دیا ہے......؟''

کامل نے شکور کے ساتھ منصور کو جواب دینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا اور گن کا بھرا ہوا کلپ فرش سے اٹھا کر دور پھینکنے کے بعد وہ اس واش روم کے دروازے کے نزدیک پہنچ گیا جس کی دوسری طرف شکور، باہر آنے کے لیے بے تاب تھا۔

''ہاں شکور......!'' منصور نے اذیت بھری آواز میں جواب دیا۔ ''یہ منحوس ہماری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک ہے......!''

''تم فکر نہیں کرو......'' شکور نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اس کی ساری خطرناکی ناک کے راستے نکال دوں گا۔''

بات کے اختتام پر شکور نے ایک جھٹکے سے واش روم کا دروازہ... کھول دیا۔ اپنے سامنے کامل کو تن کر کھڑے ہوئے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ کامل نے اسے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی اور اگلے ہی لمحے اس کا پنچ شکور کی ناک پر پڑا۔ کامل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کا

کرارا ٹمکا کھانے کے بعد شکور نے جیسے ہی اپنے ہاتھ بے ساختہ ناک کی جانب بڑھائے، کامل نے اس کے سینے پر فرنٹ کک رسید کردی۔

شکور کی ناک پر کامل نے جو قیامت ڈھائی تھی، اس نے شکور کو حواس باختہ کردیا تھا لہٰذا وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ کامل کی کک نے اسے ایسا پش دیا کہ وہ توپ کے دہانے سے نکلے ہوئے گولے کے مانند ریورس گیئر میں "سفر" کرتے ہوئے پشت کے بل کموڈ سے جاٹکرایا۔ شکور کا یہ معکوسی سفر انگلش کا سفر (Suffer) ثابت ہوا۔ سنگی کموڈ کے ساتھ اس کی تشریفِ خبیثہ کا تصادم ایسا خوف ناک اور دردناک تھا کہ وہ بڑے بھیانک انداز میں، حلق کے بل چلّانے لگا۔

جس بند ہال میں یہ معرکۂ حق و باطل جاری تھا، وہ ریسپشن والے حصے سے کافی دور تھا چنانچہ "یہاں" والی کارروائی کی آوازیں "وہاں" تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھیں۔

کامل نے اس کے چہرے کو مرکز بنا کر اپنے ہاتھ اور پاؤں کے پرکار سے ایسی ایسی قوس اور دائرے بنائے کہ جیومیٹری کی دنیا میں لہورنگ اضافہ ہوگیا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں شکور کے چہرے کا جغرافیہ تبدیل ہو چکا تھا۔ جب وہ خون آلود صورت کے ساتھ بری طرح ہانپنے لگا تو کامل نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"میرا اسیل فون کہاں ہے؟"

شاید وہ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے کٹے پھٹے ہونٹوں سے لہو جاری تھا۔ اس نے توتلی زبان میں کچھ کہا اور ساتھ ہی اپنی پتلون کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی کردیا۔

کامل نے فوراً سے پیش تر اس کی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ گھما کر دو سیل فونز برآمد کرلیے اور یہ دیکھ کر اس کی طبیعت مکدر ہوگئی کہ دونوں سیل فونز کے ڈبلے کا حشر نشر ہو چکا تھا۔ ان میں سے ایک کامل کا اور دوسرا شکور کا فون تھا۔

کامل نے دونوں فونز۔۔۔ اپنی جیب میں رکھنے کے بعد واش روم کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر جھانکا تا کہ یہ جان سکے کہ منصور کی طرف کیا حالات تھے۔ منصور اس مقام پر موجود نہیں تھا جہاں اس کے سر نے سنگی دیوار کو "بوسہ" دیا تھا۔

یہ ایک تشویش ناک صورتِ حالات تھی۔ شکور کی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ اس کی طرف سے کسی گڑبڑ کی توقع کی جاسکے۔ کامل نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور واش روم سے باہر نکل آیا اور تبھی منصور اس کی نگاہ میں آگیا۔

جس دوران میں کامل، شکور کو جاں گسل منازل سے گزار رہا تھا، منصور اپنی تکلیف کو فراموش کرکے اس گن کے قریب پہنچ گیا تھا جو غیر ارادی "اسکیٹنگ" کرتے وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری تھی۔ کامل نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے مذکورہ گن کے کلپ کو دور پھینک دیا تھا۔ اس وقت وہ خالی گن منصور کے ہاتھ میں تھی اور وہ میگزین کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا رہا تھا۔ گن، کلپ (میگزین) کے بغیر اور کلپ، گن کے بغیر کسی پیپر ویٹ سے زیادہ حیثیت کے حامل نہیں اسی لیے منصور کلپ کو گن سے "ملوانا" چاہتا تھا تا کہ وہ دونوں "صاحبِ حیثیت" ہوجائیں!

کامل بلّی کے مانند دبے پاؤں چلتے ہوئے منصور کے عقب میں پہنچ گیا۔ منصور کو کلپ کی اتنی شدت سے تلاش تھی کہ وہ اپنی اس ضرورت کو لے کر گردوپیش سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ وہ کلپ تو اسے کہیں دکھائی نہ دیا البتہ ایک سپاٹ آواز نے اس کے درِ سماعت پر دستک دی۔

"کیا تم اِسے ڈھونڈ رہے ہو......؟"

منصور نے بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اسے رات میں سورج نظر آگیا۔ کامل نے اس کی دریدہ اور پچکی ہوئی ناک کو دوبارہ نشانہ بناتے ہوئے ایک راؤنڈ ہاؤس کک متاثرہ مقام پر جڑ دی۔

منصور کے دونوں ہاتھ یکایک اس کے چہرے کی جانب اٹھے مگر قبل اس کے کہ وہ ہاتھ گھائل ناک کی مزاج پرسی کرتے، کامل نے ایک طویل اسٹیپ لے کر، اس کی کمر پر سائڈ کک رسید کردی۔ کامل کا یہ وار اتنا طوفانی تھا کہ منصور اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے قدم ڈگمگائے اور زمین بوس ہونے کے بعد وہ بے ترتیب انداز میں لڑھکتے ہوئے واش روم کے کھلے دروازے کے انتہائی پاس پہنچ گیا۔

کامل نے شانوں سے تھام کر اسے اٹھایا اور دونوں ہاتھوں کے پش کے ذریعے اسے شکور کے اوپر پھینک دیا۔ شکور کی حالت منصور سے کہیں زیادہ بری تھی۔ وہ اس افتاد پر کوئی صدائے احتجاج بھی بلند نہ کرسکا۔ البتہ، کامل کی اس "خاطر داری" پر منصور نے بڑا عامیانہ اور واہیات ردِعمل ظاہر کیا۔ شکور نے جیسے ہی اسے "گود" لیا، اس کے منہ سے مغلظات کا گٹر اُبل پڑا تھا۔

کامل نے منصور کی غلیظ زبان کو لگام دینے کے لیے

چند نسخہ جات آزمائے پھر نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
''تم دونوں، تمہارا پرائی ویٹ باپ حاتم اور اس کا ناجائز داداڈیوڈ..... اسی قابل ہو کہ کسی بیت الخلا کے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مجھ سے زندگی کی بھیک مانگتے رہو۔ ڈیوڈ کے معاملے میں تو میں ذرا سا بھی پگھلنے والا نہیں لیکن اگر تم مجھ سے تعاون کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں تمہاری جاں بخشی کی درخواست رد نہیں کروں گا۔''

شکور اور منصور کوئی مٹی کے مادھو نہیں تھے۔ وہ جرائم پیشہ لوگ تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آج تک کامل جیسے کسی چیتا صفت مدِمقابل سے ان کا پالا نہیں پڑا تھا۔ اس بھیانک تجربے نے انہیں باور کرادیا تھا کہ یہ بندہ کسی بھی قیمت پر ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا چنانچہ جب کامل نے ان کی معافی کی درخواست کو قبول کرنے کا عندیہ دیا تو پہلے انہیں کامل کی بات پر یقین نہیں آیا اور جب یقین آگیا تو وہ اپنی زندگی کے عوض کامل سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

آیندہ چند منٹ میں انہوں نے کامل کے بیش تر سوالات کے جوابات دے دیے۔ جو باتیں انہیں معلوم نہیں تھیں، ان کے لیے بڑی بڑی قسمیں کھا کر معذرت کرلی۔ سرِدست کامل کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ ان کے سچ اور جھوٹ کو الگ الگ پہچان سکے۔ بہرکیف، وہ ان کے تعاون سے، وہاں کے خفیہ ریکارڈ روم اور سی سی ٹی وی کے کمانڈ اینڈ کنٹرول روم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''ایک آخری بات.....!'' کامل نے شکور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ ''ابھی تم اپنے باس کو فون لگاؤ اور اس سے کہو کہ میں یعنی کامل، جاسم کے حوالے سے معلومات فراہم کرنے کے لیے راضی ہو گیا ہے لیکن اس کی شرط ہے کہ وہ صرف باس سے بات کرے گا۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت حاتم کو یہاں بلانا ہے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا.....؟''

شکور نے اثبات میں گردن ہلادی اور نقاہت بھرے پُراذیت لہجے میں کہا۔ ''میرا سیل فون تمہارے پاس ہے اور..... پتا نہیں، وہ استعمال کے قابل بھی ہے یا نہیں.....!''

کامل نے اپنی جیب سے شکور والا سیل فون نکال کر اس کا معائنہ کیا۔ اگرچہ اس کے سیل فون کے ڈھیلے کا سوا ستیاناس ہو چکا تھا تاہم تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ مذکورہ سیل فون آن کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''کوئی ہوشیاری نہیں شکور.....!'' کامل نے سیل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے تم دونوں سے جاں بخشی کا جو وعدہ کیا ہے، وہ تمہارے پُرخلوص اور دیانت دارانہ تعاون سے مشروط ہے۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو پھر میں بھی اپنے وعدے کو بھول جاؤں گا.....!

کامل نے اس اسپا میں گھس کر اپنا جنگ جُویانہ ''تعارف'' جس دھانسو اور دبنگ انداز میں کرایا تھا، اسے دیکھتے ہوئے شکور کسی مہم جوئی کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ سو، اس نے فوراً سے پیش تر کامل کے حکم کی تعمیل کردی۔

''حاتم کو یہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟'' کامل نے پوچھا۔

شکور نے بتایا۔ ''دس سے پندرہ منٹ۔ باس یہاں قریب ہی رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، حاتم کے آنے تک تم دونوں اسی واش روم میں رہو گے۔'' کامل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہارے باس سے میٹنگ کے بعد میں تمہیں آزاد کردوں گا۔''

کامل نے ان دونوں، زخموں سے چور، دجال کے غیر سرکاری ہرکاروں کو واش روم میں بند کرنے کے بعد پولیس ٹیم کے لیڈر، سب انسپکٹر دلاور کو فون کیا۔ رابطہ ہونے پر کامل نے کہا۔

''سر! بنگلے کے اندرونی حالات پوری طرح میرے قابو میں ہیں۔ میں نے دو مجرموں کو بری طرح زدوکوب کر کے واش روم میں بند کردیا ہے۔ ان کا سرغنہ حاتم دس سے پندرہ منٹ میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ آپ لوگ اسے گیٹ پر گرفتار کرلیں یا پھر اس کی آمد کے بعد بنگلے میں داخل ہوں، یہ سب آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ یہاں کے ریکارڈ روم اور سیکیورٹی کیمراز کی ریکارڈنگ میں آپ کو ان کے خلاف اتنا زیادہ مواد مل جائے گا کہ جس کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں اور نہ ہی تصور کرسکتے ہیں۔ دو مجرم زخمی حالت میں، واش روم کے اندر بند ہیں۔ ان کے تیسرے ساتھی کو میں نے صحن میں ''گہری نیند'' سلادیا ہے۔ یہاں کی واحد مزاحمت سیکیورٹی گارڈ ہے۔ اس کے پاس اے کے فورٹی سیون ہے.....!''

''تم نے جب سب کچھ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے تو میری بات دھیان سے سنو.....!'' سب انسپکٹر دلاور

نے شائستہ مگر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”اس مشن میں تم نے اپنے حصے کا کردار ادا کر دیا ہے۔ اب ہماری باری ہے۔ میں چار مستعد کمانڈوز کے ساتھ کافی دیر سے تمہاری کال کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ تم نے ہمارے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔ تمہارا بہت شکریہ۔ تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ باقی کے معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔“

سب انسپکٹر، کامل کو اس آپریشن سے الگ ہونے کے لیے ایسے کہہ رہا تھا جیسے دودھ میں گری مکھی کو نکال کر ایک طرف پھینک دیا جاتا ہے۔ سب انسپکٹر کے انداز سے کامل کو اپنی توہین کا احساس ہوا تاہم اس نے کسی قسم کی بحث یا تکرار سے اجتناب برتتے ہوئے معتدل انداز میں سوال کیا۔

”کیا ایس پی صاحب بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں خود کو اس معاملے سے الگ کر لوں؟“

”احسان الحق صاحب ہمارے سینئر آفیسر ہیں۔“ سب انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اُن کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ آپ ایک تجربہ کار اور سمجھ دار انسان ہو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا مسٹر کامل......!“

”ٹھیک ہو گیا سر! جو آپ کا...... میرا مطلب ہے، جو ایس پی صاحب کا حکم۔“ کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس آپریشن کو چھوڑ رہا ہوں۔ آپ لوگ اپنے حساب سے موو کرنے کے لیے آزاد ہو۔ میرے سیل فون کی ریکارڈنگ ایپ اس وقت آن ہے۔ ہمارے بیچ ہونے والی گفتگو کو میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ریکارڈ کر لیا ہے تا کہ کل کلاں ایس پی صاحب مجھے کوئی بزدل بھگوڑا نہ سمجھیں جو بیچ راستے میں مشن کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ ریکارڈنگ اس امر کا بھی ٹھوس ثبوت ہے کہ ایس پی صاحب نے مجھے فری ہینڈ دینے کی جو بات کی تھی، وہ کوئی ٹھوس حقیقت نہیں، بلکہ پانی کے بلبلے میں بند کوئی دیو مالائی افسانہ تھا...... آل دی بیسٹ!“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد کامل نے رابطہ منقطع کر دیا۔ ان لمحات میں اس کے دماغ کا درجہ حرارت کافی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے دو چار گہری سانسیں لے کر اندر کے غبار کو باہر پھینکا اور ریکارڈ روم کا رخ کیا۔

آئندہ دو منٹ میں اس نے اپنے مطلب اور ضرورت کی چند اہم ڈیجیٹل اور مینول ”چیزیں“ مذکورہ ریکارڈ روم سے ”پار“ کیں اور عقبی دیوار پھلانگ کر اس بنگلے سے باہر آ گیا۔

جب وہ اپنی منی پجیرو کی جانب بڑھ رہا تھا تو اس نے گگ ہیلتھ اسپا کے سامنے ایک پولیس موبائل کو رکتے دیکھا۔ سب انسپکٹر دلاور اپنے کمانڈوز کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ کامل اپنی جیپ میں سوار ہوا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مستعد شخص کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

”نکلو یہاں سے...... فوراً......“

شاکر علی نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

جب وہ لوگ جائے وقوعہ سے دو کلومیٹر دور نکل آئے تو کامل نے اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اسی فون سے سب انسپکٹر کو کال کی تھی۔ تباہ حال ڈسلے کے باوجود بھی فون نے بالکل ٹھیک کام کیا تھا مگر اب وہ بالکل ڈیڈ ہو چکا تھا۔ کئی بار کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنا نیا بیسک فون نکال لیا۔ وہ اپنے تمام اہم کانٹیکٹ نمبرز گزشتہ رات اس نئے سم کارڈ میں ٹرانسفر یعنی کاپی کر چکا تھا۔

کامل ہیلتھ اسپا والے بنگلے میں لگ بھگ گیارہ بج کر بیس منٹ پر داخل ہوا تھا اور جب اس نے شکور کو طلال حسنی سے فون پر بات کرتے سنا تو اس وقت ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ شکور نے مختلف قسم کی بکواسیات کے بعد حسنی سے کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد اسے دوبارہ فون کرے گا اور اب رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، گویا شکور کی دی ہوئی ایک گھنٹے کی مہلت پوری ہو گئی تھی۔ یقیناً طلال حسنی بے چینی سے شکور کی کال کا انتظار کر رہا ہو گا۔

”شاکر! اپنا فون مجھے دو......!“ کامل نے نئے فون میں سے حسنی کا کانٹیکٹ نمبر نکالنے کے بعد اپنے ساتھی سے کہا۔

”جی بھائی!......“ شاکر نے فرمانبرداری سے کہا اور اپنا سیل فون کامل کے حوالے کر دیا۔

کامل نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نیا کانٹیکٹ نمبر عام ہو اس لیے اس نے شاکر کے فون سے طلال حسنی کو کال کی۔ وہ تو ابھی تک اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ اس کا نیا نمبر ناجیہ کے پاس کیسے پہنچ گیا تھا۔

پہلی ہی گھنٹی پر حسنی نے کال ریسیو کر لی۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کامل نے معتدل انداز میں کہا۔ ”سر! میں کامل...... بہ خیر و عافیت...... اپنی پریشانی کو فل اسٹاپ لگا دیں، ابھی کے ابھی۔“

''مائی سن! تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ ایک گھنٹا میں نے کس اذیت میں گزارا ہے۔'' حسنی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ بدتمیز مردود کون تھا جس نے تمہارے نمبر سے کال کر کے میری جان ہی نکال دی تھی؟''

''وہ جاسم کا ایک غلیظ اور بدبودار دشمن تھا۔ سو، وہ میرا بھی دشمن ٹھہرا۔'' کامل نے نپے تلے الفاظ میں جواب دیا۔ ''ایک معرکے میں وہ مجھ پر حاوی آ گیا تھا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔ میں نے اسے ایسا مزہ چکھایا ہے کہ پھر کبھی بھول کر بھی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔ اسی مارا ماری میں میرے سیل فون کا بھی کچومر نکل گیا ہے اسی لیے کسی دوست کے نمبر سے آپ کو کال کر رہا ہوں تاکہ آپ سکون کی نیند سو سکیں۔ ویسے آپ کا بیٹا کیسا ہے؟''

''میرے تین بیٹے ہیں۔ اسد، جاسم اور کامل۔'' حسنی نے جذبات سے لب ریز آواز میں جواب دیا۔ ''کامل سے میں اس وقت بات کر رہا ہوں، اسد برابر والے کمرے میں سو رہا ہے اور جاسم جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

''آمین!'' کامل نے تہِ دل سے کہا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''سر! میں کل کسی وقت آپ کو فون کروں گا۔ پھر تفصیلی بات ہوگی۔''

طلال حسنی کامل کو نشا صاحی کے ریسکیو اور راشد فیضی و لیلیٰ حسینی کے عبرت ناک انجام کے بارے میں بہت کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن وہ ایک دانا و بینا شخص تھا لہٰذا اس نے اس موضوع کو پھر کبھی کے لیے چھوڑا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''او کے مائی سن، میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔''

''تھینک یو سر اینڈ گڈ نائٹ۔''

اس کے بعد ان کے بیچ لاسلکی رابطہ موقوف ہو گیا۔

کامل صحیح معنوں میں ''رات کا راہی'' تھا۔ وہ رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتا تھا اور صبح سے کچھ دیر پہلے، دو ڈھائی گھنٹے کی نیند لے لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ مکمل طور پر چارج ہو جاتا تھا۔ دن میں اگر کبھی کسل محسوس ہوا تو وہ بیٹھے بیٹھے چند منٹ کی جھپکی لگا کر خود کو تر و تازہ کر لیا کرتا تھا۔ اس کی خوراک بھی مختصر مگر غذائیت سے بھرپور ہوا کرتی تھی۔ یہ تجربے سے ثابت ہے کہ کم کھانے والوں کو نیند بھی کم ہی آتی ہے۔

جب وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ بگ ہیلتھ اسپا والے واقعے نے اسے قدرے غیر مطمئن کر دیا تھا۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ فریش ہوا اور وہ لفافہ اٹھا لیا جو آج دن میں مسز تحسین فاطمہ نے ناجیہ والے اپارٹمنٹ میں اسے دیا تھا۔ ناجیہ کے خط کے مطابق، مذکورہ لفافے کے اندر اس اپارٹمنٹ کے اوریجنل ڈاکیومنٹس تھے۔ کامل مشن پر روانہ ہونے سے پہلے اس لفافے کو اپنی رہائش گاہ پر چھوڑ گیا تھا۔ تحسین فاطمہ کے سامنے اس نے لفافے کو کھولنا ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن اب اس نے اسی نیت سے وہ لفافہ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

لفافے کے اندر سے مذکورہ اپارٹمنٹ کے اوریجنل ڈاکیومنٹس کے علاوہ کامل کے نام کا ایک خط بھی برآمد ہوا۔ کامل نے ڈاکیومنٹس کو ایک طرف رکھ کر پہلے اس خط کو پڑھا۔ ناجیہ نے کامل کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''بھائی! میں نے یہ اپارٹمنٹ ''ماریا علیم الدین'' نامی ایک خاتون کو فروخت کر دیا ہے۔ آپ ڈاکیومنٹس کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ماریا علیم الدین کسی یورپی ملک میں رہتی ہیں۔ وہ جب بھی پاکستان آ کر آپ سے رابطہ کریں تو آپ نے یہ ڈاکیومنٹس ان کے حوالے کر دینا ہیں اور جب تک وہ کراچی نہیں آتیں، آپ نے مسز تحسین فاطمہ سے کرایہ لے کر اپنے پاس جمع کرتے رہنا ہے۔ ان پیسوں کا حساب ہم بعد میں کسی وقت کر لیں گے۔ امید ہے، آپ اس ذمے داری کو آسانی سے نباہ لیں گے۔ جلد ملاقات ہوگی...... ان شاءاللہ۔''

''ناممکن...... یہ نہیں ہو سکتا۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''ناجیہ کو یہاں سے گئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں اس نے یہ اپارٹمنٹ کیسے بیچ ڈالا اور وہ بھی یورپ میں رہنے والی کسی ماریا کو۔ اس پروسس میں تو وقت لگتا ہے۔ دونوں پارٹیوں کو رجسٹری آفس میں، رجسٹرار کے سامنے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی جھمیلے ہیں۔ میں تو ناجیہ کی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں......''

ایک فوری خیال کے تحت کامل نے ناجیہ کی چٹھی کو ایک طرف رکھا اور اپارٹمنٹ کے ڈاکیومنٹس کا بہ غور جائزہ لینے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ وہ دو طرح کے ڈاکیومنٹس تھے جن میں سے ایک پرانے یعنی ناجیہ غفار داؤد کے نام کے اور دوسرے نئے یعنی ماریا علیم الدین کے نام کے۔ دونوں قانونی دستاویزات کو دیکھ کر صاف سمجھ میں آ جاتا تھا کہ ناجیہ نے وہ اپارٹمنٹ ماریا کو فروخت کر دیا تھا اور سب سے حیران کن بات اس

اپارٹمنٹ کے حوالے سے تیار کی جانے والی سیل ڈیڈ اور رجسٹریشن کی تاریخوں کی تھی۔ اس وقت دو ہزار بیس کا مارچ چل رہا تھا جبکہ ان تمام ڈاکیومنٹس پر مئی دو ہزار تیئس کی تاریخیں پڑی ہوئی تھیں۔

کامل نے ایک ایک پیپر کو متعدد بار چیک کیا۔ مختلف مہروں اور اسٹیمپ پیپرز کا باریک بینی سے جائزہ لیا مگر نتائج میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی تبدیلی...... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کامل ایک عملی اور زود رس انسان تھا۔ اس معمے کو حل کرنے کے لیے جب اس نے اپنے دماغ پر زور ڈالا تو اس کی سوچ میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی یادداشت میں جاسم کی ایک پُراسرار خیر خواہ ایشتار کا نام چمک اٹھا۔

''ہاں...... یہ سب اسی نے کیا ہوگا۔'' کامل نے خود کلامی کی۔ ''جاسم نے ایشتار کی ذات کے حوالے سے جو ناقابلِ یقین قصے سنائے ہیں، اگر انہیں سچ مان لیا جائے تو ابھی میں جو کچھ بھی حیرت انگیز اور عقل سے ماورا دیکھ رہا ہوں، ایسا کارنامہ ایشتار ہی انجام دے سکتی ہے خصوصاً میرا نیا سیل نمبر...... یہ کانٹیکٹ نمبر تو میں نے کسی کو بھی نہیں دیا، پھر تحسین فاطمہ کو موصول ہونے والے خط میں کیونکر آ گیا......؟''

کامل کا ذہن بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچا تھا۔ یہ سب ایشتار ہی کا کیا دھرا تھا۔ مریخ پر شفٹ ہونے سے پہلے وہ کچھ ایسے کام بھی کر گئی تھی جو آنے والے دنوں میں ناجیہ اور جاسم کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔ یہ ڈاکیومنٹس اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

کامل نے ان اہم دستاویزات کو اپنی رہائش گاہ کے ایک خفیہ مقام پر، ناجیہ بہ الفاظ دیگر ماریا کی امانت کی حیثیت سے محفوظ کیا اور بیڈ پر لیٹ کر آج دن بھر کی مصروفیات خصوصاً ''آپریشن رِنگ ہیلتھ اسپا'' کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس تلخ اور تکلیف دہ سوچ بچار میں چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے ایس پی احسان الحق کو کال کرنے کا خیال آ گیا۔ جب وہ اسپا سے باہر نکلا تھا تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود سے ایس پی کو کانٹیکٹ نہیں کرے گا۔ یہ اس بدمزگی بلکہ برہمی کا نتیجہ تھا جو اسے مشن سے الگ ہو جانے پر محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال اس کا اپنا ریگولر فون تو فی الحال کسی کام کا نہیں رہا تھا چنانچہ وہ نئے بیسک سیل فون سے نمبر نکال کر شاکر والے سیل فون سے اپنا کام چلا رہا تھا۔

ایس پی احسان الحق کے لیے اگرچہ کسی اجنبی نمبر سے کال آئی تھی، اس کے باوجود بھی رات کے تین بجے اس نے کال پک کر لی۔

''ہیلو...... کون بول رہا ہے؟'' اس کی مخصوص آواز کامل کی سماعت سے ٹکرائی۔

''سر! میں کامل بات کر رہا ہوں۔'' کامل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''سوچا، آپریشن کی کامیابی پر آپ کو مبارک باد ہی دے دوں۔ آپ اتنی رات گئے جاگ رہے ہیں، یقیناً آج کی کارروائی کا جشن منا رہے ہوں گے؟''

''تو کیا تم نے میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے فون کیا ہے......'' ایس پی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''پچھلے دو گھنٹے سے میں مسلسل تمہارا نمبر ٹرائی کر رہا ہوں۔''

''سر! پہلی بات تو یہ کہ اس معرکے میں سب سے زیادہ ''چوٹیں'' میرے سیل فون کو آئی ہیں۔ سرِدست وہ کسی کام کے قابل نہیں رہا۔'' کامل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''دوسری بات میں آپ کا دشمن نہیں ہوں جو آپ کی کسی پریشانی پر مجھے خوشی ہو۔ پلیز بتائیں آخر ہوا کیا ہے، آپ کی باتوں سے مجھے کسی بڑی گڑبڑ کی بُو آ رہی ہے سر......!''

''کوئی ایسی ویسی گڑبڑ......'' ایس پی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہیں مشن سے الگ کرنا ہماری غلطی تھی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا۔''

''آخر ایسا کیا ہو گیا سر...... جو آپ اتنی مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں؟'' کامل نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''پلیز...... کچھ تو بتائیں نا؟''

''تم شکور اور منصور کو زخمی حالت میں، واش روم میں بند کر کے بنگلے سے نکل گئے تھے۔'' ایس پی جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ان کے ایک ساتھی زاہد کو تم بے ہوشی کی حالت میں لان میں چھوڑ آئے تھے لیکن ہماری بدقسمتی کہ دلاور کے بنگلے کے اندر داخل ہونے سے پہلے سیکیورٹی گارڈ فدا حسین کو ریسپشن سے نکل کر بنگلے کے اندرونی حصے میں جانے کا خیال آ گیا اور اسی وقت اس نے بے ہوش پڑے زاہد کو دیکھ لیا۔ اس نے زاہد کو بیدار کیا، پھر وہ دونوں شکور اور منصور کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے ان دونوں زخمیوں کو واش روم سے باہر نکالا اور قبل اس کے کہ دلاور اپنے کمانڈوز کے ہمراہ اس بنگلے پر ریڈ کرتا، وہاں کا نقشہ ہی بدل گیا......'' ایس پی نے اپنی پھولی ہوئی سانس کو ہموار کرنے کی غرض سے توقف کیا

پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں، ان کم بختوں نے کس کو فون کھڑکایا تھا کہ اگلے ہی لمحے دلاور کے نمبر پر ایک سینئر پولیس آفیسر کی کال آئی اور اس سے پوچھا کہ وہ آپریشن کس کے کہنے پر کیا جارہا ہے۔ دلاور نے میرا نام لے دیا۔ اس کے بعد میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"احسان الحق!" مجھ سے کہیں سینئر آفیسر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اس آپریشن کو فوراً روک دو اور اپنے بندوں سے کہو کہ وہاں سے چلے جائیں۔ یہ بڑا ہائی پروفائل معاملہ ہے۔ تم بالکل اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ لوگ کون ہیں اور ان کی پہنچ کہاں تک ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس واقعے کو اپنی یادداشت سے مٹا ڈالو۔"

"اور آپ نے کہا ہوگا......" کامل کی طنزیہ آواز ایس پی کے کانوں میں گونجی۔ "او کے سر......یس سر......"

"ہمیں یہی بتایا اور سکھایا جاتا ہے کہ پہلے اپنے سینئر کے حکم کی تعمیل کرو۔ اس کے بعد اپنی شکایت کو بیان کرو۔" ایس پی نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ "فرسٹ اوبے، دین کمپلین!"

"اس اصول سے میں بھی واقف ہوں سر۔" کامل نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اس طرح کا اصول صرف پولیس ہی میں نہیں، بلکہ تمام عسکری شعبوں میں رائج ہے۔ میں کوئی سخت بات کہہ کر آپ کے دکھ کو بڑھانا نہیں چاہتا سر لیکن یہ بات تو اچھی طرح آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ عوام، پولیس پر بھروسا کیوں نہیں کرتے۔ وہ اس ڈپارٹمنٹ سے اتنا زیادہ بدظن کیوں ہیں؟"

"آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو......؟" وہ چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "اس کا حالیہ واقعے سے کیا لینا دینا......؟"

"سر! دنیا کے تمام مہذب معاشروں میں، جرائم کی روک تھام کے لیے پولیس ڈپارٹمنٹ سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر ایک خصوصی پروگرام چلاتا ہے جو "نیبر ہُڈ واچ" کہلاتا ہے جس کے حیرت انگیز نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں۔" کامل نے شائستہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہمارے ہاں تو سول سوسائٹی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔"

"میں نیبر ہُڈ واچ کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور تمہاری شکایت کو بھی سمجھ رہا ہوں۔" ایس پی نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "ان حساس اور دل جلانے والے موضوعات پر ہم پھر کبھی کھل کر بات کریں گے۔ فی الحال تمہارے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ چند روز کے لیے تم انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ......"

"یعنی میں زیر زمین چلا جاؤں۔" کامل نے حد درجہ تلخ لہجے میں کہا۔ "گویا، میں اپنے ہاتھوں سے خود کو دفن کر لوں......؟"

"کامل!" ایس پی نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں سلامت اور محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تھینک یو سر! میں آپ کی صلاح پر غور کروں گا۔" کامل نے سرسری انداز میں کہا۔ "میرے سیل فون کی بیٹری جارہی ہے۔ کل دن میں بات کریں گے۔"

کامل نے سیل فون آف کر کے چارجنگ پر لگایا اور آنکھیں بند کر کے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے جاسم کا چہرہ اس کے تصور میں روشن ہوگیا۔ اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر جاسم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جگر! دجال کے ان رذیل مریدوں کو صرف تم ہی مندوے سکتے ہو۔ آئی پراؤڈ آف یو مائی ڈیئر فرینڈ......"

کامل کو ایسا محسوس ہوا، جاسم نے اس کے دوستانہ جذبات کا جواب دیا ہو......ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ......!

☆☆☆

جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نرم و ملائم اور گداز بستر پر پایا۔ یہ آیل آف مین کے دارالحکومت "ڈگلس" میں واقع ایک شاندار ہوٹل "ریجنسی" کا کمرا تھا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے تھے اور یہ یکم اکتوبر دو ہزار تیئس کا دن تھا۔ سکھی بھاجی (سکھ وندر سنگھ) کا "رمتا جوگی" تو اک پل میں صدیاں بتی آیا تھا کیونکہ اس نے ساری مدھوشالا اپنے اندر اتار رکھی تھی لیکن جاسم کا معاملہ "رمتا جوگی" سے بالکل الگ تھا۔ جاسم تیاگی تھا، نہ بیراگی اور نہ ہی اس کے پاس کوئی ایسی شے تھی جسے گٹک کر وہ رمتا جوگی کا مقابلہ کرتا۔ سو، وہ ایک پل میں اگر تین سال گزار آیا تھا تو یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

بیدار ہونے سے پہلے کے چند مناظر اس کی یادداشت میں محفوظ تھے مگر وہ تین سال پہلے کا زمانہ تھا۔ وہ تبوک کے ہوٹل مینا میں اپنے دشمنوں کی ایسی کم تیسی کر کے ایسا نکلا تھا کہ پھر اس کی آنکھ، تبوک کے مضافات میں واقع نارنجی کوہی سلسلے "الزیتا" میں کھلی تھی جہاں اس کی ملاقات لینا، اس کے دادا ابوزیان اور اِشمار سے ہوئی تھی۔ ابوزیان

کے ایما پر ایشتار اسے اپنے ساتھ ایک دور اُفتادہ کشادہ کمرے میں لے گئی تھی۔ وہ سنگی کمرا بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا بابوتیپل کا سنگی کمرا جہاں ایشتار نے جاسم کو گہری نیند سلانے کے بعد اس پر کوئی جادوئی عمل کیا تھا۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا، پہلی مرتبہ سے بھی کہیں بڑھ کر......!

اور......وہ سب ہوگیا جس کے بارے میں جاسم نے صرف ایشتار کی زبان سے سنا تھا۔ وہ سنسنی خیز اور حیرت آمیز تجربہ جو جاسم کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ ایشتار نے اپنے سحری کمالات کے ذریعے اسے ٹائم ڈائلیشن کے عمل سے گزار کر، اس کی بے خبری میں، دو ہزار بیس سے دو ہزار تیئیس میں پہنچا دیا تھا۔ جاسم کی یہ بے خبری ایک پل کی تھی یا پھر پورے تین سال کی، اس کے بارے میں وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس کے احساس کی مدت صرف ایک لمحہ تھی یا اس سے بھی کچھ کم وقت لگا ہوگا۔ وہ ایش کی معیت اور سنگت میں الزیتاموتین کے ایک ٹھنڈے ٹھار سنگی کمرے میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ آیل آف مین (ڈگلس) کے ایک ہوٹل کے آرام دہ کمرے کے عالی شان بستر پر دراز تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ خود کو نہایت ہی تروتازہ اور چاق چوبند محسوس کر رہا تھا۔ صبح کے چھ بجے تھے۔ درجہ حرارت دس اور پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہا ہوگا۔ اس نے ایک طویل اور بدن توڑ انگڑائی لی۔ اسی وقت اس کی نظر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے ایک بریف کیس پر پڑی۔ اس نے مذکورہ بریف کیس کو کھول لیا۔

بریف کیس کے اندر اس کا پاسپورٹ، آئی ڈی کارڈ، ائرلائنز کے ٹکٹ، ڈالرز اور پاؤنڈ اسٹرلنگ کی شکل میں ایک معقول رقم اور چند دیگر کاغذات جن میں اس ہوٹل کی ریزرویشن کے علاوہ ایک لفافہ بھی موجود تھا۔ جاسم نے سب سے پہلے وہ لفافہ کھول لیا۔

مذکورہ لفافے کے اندر سے دو کاغذ برآمد ہوئے جن میں ایک چھوٹا سا اور دوسرا بڑا تھا۔ چھوٹے کاغذ پر مختلف مقامات کے جی پی ایس کوآرڈی نیٹس درج تھے جن میں ڈگلس، کاسل ٹاؤن، جیمس ٹاؤن، لندن، ہاؤسٹن ریجنسی اور یروشلم کی لوکیشن وغیرہ شامل تھیں۔ اس نے چھوٹے کاغذ کو ایک طرف رکھ کر بڑا کاغذ اٹھا لیا۔ یہ ایک طویل تحریر تھی۔ جاسم کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا۔ آغاز کچھ اس طرح کیا گیا تھا۔

"اس خط کو پڑھنے کے بعد ضائع کر دینا۔ بریف کیس کے اندر موجود تمام چیزیں تمہاری ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ ٹیلی پورٹیشن کی سائنس سے واقف ہو جانے کے بعد تمہیں کہیں بھی آنے جانے کے لیے پاسپورٹ، ویزا، ہوائی سفر وغیرہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے لیکن کسی ہنگامی صورت حال کے لیے ان ڈاکیومنٹس کا تمہارے پاس ہونا ضروری ہے تاکہ کوئی تم پر یعنی ٹیلی پورٹیشن کی ٹیکنیک کے حوالے سے شک نہ کرے اور تمہیں ایک عام نارمل انسان سمجھا جائے جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک کا سفر کرنے کے لیے ان بنیادی چیزوں کی لازمی ضرورت ہوتی ہے۔

"بریف کیس میں رکھی دستاویزات کے مطابق، تمہارا نام ثوبان قاسم ہے۔ تم ایک اسرائیلی مسلمان ہو، بہ الفاظ دیگر ایک فلسطینی مسلمان۔ تمہارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ رشتے داروں میں صرف ایک دادا زندہ ہے جس کا نام زین باقر ہے۔ زین باقر اولڈ یروشلم میں فروٹ اینڈ جوس کی ایک دکان چلاتا ہے اور تم اسی کے ساتھ رہتے ہو۔ زین باقر اگرچہ تمہارا حقیقی دادا نہیں ہے مگر مجبوری کا نام شکریہ کے مصداق تمہیں کام چلانا پڑے گا۔ اس کام میں تم اپنے دادا کا ہاتھ بٹاتے ہو۔ آج کل تم آیل آف مین کے تفریحی دورے پر آئے ہوئے ہو۔ ہوٹل ریجنسی میں تمہارا تین دن کا اسٹے ہے۔ تم گزشتہ رات ہی یہاں چیک اِن ہوئے ہو۔ اس حوالے سے ضروری کاغذات بھی اسی بریف کیس میں موجود ہیں۔

"دجال کے چند اطاعت گزار مریدوں کو لے کر تمہارے دل ودماغ میں بہت زیادہ غم وغصہ بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ انہیں ختم کر دینے سے اس ابلیسی نیٹ ورک کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ وہ تو اس طاغوتی بساط کے پیادے ہیں لیکن دل کا غبار اور دماغ کا خمار بہت تنگ کرتے ہیں۔ یہ انسان کی سوچ کو کبھی بھی توازن میں نہیں رہنے دیتے۔ تمہارے آگے مشن کی ایک طویل قطار لگی ہوئی ہے اس لیے بھڑاس کا نکل جانا ہی ٹھیک ہے اور اس کے لیے تین دن کافی ہیں......!

"تمہاری صورت، فنگر پرنٹس، آئی ریٹینا اور دیگر چند معاملات میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں تاکہ تمہیں دشمنوں کی نظر بد سے بچایا جا سکے۔ وہ بھی ثوبان قاسم کو جاسم باری کی حیثیت سے پہچان نہیں سکیں گے۔ ایسے ہی پروسس سے گزارنے کے بعد ناجیہ کو بھی ماریا بنا دیا گیا ہے۔ تم

دونوں کے چہروں میں تمہاری اصلی شخصیت کی جھلک تو موجود ہے لیکن تم لوگ پہلے جیسے بالکل نہیں رہے ہو۔

"تم اپنے دادا ازین باقر کے ساتھ اولڈ یروشلم کے علاقے حارۃ المسلمین (مسلم کوارٹر) میں رہتے ہو۔ ایک فصیل کے اندر بند یروشلم کا یہ قدیم شہر چار بڑے حصوں میں بٹا ہوا ہے جنہیں مسلم کوارٹر، جوئش کوارٹر، کرسچین کوارٹر اور سب سے چھوٹا حصہ آرمینین کوارٹر۔ حارۃ المسلمین (مسلم کوارٹر) آبادی اور رقبے کے لحاظ سے، سب سے بڑا شمار کیا جاتا ہے۔ لائن گیٹ سے دمشق گیٹ تک پھیلے ہوئے ستتر ایکڑ قطعہ اراضی پر موجود مسلم کوارٹر میں کم وبیش بائیس ہزار مسلمان آباد ہیں۔ ڈوم آف راک (قبۃ الصخرہ) اور مسجدِ اقصیٰ بھی اسی علاقے میں واقع ہیں۔ یہ ساری تفصیلات تم تک پہنچانے کا ایک خاص مقصد ہے کیونکہ تمہارا دادا ازین باقر اس دستے کا ایک فعال رکن ہے جو یہودیوں کو تابوتِ سکینہ تک پہنچنے سے روکنے کے کام پر مامور ہے اور ظاہر ہے، تم اپنے "دادا" سے الگ تو نہیں ہو۔ جب تم جوس اینڈ فروٹ کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہو تو اس تنظیم مقصد سے آنکھیں بند کیسے کر سکتے ہو......؟

"حال ہی میں پتا چلا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کے نزدیک واقع ایک خستہ حال قدیم مکان کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ملبے کو اٹھانے کے ساتھ ہی کھدائی کا عمل بھی جاری ہے۔ یہاں پر کوئی نئی عمارت تعمیر کی جانے والی ہے جس کا مالک ایک کاروباری یہودی ہے۔ ان چار کوارٹر کے نام چار مختلف اقوام کے نام پر رکھنے کی وجۂ تسمیہ ان کی آبادی کی اکثریت ہے ورنہ ہر کوارٹر میں دوسری اقوام کے لوگ بھی آباد ہیں مگر آٹے میں نمک کے برابر۔ مسلم کوارٹر میں اِکّادُکّا یہودی بھی نظر آجاتے ہیں۔ جس مکان کو گرائے جانے کی بابت تمہیں بتایا گیا ہے اس کے حوالے سے ایک خطرناک اور سنسنی خیز خبر تمہارے دادا ازین باقر تک پہنچی ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ مکان کو مسمار کرنے کے بعد اس کی جگہ پر جو گہری کھدائی کی جارہی ہے، وہ دراصل ایک خفیہ سرنگ کی تیاری کا مذموم عمل ہے جو سیدھی مسجدِ اقصیٰ کے نیچے پہنچے گی۔ تمہیں بتایا جا چکا ہے کہ یہودیوں کے خیال میں تابوتِ سکینہ مسجدِ اقصیٰ کے نیچے واقع ایک سرنگ میں موجود ہے۔ وہ لوگ مسجدِ اقصیٰ کو شہید کر کے تابوتِ سکینہ تک رسائی حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کر چکے ہیں، صرف منصوبہ بندی کی حد تک کیونکہ فلسطینی مسلمان پوری چوکسی سے مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت کررہے ہیں لہٰذا یہودیوں کی کوئی ترکیب کارگر نہیں ہو پا رہی۔ اسی لیے......اب وہ اس مکان کو گرانے کے بعد تعمیرِ نو کی آڑ میں اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں اور انہیں روکنے والوں میں تمہارا دادا ازین باقر بھی شامل ہے۔

"تم پر کوئی پابندی یا دباؤ نہیں ہے لیکن ایک مسلمان ہونے کے ناتے اپنے فلسطینی مسلمان بھائیوں کی قربانیوں کے بارے میں ضرور سوچنا۔ مسلمان کسی بھی رنگ ونسل اور کسی بھی علاقے یا خطے سے تعلق رکھتا ہو، مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت اپنی جان کی حفاظت سے زیادہ اس پر لازم وواجب اور فرض ہے۔"

اس تحریر کے آخر میں راقم الحروف کا نام درج نہیں تھا۔ جاسم نے اس اہم پیغام کو نقارۂ فلک جانا اور کاغذ کے پرزے پرزے کر کے اسے کموڈ کے فلیش میں بہا دیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ دیوارگیر آئینے پر پڑی تو وہ اپنی صورت دیکھ کر مسکرا دیا۔ اگر اس کا کوئی بھائی ہوتا تو وہ یقیناً "اس" جاسم کے جیسا ہی دکھائی دیتا۔ ثوبان قاسم (جاسم) کے چہرے پر ہلکی داڑھی بڑی بھلی نظر آرہی تھی۔

واش روم سے باہر آکر اس نے وارڈروب کا جائزہ لیا۔ وہاں اس کے سائز کے کئی ایک آؤٹ فٹس ٹنگے ہوئے تھے۔ وارڈ روب کے زیریں حصے میں کئی طرح کے فٹ ویئرز بھی رکھے نظر آرہے تھے۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔

آئل آف مین کے اسی شہر ڈگلس کی "یو سی ایم" یونیورسٹی میں ناجیہ، ماریا کی حیثیت سے سوشل سائنسز میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ حساب کے مطابق، دو ہزار تیئس کے وسط میں اس کا تھیسس مکمل ہو جانا تھا اور اس وقت دو ہزار تیئس کا ماہ اکتوبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ ناجیہ کی رہائش کاسل ٹاؤن میں واقع ہوٹل جارج میں تھی۔ جاسم، ناجیہ سے ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا۔

"مجھے ناجیہ کے ہوٹل کی طرف اُڑان بھرنا چاہیے۔" اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ "نہیں، اس کی یونیورسٹی جانا ٹھیک رہے گا۔" اس آخری خیال نے اسے تذبذب میں ڈال دیا۔ "ہو سکتا ہے، وہ اپنے ہوٹل سے نکل آئی ہو اور ابھی یونیورسٹی بھی نہیں پہنچی ہو۔" چند لمحات کے اسی شش وپنج نے اسے ایک تیسری راہ دکھا دی۔ "ناجیہ سے لنچ پر ملاقات کرتا ہوں، پھر ہم ڈھیروں باتیں کریں گے۔ اس نے یہ تین سال میرے بغیر کیسے گزارے۔ میں اس سے ایک، ایک دن کی کہانی سنوں گا۔"

ایک فوری خیال کے تحت اس نے وارڈ روب کے نچلے حصے میں رکھے اپنے سفری بیگ کی تلاشی لی۔ پھر وہ بریف کیس کھول کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں سیل فون کا تصور اُبھرا تھا اور یہ اضطراری تلاش اسی سلسلے میں تھی لیکن تمام تر سامان کو ٹٹولنے کے باوجود بھی اسے کہیں اپنے سیل فون کی صورت دکھائی نہیں دی۔ شاید اس کے ذہن کے کسی حصے میں ناجیہ سے لاسلکی رابطہ کرنے کی خواہش اُبھری تھی حالانکہ اس کے پاس ناجیہ کا یہاں کا کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا مگر اس کی یہ لاشعوری بہ الفاظ دیگر غیر ارادی کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی تھی۔

اپنے سیل فون کو کہیں نہ پا کر اس کی یادداشت میں، ایشتار سے ہونے والی گفتگو کا ایک اہم حصہ تازہ ہو گیا۔ وہ عالم رویائے صادقہ میں، ایشتار کے ساتھ ڈوم آف راک (قبۃ الصخرہ) کے صحن میں موجود تھا۔ ان کے بیچ سیل فون کے استعمال پر بات چل نکلی تھی۔ ایشتار نے کڑے لہجے میں پوچھ لیا تھا۔

''کیا تم خاکی لوگ سیل فون اور دیگر گیجٹس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے؟''

''ایش! تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' جواب دینے کے بجائے جاسم نے الٹا سوال کر دیا تھا۔

''تمام گیجٹس، خصوصاً اسمارٹ سیل فون بہت خطرناک چیز ہے......'' ایشتار نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا تھا۔ ''میری ایک بات تم اپنے ذہن پر نقش کر لو...... یہ سیل فون ایک دن تمہیں کسی بڑی مصیبت میں ڈال دے گا۔''

عالم رویا... میں ایشتار کی یہ تنبیہ جاسم کے پلّے نہیں پڑی تھی لیکن جب مسٹر اولیور کی ٹیم نے کامل سے ہونے والی اس کی سیلولر گفتگو کو ٹریک اینڈ ٹریس کرنے کے بعد تبوک کے ہوٹل مینا میں اس پر مسلح یلغار کی تو ایشتار کا کہا ہوا ایک ایک لفظ نہ صرف اس کی سمجھ میں آ گیا بلکہ وہ اسمارٹ سیل فون کے استعمال کی ہولناکیوں سے بھی کماحقہ، آگاہ ہو گیا تھا۔

اپنے سامان میں سیل فون یا کسی اور گیجٹ کو نہ پا کر اسے ٹھیک ٹھاک احساس ہو گیا کہ ایشتار اس سے کیا چاہتی ہے۔ اس نے ممنوعہ اشیا میں کچی پیاز، بڑے کا گوشت کے ساتھ ہی سیل فون کا نام بھی شامل کر لیا۔

ایک ٹھوس اور حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اس نے بریف کیس میں رکھا ہوا چھوٹا پرچہ اٹھا لیا۔ مذکورہ کاغذ پر چند مقامات کے جی پی ایس، کوآرڈی نیٹس درج تھے جن میں سے دو جگہوں کے جی پی ایس کوآرڈی نیٹس کو بڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کیا گیا تھا یعنی...... پوائنٹ کے بعد فور ڈیسیملز تک فگر نظر آ رہا تھا۔ انہی دو خصوصی مقامات میں سے اس نے ایک کا انتخاب کر لیا۔

ان لمحات میں جاسم ایک ہیجانی اور دل خوش کن کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اب تک کے تمام نادیدہ سفر اس نے ایشتار کے توسط اور تعاون سے کیے تھے۔ اس وقت ایشتار، جاسم کے ساتھ نہیں تھی لیکن اس کی تعلیم کردہ سائنسی تیکنیک اس کی یادداشت میں محفوظ تھی اور...... اس کے عملی مظاہرے کا وقت آن پہنچا تھا۔

جاسم نے پرچے پر نگاہ جما کر، ٹیلی پورٹیشن سائنس کا پہلا قدم اٹھایا۔ ''زیرو فور پوائنٹ فور ایٹ تھری ایٹ تھری ڈگری ویسٹ اینڈ ففٹی فور پوائنٹ ون فائیو سیون سکس ڈگری نارتھ......'' اس کے بعد دوسرا قدم کچھ یوں اٹھا۔ ''زیرو فائیو پوائنٹ سیون ون نائن زیرو ڈگری ویسٹ اینڈ ففٹین پوائنٹ نائن ٹو فور نائن ڈگری ساؤتھ......!''

اپنے موجودہ اور مطلوبہ مقام کے جی پی ایس۔ کوآرڈی نیٹس اس نے زیرِ لب دہرائے تھے اور اب اس پروسس کا تیسرا اور آخری مرحلہ تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر آنکھیں بند کیں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بہ زبانِ خاموشی ''کی نوٹ'' کو بڑی احتیاط کے ساتھ دہرایا۔ ''ج عتی خلوم مطم عن فو اور!''

جاسم نے جب آنکھیں کھولیں تو وہ ہوٹل ریجینسی (ڈگلس/آئل آف مین) سے لیڈر ہل فورٹ (جیمس ٹاؤن/سینٹ ہیلینا) ٹیلی پورٹ ہو چکا تھا۔ ڈگلس اور جیمس ٹاؤن کے درمیان کم و بیش ساڑھے سات ہزار کلو میٹرز کا فضائی فاصلہ ہے اور اس سفر کے لیے کسی ہوائی جہاز کو بحر اوقیانوس کے اوپر مسلسل دس گھنٹے پرواز کرنا پڑتی ہے مگر جاسم نے یہ طویل مسافت ٹیلی پورٹیشن سائنس کی مہربانی سے پلک جھپکتے میں طے کر لی تھی۔

ڈگلس اور جیمس ٹاؤن کے میریڈئین (لانگچیوڈ یعنی طول البلد) میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ان دونوں مقامات کا مقامی معیاری وقت بھی ایک ہی جیسا ہے۔ گویا، جاسم کا ''ٹیک آف'' اور ''لینڈنگ'' ایک ہی وقت پر، دونوں ملکوں کی صبح میں عمل میں آئی تھی۔

اس کرۂ ارض پر ایک درجہ طول البلد کا فاصلہ چار منٹ کے برابر ہوتا ہے۔ ایک دن یعنی چوبیس گھنٹے میں یہ گلوب اپنی تین سو ساٹھ ڈگری (درجات) کا ایک چکر مکمل کر لیتا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمین پر رہنے

والے کسی بھی شخص کو اس گردشی حرکت کا احساس تک نہیں ہوتا۔

سینٹ ہیلینا کے مشرقی اُفق پر ابھی تک سورج نے اپنا دیدار نہیں کرایا تھا، تاہم سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ صبح کا سماں بہت سہانا، دل پذیر اور جاذب نظر تھا۔ جاسم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کا پہلا ہی تجربہ سنسنی خیز اور کامیاب رہا تھا۔ ایشتار کی محنت رنگ لے آئی تھی اور وہ اللہ کے فضل سے، آج کی تاریخ میں ٹیلی پورٹر بن گیا تھا اور اس وقت وہ لیڈرہل فورٹ کے اندر موجود تھا۔

لیڈرہل فورٹ تک رسائی کے بہ ظاہر دو ہی راستے تھے۔ ایک تھی لہراتی، بل کھاتی پتلی سی سڑک جو پہاڑی پر چڑھتی ہوئی دور سے ایسی نظر آتی تھی جیسے کسی مخروطی شے کے گرد موٹی سیاہ رسی لپیٹ دی گئی ہو۔ دوسرا راستہ "جیکب ز لیڈر" کہلاتا تھا یعنی جیکب کی سیڑھی۔ کچھ لوگ اسے آسمان کی سیڑھی بھی کہتے تھے کیونکہ اس کی طوالت اور بلندی ایسا سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ یہ کم و بیش چالیس ڈگری پر بنائی گئی چھ سو ننانوے سنگی اسٹیپس کی سیڑھی تھی جو جیمس ٹاؤن کے زیریں حصے سے سیدھی لیڈرہل فورٹ تک جاتی تھی۔ جیمس ٹاؤن سے پہاڑی قلعے تک اس کی لمبائی (ترچھا فاصلہ) ایک سو اٹھاسی میٹر یعنی چھ سو فٹ ہے۔ اس سیڑھی کا شمار انسان کے ہاتھ سے بنائے گئے عجائبات میں ہوتا ہے۔ مہم جو افراد جب جیمس ٹاؤن کا رخ کرتے ہیں تو وہ "جیکب ز لیڈر" پر چڑھ کر پرانے ریکارڈ توڑنے اور نئے ریکارڈ بنانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ تاہم انہیں فورٹ (قلعے) کے اسی حصے تک جانے کی اجازت ہے جہاں اس سیڑھی کا اختتام ہوتا ہے۔ سینٹ ہیلینا کے کیپٹل جیمس ٹاؤن کے حوالے سے یہ تفصیلات بلا مقصد بیان نہیں کی جا رہی۔ ماہرین ارضیات کے مطابق، زمین پر پائے جانے والے جنت نظیر مقامات میں "جیمس ٹاؤن" کا نام خاصا نمایاں ہے۔

سینٹ ہیلینا کی کُل آبادی صرف ساڑھے چار ہزار نفوس پر مشتمل ہے جن میں سے چودہ فیصد یعنی محض چھ سو تیس افراد جیمس ٹاؤن میں آباد ہیں۔ دو پہاڑیوں کے درمیان، ایک تنگ سی گھاٹی میں واقع لگ بھگ ایک میل لمبا یہ شہر، ارضی بہشت کا منہ بولتا اور آنکھوں دیکھا نمونہ ہے جہاں پر رہنے والے لوگوں کو اُوبر (UBER) سروس کے علاوہ اس دنیا میں پائی جانے والی زندگی کی ہر نعمت میسر ہے اور وہ بھی انتہائی معیاری اور صد فیصد خالص حالت......!

اس قسم کی باتیں سننے میں بہت بھلی مگر ناقابل یقین لگتی ہیں کیونکہ جو شے انسان کی خواہش کا حصہ تو ہو مگر ہزار کوشش کے باوجود بھی اسے حاصل نہ کر پائے تو ایسی چیز کا بیان عنقا اور خواب خواب سا محسوس ہوتا ہے۔

جاسم کی پُراسرار لینڈنگ (ظہور) لیڈرہل فورٹ کے اندرونی حصے میں ہوا تھا اور یہ سب ان تفصیلی جی پی ایس۔ کوآرڈی نیٹس کی بدولت ممکن ہوا تھا جو اس چھوٹے پرچے پر درج تھے۔ اگر وہ فگرز فور ڈیجٹ ڈیسیملو تک نہ لکھے ہوتے تو وہ اس فورٹ (قلعے) کے اندر نہیں بلکہ جیمس ٹاؤن کے کسی بھی مقام پر ظاہر ہو سکتا تھا۔ جاسم نے نادیدہ اُڑان بھرنے سے پہلے وہ کام کا پرچا اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

جاسم کے ماحول میں گہری تاریکی کا بسیرا تھا مگر یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ ایشتار کے چمت کارک آئی ڈراپس نے اسے اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کر دی تھی۔ اگرچہ اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر اجلے دن کے مانند عیاں نہیں تھا تاہم اس ملگجی روشنی میں وہ بہ آسانی دیکھ پا رہا تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا وہ قلعہ سترھویں صدی عیسوی میں، برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں تھا۔ وہ لوگ اپنے بدترین مخالفین اور خطرناک مجرموں کو اسی قلعے کے اندر پھانسی کی سزا دیا کرتے تھے۔ بہت سوں کو عمر بھر کے لیے قلعے کے تہ خانے میں ڈال دیا جاتا تھا لیکن یہ سب چار صدی پہلے کا قصہ ہے اور اگر آج کی بات کی جائے تو پچھلے تین سال سے اس ویران قلعے کا ایک خفیہ حصہ دجال کی ناجائز اولاد "ڈیوڈ" کے ناپاک وجود سے آباد تھا۔

باہر سے اجڑا ہوا دیار نظر آنے والے اس قلعے کا اندرونی، ڈیوڈ کے زیر استعمال حصہ ہائی ٹیک اور دیگر سہولیات سے "مالا مال" تھا۔ ڈیوڈ نے وہاں تک آنے والے دونوں ظاہرہ راستوں پر اپنے مستعد اور عقابی نگاہ رکھنے والے مسلح افراد کی نگرانی بٹھا رکھی تھی۔ اس کے خیال میں، وہ اس قلعے کے اندر اتنا محفوظ تھا کہ وہاں موت کا فرشتہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

ڈیوڈ کے اسی کفریہ گھمنڈ پر قدرت نے جاسم کو، سیکیورٹی گارڈز اور سی سی ٹی وی کیمراز کی نگاہوں سے بچا کر ایک تیسرے نادیدہ راستے (ٹیلی پورٹیشن) سے ڈیوڈ کی سرکوبی کے لیے اس کے انتہائی نزدیک پہنچا دیا تھا۔ ڈیوڈ اس قلعے میں تین سال بہ خیریت گزار چکا تھا لیکن اب خیر

اورعافیت کے گزرنے کا وقت آگیا تھا۔

تاریکی اور روشنی کے درمیان چند قدم طے کرنے کے بعد جاسم ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پر لفٹ لگی ہوئی تھی۔ اس قسم کا لفٹ سسٹم تو بلند عمارتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے تاکہ اوپر نیچے آنے اور جانے میں آسانی ہو جائے مگر اس پہاڑی کے اندر لفٹ کی تنصیب بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتی تھی۔ جاسم نے ڈیوڈ کے کائرو (قاہرہ) والے ٹھکانے کا ایک مختصر سا دورہ کیا تھا۔ اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں تھا کہ ڈیوڈ کائرو والے اس عالی شان بنگلے میں بہ نفس غلیظ موجود تھا یا محض ٹیکنالوجی کے توسط سے اس نے ہر معاملے کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا۔ بہرکیف، یہ جگہ ڈیوڈ کے کائرو والے "مسکن" کی بہ نسبت کافی نچلے درجے کی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سلور کوئین نے اپنی خفگی نکالنے کے لیے اس ڈیوڈ کو محل سے نکال کر جھونپڑے میں پھینک دیا ہو تاہم جاسم کو اس امر کا یقین تھا کہ ڈیوڈ یہاں پر لازمی موجود ہوگا کیونکہ ایش کے فراہم کردہ جی پی ایس۔ کوآرڈی نیٹس نے اسے ڈیوڈ کی پن لوکیشن پر ہی پہنچایا تھا۔

لفٹ کے پاس سے گزر کر وہ ایک ایسے کمرے کے سامنے آگیا جس کے اندر خاصی تیز روشنی تھی اور وہاں سے دو انسانوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ جاسم کو یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت نہیں ہوئی کہ ان میں سے ایک آواز نسوانی اور دوسری مردانہ تھی اور وہ دونوں خاصے "خوشگوار" موڈ میں لگتے تھے اور اس "خوش گواریت" میں بیداری سے زیادہ مخموری پائی جاتی تھی حالانکہ وہ وقت تو مدہوشی سے ہوش میں آنے کا تھا۔

لیڈر ہل فورٹ کے اندرونی حصے میں مختصر سی "چہل قدمی" کے بعد جاسم کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پورا ایریا ساؤنڈ پروف تھا۔ جاسم اس وقت جس کمرے کے سامنے موجود تھا، اس کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا اسی لیے اندر والے جوڑے کی معنی خیز بدمست آوازیں جاسم کی سماعت تک بہ آسانی پہنچ رہی تھیں۔ وہ فوراً سے پیشتر جان گیا کہ اندر موجود ابنِ آدم اور بنتِ حوا کس نوعیت کی مصروفیت میں "مشغول" تھے۔ اخلاقیات کے بنیادی تقاضے نبھاتے ہوئے جاسم نے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

دستک کی وہ دھیمی سی آواز بھی اس فورٹ کے اندرونی سناٹے میں کسی مہیب دھماکے کی طرح گونجی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے اندر موجود مرد و زن کی جسمانی تفریح کو بریک لگ گئے۔

"ڈیوڈ! باہر کوئی ہے......!" نسوانی آواز نے اپنے بیڈ پارٹنر کو مخاطب کرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"ناممکن!" مردانہ آواز نے چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ جواب دیا۔ "اینجیل! تم کافی عرصے سے میرے ساتھ ہو اور اس سسٹم کا حصہ بھی ہو۔ میری اجازت کے بغیر کوئی اس طرف پھٹک بھی نہیں سکتا......"

ان دونوں کی گفتگو سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ کمرے میں اینجیل نامی اس عورت کے ساتھ ڈیوڈ موجود تھا۔

"یہ ونسیٹ یا الفریڈ میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔" اینجیل نے زور دے کر کہا۔ "میں نے دستک کی باقاعدہ آواز سنی ہے۔"

"تمہارے کان بجے ہوں گے۔" ڈیوڈ نے بے پروائی سے کہا۔ "اگر کسی نے اس کمرے کے دروازے پر دستک دی ہوتی تو اس کی آواز مجھے بھی سنائی دیتی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ونسیٹ اور الفریڈ اس حساس ایریا سے باہر والے حصے میں ڈیوٹی دیتے ہیں اور جب تک میں انہیں بلاؤں نہیں، وہ اس طرف آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تم فضول قسم کے خیالات سے اپنے دماغ کو خراب اور میرے مزے کو کرکرا نہ کرو......!"

جیکب زلیڈر کی دیکھ ریکھ کرنے والے اسٹاف میں ڈیوڈ کے لوگ بھی موجود تھے۔ اسی طرح فورٹ کی طرف آنے والا وہ تنگ سا پہاڑی راستہ بھی ڈیوڈ کے چیتا صفت آدمیوں کی کڑی نگرانی میں تھا۔ ان سب کی نظر بچا کر کوئی ڈیوڈ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ونسیٹ اور الفریڈ ڈیوڈ کے مسلح خدمت گار تھے جو ایک خاص حد تک رہ کر ڈیوڈ کے حکم کا انتظار کیا کرتے تھے۔

"میری سماعت کو دھوکا نہیں ہوا ڈیوڈ!" اینجیل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "اور میری چھٹی حس بھی یہی بتا رہی ہے کہ باہر کوئی موجود ہے۔"

"ٹھہرو...... میں چیک کرتا ہوں۔" ڈیوڈ کی جھنجلاہٹ بھری آواز ابھری۔ "جب تک میں ونسیٹ اور الفریڈ سے بات نہ کرلوں، تمہاری تسلی نہیں ہوگی۔"

ڈیوڈ کی باتیں سن کر جاسم کو حد درجہ مایوسی ہوئی۔ پہلے والا ڈیوڈ ہو یا یہ والا، جاسم کے ذہن میں اس کا تصور کسی ناقابلِ تسخیر انسان کا تھا۔ اسی لیے تو وہ اسے تسخیر کرنے یہاں پہنچا تھا۔ پھر ڈیوڈ اپنی زبان سے بھی خود کو بڑا با اختیار اور قدرت والا بتاتا تھا۔ بقول اس کے، وہ ایک ایسی آنکھ تھا

جو اس زمین اور آسمان میں موجود ہر شے کو دیکھ سکتا تھا مگر اس کی نگاہ اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی لیکن یہاں تو سب کچھ ڈیوڈ کے بلند بانگ دعوؤں کے بالعکس نظر آرہا تھا۔ خود کو زمینی خدا سمجھنے اور بتانے والا ڈیوڈ، اپنے ملازمین سے رابطہ کرنے کے لیے ایک فون کال کا محتاج ہوگا، ایسا جاسم نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

''اوہ...... کھودا پہاڑ، نکلا چوہا......!'' جاسم نے دھیمے سُروں میں خودکلامی کی۔ ''مگر یہ چوہا مرا ہوا نہیں ہے۔ یہ سانس لے رہا ہے اور اپنے بندوں سے بات بھی کر رہا ہے۔''

''ونسیٹ! تم کہاں ہو؟'' ڈیوڈ نے اپنے ایک محافظ سے پوچھا۔

''گیٹ کے سامنے ڈیوٹی پر ہوں سر!'' ونسیٹ نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''کوئی حکم سر......؟''

''کیا الفریڈ بھی تمہارے آس پاس ہے؟''

''جی سر......! ہم دونوں داخلی دروازے پر موجود ہیں۔''

''کیا تم لوگوں نے کسی کو میرے والے حصے کی طرف آتے دیکھا ہے؟'' ڈیوڈ نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں سر...... کوئی ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جائے، اس کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔'' ونسیٹ نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا۔ ''لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں...... کیا کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟''

''نہیں......!'' ڈیوڈ نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے اپنے کمرے کے باہر ایک عجیب سی آواز سنی ہے۔ ہوسکتا ہے، یہ میرا وہم ہو لیکن پھر بھی تم احتیاطاً اندرونی حصے کا ایک راؤنڈ لگالو۔''

''اوکے سر......!'' ونسیٹ نے فرمانبرداری سے کہا۔

جاسم صرف ڈیوڈ کی آواز سن پا رہا تھا۔ دوسری جانب اس کے ملازم نے کیا کہا، وہ جاسم کو معلوم نہیں تھا۔ تاہم وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ آئندہ چند لمحات میں وہاں کون سی قیامت بپا ہونے والی ہے۔

''اب تو تمہاری تسلی ہوگئی نا......؟'' ڈیوڈ نے ایبکیل سے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ ہمارے آس پاس کوئی تیسرا موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوا بھی تو ونسیٹ اور الفریڈ اس سے نمٹ لیں گے۔ آؤ...... ہم ایک دوسرے سے نمٹنے کی کوشش......!''

ڈیوڈ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت جاسم نے کمرے میں داخل ہوکر اس کی زبان پر قفل ڈال دیا تھا۔

وہ دونوں قابلِ اعتراض حالت میں ناقابلِ بیان کام میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ مگر جاسم کی طوفانی آمد نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے۔ جاسم پر نگاہ پڑتے ہی ایبکیل کی چیخ نکل گئی اور وہ اضطراری انداز میں خود کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

''کک...... کون ہو تم......؟'' ڈیوڈ نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

اپنے استفسار کے اختتام پر ڈیوڈ نے اس لباس کی جانب ہاتھ بڑھایا جو بیڈ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر پڑا تھا۔ جاسم نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی کیونکہ اس سے پہلے کہ ڈیوڈ کا ہاتھ اس کے لباس تک پہنچتا، جاسم نے مذکورہ کرسی کو ایک فٹ بال تصور کرتے ہوئے اس پر ایک فری کک آزما ڈالی تھی۔ وہ کرسی جاسم کے پاؤں کی ٹھوکر کھانے کے بعد لباس سمیت فضا میں بلند ہوئی اور سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کمرے میں ایمرجنسی نافذ ہوگئی۔

ڈیوڈ نے اپنے برہنہ تن کی پروا کیے بغیر بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز کھول لی۔ جاسم پلک جھپکنے میں اس کے خطرناک عزائم سے واقف ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک طویل جست بھری اور ڈیوڈ کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے وہ بیڈ سائڈ ٹیبل کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بجلی کی سی سرعت سے ٹیبل کی دراز کو پورے زور سے بند کر دیا۔

ڈیوڈ نے حلق کے بل ایک اذیت ناک چیخ ماری۔ گن کی تلاش میں اس کا جو ہاتھ میز کی دراز کے اندر داخل ہوا تھا، وہ کچلی ہوئی خون آلود حالت میں جب باہر نکلا تو خاصی بھیانک شکل اختیار کر چکا تھا۔ ڈیوڈ اپنے گھائل ہاتھ کو تھامے بری طرح چیخ چلّا رہا تھا۔ جاسم نے ایبکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں خواتین پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ کیا تم زندہ رہنا چاہتی ہو؟''

ایبکیل نے میکانگی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور خوف سے لب ریز ڈری سہمی آواز میں بولی۔ ''ہاں......!''

''گڈ گرل......!'' جاسم نے زخمی ڈیوڈ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے ایبکیل سے کہا۔ ''اپنا لباس پہن لو اور جا کر سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں ڈیوڈ سے نمٹنے کے بعد تم سے

بات کروں گا...... او کے؟"

"ٹھ...... ٹھیک ہے......!" اینجیلی نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "تم جیسا کہو گے...... میں بالکل ویسا ہی کروں گی۔"

"اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" جاسم نے تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "اگر تم نے کوئی ہوشیاری یا چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں بھی یہ بھول جاؤں گا کہ تم کوئی صنفِ نازک ہو۔ میں مکار عورتوں کا حشر ڈیوڈ جیسے بدذات مردوں سے بھی زیادہ برا کرتا ہوں۔"

اینجیلی نے اپنی گردن کو اثباتی انداز میں دو، تین بار جھٹک کر جاسم کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس کی بات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہے۔ پھر وہ اپنا لباس اٹھا کر کرسی کی سمت بڑھ گئی۔ جاسم، ڈیوڈ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

جاسم کو اینجیلی سے بات کرتے دیکھ کر ڈیوڈ نے اپنا تن ڈھانپنے کی نیت سے بیڈ شیٹ کو کھینچ لیا تھا لیکن جاسم اس کی اس ننھی سی خواہش کو بھی پورا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ ڈیوڈ کے ہاتھ سے وہ شیٹ کھینچ لی۔ اس عمل کی زد میں، اس کا زخمی ہاتھ آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ ایک بار پھر بہ آواز بلند چیخنے لگا۔ جاسم نے اس کے منہ پر زناٹے دار طمانچے رسید کرنے کے بعد استہزائیہ انداز میں کہا۔

"ڈیوڈ! تمہیں ستر پوشی کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ویسے اس حالت میں تم بڑے بے ہودہ اور واہیات نظر آ رہے ہو۔"

ڈیوڈ نے اپنے ہاتھ کی پشت سے ہونٹوں سے رسنے والے خون کو صاف کیا پھر سلگتے ہوئے لہجے میں دھمکی دی۔ "تم نے شیر کی کچھار میں قدم رکھ کر بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ تم یہاں آ تو گئے ہو مگر زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔"

"ابے او مریل چوہے......" جاسم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "خود کو شیر کہتے ہوئے تمہیں ذرا سی بھی شرم نہیں آ رہی؟" وہ لمحے بھر کو تھما پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"ہاں، البتہ...... تم میں اور شیر میں ایک قدر مشترک تو ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہونے کے ناتے سے ننگ دھڑنگ گھومتا ہے اور تم بھی اس وقت بے لباس ہو......"

"میرے مسلح گارڈز یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔" ڈیوڈ نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "وہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سمندر میں پھینک دیں گے۔ تمہارا کھیل ختم۔"

"یہ کھیل میں نے شروع کیا ہے لہٰذا اسے ختم بھی میں ہی کروں گا۔" جاسم نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سفاک لہجے میں کہا۔ "اگر تمہارے دو گارڈز ونسینٹ اور الفریڈ یہاں آنے والے ہیں تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے ڈیوڈ...... ان بے چاروں نے اپنے باس کو کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا ہو گا۔ یہ لائیو ٹیلی تھیٹر انہیں بھی محظوظ کرے گا۔"

جاسم کی زبان سے ونسینٹ اور الفریڈ کا نام سن کر ڈیوڈ کے چہرے پر الجھن آمیز بے یقینی نمودار ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا کیونکہ کمرے کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ الفریڈ اور ونسینٹ ہی تھے۔ انہوں نے اپنے باس کی فلک شگاف، دردناک چیخیں سماعت کر لی تھیں۔ جاسم نے برق رفتاری سے حرکت کی اور بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں سے لوڈڈ گن نکال لی۔ اگلے ہی لمحے وہ آنے والوں کے استقبال کے لیے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

یہ وہی ریڈی گن تھی، تھوڑی دیر پہلے ڈیوڈ نے جسے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی یہ کوشش بار آور ثابت نہیں ہو پائی تھی اور اب وہی گن جاسم کے پاس آ کر اس کا ہتھیار بن چکی تھی۔

ونسینٹ اور الفریڈ پر نگاہ پڑتے ہی برہنہ تن ڈیوڈ انتہائی بدتمیزی پر اتر آیا۔ "وہ حرام زادہ دروازے کے پٹ کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔" اس نے جاسم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے غلاظت بھرے لہجے میں کہا۔ "ختم کر دو اس نامراد کو...... یہ بچ کر نہ جائے۔ میں خون میں لت پت اس کی لاش کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جاسم کے لیے اتنی مہلت کافی سے بھی زیادہ تھی۔ ونسینٹ کے ہاتھ میں گن تھی اور الفریڈ خنجر بہ دست تھا۔ ڈیوڈ کے حکم پر وہ دونوں جب جاسم کی جانب بڑھے تو اس نے ایک عجیب سی حرکت کی۔ گن کے سامنے صرف دو ہی چیزیں کام آتی ہیں۔ نمبر ایک...... حاضر دماغی۔ نمبر دو...... ٹائمنگ۔

جاسم کے حاضر دماغ ہونے میں کوئی شک تھا اور نہ ہی اس کی ٹائمنگ پر سوال اٹھایا جا سکتا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ کمر کے بل جھکا اور گھوم کر الفریڈ کے عقب میں چلا گیا۔ جاسم کی یہ حرکت اتنی اچانک اور عقل میں نہ آنے والی تھی کہ ان دونوں مسلح افراد کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

الفریڈ کے پیچھے پہنچتے ہی جاسم نے رکوع کی حالت میں رہتے ہوئے ہپ پش سے الفریڈ کو ونسینٹ کی طرف دھکیل دیا۔ یہ جاسم کی ایک خطرناک چال تھی۔ ونسینٹ کی گن کا رخ جاسم کی کھوپڑی کی جانب تھا۔ اس صورتِ حال

نے اسے اس قدر بوکھلا دیا کہ ٹریگر پر اس کی انگلی دب گئی۔

جاسم فائرنگ رینج میں نہیں رہا تھا۔ اس کی جھکائی کے ساتھ ہی الفریڈ کا چہرہ ونسیٹ کی گن کی نال کے سامنے آ گیا تھا۔ اس پر جاسم کے ہپ پش نے الفریڈ کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے۔ ونسیٹ کی گن سے نکلنے والی گولی الفریڈ کی کھوپڑی کے پار ہو گئی۔

جاسم نے ونسیٹ کو حیران یا پریشان ہونے کی مہلت نہیں دی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رکوع سے قیام کی حالت میں آیا اور ونسیٹ کے گن بردار ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر ایک خطرناک مروڑا دیا۔ کلائی مڑتے ہی گن کا رخ ونسیٹ کی پیشانی کی طرف ہو گیا۔

جاسم نے بڑی بے رحمی سے گن کی نال کو ونسیٹ کی ایک آنکھ کے ساتھ لگا کر ٹریگر دبا دیا۔ بے زبان گولی ایک مہیب آواز کے ساتھ ونسیٹ کی آنکھ کے راستے، سر میں ہوا دان بناتے ہوئے دوسری جانب نکل گئی۔

اس صورت حال نے ڈیوڈ کے خوف کو ساتویں آسمان تک پہنچا دیا۔ وہ دہشت زدہ نظر سے اپنے دونوں محافظوں کی خون اگلتی لاشوں کو تک رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ بے بسی اور کم مائیگی کی تصویر بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی دہشت اور چہرے سے جھلکتی سراسیمگی کو دیکھ کر کوئی یہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ یہ وہی ڈیوڈ ہے جو خود کو ایک نادیدہ اور پُراسرار آنکھ کہتا تھا اور نعوذ باللہ خدائی کا دعوے دار بنا پھرتا تھا۔

آئندہ دس منٹ میں جاسم نے ایبگیل کی مدد سے بیڈشیٹ کی لمبائی کے رخ پٹیاں کاٹ کر ڈیوڈ کو کرسی پر اس طرح فکس کر دیا کہ وہ اپنی مرضی سے جسم کے کسی اعضا کو معمولی سی حرکت دینے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ پٹیوں کے پھیرے اور بندشیں کسی تیز دھار چھری کے مانند اس کے جسم کے مختلف مقامات کے اندر ''دھنس'' رہی تھیں کیونکہ جاسم نے ابھی تک اسے لباس پہننے کی اجازت نہیں دی تھی۔

جاسم نے الفریڈ والے خنجر کو اٹھایا اور ڈیوڈ کے سامنے دوسری کرسی بچھا کر بیٹھ گیا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گمبھیر لہجے میں بولنا شروع کیا۔

''ڈیوڈ! تم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں کون ہوں؟ میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو یہی جواب دیتا کہ...... ڈیوڈ! میں تمہاری موت ہوں...... لیکن میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ میں تمہاری ذلت ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے اس ٹھکانے کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں پر ہائی ڈیفینیشن ہڈن کیمرا نصب نہ ہوں۔ تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم نے اس زمین، اس آسمان اور ان دونوں کے بیچ پائی جانے والی ہر شے پر نگاہ رکھی ہوئی ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تمہیں بھی ہر لمحہ مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ تم میم سیمیں بدن کی نظر میں اتنے حقیر اور ناقابل بھروسا ہو کہ تمہاری ایک ایک پل کی حرکات کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ تم نے کچھ دیر پہلے ایبگیل کے ساتھ جو خرمستیاں کی ہیں، وہ بھی ایک ریکارڈ کی صورت اختیار کر چکی ہیں جنہیں دیکھ کر میڈم سیم تن اپنی تنہائی کے لمحات کو خوش گوار بنائے گی۔''

''تم کس میم سیمیں بدن اور میڈم سیم تن کی بات کر رہے ہو؟'' جاسم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈیوڈ پوچھ بیٹھا۔

''میں سلور کوئین کا ذکرِ شر کر رہا ہوں۔'' جاسم نے سنسناتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

ڈیوڈ کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور وہ خوف زدہ نظر سے جاسم کو تکنے لگا۔ جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس، ایک چھوٹا سا آخری کام۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا......''

''کک...... کون سا...... آخری کام......؟'' ڈیوڈ نے سہمی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''میں نے اب تک کچھ بھی تم سے چھپا کر نہیں کیا ڈیوڈ!'' جاسم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''میرا آخری کام بھی تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اذیت اور کرب کی بلندی سے گزرتے ہوئے۔''

اس کے بعد جاسم نے الفریڈ والے تیز دھار خنجر کی مدد سے، ڈیوڈ کے دونوں ٹخنوں کے عقبی حصے میں واقع فیبولا میں پائے جانے والے ایکلیس ٹینڈن کو بیدردی سے چیر ڈالا۔ جاسم کی اس میڈیکل بلکہ سرجیکل ٹریٹمنٹ کے بعد ڈیوڈ کا کیا حال ہوا، اسے دیکھنے کا جاسم کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

''کام ختم، دکان بند......!''

جاسم، ڈیوڈ اور ایبگیل کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس کمرے سے نکل آیا پھر بڑے اعتماد سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

**حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے**

# سِگنل والی

جمال دستی

زندگی کی ڈور کسی نہ کسی رشتے سے بندھی نہ ہو تو زندگی ادھوری ادھوری سی رہتی ہے... وہ بھی تنہا زندگی بسر کررہا تھا کہ اچانک اس کے دل کی کلی کھل گئی... اس کے وجود کو نت نئے شگوفے کھلاتی محبت نے اسیر کرلیا... اس کا خیال تھا کہ اس کی جستجو پکی اور لگن سچی ہے اس لیے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک ترکیب سوجھ گئی...

محبت کی شاہراہ پر سگنل پر کھڑے ایک شخص کی ویرانی...... پامالی و سادگی......

آفس جاتے آتے ہوئے وہ سگنل میرے راستے میں پڑتا تھا اور سگنل والی بھی مگر اس سے میرا سامنا صرف صبح ہی ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ میرے آفس جانے والی سائڈ روڈ پر، سگنل کے چبوترے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی بھیک مانگ رہی ہوتی تھی۔ ''بھیک مانگنے'' سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے مختلف قسم کی دردانگیز اور متاثر کن صدائیں لگایا کرتی تھی۔ وہ بس، آلتی پالتی مارے چپ چاپ اُمید بھری نظر سے، وہاں سے گزرنے والے پیدل اور سوار انسانوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی نگاہ اور انداز میں ایسا جادو تھا کہ ہر تیسرا یا چوتھا شخص اسے کچھ نہ کچھ دے کر ہی آگے بڑھتا تھا۔ اِن دیالو افراد میں اتفاق سے میں بھی شامل تھا۔

میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے کبھی اسے بھکارن نہیں سمجھا تھا اور میں اسے جو کچھ بھی دے جاتا تھا، اس حوالے سے میرے ذہن میں کہیں بھی ''بھیک'' کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ آپ اسے خالصتاً میری داخلی کیفیت سمجھ لیں۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ایک روز ہمت کرکے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

اس نے گہری اور ٹٹولنے والی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ہماری نظریں پہلی بار باقاعدہ چار ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے خدوخال میں ایسی کشش اور جاذبیت تھی کہ مجھے اپنا دل زیروزبر ہوتا محسوس ہوا۔ میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ نہادھو کر مناسب سا صاف ستھرا لباس بھی زیبِ تن کرلیتی تو وہ شہر کی دس حسین و جمیل عورتوں میں شمار کی جاسکتی تھی۔ وہ پُرکشش سراپا اور زرخیز تن کی مالک ایک نایاب اور شاداب ہستی تھی۔

میں نے اس سے کوئی ایسا سوال نہیں کیا تھا کہ جس کا جواب دینے کے لیے راکٹ سائنس سے واقفیت ضروری ہو۔ اس اللہ کی بندی نے بھی ایک ہی لمحے میں مجھے فارغ کر دیا تھا۔ یہ وہی لمحہ تھا جب اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر بےگانگی سے دوسری سمت دیکھنے لگی تھی۔

اس نے مجھے دانستہ نظرانداز کیا تھا اور اس فعل کے لیے وہ حق بہ جانب بھی تھی۔ میں اس کے لیے ایک غیر اور اجنبی شخص تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی پابند تھی اور نہ ہی میں اسے اس کام کے لیے مجبور کرسکتا تھا لہٰذا میں نے خاموشی اور شرافت کے ساتھ اپنی بائیک آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

میرا نام شیراز ہے...... شیراز علی۔ میں ایک معروف اسپورٹس میگزین میں بہ طور سب ایڈیٹر کام کرتا ہوں۔ مذکورہ میگزین کا نام ''پلے گراؤنڈ'' ہے۔ کسی اردو میڈیم رسالے کا انگریزی نام اگرچہ عجیب سا لگتا ہے لیکن میرے خیال میں ''کھیل کا میدان'' کی بہ نسبت ''پلے گراؤنڈ'' سمعی و بصری لحاظ سے زیادہ توانا اور متاثر کن محسوس ہوتا ہے۔ اس میگزین کا آفس ''ڈی ایچ اے'' کے فیز ٹو (ایکسٹینشن) کی ایک عمارت میں واقع ہے اور میری رہائش خداداد کالونی میں

ہے۔ چنانچہ گھر سے آفس کے درمیان سفر کرتے ہوئے مجھے شاہراہِ قائدین سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ سگنل اسی سڑک پر پڑتا ہے جس کو لے کر میں خاصا جذباتی ہو جایا کرتا تھا۔

ایک سال پہلے تک میں شادی شدہ ہوا کرتا تھا پھر ایک روز رخشندہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ ہماری بارہ سالہ ازدواجی رفاقت کی نشانی کا نام تھا، ثاقب...... میری اور رخشندہ کی اکلوتی اولاد جو ہماری شادی کے دس سال بعد پیدا ہوا تھا۔ ثاقب اس وقت تین سال کا تھا اور اس نے ایک نرسری اسکول میں اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا تھا۔ آفس آتے ہوئے میں ثاقب کو اس کی نانی کے یہاں چھوڑ دیا کرتا تھا جہاں پر میری چھوٹی سالی تابندہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی تھی۔ شام میں آفس سے واپسی پر میں ثاقب کو اپنے ساتھ گھر لے جاتا تھا۔ پچھلے ایک سال سے زندگی اسی ڈھنگ اور ڈگر پر رواں دواں تھی کہ اس سگنل والی نے یکا یک میری سوچ میں ایک حرارت بخش جذبے کو بیدار کر دیا تھا۔

آفس میں میری زیادہ بات چیت صفدر حسین سے ہوتی تھی۔ ہم دونوں پچاس کے ہندسے کے آس پاس تھے۔ شاید اسی ہم عمری نے ہمارے بیچ بے تکلفی کو اجاگر کر دیا تھا۔ صفدر حسین ''پلے گراؤنڈ'' میں پروف ریڈر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور وہ میرے گھریلو حالات سے پوری طرح واقف بھی تھا۔

ایک دوپہر لنچ بریک میں اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''شیراز بھائی! آپ کے بیٹے کا کیا حال ہے؟''

''الحمدللہ!'' میں نے جواب دیا۔ ''ثاقب ٹھیک ٹھاک ہے۔ باقاعدگی سے اسکول جا رہا ہے۔ تابندہ اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ وہ اپنی نانی اور خالہ کے ساتھ خوش ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' صفدر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ددھیال میں اس کا کوئی نزدیکی رشتے دار تو ہے نہیں اور ننھیال میں بھی بس، چھوٹی خالہ اور نانی ہی ہیں مگر......''

''مگر کیا؟'' صفدر نے اچانک بات ادھوری چھوڑی تو میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''دن کا آدھا حصہ تو وہ اسکول میں گزار لیتا ہوگا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''باقی کا آدھا دن وہ ننھیال میں رہتا ہے۔ جب آپ رات میں اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتے ہیں تو وہاں وہ خاصی تنہائی اور بوریت محسوس کرتا ہوگا۔''

"میں آپ کی بات کو یکسر رد تو نہیں کروں گا صفدر بھائی لیکن میں اپنی سی پوری کوشش کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "ہوم ورک تو وہ اپنی نانی کے گھر سے کر کے ہی آتا ہے۔ باقی اس کی خوشی کی خاطر میں اس کے ساتھ مختلف بچوں والے کھیل کھیلتا ہوں اور وہ بھی ایک چھوٹا بچہ بن کر......!"

"یقیناً یہ آپ کا ایک قابلِ ستائش کارنامہ ہے شیراز بھائی!" وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر بولا۔ "لیکن آپ کو اس سے بڑھ کر بھی کچھ کرنا چاہیے!"

"مثلاً کیا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"مثلاً...... یہ کہ آپ کے گھر میں کوئی رونقِ نسواں بھی ہونا چاہیے۔" وہ میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت ضروری ہے شیراز بھائی!"

"صفدر بھائی! آپ بھی نا......" میں نے بیزاری بھرے انداز میں کہا۔ "پھر وہی دوسری شادی کا قصہ......"

"آپ یہ تجربہ کر کے تو دیکھیں۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے، بعدازاں آپ میرے اس مشورے کا شکریہ ادا کرتے تھکیں گے نہیں۔"

"ٹھیک ہے صفدر بھائی......" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے پہلے بھی کئی بار مجھے دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ آپ میرے ایک مخلص اور ہمدرد دوست ہیں۔ میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے آج ہی کسی سمجھ دار اور بردبار عورت کی تلاش میں لگ جاتا ہوں۔"

"میرے خیال میں آپ کو اس تلاش میں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "جو شے گھر میں موجود ہو اس کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"گھر میں موجود......" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "اس سے آپ کا کیا مطلب ہے صفدر بھائی؟ یقین جانیں، میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پایا ہوں۔"

"میرا اشارہ آپ کی اکلوتی سالی تابندہ کی طرف ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ثاقب، تابندہ کے ساتھ بہت زیادہ خوش رہتا ہے۔ اس طرح تین کام ایک ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ کو بیوی مل جائے گی، ثاقب کو ماں اور آپ کی ساس اپنے آخری فرض سے سبکدوش ہو جائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں، آپ کے لیے اس سے بہتر آپشن اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"صفدر بھائی!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہر انسان اپنے دماغ سے سوچتا ہے۔ آپ نے میری بھلائی کو مدِنظر رکھتے ہوئے میرے لیے جن جذبات کا اظہار کیا، میں تہِ دل سے ان کا احترام کرتا ہوں لیکن آپ سے درخواست ہے کہ آئندہ بھی اس حوالے سے آپ تابندہ کا نام نہیں لیجیے گا۔"

"آئی ایم سوری شیراز بھائی......" وہ معذرت خواہانہ انداز میں جلدی سے بولا۔ "میں آئندہ خیال رکھوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کے احساسات کو مجروح کیا۔"

"اِٹس او کے...... نو ایشو......" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔ "جب رخشندہ سے میری شادی ہوئی تو تابندہ محض چار سال کی تھی۔ اب وہ سولہ سال کی ہو چکی ہے اور میٹرک کا امتحان دینے والی ہے لیکن میری نظر میں وہ آج بھی ایک چار سال کی معصوم اور بھولی بھالی بچی ہی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ گزرے ہوئے ان بارہ، تیرہ سالوں میں، میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی سالی نہیں سمجھا۔ وہ میرے لیے ہمیشہ ایک سگی بیٹی کی طرح رہی ہے اور میری آخری سانس تک اس رشتے میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ باقی جہاں تک میری دوسری شادی کا معاملہ ہے تو......" لمحاتی توقف کر کے میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"صفدر بھائی! اس سلسلے میں، انشاء اللہ میں جلد ہی آپ کو کوئی خوش خبری سناؤں گا۔"

جواب میں صفدر حسین نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک دل خوش کن مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

گھر سے نکل کر شاہراہِ قائدین پر آتے ہی میں اپنی بائیک کی رفتار کو دھیما رکھتا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی، وہ سگنل مجھے بند ملے اور میں محوِ انتظار ٹریفک میں سب سے پیچھے رکوں تاکہ سگنل کھلتے ہی سارا ٹریفک نکل جائے اور مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔ میری یہ حکمتِ عملی تو کارگر جا رہی تھی لیکن اس اللہ کی بندی نے بقول کسے، ابھی تک مجھے گھاس نہیں ڈالی تھی۔

آج میں نے یہ ٹھان کر اس کے نزدیک بائیک روکی کہ چاہے کچھ بھی ہو، میں اسے بولنے پر مجبور کر دوں گا۔ اتنے دنوں کی ناکامی کے بعد مجھے شک سا ہونے لگا تھا کہ

کہیں وہ گونگی تو نہیں۔

میں عموماً اسے دس یا بیس روپے والا نوٹ دیا کرتا تھا لیکن آج میں نے ایک سو روپے کا کرارا نوٹ اس کی جانب بڑھایا اور معتدل انداز میں کہا۔

''میرا نام شیراز علی ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا اور برسرِ روزگار شخص ہوں۔''

اس نے میرے تعارفی کلمات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اس سو روپے والے کڑک نوٹ کو الٹ پلٹ کر تنقیدی نگاہ سے دیکھا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

''بابو! تیرا یہ نوٹ اصلی تو ہے نا......؟''

''ایک دم اصلی، بالکل تمہاری طرح......'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ابھی بینک سے لے کر آیا ہوں۔''

میں جوش جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ دراصل اسے سن کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ میرا یہ خدشہ تو دور ہو گیا تھا کہ خدانخواستہ کہیں وہ گونگی نہ ہو۔

اس نے یہ کہتے ہوئے میرے دیے ہوئے نوٹ کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''تو کہتا ہے تو بھروسا کر لیتی ہوں۔ باقی تو جان تے تیرا رب جانے......''

اس کے بولنے کی خوشی میں، میں نے بات کو آگے بڑھانا ضروری جانا۔ ''آج سے پہلے تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ نوٹ اصلی ہے یا نقلی!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر نرم لہجے میں سوال کیا۔ ''پھر آج یہ تفتیش کس لیے؟''

''کل دن میں، تیرے جیسے ایک صاف ستھرے بابو نے مجھ سے پانچ سو روپے کا کھلا مانگا تھا۔'' وہ کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں نے تو اس کی مشکل آسان کر دی مگر وہ کم بخت مجھے مشکل میں ڈال گیا۔ گھر جا کر جب میں نے اس کا دیا ہوا نوٹ تسلی سے چیک کیا تو وہ جعلی نکلا۔''

''اس دنیا میں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔'' میں نے گفتگو کا عمل جاری رکھتے ہوئے شائستہ انداز میں کہا۔ ''جو کسی کے ساتھ دھوکا کرتا ہے، وہ بھی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

''تو دس، بیس کی جگہ آج تو نے سو کا نوٹ اس لیے دیا ہے کہ میں تجھے اپنا نام بتا دوں؟'' اس نے تیز نظر سے مجھے گھورا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' میں اس کے چبھنے والے سوال پر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا۔ ''مجھ پر خواہ مخواہ شک نہ کرو۔'' میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''یہ تم پر ہے، اپنا نام بتاؤ یا نہیں۔ میں دوبارہ تم سے کبھی نہیں پوچھوں گا۔''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکتی رہی پھر ٹھوس انداز میں گویا ہوئی۔ ''میرا نام زینی ہے۔''

''زینی......!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''مطلب...... زینب، زینت، زیتون یا......؟''

''یہ سب میرے کو نہیں پتا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''اب تو جا یہاں سے۔ تیری وجہ سے اپنا دھندا خراب ہو رہا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے، سو روپے میں سارا دن میں تجھ سے بات کرتی رہوں گی۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے مجھے کچھ اس طور نظرانداز کر دیا جیسے میں اس کے ماحول میں موجود ہی نہ ہوں۔ میرے پاس بائیک آگے بڑھانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ سو میں نے آفس کی راہ لی۔

بہرکیف، میں خوش تھا۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میں نے اس کا نام معلوم کر لیا تھا۔

☆☆☆

اس کا اصلی نام جو کچھ بھی تھا۔ یہ میرے لیے زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ اسے مخاطب کرنے کے لیے ''زینی'' ہی کافی تھا۔ زینی سے ہلکی پھلکی بات چیت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ تاہم اس کا انداز ''دوٹوک'' والا ہی تھا۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے میں خاصا محتاط رہتا تھا کہ کہیں میری کوئی بات اسے بری نہ لگ جائے اور وہ بے مروتی سے چٹکی بجاتے ہوئے دو منٹ میں مجھے چلتا نہ کر دے۔ بڑی محنت سے تو میں اسے لائن پر لایا تھا اور ابھی تک میں نے اس سے اپنے دل کی بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ بات جو میرے احساسات اور جذبات میں کروٹیں بدلتی رہتی تھی اور مجھے ہر پل بے کل کیے ہوئے تھی۔

چند روز بعد صفدر حسین نے مجھے فارغ بیٹھے دیکھا تو وہ میرے پاس آ گیا۔ دو روز پہلے ہم نے میگزین کی کاپی پریس بھیج دی تھی اور اب تو ''پلے گراؤنڈ'' کا نیا شمارہ مارکیٹ میں بھی آ چکا تھا۔ میگزین آ جانے کے بعد دو، چار روز کام کا دباؤ نہیں ہوتا تھا۔ پبلشر اور ایڈیٹر صاحبان تو باقاعدہ چھٹی کرتے تھے اور ہم لوگ بھی ''ایزی'' ہو جایا کرتے تھے۔ اگر ہم چھٹی نہ بھی کریں تو دیر سے آنا اور جلدی چلے جانا ایک عام سی بات تھی۔

''اور سنائیں شیراز بھائی......'' صفدر حسین نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آپ کا مشن کہاں تک پہنچا؟''

''کون سا مشن......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''جناب! میں شادی والے مشن کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ یاددہانی کرانے والے انداز میں بولا۔

''اچھا وہ......!'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں، ہاں...... وہی۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر بولا۔ ''تو پھر بتائیں، کیا پروگریس ہے؟''

''ایک بندی میری نظر میں آئی تو ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''اس پر کام کر رہا ہوں۔''

''بہت خوب!'' وہ جوش بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کون ہے، کہاں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے؟''

''اوخدایا...... اتنے سارے سوالات اور وہ بھی ایک ہی سانس میں......'' میں نے کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''صفدر بھائی! مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کے سوالات کے مناسب اور موزوں جوابات نہیں دے سکوں گا۔ کیوں نا ہم ایک کام کریں؟''

صفدر حسین پر میں بھروسا کرتا تھا اسی لیے میں اپنے انتہائی نجی معاملات بھی اس سے ڈسکس کر لیا کرتا تھا اور زینی والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے اپنی بات سوالیہ جملے پر ختم کی تھی اس لیے اس نے فوری ردِعمل دیا۔

''بھائی کون سا ایک کام؟'' اس نے پوچھا۔

''میں آج ہی آپ کو اس سے ملوا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آفس میں ویسے بھی کوئی خاص کام نہیں ہے۔ ہم جلدی اٹھ جاتے ہیں۔''

''گڈ آئیڈیا......'' اس نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''جانا کہاں ہے؟''

میں نے بتایا۔ ''شاہراہِ قائدین تک۔''

صفدر حسین کی رہائش ڈرگ روڈ کے علاقے میں تھی اور وہ شارع فیصل پر طویل سفر کرنے کے بعد گھر پہنچتا تھا۔ شاہراہِ قائدین کی طرف آنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔

''تب تو ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو تقریباً میرے راستے ہی میں پڑے گا۔''

''تقریباً'' کا لفظ اس نے اس لیے استعمال کیا تھا کہ شاہراہِ قائدین کا رخ کرنے کے لیے اسے چند منٹ کے لیے شارع فیصل کو چھوڑنا پڑتا۔ بہرکیف، اس سہ پہر میں صفدر حسین کو اپنے ساتھ شاہراہِ قائدین کے اس سگنل تک لے گیا جہاں زینی بھیک مانگا کرتی تھی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو زینی اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھی۔ میں نے صفدر حسین کو نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں ادھر ہی رکوں گا۔ آپ روڈ پار کر کے دوسری طرف جائیں اور زینی کا بہ غور جائزہ لے لیں۔ پھر ہم کسی چائے خانے میں بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے۔''

''آپ کا مطلب ہے......'' وہ کبھی زینی کو اور کبھی مجھے دیکھتے ہوئے الجھن بھری حیرت کے ساتھ بولا۔ ''شیراز بھائی! کیا آپ واقعی ایک بھکارن سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

''صفدر بھائی! ساری باتیں کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر کریں گے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا اور آپ کو اپنی بائیک پر گھر بھی چھوڑ کر آؤں گا۔ آج آپ کو بس میں سفر نہیں کرنا پڑے گا۔''

طوعاً و کرہاً وہ میری بائیک سے اترا اور بددلی سے قدم اٹھاتے ہوئے سڑک پار کرنے لگا۔

☆☆☆

شام ہونے والی تھی۔ میں صفدر حسین کے ساتھ ڈرگ روڈ کینٹ بازار کے ''انصاف ہوٹل'' میں دودھ پتی پر ''بیٹھا'' ہوا تھا۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ سوسائٹی آفس کے نزدیک ہی کسی ریسٹورنٹ میں چائے پی لیں گے لیکن صفدر حسین نے زینی کا ''معائنہ'' کرنے کے بعد مجھ سے کہا تھا۔

''بھائی! آپ پہلے مجھے ڈرگ روڈ پہنچائیں۔ اس کے بعد ہی آپ سے اس موضوع پر کوئی بات ہوگی۔''

اس کا انداز اتنا دوٹوک اور حتمی تھا کہ میں بے چون و چرا اسے اپنی بائیک پر بٹھا کر انصاف ہوٹل تک لے آیا تھا۔ وہ یہاں نزدیک ہی ایک گلی میں رہتا تھا۔

دو کپ دودھ پتی اور گمبھیر خاموشی نے ہمارے بیچ دھرنا دے رکھا تھا۔ بالآخر اس موت سے بھی گہرے اس سکوت کو صفدر حسین نے توڑ ڈالا۔

''شیراز بھائی!'' اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''آپ مجھ سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہے نا؟''

''میں ہر لحاظ سے سنجیدہ ہوں صفدر بھائی۔'' میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

''تو آپ نے ایک بھیک مانگنے والی عورت سے

شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں مستفسر ہوا۔

''ہاں، بالکل!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا آپ کو زینی میں کوئی کمی یا خرابی نظر آئی ہے؟''

''میری بات غور سے سنیں شیراز بھائی!'' وہ اپنے کپ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔ ''آپ مجھے بہت عزیز ہیں اس لیے میں آپ سے کھری اور سچی بات کروں گا، اس امر کی پروا کیے بغیر کہ میری رائے آپ کو اچھی لگے گی یا بُری۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں بھائی!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے آپ پر کامل اعتماد ہے اسی لیے میں نے آپ کو ڈائریکٹ زینی سے ملا دیا ہے۔ میری نظر میں آپ کی رائے کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ بلاخوف وخطر بے لاگ تبصرہ کریں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''آپ نے پوچھا، زینی میں کیا کمی اور خرابی نظر آئی مجھے......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کمی اور خرابی دو الگ معاملات ہیں اس لیے میں ان کا الگ الگ ہی جواب دینا چاہوں گا تاکہ آپ میری سوچ سے کماحقہ آگاہ ہو سکیں۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں صفدر بھائی!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

''آپ کی وہ زینی میرے محتاط اندازے کے مطابق، پینتیس سے چالیس کے درمیان کی ہوگی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شکل وصورت کی بھی اچھی ہے۔ عمر اور شخصی تاثر کے لحاظ سے وہ آپ کے لیے مجھے موزوں اور مناسب نظر آتی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک بیوی کی حیثیت سے اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ باقی جہاں تک خرابی کا تعلق ہے تو اس کا مفصل جواب میں اس وقت دوں گا جب آپ مجھے بتائیں گے کہ اس کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہیں!...... اس کے علاوہ کہ وہ ایک بھکارن ہے اور شاہراہِ قائدین کے ایک سگنل پر بیٹھ کر وہ دن بھر بھیک مانگتی ہے؟''

اس نے ایک کھلے اور جائز سوال پر اپنی بات مکمل کی تو میں شش وپنج میں پڑ گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں زینی کی ذات کے حوالے سے کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ جب کچھ بھی نہ سوجھا تو میں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''فی الحال مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ بہت خوب صورت اور پُرکشش و دل نشیں ہے...... اگرچہ زینی ایک بھکارن ہے لیکن وہ میرے قلب وجگر میں اتر چکی ہے۔ اسے سوچتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور...... سانسوں کی ترتیب بگڑ جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، زینی نے میرے دماغ کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا ہو اور میرے حواس پر اس کا قبضہ ہو۔ جب بھی مجھے اس کا خیال آتا ہے تو پھر میں کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔''

''یہ ساری علامات تو ایک خاص الخاص مرض کی ہیں شیراز بھائی!'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''اور اس مرض کا نام ہے...... محبت!''

''آپ پہنچ گئے ہیں معاملے کی تہ تک......'' میں نے جذبات سے معمور آواز میں کہا۔

''میرا پہنچنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے شیراز بھائی!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کیس میں آپ کو بہت کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں، عشق کا بخار انسان کی عقل، حواس اور آنکھوں پر دبیز پٹی باندھ دیتا ہے۔ اسے اپنی خواہش نما چاہت کے سوا دنیا میں اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ میں آپ کی کیفیت کا اندازہ بہ خوبی لگا سکتا ہوں لیکن ایک مخلص دوست ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو سرسام ہونے سے بچاؤں کیونکہ یہ بخار اپنی جلو میں خمار آلود تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔''

''آپ سے بات کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ مجھے مناسب گائڈ کریں۔'' میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''بتائیں، مجھے کیا کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے؟''

''سب سے پہلے تو آپ زینی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس طبقے کے لوگ عموماً بھروسا کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان میں سے بہت سارے مختلف نوعیت کے چھوٹے اور بڑے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کا ان کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ بادی النظر میں یہ لوگ بے چارے اور بے ضرر لگتے ہیں۔ انہیں بھیک دے کر آگے بڑھ جانا اور بات ہے لیکن ان کے ساتھ کوئی سنجیدہ ناتا جوڑنا بالکل الگ معاملہ ہے۔ اُمید ہے، آپ میری بات کو سمجھ رہے ہوں گے......؟''

''جی، بالکل!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے زینی کے ماضی اور حال کو کھنگال ڈالوں گا۔''

''روشن اور پُرسکون مستقبل کے لیے ماضی اور حال سے گہری واقفیت بہت ضروری ہے شیراز بھائی......!'' اس

نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کی زینی سے بات چیت بھی ہے یا ابھی تک یہ کہانی صرف دیکھنے تک ہی محدود ہے؟''

''ہلکی پھلکی گفتگو ہو جاتی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کیا آپ نے اس سے اظہارِ محبت کر دیا ہے؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ہوں......'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد استفسار کیا۔ ''کیا آپ نے کبھی زینی کو چلتے پھرتے بھی دیکھا ہے؟''

''نہیں!'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا اور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اس سوال کا کیا مطلب ہے صفدر بھائی؟''

وہ چند لمحات تک مجھے سوچتی ہوئی نگاہ سے تکتا رہا پھر معتدل انداز میں بولا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ جسمانی معذور ہو......اس کے پاؤں جزوی یا کلی طور پر کام نہ کرتے ہوں اس لیے وہ ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر بھیک مانگتی ہو......''

''میں اس بارے میں جاننے کی کوشش کروں گا صفدر بھائی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے ایک اہم جانب توجہ دلائی ہے۔''

''میں آپ کا خیر خواہ ہوں شیراز بھائی!'' اس نے خلوص بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ نے جس راہ پر قدم رکھ دیا ہے وہ سیدھی اور آسان نہیں ہے۔ یہاں جا، بے جا آپ کو پتھر، کانٹے اور گڑھے ملیں گے۔''

''سمجھ گیا بھائی!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، سمجھ جائیں۔''

میں نے صفدر حسین کا شکریہ ادا کیا اور الوداعی مصافحے کے بعد واپسی کی راہ لی۔ اس نے جتنی بھی باتیں کی تھیں، ان میں سے کوئی ایک بھی منطق اور وزن سے خالی نہیں تھی!

☆☆☆

زینی کو باتوں میں لگا کر میں یہ جاننے میں تو کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ گونگی نہیں تھی۔ اب کسی طرح مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ صفدر حسین کے خدشے کے مطابق، کہیں وہ کسی قسم کی جسمانی معذوری کا شکار تو نہیں تھی۔ یہ اسی وقت پتا چل سکتا تھا جب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوتی اور کسی سمت قدم بڑھاتی۔

میری جستجو پکی اور لگن سچی تھی کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ وہ سڑک کی جس جانب سگنل والے چبوترے سے ٹیک لگا کر بیٹھا کرتی تھی، اس کے ساتھ ہی سروس روڈ تھی جس کے بعد ایک باربی کیو والا معروف ریسٹورنٹ تھا۔ مذکورہ ریسٹورنٹ میں بہت زیادہ رش ہوتا تھا اس لیے ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے اپنے دو فلورز کی سیٹنگ کے علاوہ سروس روڈ والی فٹ پاتھ پر بھی قبضہ کر کے وہاں اپنے کسٹمرز کے لیے ایک لمبی قطار کی صورت میز کرسیاں لگا رکھی تھیں۔

ایک شام آفس سے واپسی پر میں متذکرہ بالا ریسٹورنٹ کی فٹ پاتھ پر لگی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر جم کر بیٹھ گیا۔ ریسٹورنٹ میں کسٹمرز کی آمدورفت عموماً رات ہو جانے کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ میں نے وہاں اپنی موجودگی کو اخلاقی طور پر جائز کرنے کے لیے اپنے لیے ایک کولڈ ڈرنک منگوا لی اور ٹکٹکی باندھ کر زینی کو دیکھنے لگا۔ میں جس زاویے پر بیٹھا ہوا تھا وہاں زینی مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یہ تو طے تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے وہاں بیٹھ کر بھیک نہیں مانگتی ہو گی۔ بس، اسی خیال سے میں اس کی نگرانی کر رہا تھا کہ وہ کب اپنی ''دکان'' بڑھاتی ہے۔ مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مغرب کی اذان کے بعد جیسے ہی اندھیرا پھیلنے لگا، میں نے دیکھا، ایک موٹر سائیکل زینی سے کم و بیش پانچ گز کے فاصلے پر آ کر رکی۔ یہ وہی مقام تھا جہاں مین شاہراہِ قائدین اپنی سروس روڈ سے ملتی تھی۔

موٹر سائیکل پر درمیانی عمر کا ایک شخص سوار تھا۔ اس نے ہیلمٹ لگانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اس لیے مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ مضبوط بدن کا مالک، سانولی رنگت والا ایک دراز قامت شخص تھا۔

میں نے دیکھا، زینی اس موٹر سائیکل سوار کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ بندی زینی کو پک کرنے آیا تھا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ زینی لولی تھی، نہ لنگڑی اور نہ ہی کسی اور جسمانی معذوری کا شکار۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے بائیک کے نزدیک پہنچی، پھر عقبی نشست پر جم کر بیٹھ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے ''رائیڈر'' نے اپنی بائیک آگے بڑھا دی۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ صفدر حسین کا خدشہ غلط ثابت ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا ''مجھے اس بائیک والے کا تعاقب کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ رہتی کہاں ہے؟''

"نہیں!" اگلے ہی لمحے میرے ذہن نے اس خیال کو رد کر دیا۔ "اگر زینی نے مجھے تعاقب کرتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ میرے حوالے سے ان گنت شکوک و شبہات کا شکار ہو سکتی ہے۔" میں نے سوچا اور خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ کہیں بھاگی تھوڑی جا رہی ہے۔ کل وہ پھر اسی سگنل پر بیٹھی ملے گی۔ مجھے جلد بازی میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے کہ بنا بنایا کام خواہ مخواہ خراب ہو جائے۔"

میں چونکہ کوئی رسک لینے کے بارے میں غلطی سے بھی نہیں سوچ سکتا تھا اس لیے یہ نکتہ فوراً سے پیشتر میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے کولڈ ڈرنک کا بل ادا کیا اور اپنی بائیک پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

آئندہ روز میں نے موقع ملتے ہی صفدر حسین کو اپنی اس "جاسوسی" کے بارے میں بتایا، وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

"بہت خوب شیراز بھائی۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کی محبوبہ چلنے پھرنے سے عاری نہیں ہے۔"

اس کے لبوں پر موجود معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر میں نے پوچھ لیا۔ "صفدر بھائی! آپ مجھ سے تفریح تو نہیں لے رہے؟"

"کیا بات کرتے ہیں شیراز بھائی۔" وہ صفائی پیش کرنے والے انداز میں جلدی سے بولا۔ "بھئی اچھا ہے یک طرفہ ہی سہی، یہ ایک سنسنی خیز اور محبت بھری کہانی تو ہے اور اس کہانی کی رو سے زینی آپ کی محبوبہ ہی ہوئی نا۔"

"بس، آپ دعا کریں۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "آگے بھی سب ٹھیک ہی رہے۔"

"دعا کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے شیراز بھائی اور میں یقیناً آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا بھی لیکن......"

اس نے بات ادھوری چھوڑی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "لیکن کیا صفدر بھائی؟"

"دعا خالصتاً اللہ سے مدد مانگنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن یہ مت بھولیں کہ اللہ نے ہمیں زندگی گزارنے کے لیے اس دنیا میں بھیجا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لہٰذا ہمیں دنیا داری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دعا کے ساتھ ہی دوا بھی کرنا ہو گی اور اس دوا کا سب سے آسان راستہ ہے خلوصِ نیت، اٹل ارادہ اور جہدِ مسلسل۔ میں دیکھ رہا ہوں، آپ کی نیت میں کوئی فتور نہیں اور آپ کا ارادہ بھی خاصا مضبوط ہے۔ اب رہ گئی کوشش کی بات......تو اس سلسلے میں آپ کو سب سے پہلے ایک ضروری کام کرنا ہے......"

"کون سا کام؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"جس طرح آپ نے اپنے ذہن کو استعمال کر کے یہ تسلی کر لی ہے کہ زینی گونگی ہے اور نہ ہی لنگڑی......" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسی طرح ہمت کر کے اپنے دل کی بات کو اس کے دل تک پہنچا کر اس امر کی تصدیق کریں کہ آپ یہ تالی ایک ہی ہاتھ سے بجانے کی کوشش کر رہے ہیں یا......"

"یہ میرے ذہن میں بھی ہے صفدر صاحب......" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پیار محبت کے معاملات کو دل میں دبا کر یا ذہن میں چھپا کر رکھنے سے بات نہیں بنتی شیراز بھائی......" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "یہ نہ ہو کہ آپ بغیر رسید لیے جس بینک میں اپنے جذبات اور احساسات ڈپازٹ کرتے جا رہے ہیں، بعد میں پتا چلے کہ وہ بینک ہی دیوالیا ہو گیا۔ میں آپ کو کسی صدمے سے دوچار ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......؟"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

آج میں گھر سے یہ ٹھان کر نکلا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں اپنے دل کی آواز کو زینی کے دل تک پہنچا کر ہی رہوں گا۔ حسبِ معمول میں نے اس کے نزدیک اپنی بائیک روکی اور سو روپے والا ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں نے دس، بیس اور پچاس والے نوٹ کو لفٹ کرانا چھوڑ دی تھی اور جب بھی میں اس کے پاس رکتا تھا، اسے کم از کم سو روپے ہی دیتا تھا۔

"بابو! لگتا ہے، آج کل تیرا دھندا خوب چمکا ہوا ہے......" اس نے میرے ہاتھ سے نوٹ لیتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ "تو مجھے دس، بیس دینا ہی بھول گیا ہے۔"

"میرا کوئی دھندا نہیں ہے۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں ایک مقامی رسالے میں جاب کرتا ہوں۔"

"اوہ......جاب!" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ "مہینے کا کتنا کما لیتے ہو؟"

"میری تنخواہ چالیس ہزار روپے ہے۔" میں نے بتایا۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ تو مہینے میں ایک لاکھ سے زیادہ نہیں کماتا ہوگا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

وہ خود مجھے بات کرنے کا موقع فراہم کررہی تھی۔ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ اندازہ تم نے کس بنیاد پر قائم کیا ہے؟"

"بابو! میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جب مرد کی آمدنی ایک لاکھ سے اوپر ہو جاتی ہے تو وہ کار کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ "تیری طرح موٹر سائیکل کو گھسیٹتا نہیں پھرتا۔"

"تم کہہ تو بالکل ٹھیک رہی ہو زینی۔" میں نے گول مول بات کی۔

"ایک بات پوچھوں بابو؟" وہ میری آنکھوں میں تکتے ہوئے بولی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں، ضرور......"

"تو اپنی آدھی تنخواہ تو بھیک میں مجھے دے جاتا ہے......" وہ تیکھے انداز میں مستفسر ہوئی۔ "تیری گھر والی تو تجھ سے بہت جھگڑا کرتی ہوگی؟"

"میری گھر والی نہیں ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تو، تو مجھے پکی عمر کا لگتا ہے۔" وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی۔ "تو نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"آج سے تیرہ سال پہلے میں نے شادی کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک سال ہوا، میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ میرا تین سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بس یہی میری زندگی ہے۔"

"تیری بیوی کی موت کا سن کر مجھے افسوس ہوا۔" اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

میرے اندر سے، محبت کے مارے ہوئے شیراز علی نے چیخ سے مشابہ آواز میں خاموش احتجاج کیا۔ "ابے او گدھے! تو رخشندہ کے ماتم میں وقت کیوں برباد کررہا ہے۔ زینی سے کام کی بات کر۔ اگر یہ تجھ سے دھیان ہٹا کر اپنے دھندے میں لگ گئی تو پھر حالِ دل بیان کرنے کا یہ سنہری موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"زینی! اگر تمہیں برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟" میں نے اندر والے شیراز کی سن لی۔

"ہاں بول......" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم بہت خوب صورت ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔

"ہاں......" وہ سرسری انداز میں بولی۔ "تیری طرح اور بھی دو تین بندوں نے مجھ سے ایسی بات کی ہے۔"

"میں ان بندوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں زینی......"

میرے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ چونک کر مجھے تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے گہرا تذبذب ہلکورے لیتا نظر آیا۔ چند لمحات کی پُراسرار خاموشی کے بعد اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"مجھے یہ تو اندازہ ہو چکا ہے کہ تو مجھ پر نیت لگائے بیٹھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تیری نیت صاف ہے یا گڑبڑ......"

"مجھے غلط مت سمجھو زینی......" میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب تو اپنے من کی کہے گا۔" وہ گہری نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"میں تم سے جو بھی کہنا چاہتا ہوں، وہ بہت خاص ہے۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟"

اس نے شک آلود نظر سے مجھے گھورا پھر بڑی بے باکی سے استفسار کیا۔ "میرے ٹھکانے پر چلے گا یا مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہے......؟"

اس کے سوال نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان لمحات میں زینی کے دماغ میں کیا چل رہا تھا تاہم اس کے استفساریہ لہجے میں زمانے بھر کی سنسنی خیزی بھری ہوئی تھی۔ جواب دینا ضروری تھا چنانچہ میں نے کہہ دیا۔

"جیسے تمہیں آسانی ہو زینی!"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اپنا موبیل (موبائل) نمبر دے مجھے۔"

میں نے والٹ میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کارڈ پر میرا اسیل فون نمبر موجود ہے۔"

اس نے میرے وزیٹنگ کارڈ کو بہ غور دیکھنے کے بعد اپنے پاس رکھ لیا اور بات ختم کرنے والے انداز میں بولی۔

"اب تو جا یہاں سے۔ میں میسج کرکے تجھے بتادوں گی کہ کب اور کہاں آنا ہے۔"

اس نے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ بہرکیف، آج ہمارے بیچ جتنی بھی بات چیت ہوئی اس نے مجھے شاداں وفرحاں کردیا تھا۔

☆☆☆

اس روز آفس پہنچ کر میں نے صفدر حسین کو، زینی سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

"پروگریس ہو تو رہی ہے مگر اس کی رفتار بہت دھیمی ہے شیراز بھائی!"

"اگلی ملاقات پر صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو بہت پُرامید ہوں صفدر بھائی!"

"اور میں آپ کے لیے دعاگو ہوں کہ آپ کی ساری اُمیدیں برآئیں۔" اس نے خلوصِ نیت سے کہا۔

"آمین!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ لیکن زینی کی جانب سے مجھے کوئی میسج موصول نہیں ہوا۔ اگلے روز وہ شاہراہِ قائدین والے سگنل پر بھی مجھے دکھائی نہیں دی تو میں اس کے بارے میں فکرمند ہو گیا۔ آفس پہنچ کر میں نے صفدر حسین کو زینی کی خاموشی اور غیاب کے بارے میں بتایا تو اس نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے شیراز بھائی۔ ہو سکتا ہے، زینی کی طبیعت ٹھیک نہ ہو اس لیے وہ آج دھندے کے لیے گھر سے نہ نکلی ہو۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو اس کے گھر کا پتا بھی نہیں جانتا ورنہ اس کی خیریت دریافت کرنے ضرور جاتا۔"

"آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے ہیں شیراز بھائی۔"

"اگر آپ میری جگہ پر ہوتے تو آپ کی بھی یہی کیفیت ہوتی۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے صفدر بھائی۔"

"آپ اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔" وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ آپ کو صبر اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

ادھر صفدر حسین کی بات مکمل ہوئی، ادھر میرے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ وہ میسج کسی اجنبی نمبر سے آیا تھا۔ میں نے مذکورہ میسج کو اوپن کیا۔ وہاں لکھا تھا۔

"کل دوپہر دو بجے، ائرپورٹ کے سامنے والے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں آ کر مجھ سے مل بابو۔ کسی کو ساتھ نہیں لانا...... زینی!"

میں نے وہ میسج صفدر حسین کو دکھایا۔ اس نے مذکورہ میسج کو پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "مبارک ہو شیراز بھائی۔ آپ کی زینی نے میٹنگ فکس کر دی ہے۔ اب آپ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیجیے گا۔ آگے جو اللہ کو منظور......!"

"وہ تو ٹھیک ہے......" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "لیکن زینی نے تو کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے ٹھکانے پر بلائے گی پھر یہ ائرپورٹ اور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کی کیا کہانی ہے؟"

"یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا شیراز بھائی۔" اس نے کہا۔ "عین ممکن ہے کہ زینی نے بھیک مانگنے کا پوائنٹ بدل لیا ہو اور اب وہی اس کا ٹھکانا ہو جہاں وہ آپ کو بلا رہی ہے۔"

منطقی اعتبار سے صفدر حسین کی بات درست تھی لیکن میں نے اپنی تسلی کی خاطر اس نمبر پر فون کیا جہاں سے زینی کا میسج آیا تھا۔ میری تین، چار بار کی کوشش کے باوجود بھی کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی۔

میں نے یہ سوچ کر بوجھل دل کے ساتھ صبر کر لیا کہ کل دوپہر میں وقت ہی کتنا ہے۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے کے بعد، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔

☆☆☆

میں نے کافی عرصے سے شاہراہِ قائدین کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے اور یہ سب زینی کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب زینی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس روز زینی سے ہونے والی ملاقات نے میرے احساسات اور حواس پر ایسی بجلی گرائی تھی کہ اس نے میرے دل و دماغ کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

زینی کے میسج کے مطابق، میں اس روز دوپہر میں ائرپورٹ کے سامنے والے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت خاصا رش تھا۔ میں نے زینی کی تلاش میں نگاہ دوڑائی لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں کونے والی ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے ریسٹورنٹ کا داخلی دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ اگر وہ اندر آتی تو میری نگاہ سے بچ نہیں سکتی تھی۔

میں مذکورہ دروازے پر نظر جمائے بیٹھا تھا کہ ایک خوش لباس، زہرہ جمال حسینہ میرے پہلو سے نکل کر سامنے آ گئی اور خاصی بے تکلفی سے بولی۔

"بابو آ گیا تو......!"

میں نے زینی کو اس کی آواز اور مخصوص لب و لہجے سے پہچان لیا ورنہ اس کی سج دھج، پہناوا اور اٹھان کسی بھی طور

شناسائی میں آنے والی نہیں تھی۔
”زینی...... یہ تم ہو......“ میں نے حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے تمہارا یہ روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“
”آج کے بعد بھی کبھی نہیں دیکھو گے کیونکہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“ وہ رعونت بھرے لہجے میں بولی۔ ”تیرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔“ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”جو بھی کہنا ہے، کہہ ڈال۔ میں اٹھ گئی تو پھر تیری ایک نہیں سنوں گی۔ میں اگلی فلائٹ سے سعودی عرب جارہی ہوں۔“
”کیا عمرہ کرنے جارہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیونکہ حج میں تو ابھی ایک ماہ سے زیادہ وقت پڑا ہے۔“
”میں عمرہ یا حج کرنے سعودی عرب نہیں جارہی۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”یہ سالانہ دھندے کا پروگرام ہے۔ میرے ساتھ ہماری برادری کے پچیس اور افراد بھی ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھ، تجھے وہ لوگ گروپ کی شکل میں بیٹھے نظر آئیں گے۔“
میں نے اپنے عقب میں نگاہ دوڑائی تو زینی کی بات مجھے سولہ آنے درست نظر آئی۔ بے ساختہ میں نے سوال کردیا۔
”تم لوگ وہاں کس قسم کا دھندا کرنے جارہے ہو؟“
”وہی...... جو ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔“ وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ ”ہم ہر سال حج سے پہلے اور بعد میں لگ بھگ تین ماہ کے لیے عرب کے دورے پر جاتے ہیں اور وہاں بھیک مانگتے ہیں۔ حرم کے باہر اور مدینہ کی گلیوں میں، ہم پر ریالے (ریال) برستے ہیں۔ تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان تین ماہ میں ہم لوگ کتنا کما لیتے ہیں۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
”ہم اور ہمارا دھندا تیری سمجھ میں نہیں آسکتا بابو اس لیے تو اپنے دماغ پر زیادہ زور نہ دے۔ ہم لوگ پاکستان میں تو صرف نو مہینے کی چھٹیاں گزارنے آتے ہیں اور ”ٹک ٹک“ تھوڑا بہت دھندا بھی کرتے رہتے ہیں۔ اب کی بار ہم میں سے چند لوگ دبئی چلے جائیں گے جن میں، میں بھی شامل ہوں۔ میں نے ادھر مستقل رہائش کی سیٹنگ بنالی ہے۔ انسان کماتا آخر کس لیے ہے۔ میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے کہ تین ماہ سعودیہ کا دھندا۔ باقی کے نو ماہ دبئی میں عیش و آرام کی زندگی۔“
مجھے وہ سب خواب خواب سا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے ایک بار اپنے بازو پر چٹکی بھی کاٹی تاکہ اگر یہ خواب ہے تو میری آنکھ کھل جائے لیکن میری آنکھیں کھلی ہی رہیں۔ میں خواب ناک ماحول میں ایک سفاک حقیقت کے روبرو تھا۔
”میں نے تجھے پندرہ منٹ دیے تھے بابو......!“ وہ اپنی قیمتی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ”جس میں سے تو نے دس منٹ فضول باتوں میں برباد کر ڈالے۔ تیرے پاس اب صرف پانچ منٹ بچے ہیں۔“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے گھورا اور کہا۔ ”تو نے ابھی تک اپنی کوئی بات نہیں کی......؟“
”میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں زینی......“ میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔
”عورت کو حاصل کرنے کے لیے یہ مرد کا سب سے خطرناک داؤ ہے بابو......“ وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ”میں نے بہت سے ہوس پرست مردوں سے دھوکا کھایا ہے۔ میرے سامنے تو محبت کا نام بھی مت لو۔“
”میں ان مطلب پرست اور عیاش مردوں میں سے نہیں ہوں زینی......“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تم سے باقاعدہ شادی کروں گا اور عزت و آبرو کے ساتھ اپنے گھر میں رکھوں گا۔“
”تو مجھ سے شادی کرے گا......؟“ وہ مجھ پر حقارت بھری نظر ڈالتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”او چالیس ہزار روپے ماہانہ کمانے والے بابو! تیری اوقات ہے مجھ سے شادی کرنے کی......؟“
بات ختم کرتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ قبل اس کے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتا، وہ اپنی بین الاقوامی بھکاری برادری میں جا کر گھل مل چکی تھی۔
سچی بات تو یہ ہے کہ زینی نے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے آخری الفاظ نے مجھے اندر سے سنگسار کردیا تھا۔ وہ مجھے میری اوقات یاد دلا کر، اپنی نظر میں بھک منگا بنا گئی تھی۔
جب بھی میں اب کہیں جاتا آتا ہوں تو سڑک پر سفر کرتے ہوئے میں صرف سگنل کی سرخ اور سبز بتیوں پر نگاہ رکھتا ہوں۔ میری نظر غلطی سے بھی بھی اس سگنل کی جڑ میں بیٹھی ہوئی کسی بھکارن پر نہیں پڑی۔ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پھر کوئی سگنل والی مجھے محبت کی شاہراہ پر سگنل فری نہ کردے۔ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں۔
”ایک محبت کافی ہے۔ باقی عمر اضافی ہے۔“

❖❖❖

ذہانت کے ذریعے کی جانے والی خیانت کے خطرناک مضرات......

زندگی احساس سے مشروط ہے... اور انسانی وجود جذبات و احساسات کے بغیر نامکمل رہتا ہے... وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات... اخلاقی جبلت اور فطرت سے خالی ایسے جسم و وجود میں آچکے ہیں جو انگلی کی ایک جنبش پر ہر حکم بجا لاتے ہیں...

# سُرخ دھبّا

انور ظہیر رہبر

ٹیکساس کی خوبصورت سڑک پر آٹومیٹک کار بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھی میگی کار میں لگی ایک بڑی اسکرین پر اپنی پسندیدہ ٹی وی سیریل دیکھ رہی تھی۔ روبوٹک کار میں سب کچھ خودکار نظام کے تحت چل رہا تھا۔ کار کی ونڈ اسکرین پر میگی کبھی کبھار دیکھ لیتی کیونکہ اس کار میں اُسے صرف ایک مسافر کی طرح بیٹھنا تھا اور سفر کو انجوائے کرنا تھا۔ سارا کام کار میں لگے روبوٹ مسٹر فال نے سنبھال رکھا تھا۔ کار کی رفتار کب بڑھانی ہے، کب کم کرنی ہے، سگنل پر یا زیبرا کراسنگ پر رکنا ہے، گاڑی میں لگا روبوٹ اور اُس سے منسلک تمام سینسر اپنا کام بڑی مستعدی سے کر رہے تھے۔ کار بہت آرام دہ اور بہت ہی خوبصورت تھی۔ میگی اپنے اس روبوٹک کار کے سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ٹی وی سیریل بہت ہی دلچسپ تھی اور وہ اس میں بُری طرح منہمک ہو چکی تھی۔

کار کی دوسری اسکرین پر جہاں میگی کی نظر نہیں تھی، ایک سرخ اسپاٹ مستقل جل بجھ رہا تھا شاید کوئی الارم تھا جو کچھ بتا رہا تھا لیکن میگی تو اپنی فلم میں محو تھی اور پھر اچانک سے ایک

زبردست قسم کا زور دار دھماکا ہوا اور کار کسی چیز سے ٹکرائی۔
میگی کو زبردست جھٹکا لگا تب اسے خیال آیا کہ جلدی سے ایمرجنسی بریک کا بٹن دبائے۔ بٹن کے دبنے کی دیر تھی کہ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور گاڑی رک گئی۔ لیکن اس وقت تک وہ بوڑھا شخص جس کی سائیکل کو کار نے ٹکر ماری تھی، سڑک پر گرا آخری سانسیں لے رہا تھا۔

"اُف یہ اسٹوپڈ لوگ سڑک درمیان سے کراس کرتے ہیں۔ اگر زیبرا کراسنگ سے کرتے تو گاڑی کا خودکار نظام اس کو پہچان لیتا۔"

میگی بڑبڑا رہی تھی مگر اتنی بلند آواز سے کہ راہگیر جو اس دھماکے کی آواز سن کر یہاں جمع ہوگئے تھے، وہ بھی سن لیں۔ اس طرح وہ اپنی غلطی کو اس شخص پر ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میگی نے جلدی سے اپنا فون نکالا اور پولیس کو حادثے کی اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس اور ایمبولینس اس جگہ پہنچ گئیں۔ پولیس والے میگی سے مستقل سوال کر رہے تھے اور وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اُسے جلدی تھی کہیں پہنچنے کی۔ اس نے پولیس والے سے درخواست کی کہ اس کی ایک زوم میٹنگ ہے، وہ اسے ایک اہم فون کرنے دیں اس کے بعد ہی وہ ان کے سوالات کا جواب دے سکے گی۔

اب میگی مستقل فون کر رہی تھی لیکن اُسے اس کا مطلوبہ شخص... نہیں مل رہا تھا۔ اس کی بے چینی دیکھ کر ایک خاتون پولیس نے اس سے دریافت کیا۔

"میڈم۔ کیا بات ہے آپ بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی لگ رہی ہیں؟"

اس پولیس خاتون کا خیال تھا کہ اس جان لیوا حادثے کی وجہ سے وہ پریشان ہوگی لیکن میگی تو کسی اور بات سے پریشان تھی، وہ بولی۔ "دراصل مجھے دفتر پہنچنے میں دیر ہورہی ہے۔ دفتر میں میری ساؤتھ کوریا کے ایک روبوٹ کے انجینئر کے ساتھ زوم میٹنگ ہے اور آج ہماری فرم کے لیے ایک بہت بڑے تجارتی معاہدے کو آخری شکل دینی ہے، لیکن جس شخص سے میٹنگ ہے اس سے رابطہ نہیں ہورہا۔ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں کچھ تاخیر سے اُسے جوائن کروں گی۔"

"اوہ!" پولیس عورت میگی کی بات پر اُسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

خدا خدا کر کے میگی کی پولیس والوں سے جان چھوٹی تو اُس نے اپنی ربوٹک کار سے باقی سفر طے کیا اور اپنے دفتر پہنچی۔ دفتر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔ جلدی سے اپنا کوٹ اتارا اور کرسی پر پھینکا اور جلدی سے لیپ ٹاپ آن کیا اور پھر زوم میٹنگ کو۔ لیکن دوسری طرف سے مسٹر یونگ زوم پر نظر نہیں آرہے تھے۔ میگی پریشان تھی کہ یہ بڑی ڈیل کہیں مس نہ ہوجائے۔ اس نے جلدی سے ساؤتھ کوریا کی فرم کوشان کو فون لگایا اور مسٹر یونگ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک کورین لہجے کی آواز میں ایک خاتون نے اسے بتایا کہ "معافی چاہتی ہوں آپ مسٹر یونگ سے بات نہیں کر پائیں گی۔ وہ اس وقت آپ سے بات نہیں کر سکتے۔"

"ارے میری اُن کے ساتھ ایک اہم میٹنگ ہے دراصل میں حادثے کا شکار ہوگئی تھی اس لیے وقت پر رابطہ نہیں کر سکی......"

میگی اس خاتون کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچھا آپ بھی؟" اس خاتون کے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن فوراً ہی وہ اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھیں مجھے جتنا کہا گیا ہے، اُتنا ہی بتا رہی ہوں کہ اس وقت وہ آپ سے بات نہیں کر سکتے۔"

یہ کہہ کر اس خاتون نے فون بند کر دیا۔

عجیب و غریب سی بات ہے۔ میگی پریشان سی کمرے سے نکلی تاکہ اپنے باس کو صورتِ حال سے آگاہ کر سکے۔

☆☆☆

جنوبی کوریا گوسیونگ نامی علاقے کے جنوبی ضلع میں موجود فرم کوشان میں مسٹر یونگ جب داخل ہوا تو اس وقت اُس کے سر پر آج کی میٹنگ سوار تھی۔ روبوٹ انجینئر ہونے کے ناتے وہ اس فرم کا سینئر ڈائریکٹر بھی تھا اور اس فرم میں خودکار کام کرنے والے روبوٹ کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا تھا کیونکہ یہ روبوٹ بنانے کے کام... بھی کر چکا تھا اور اس میں اس نے اپنا بہت نام کمایا تھا۔ آج اس نے اپنی ڈیوٹی دوسری شفٹ میں کروائی تھی تاکہ رات 12 بجے وہ دفتر سے ٹیکساس امریکا زوم پر میگی کے ساتھ میٹنگ کر سکے۔ پندرہ گھنٹے کے فرق کے باعث اسے اکثر بزنس کے لیے ایسا ہی کرنا پڑتا تھا۔

حسبِ معمول دفتر پہنچ کر اس نے اپنا چھوٹا سا فریج کھولا اور اورنج جوس کا ڈبا نکالا۔ اورنج جوس کے گلاس کو منہ سے لگائے آج کی میٹنگ کی تفصیل دیکھنے لگا۔ اسے بہت خوشی تھی کہ اس کا روبوٹ ایکسپرٹ کے طور پر آج ٹیکساس سے ایک بڑا معاہدہ ہونا ہے۔ جوس پینے سے اسے مزید بھوک لگنے لگی۔ اس نے آن لائن پیزا کا آرڈر دیا۔ آدھے گھنٹے میں پیزا اس کی میز پر تھا۔ ابھی اس نے پیزے کا ایک ٹکڑا اٹھایا تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجائیں کون ہے۔" اس نے آواز لگائی۔

ہانپتا کانپتا ایک شخص اندر دوڑتا ہوا آیا اور مسٹر یونگ سے مخاطب ہوا۔

''مسٹر یونگ روبوٹ روبروک میں کوئی خرابی ہوگئی ہے، وہ ڈبوں کو درست انداز سے اکٹھے نہیں کر رہا جس سے پیکنگ میں خلل پڑ رہا ہے۔''

اندر آنے والے شخص نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

''او کے او کے، تم چلو میں آتا ہوں۔'' مسٹر یونگ نے اس شخص سے کہا۔

اس شخص کے جانے کے بعد اس نے پیزا کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اب وہ ربوٹ روبروک کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ہال میں بے ترتیبی سے سارے ڈبے بکھرے پڑے ہیں بلکہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے اس بے ترتیبی کو دیکھا اور پھر روبروک روبوٹ سے مخاطب ہوا۔

''کیوں مسٹر روبروک یہ سب کیا ہے، کیا آج ٹھیک سے کام کرنے کا دل نہیں چاہ رہا؟''

روبروک ایک دیو ہیکل روبوٹ تھا۔ جس کے بڑے بڑے بھاری ہاتھ اور بڑے بڑے پاؤں کے سامنے مسٹر یونگ ایک بہت ہی چھوٹا سا کھلونا نما انسان نظر آ رہا تھا۔ لیکن مسٹر یونگ کو اپنے بنائے ان روبوٹ پر بڑا فخر تھا اور وہ ان دیو ہیکل کو اپنے قابو میں رکھتا تھا۔ اس خاص روبوٹ پر اسے فخر ہی نہیں بہت ناز تو تھا ہی اور کچھ گھمنڈ بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ روبوٹ کے درمیان رہنے والا یہ شخص خود بھی روبوٹ بن چکا تھا۔ اس کی اپنی سیکریٹری کئی سالوں سے اس کی مسکراہٹ اور اس کی قربت کے لیے تڑپ رہی تھی لیکن مسٹر یونگ کو صرف اپنے روبوٹوں میں ہی رہنا پسند تھا۔ وہ ان سے ہی محبت کرتا، نفرت کرتا اور نئی نئی اختراع بھی ایجاد کرتا رہتا......

اس نے روبروک روبوٹ کو آن کیا، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ روبوٹ میں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ پیزا کا ٹکڑا بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ روبوٹ اپنے بڑے بڑے پاؤں اٹھاتا ہوا ایک دیو کے مانند چند قدم آگے بڑھا اور پھر پلٹا اور ڈبے کو اٹھا کر ترتیب سے اوپر نیچے لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کا بھاری ہاتھ بالکل ہی غلط انداز میں حرکت کر رہا تھا اور ڈبوں کی ترتیب نہیں بن پا رہی تھی۔ مسٹر یونگ روبوٹ کے ذرا اور قریب گیا تو اسے روبوٹ کی قربت کا احساس ہونے لگا۔ ابھی وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک روبوٹ نے ڈبے کے بجائے مسٹر یونگ کو دبوچا اور کنویئر بیلٹ پر دے مارا۔ کام کرنے والے دوسرے لوگ دوڑے اور ایک شخص نے روبوٹ کا ایمرجنسی بٹن دبا کر اسے مزید حرکت کرنے سے روکا۔ اور دوسرے شخص نے کنویئر بیلٹ کو بند کیا۔ مسٹر یونگ کے سر اور سینے پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ انہیں فوری طور پر اسپتال شفٹ کر دیا گیا۔ جب میگی کا فون آیا تھا اور وہ مسٹر یونگ کو تلاش کر رہی تھی تو اس وقت فرم کی سیکریٹری نے اپنی فرم کے اس حادثے کی خبر کو باہر نہ نکلنے کے باعث صرف میگی سے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ مسٹر یونگ اس وقت بات نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

آج جب میگی دفتر آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے نام بہت سارے خطوط آئے ہوئے تھے۔ اس نے خطوں کو کھولنا شروع کیا۔ ایک خط کورٹ کا تھا۔ اس پر وکیل استغاثہ نے الزام لگایا تھا کہ اس حادثے کی وجہ وہ تھی۔ وہ زور زور سے بڑبڑانے لگی۔

''ارے حادثہ تو روبوٹ کا رنے کیا ہے میں نے تھوڑی، یہ مجھ پر کیوں الزام لگایا جا رہا ہے؟''

بڑبڑاتے ہوئے اس نے اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ اخبار کے تیسرے صفحے پر ایک بہت ہی چھوٹی سی خبر نے اسے چونکا دیا۔

''مصنوعی ذہانت کے ایک ربوٹ نے جنوبی کوریا میں ایک شخص کو دبوچ لیا۔'' وہ اخبار لے کر اپنے باس کے پاس دوڑی۔

''مسٹر ابراہام دیکھیں یہ خبر دیکھیں۔ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے جنوبی کوریا سے روبوٹ خریدنے کا بڑا معاہدہ نہیں کیا۔''

''اچھا مجھے بھی دکھاؤ، کیا خبر ہے۔''

مسٹر ابراہام نے میگی سے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

''سوری میگی! تمہارا اندازہ غلط ہے۔ ارے فرم میں پہلے بھی حادثات ہوتے رہے ہیں، وہ انسانوں سے ہوتے تھے اب روبوٹ سے ہو رہے ہیں۔ حادثے کی وجہ سے کیا فرم بند کر کے کاروبار کرنا چھوڑ دیا جائے۔ تم کوشش کرو یہ روبوٹ ہمیں ہر حال میں ملیں۔ ہم ان روبوٹوں کو لے کر اس کی پوری جانچ پڑتال کریں گے اور اس کی ساری خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے زیادہ بہتر روبوٹ بنا کر جنوبی کوریا کو پیچھے دھکیل دیں گیا۔ اگر اس کے لیے ایک دو مزدور ہمیں قربان کرنا پڑے تو کیا ہوا۔ ہم دے دیں گے کچھ پیسے ان کے خاندان کو...... پہلے مشین پر خون کا سرخ دھبا لگتا تھا اور اب روبوٹ پر......'' باس نے نہایت اطمینان سے اپنی بات ختم کی۔

❖❖❖

# بلائے جاں

ابراہیم عبدالہادی

اگر فطرت کسی پائدار رجحان پر مرکوز نہ ہو تو کسی بھی شے کی طلب اور والہانہ لگائو دیرپا نہیں رہتا... اس کی طلب کی شدت اسے کسی ایک مطلوب تک محدود نہیں رہنے دیتی... اس والہانہ لگائو پیدا کرنے کی سب سے بڑی قوت جس عام حیوانی جبلت میں پائی جاتی ہے، وہ جنسی جبلت ہے... یہ لگائو اخلاق کے دائرے سے باہر نکلے تو شدید بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ دورِ حدید کے نئے تقاضوں اور کرتوتوں کے وہ رنگ ڈھنگ جس نے نئی نسل کے لہو میں دوڑنا شروع کر دیا ہے... اچھائی سے دور اور برائی کے نزدیک ناپائیدار راستے ان کی منزل بن چکے ہیں۔ جدید آلاتِ زندگی کے عمل دخل سے رونما ہونے والی تباہی و بربادی کی دل خراش داستاں...

بلائے جاں کی طرح چمٹ جانے والے لذت وکیف کے پُرآزار سانحات ظلمات

اُس کے اطراف میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس اندھیرے میں ہر سُو عجیب چیختا چنگھاڑتا شور تھا جو اعصاب کے لیے سخت آزار بنا ہوا تھا۔

’’یہ سب آخر کب تک چلے گا؟ اس عذاب کا کوئی اختتام ہے بھی یا میری زندگی اسی طرح چلتی رہے گی؟‘‘ اس نے جھنجلا کر سوچا۔

پھر اسے ایک حل سُجھائی دے ہی گیا۔

☆☆☆

بلند آہنگ موسیقی نے گھر بھر کی فضا مرتعش کر رکھی تھی۔ اس موسیقی کی نوعیت ہر دوسرے منٹ کے بعد تبدیل ہو جاتی تھی۔

’’کیا بات ہے؟ تمہارے ہاتھوں کو چین نہیں ہے کیا؟ تھوڑا سا ٹیپو بننے ہی لگتا ہے کہ تم سارے موڈ کی مدر سسٹر ایک کر دیتے ہو۔ کوئی تو سونگ پورا چلنے دو۔‘‘ جواد نے زچ ہو کر عمران کو مخاطب کیا جس نے موسیقی کا انتظام سنبھال رکھا تھا۔

’’اس گدھے کو یہاں کا کنٹرول دے کر بٹھایا کس نے ہے؟‘‘ ثانیہ نے منہ بگاڑ کر پوچھا۔

’’میں نے بٹھایا ہے اسے یہاں۔ اینی پرابلم؟‘‘ فائزہ نے جواب دیا۔ وہ اس تمام تر رونق اور ہلے گلے کا محور و مرکز تھی۔

’’یس! بالکل ہے پرابلم۔‘‘ ثانیہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔ ’’تم خود سوچو ذرا۔ ڈیکوریشن، لائٹنگ ہر چیز پرفیکٹ ہے لیکن میوزک سسٹم گاجر کے حلوے میں نمک ثابت ہو رہا ہے۔‘‘

ثانیہ کی اس بات پر فائزہ نے غیر اختیاری طور پر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے، دیواروں اور سیڑھیوں کے جنگلے کے گرد گیندے کے خوب صورت پھول لپٹے تھے۔ دیواروں کی بالائی اطراف میں مخصوص برقی قمقموں کی لڑیاں چپکائی گئی تھیں۔ ان

قمقموں سے مختلف رنگوں کا انعکاس ماحول میں خوشگواریت پیدا کر رہا تھا تو چھت کے وسط میں نصب فانوس کے ڈسکو بلب اس خوشگواریت میں ترنگ کا اضافہ کر رہے تھے۔ کمرے میں موجود تقریباً نصف درجن افراد ڈانس ریہرسل کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ان تمام عوامل و عناصر کا جائزہ لیتی فائزہ کے دل میں فخر و غرور کی لہریں موجزن ہونے لگیں۔ ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی بلوغت کی وادی میں قدم رکھتے ہی شادی کے خواب دیکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق ان خوابوں کے رنگوں میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ ہر روایتی لڑکی کی طرح وہ اپنی شادی کی بھی تقریبات یادگار بنانا چاہتی تھی۔

''کیا ہوا؟ اب خاموش کیوں ہو گئی ہو؟'' ثانیہ نے جھنجلا کر دریافت کیا۔

''تھنک یو!'' اس نے سر جھٹکا اور اپنے کمرے سے ایک یو ایس بی نکال لائی۔ ''اسے اٹیچ کر لو۔''

''جیتی رہو وش کنیا! ہمیں تم سے یہی امید تھی تم نے بروقت ہماری مدد کی ہے اس لیے ہم یہی دعا اور کوشش کریں گے کہ تمہاری شادی یادگار ثابت ہو۔ سب مل کر بولو آمین!!'' متین نے تان لگائی۔

اس تان میں بھی افراد نے بہ آواز بلند حصہ لیا۔ فائزہ بھی زیرِ لب آمین کہہ اٹھی۔ غالباً وہ لمحہ قبولیت ہی کا تھا۔ فائزہ کی شادی حقیقتاً بہت یادگار ثابت ہوئی تھی۔ اپنی دعاؤں کی اس قبولیت سے بے خبر وہ موبائل فون پر آنے والی کال کی جانب متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

دانش طیب کے گھر بھی اس وقت قدرے گہما گہمی تھی۔ گھر کی زیریں منزل پر بالکل خاموشی طاری تھی۔ اس کے والدین فائزہ کے ولیمے کا سلائی شدہ جوڑا لینے کے لیے بوتیک پر گئے تھے۔ چھوٹی بہن طوبیٰ پارلر روانہ ہو چکی تھی۔ ان کی روانگی کے بعد دانش کے قریبی دوست بالائی منزل پر اس کے کمرے میں دندناتے پھر رہے تھے۔

دانش کا کمرا اس وقت کسی بھی سامان سے بالکل عاری تھا۔ فرش پر بچھے قالین اور دو کاؤچز کے سوا کہیں کوئی اسباب نہ تھا۔

''ویسے یار دانی! تیری شادی کا سامان بہت زیادہ لیٹ نہیں ہو گیا؟'' سعد نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے دریافت کیا۔

''پرسوں تک آجائے گا۔ کوئی پالشنگ کا کام رہ گیا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''شادی میں ٹائم ہی کتنا رہ گیا ہے بھئی؟ اور اب تک سامان کا کوئی اتا پتا نہیں۔''

''کون سی بے کار باتوں میں الجھ رہے ہو یار؟ جس کام کے لیے یہاں آئے ہو، اس معاملے میں کوئی سیریس

ہی نہیں ہو رہا۔ لڑکی والوں کے سامنے ناک کٹواؤ گے کیا میری؟" دانش نے انہیں غصے سے ٹوکا۔

"یار تیری قسم! بہت کوشش کر رہے ہیں۔ ٹیمپو ہی نہیں بن رہا۔" سعد کھسیایا۔

"اپنے جاسم کی شادی پر تو سب نے بندروں کی طرح اچھل اچھل کر بہت ڈانس کیا تھا۔" وہ حسبِ مزاج ایک بار پھر تنک گیا۔

"یار! تیرا شکوہ اپنی جگہ بالکل جائز ہے لیکن یاد کر ذرا! اُس وقت اپنا جگر بلال یہاں موجود تھا۔ ڈانس تو وہی سکھاتا تھا ناہمیں۔" فہد نے فوراً تاویل دی۔

دانش ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ فہد کی تاویل بالکل درست تھی۔ بلال اپنے ہر دوست کی منگنی اور شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ اس کا جسم قدرتی طور پر ہی بہت لچک دار تھا۔ اس لیے ہر قسم کے رقص کو نہایت مہارت سے اختیار کر لیتا۔

"تو تم لوگوں کے دماغوں میں بھوسا بھرا ہے کیا؟ کچھ اپنی عقل سے بھی کام لے لو۔" دانش نے دانت پیسے۔ "جو ڈانس وہ تمہیں جاسم کی شادی پر سکھا کر گیا تھا وہی میری مہندی پر کرلو۔"

"آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔" فہد نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"لیکن ایک ایشو ہے۔" سعد نے بھی کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "جاسم کی شادی کو دو سال ہو چکے ہیں۔ اس وقت سونگز کا ٹرینڈ کچھ اور تھا۔ اب مارکیٹ میں اور سونگز ہیں۔"

"ایک کام ہوسکتا ہے ویسے!" اس دوران خاموشی سے گفتگو سنتے عدنان نے انہیں مخاطب کیا اور سب کو اپنی جانب متوجہ پا کر کہنے لگا۔ "دانش تم کسی طرح بھابی سے پوچھو کہ ان کی سائڈ پر کس قسم کے سونگز پر پریکٹس ہو رہی ہے۔ اِدھر ہم بھی کوئی نئے پیس نکال کر اپنی 'یوٹیوب آنٹی' کا دروازہ ناک کرتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا یہ آنٹی کتنی ہر فن مولا ہیں۔"

"آل رائٹ! تم لوگ فی الحال جاسم کی شادی والی ویڈیوز نکال کر اپنی میموری فریش کرو۔ میں فائزہ سے بات کر کے آتا ہوں۔" دانش نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ دوسری جانب 'بزی ٹون' سن کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

☆☆☆

اس کے سامنے ایک دوراہا تھا۔ دل و دماغ سخت اُلجھن میں تھے۔ اس دوراہے کی پہلی راہ پر ویسی ہی تاریکی تھی جو اَب تک اس پر مسلط تھی اور اب ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ دوسری راہ پر ایک خوش کن اور مسحور کن اجالا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اُجالا اس کے لیے ایک بالکل انوکھی شے تھی۔ ایسی خوشنمائی اور سحر اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ مخملیں اُجالا اس کا دل للچانے لگا۔

"اس راہ پر قدم رکھنا آسان نہیں ہے۔ کیسے مینج ہوگا سب کچھ؟" اس نے مضطرب ہو کر سوچا۔

اس اضطراب میں بے بسی واضح تھی اور یہی بے بسی اسے نئی مسافت اختیار کرنے پر اکساتی تھی۔

"ہو جائے گا مینج۔ تم کوشش تو کرو۔ آغاز میں کچھ مشکل تو ہوگی لیکن تم ہمت کر لینا۔ یہ سب کچھ تمہاری ہمت پر ہی منحصر کرتا ہے۔ اگر مینج کر لیا تو پھر اس عذاب سے تو جان چھوٹ جائے گی۔" اس نے خود کو سمجھایا۔

مسافت اب آسان دکھائی دینے لگی تھی۔

☆☆☆

فائزہ کے گھر گہما گہمی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ یو ایس بی میں ملنے والے گانوں اور فائزہ کی جانب سے ملنے والی گھرکیوں نے بھی کا جذبہ مہمیز کر دیا تھا۔ فائزہ بھی نہایت ذوق و شوق سے ان کی ہر ایک حرکت کا جائزہ لیتے گاہے بگاہے موصول ہونے والی فون کالز سننے میں مصروف تھی۔ کچھ ہی لحوں بعد موبائل فون پر بجنے والی مخصوص گھنٹی سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اسکرین کی جانب دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ یہ فون کال دانش کی جانب سے ہے۔

اُس نے اچٹتی نگاہ سے اطراف کا جائزہ لیا اور عجلت میں گھر کے عقبی حصے میں چلی آئی۔ یہاں موسیقی اور ہنگامے کا شور بھی تقریباً ناقابلِ سماعت تھا۔

"نمبر بزی جا رہا تھا تمہارا۔ کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔" اس نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد دریافت کیا۔

"جی ہاں! بزی تھا لیکن زیادہ دیر سے تو نہیں 'خیر۔" فائزہ نے فوراً وضاحت کی۔ وہ مختصر عرصے میں ہی دانش کے تند اور حاکمانہ مزاج سے واقف ہو چکی تھی۔

"کہاں بزی تھیں؟ کیا مجھ سے بھی زیادہ کوئی ضروری کام ہوسکتا ہے تمہارے لیے؟" دانش نے فوراً اگلا سوال جڑ دیا۔

''نن...... نہیں...... وہ مہندی لگانے والے کی کال تھی۔ ٹائمنگ کنفرم کررہا تھا۔'' فائزہ نے ہونٹ کچلتے ہوئے جواب دیا۔ دانش یونہی اپنے تند و تیز سوالات سے مقابل کو بوکھلا دیا کرتا تھا۔

''مہندی لگانے والے کے پاس تمہارا نمبر کیوں ہے؟ گھر میں کوئی بڑا نہیں تھا کیا؟ اور بائی دی وے! تم لوگوں نے کسی لیڈی کو ہائر کیوں نہیں کیا؟ مجھے جینٹس کا مہندی لگانا سخت بُرا لگتا ہے۔ فوراً ہی یہ ریزرویشن کینسل کرو۔'' وہ حسبِ عادت تندی سے کہتا چلا گیا۔

فائزہ کو اپنے اعصاب میں سخت کشیدگی محسوس ہونے لگی۔ دانش کے مزاج کے یہ رنگ اس کے لیے نئے نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ ہر بار ایک نئی اذیت محسوس کرتی تھی۔ دانش بے حد خود پسند، شکی مزاج اور حاکمانہ طبیعت کا مالک تھا۔

''ولیمے کا ڈریس ریڈی ہو کر آ گیا؟'' فائزہ نے سر جھٹکتے ہوئے موضوعِ گفتگو تبدیل کیا۔

''آجائے گا۔ ہمیں تم لوگوں سے زیادہ فکر ہے اس کی۔'' دانش نے رُکھائی سے جواب دیا۔

فائزہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

''خیر! یہ بتاؤ! فنکشن کی تیاری مکمل ہو گئی تم لوگوں کی طرف سے؟'' وہ اصل مدعا پر آیا۔

''جی! تقریباً۔'' فائزہ کا مزاج مکدر ہو چکا تھا۔ اپنی ذات کی نفی اور سرد مہر اندازِ گفتگو اب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔

''تم نے کوئی ویڈیو یا پکچرز سینڈ نہیں کیں مجھے؟ لڑکیاں تو اپنے فیانسیز کو ہر چھوٹی سے چھوٹی مومنٹ کی ویڈیوز سینڈ کیا کرتی ہیں۔''

دانش کے اس شکوے پر فائزہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ اس نے ویڈیوز بنائی ضرور تھیں لیکن اسے نہ بھیج پانے کی تاویل بتانے کی حماقت کبھی نہیں کر سکتی تھی۔

''وہ...... میں...... نے سرپرائز رکھا ہے آپ کے لیے۔'' اس سے کوئی اور بات نہ بن پڑی۔

''مجھے یہ سرپرائز کی حرکتیں سخت زہر لگتی ہیں۔ اس لیے پہلے ہی بتا رہا ہوں کہ اپنی یہ عادت وہیں چھوڑ کر آنا۔''

فائزہ کا مزاج مزید مکدر ہو گیا۔ وہ ہونٹ کچلتے گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

''اب اس طرح خاموش رہ کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟ اوہ...... اوکے...... تم بزی تھیں۔ میں نے خواہ مخواہ ڈسٹرب کر دیا۔ گو اہیڈ...... بائے۔'' دانش نے اس کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

فائزہ فون کان سے لگائے کتنی ہی دیر ساکت کھڑی رہی۔

ارے فائزہ! اسٹیچو بن کر کیوں کھڑی ہو گئی ہو؟ ایک سونگ فل تیار ہو گیا ہے۔ آجاؤ اندر۔ دکھاتے ہیں تمہیں۔'' اس کی سماعت میں متین کی آواز پڑی تو وہ اپنے خیالات سے چونک گئی اور ہمت مجتمع کرنے کے لیے گہری سانسیں بھرتی اس کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

''ہو گئی تیری پرائیویٹ کال؟'' دانش کے کمرے میں واپس آتے ہی فہد نے تان لگائی۔

''ہاں...... نہیں...... اس کی بہن نے فون اٹھایا تھا۔ وہ خود نماز پڑھ رہی تھی۔ میں بعد میں پوچھ لوں گا۔ تم جاسم والے سونگز پر پریکٹس اسٹارٹ کرو۔'' دانش نے خود کو متوازن کرتے ہوئے عذر تراشا۔

اس عذر کے کامیاب نتائج کے باوجود وہ شکن آلود پیشانی اور بھینچے ہونٹ لیے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے وجود میں سخت تلاطم برپا تھا۔ دانش کی خود پسندی اور انا اپنے مزاج کے خلاف کوئی بھی بات برداشت نہیں کرتی تھی۔ زندگی کے ہر معاملے کے متعلق اس کی اپنی ذاتی رائے تھی جو اس قدر اٹل تھی کہ کوئی بھی تاویل اسے قائل نہیں کر پاتی تھی۔ عورت ذات کے متعلق بھی اس کا نقطہ نظر یہی تھا کہ اسے ایک 'حد' میں رکھنا ہی پُرسکون زندگی کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ بصورت دیگر یہ 'ناقص العقل' مخلوق مرد کے لیے جینا دوبھر کر دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتی ہے۔ اس نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے تاحال اَن گنت لڑکیوں سے 'دوستانہ تعلقات' استوار رکھے تھے تاہم اس کے تند مزاج کے باعث کوئی بھی تعلق تین چار ماہ سے زیادہ استوار نہیں رہ پایا تھا۔ اس کی دو عدد منگنیاں بھی بے نتیجہ ثابت ہوئی تھیں۔ دانش نے اس صورتِ حال سے کچھ بھی سیکھنے کے بجائے شریکِ حیات کے معاملے میں اپنی کسوٹی سخت تر کر دی تھی۔ اس کسوٹی پر پورا اترتے اترتے فائزہ بے طرح ہلکان ہو چکی تھی۔

''اوئے صُمٌ بُکمٌ!'' سعد نے اس کا کندھا ہلایا۔

''جاسم نے تو اپنی مہندی پر کپل ڈانس بھی کیا تھا۔ تمہارا کیا پلان ہے؟''

دانش کی پیشانی ایک بار پھر شکن آلود ہو گئی۔

''ہاں! ابھی ڈسکس کرلوں گا یہ بات بھی۔'' اس نے ٹالتے ہوئے کہا اور اپنے ذہنی ارتکاز کی تبدیلی کے لیے ان سب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

نکاح کا مرحلہ بخیر و خوبی مکمل ہو چکا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کے بعد فائزہ اپنے دل و دماغ کو عجیب تبدیلیوں کی زد میں محسوس کر رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک گداز پیدا ہو چکا تھا جس کے زیرِ اثر آنکھوں میں بار بار نمی اُمڈ آتی تھی۔

دوسری جانب دانش کا بھی یہی حال تھا۔ منگیتر کے شریک حیات کے عہدے پر فائز ہوتے ہی اسے اپنے کندھوں پر ایک گراں ذمّے داری کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایسی ذمّے داری جس کے ساتھ یقینی طور پر بہت سی ذہنی الجھنیں بھی نتھی تھیں۔ ان خیالات نے جب دل و دماغ پر مزید بوجھ ڈالا تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

''ان مومنٹس کو انجوائے کرو دانش! یہ کن سوچوں میں پڑ گئے ہو؟ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی فنکشن پر فوکس کرو بس!'' اس نے خود کو پُرسکون کیا۔

اسی لمحے فہد، سعد اور عدنان اس سے بغلگیر ہو کر مبارک باد دینے چلے آئے تھے۔

''بلال کہاں رہ گیا؟ وہ تو کہہ رہا تھا فنکشن سے پہلے پہنچ جائے گا۔'' عدنان نے جز بز ہو کر استفسار کیا۔

''میں نے فون کیا تھا اُسے۔ کال ریسیو ہی نہیں کی اس نے۔'' سعد نے منہ بنایا۔ وہ سب حقیقتاً بلال کی کمی بے طرح محسوس کر رہے تھے۔

اسی اثنا میں دانش کو اسٹیج پر لے جانے کا غلغلہ بلند ہو گیا۔

''رسم کے بعد پورے اعتماد سے اپنی پرفارمنس دینا۔'' دانش نے یاددہانی کروائی۔

''فکر نہ کر جگر! ہم تیری ناک کٹنے نہیں دیں گے۔ ویسے میں ایک بات سے ذرا نروس ہو رہا تھا۔'' فہد نے اسے دلاسا دیتے ہوئے اپنی کیفیت بھی بیان کر دی۔

دانش استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''بھابی کے ہاں تو ماشاء اللہ کزنز کی پوری پلٹن موجود ہے اور اُن کے انداز سے لگ رہا ہے کہ یہ 'فل فارم' میں ہیں۔''

فہد کے اس تجزیے پر دانش کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ اپنے والدین کے اکلوتے ہونے کے باعث وہ کسی بھی قریبی کزن سے محروم تھا۔ دور کے عزیز و اقارب میں زیادہ تر بچے ہی تھے۔

''چلیں دانش بھائی! رسم کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' متین نے شائستگی سے اسے مخاطب کیا اور اپنی معیت میں قالین سے ڈھکی ایک گزرگاہ تک لے آیا جہاں فائزہ پہلے ہی روایتی پھولوں کی چادر تلے نہایت اعتماد سے کھڑی تھی۔

دانش کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ دانش کے ساتھ کھڑے ہونے کا احساس ایک ناقابلِ بیان سُرور تھا۔ اسے اپنا وجود کسی محفوظ سائے میں محسوس ہونے لگا تھا۔

''یہ تم نے کیا بے ہودہ لباس پہن رکھا ہے؟ شرٹ اتنی چھوٹی کیوں ہے؟ اور میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اپنے کپڑوں کی زیادہ فٹنگ مت رکھوانا۔ آج کے دن تو ہیئر اسٹائل اچھا سا بنوا لیتیں؟ ایک تو پہلے ہی بال اتنے چھوٹے ہیں۔ اس پر بے بی کٹ لے کر خود کو بھی بچی ثابت کرنا چاہتی ہو کیا؟ اور یہ لینز لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ سخت زہر لگتی ہیں مجھے یہ حرکتیں۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔

فائزہ کے حواس پل بھر میں ہی شل ہو گئے۔ وہ ایسے موقع پر کسی رومانوی سرگوشی کی منتظر تھی لیکن اس سرد مہری نے اس کا وجود ہی سنسنا کر رکھ دیا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ اسٹیج پر رسم کے دوران بھی دانش کا لیا دیا انداز برقرار رہا۔ اسی دوران اسے کسی کی کال موصول ہوئی تو وہ قدرے مضطرب دکھائی دینے لگا۔ اس نے فہد کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

''بلال کا فون ہے۔ اسے اپنے نمبر سے یہاں کی لوکیشن سینڈ کر دے۔''

فہد نے بھی چونک کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ دانش کے چہرے پر پہلی بار ہلکی مسکراہٹ امڈی تھی تاہم یہ صورتِ حال بالکل لمحاتی ثابت ہوئی۔ اس کا مزاج اگلے ہی پل بے طرح مکدّر ہو گیا۔ ثانیہ نے رسم کے بعد مٹھائی کھلانے کے مرحلے میں برفی کا پورا ٹکڑا ہی دانش کے منہ میں ٹھونسنا چاہا تو وہ بھڑک گیا۔

''واٹ نان سینس! کوئی ایٹی کیٹس ہیں یا نہیں؟'' وہ دبی آواز میں چلّایا۔ اسے ذاتی طور پر شادی کی رسموں میں مٹھائی کھلائے جانے پر شدید کوفت ہوتی تھی اور لڑکی والوں کی جانب سے ایسا مذاق تو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

ثانیہ کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا اور وہ 'پیسے وارنے' کی رسم کیے بغیر ہی نیچے اتر گئی۔

''نہایت جاہل خاندان ہے تمہارا۔'' دانش نے

اپنے پہلو میں مضطرب بیٹھی فائزہ کو درشتی سے مخاطب کیا۔

''جہالت اسے نہیں بلکہ لائف ٹائم آ کیزن پر سڑا ہُبسا منہ بنانے اور خواہ مخواہ کا ایٹی ٹیوڈ دکھانے کو کہتے ہیں۔'' فائزہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اسے دانش کا یہ رویّہ اور اندازِ گفتگو سخت کھل رہا تھا۔

دانش اس کی 'جسارت' پر سلگ کر رہ گیا۔ وہ کوئی سخت جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اسٹیج پر طہور اور متین رسم کے لیے چلے آئے۔ دانش، طہور کو دیکھ کر واضح طور پر چونکا تھا۔

''ایک سیلفی ہو جائے پلیز!'' طہور نے رسم کی تکمیل کے بعد خوش دلی سے انہیں مخاطب کیا۔

فائزہ نے فوراً مسکراتے ہوئے اپنے چہرے کے تاثرات میں مطلوبہ تبدیلیاں پیدا کرلیں۔

''تم 'طہور پرنس' کے نام سے اسنیپ چیٹ اور انسٹا گرام یوزر ہو نا؟''

''یس! یو آر رائٹ برو!'' طہور مسکرایا۔

''اپنے فون سے یہ تصویر ڈیلیٹ کر دو۔'' دانش نے چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''جی؟'' طہور مضطرب ہوا۔ ''لیکن کیوں برو؟''

''مجھے اپنی وائف کی اس طرح نمائش بالکل پسند نہیں ہے۔''

''لیکن میں آپ کی پکچر ایڈیٹ کر کے ہی......'' اس نے وضاحت دینی چاہی۔

''میں نے جو کہا تمہیں سنائی نہیں دیا کیا؟ یا میں اس معاملے میں تمہارے بڑوں سے بات کروں؟'' دانش حسبِ عادت درشتی سے بولا۔

طہور نے تاسف سے فائزہ کو دیکھا اور تصویر ڈیلیٹ کر کے خاموشی سے نیچے اتر گیا۔ فائزہ کے تن بدن میں چنگاریاں سلگنے لگی تھیں۔ اسے دانش کا یہ رویّہ وحشت اور گھٹن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ دانش سے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ فہد، بلال کے ہمراہ اسٹیج پر چلا آیا۔

''اچھا دوست ہے بھئی! سب سے لیٹ تو ہی آیا ہے۔'' دانش نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات پل بھر میں ہی تبدیل ہوئے تھے۔

فائزہ اس کی تبدیلی پر خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئی۔ اسے ستائیس، اٹھائیس سالہ اس گندمی رنگت، قدرے اندر دھنسی آنکھوں اور ہلکے بھورے بالوں والے شخص کی آمد پر سخت ناگواری محسوس ہوئی تھی۔

''بس فلائٹ لیٹ ہوگئی تھی میری۔ سامان گھر میں رکھ کر سیدھا یہاں آیا ہوں۔'' بلال نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

''اینی ہاؤ! نکاح بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک تمہاری زندگی میں ڈھیروں خوشیاں اور درجن بھر 'چیاؤں میاؤں' لے آئے۔'' اس نے اپنے فقرے کے اختتام پر ہاتھوں کو مخصوص انداز میں جھلایا۔

دانش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور فائزہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس سے ملو! یہ میرا اس وقت سے دوست ہے جب ہم دونوں دوستی کے مطلب سے ہی واقف نہیں تھے۔ میرا چڈی بڈی۔ اس کے بغیر میری ہر خوشی ادھوری ہے۔''

دانش کے اس تعارف پر بلال جھینپ کر فائزہ کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر سخت اُلجھن در آئی تھی۔ آنکھوں میں گومگو کیفیت واضح محسوس ہو رہی تھی۔

''نائس ٹو میٹ یو بھابی!'' اس نے چند لمحوں بعد سپاٹ لہجے میں کہا اور اضطراب سے پیشانی مسلتا ہوا رسم کی ادائیگی کے لیے دانش کے ساتھ بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے اپنی نئی مسافت کے بیشتر 'پیچ و خم' 'سینچ' کرنے سیکھ لیے تھے۔ اب یہ سفر بے حد فرحت بخش اور سنسنی خیز محسوس ہونے لگا تھا۔

''زندگی اِک سفر ہے سہانا...... یہاں کل کیا ہو کس نے جانا؟......''

اس نے گنگناتے ہوئے بے اختیار جھومنا شروع کر دیا۔ کل کیا ہونا تھا کیا نہیں؟ اسے کسی بھی چیز کی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ دانش کے کمرے میں موجود بلال اور فہد سخت تھکاوٹ زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ سعد اور عدنان کچھ دیر پہلے ہی رخصت ہوئے تھے۔

''چل یار! میں بھی چلتا ہوں۔ ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔ یہ بھی اچھا ہی ہے کہ برات میں ایک دن کا گیپ ہے۔ آج تو بہت تھکاوٹ ہوگئی۔'' فہد نے دانش کو مخاطب کیا جو تقریب سے واپسی کے بعد سخت طیش زدہ تھا۔ فائزہ کے کزنز کا منظم ڈانس اور اپنے دوستوں کی ٹانک، ٹوئیاں اسے بالکل نہیں بھائی تھیں۔ اس پر مستزاد فائزہ کے والد نے 'کپل ڈانس' سے منع کر کے اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔

''اوکے! سہرابندی سے پہلے ہی پہنچ جانا۔'' دانش نے اسے یاددہانی کروائی۔

فہد نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور الوداعی معانقہ کے بعد رخصت ہوگیا۔

''تو کن سوچوں میں گم ہے بھئی؟ تجھ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔'' دانش نے اُلجھن بھری خاموشی میں گرفتار بلال کو مخاطب کیا۔ وہ اسٹیج پر رسم کی ادائیگی کے بعد انہی کیفیات میں مبتلا تھا۔ ''مجھے تو پورا یقین تھا کہ تو ان سب شوخوں کی واٹ لگادے گا لیکن پتا نہیں تیرا فیوز کیوں اُڑا ہوا تھا؟''

''ہاں! میں اُس وقت سے ہی کچھ اسٹریس میں ہوں اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ تجھے اس بارے میں کچھ بتاؤں یا نہیں؟'' بلال نے پیشانی مسلی۔

''کیسا اسٹریس؟ اور تو نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تو آج یہ سب کیوں؟'' دانش نے حیرت سے کہا۔

''کیونکہ اس اسٹریس کا تعلق تیری ہی ذات اور مستقبل سے ہے۔ خاموش رہتا ہوں تو ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔ کچھ بتانے کا ارادہ کرتا ہوں تو ایک جھجک روک لیتی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''جو بھی بات ہے، مجھے کھل کر بتا۔'' دانش بھی اب سخت اُلجھن کا شکار ہوگیا تھا۔

''فائزہ سے رشتہ کس کے توسط ہوا ہے تیرا؟'' اس نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

''کسی رشتے والی نے کروایا تھا۔'' دانش مزید اُلجھا۔ اسے ایسے سوال کی قطعی امید نہیں تھی۔

''تو یہ لوگ اتنی جلدی شادی کیوں کرنا چاہتے تھے؟ میرا مطلب ہے ایسی کیا ایمرجنسی تھی انہیں؟''

''وہی ٹیپیکل اسٹوری۔ فائزہ کی امی کافی بیمار ہیں۔ کینسر ہے شاید انہیں۔ انہیں ٹریٹمنٹ کے لیے باہر جانا ہے اسی لیے بیٹی کی شادی جلدی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں ڈر ہے کہ علاج کامیاب ہو بھی پاتا ہے یا نہیں۔ میرے والدین نے بھی کہا چلو کوئی ایشو نہیں۔ فیملی اچھی ہے۔ سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ بسم اللہ کرتے ہیں۔'' دانش نے مختصراً بتایا۔

''تو تم لوگوں نے کوئی انکوائری وغیرہ بھی کروائی تھی یا ایسے ہی رشتہ ڈن کر دیا؟'' بلال کے ایک اور سوال نے اسے اُلجھایا۔

''بالکل کروائی تھی۔ میں نے خود سارا معاملہ دیکھا تھا۔ سب آل سیٹ تھا لیکن تو یہ سب کیوں پوچھ رہا ہے؟ کیا پرابلم ہے آخر؟'' دانش جھنجلایا۔

''بات پکی ہونے کے بعد تو نے مجھے فائزہ کی کوئی پک کیوں نہیں دکھائی؟ میں نے کئی بار تجھ سے کہا تھا۔'' بلال نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا تجھے نہیں پتا کہ میں موبائل فون پر پکس سینڈ کرنے کے معاملے میں کتنا وہمی ہوں۔ موبائل فون بالکل بھی سیف نہیں ہوتا، پکس لیک ہو جایا کرتی ہیں۔'' دانش نے اسے اپنی دیرینہ سوچ وعادت یاد کروائی۔

بلال نے مضطرب ہو کر اپنی پیشانی مسلی اور موبائل فون نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ دانش حیرت سے اچھل پڑا۔ اسکرین پر فائزہ کی تصویر جگمگا رہی تھی۔

''یہ تیرے پاس کیسے؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''صرف یہی نہیں اور بھی بہت ہیں۔'' بلال تلخی سے ہنسا اور اپنی انگشتِ شہادت کو جنبش دیتے ہوئے اسے مزید تصاویر دکھانے لگا۔

مختلف ناز و انداز سے لی گئی وہ تصاویر بلاشبہ بہت خوب صورت تھیں۔ اس کے بعد بلال نے اپنا 'ویڈیوز فولڈر' کھولا اور دانش کو دو ویڈیوز دکھانے لگا۔

''یہ سب تیرے پاس کیسے آئی ہیں؟'' اس کی آواز فرطِ طیش سے پھٹنے لگی تھی۔

''یہ میری سوشل میڈیا فرینڈ ہے۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی فرینڈشپ ہوئی۔ پہلے چیٹنگ ہوتی رہی۔ پھر پکچرز اور ویڈیوز وغیرہ شیئر ہوئیں۔ واٹس ایپ پر ایڈ کیا اس نے مجھے۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پکچرز، ویڈیوز اور ویڈیو کال کے لیے میں نے ہی فورس کیا تھا اسے۔'' بلال نے سنجیدگی سے بتایا۔

''کمینی۔ مجھے کہتی تھی کہ میں سوشل میڈیا یوز ہی نہیں کرتی۔'' دانش نے حسبِ عادت دانت پیسے۔

''اس نے کہا اور تو نے مان لیا؟'' بلال استہزائیہ ہنسا۔ ''آج کل کے دور میں کوئی فرشتہ ہی ہوگا جو ایسا نہ کرتا ہو اور یہ انسانوں کی دنیا ہے فرشتوں کی نہیں۔''

دانش کی آنکھیں لہورنگ ہونے لگیں۔ چہرے کے عضلات پھڑکتے دکھائی دینے لگے تھے۔

''میں تجھے یہ سب نہ دکھاتا۔ خاموش ہی رہتا لیکن سچ کہوں تو تیری شادی کے بعد میں اسے اسی نظر سے ہی دیکھتا۔ جو کچھ دیکھ چکا ہوں اپنے ذہن سے ختم تو نہیں کر سکتا نا۔ پھر تجھے مجھ سے کوئی شکایت ہوتی یا ہماری دوستی میں کوئی فرق آتا تو زیادہ دکھ ہوتا مجھے۔'' بلال نے وضاحت کی۔

''اچھا کیا تو نے! بہت اچھا کیا۔ اب آگے کے

معاملات میں خود ہی دیکھ لوں گا۔'' دانش کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔اس کے دل و دماغ میں سخت تلاطم برپا تھا۔

☆☆☆

فضا میں فجر کی اذان کے مقدس کلمات کی گونج دل میں گداز پیدا کر رہی تھی۔ فائزہ اپنا بوجھل دل اور تھکاوٹ سے چور بدن سنبھالتی بستر سے اٹھی اور وضو کے لیے چل دی۔ نماز کی ادائیگی کے دوران اس کی آنکھوں سے بے اختیار ہی آنسو رواں ہو گئے۔

''کیا بات ہے فائزہ؟ تم ساری رات سوئی نہیں ہو نا؟''

مریم کے استفسار پر فائزہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ ٹھیک نہیں! اگر نیند پوری نہیں کرو گی تو فریش کیسے لگو گی؟'' مریم نے پیار سے سمجھایا۔

''فریش نیس میری زندگی سے رخصت ہو چکی ہے آپی!'' اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔

''اتنا نیگیٹو کیوں ہو رہی ہو؟'' مریم مضطرب ہوئی۔

''بہت جلدی کی آپ لوگوں نے میرا رشتہ کرنے میں۔ اگر مما پاپا کو ابروڈ جانا تھا تو میں آپ کے پاس آ کر بھی تو رہ سکتی تھی۔ ہر مسئلے کا حل صرف شادی ہی تو نہیں ہوتی۔'' اس کے آنسو ایک بار پھر رواں ہو گئے۔

''ساری سچویشن تمہارے سامنے ہی ہے۔ پھر بھی ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟'' مریم نے بے بسی سے جواب دیا۔

فائزہ کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ اپنے اندرونی اضطراب کی حقیقی نوعیت سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ اس اضطراب میں پوشیدہ دھڑکے اسے سخت خائف کر رہے تھے۔

''کیا شادی ایسی ہوتی ہے؟ اس شخص کو اپنے سوا کسی کی پروا نہیں ہے۔ آج اس نے ثانیہ اور طہور کے ساتھ جو کیا کل تک پورا خاندان اس پر گوسپ کر رہا ہو گا۔ خاک عزت کریں گے وہ سب اس کی۔ اتنا تو آپ بھی جانتی ہیں کہ عورت محبت اور دولت کے بغیر تو زندہ رہ سکتی ہے لیکن عزت کے بغیر کہاں گزارا ہوتا ہے اس کا؟ اور وہ شخص عزت نام کی شے سے ہی واقف نہیں۔ عجیب فرسٹریٹڈ انسان ہے۔''

''پازیٹو سوچو بس۔ اس دنیا میں پیار اور توجہ سے ہر مرد رام ہو جایا کرتا ہے۔ بس تھوڑا صبر اور انتظار کرنا پڑتا ہے۔'' مریم نے ملائمت سے تشفی دی۔

فائزہ گہری سانس بھر کے خاموش ہو گئی۔ وہ کسی کو بھی اپنی کیفیات نہیں سمجھا سکتی تھی۔ اس نے نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں مسلیں اور خدشات کی لے پر ڈوبتے ابھرتے دل میں وارد ہونے والے کچھ نئے دھڑکے نظر انداز کرتی بستر پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

اس کی مسافت ہموار طریقے سے رواں تھی۔ نتائج بے حد شاندار ثابت ہوئے تھے۔ اس کی خوشی و سرشاری کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا لیکن ایک 'ارچن' تا حال نا قابلِ حل تھی۔ یہ ارچن تمام تر سرشاری کا مزہ کرکرا کر دیتی۔

''اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا پڑے گا۔ ایسے تو کام نہیں چلے گا۔'' اس نے پریشانی سے سوچا۔

''لیکن کیا کروں؟ کیا کسی سے ہیلپ لوں؟''

''اوہ نو! مدد کا تو سوچنا بھی نہیں۔ جو بھی کرنا ہے خود کرنا ہے۔ جہاں اتنی پریشانیاں حل ہوئی ہیں یہ بھی ہو جائے گی۔ بس ہمت کرنی ہو گی۔'' اس نے اپنا عزم دہرایا اور موجودہ مسئلے پر سوچ بچار کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم کی فضا سخت تناؤ زدہ تھی۔ دانش اپنے والدین کے ہمراہ سہ نشستی صوفے پر براجمان تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت کے تاثرات نعمان اور سمیعہ کو ہزارہا وسوسوں میں مبتلا کر رہے تھے۔ حفصہ اور طیب البتہ نظریں چراتے سخت کبیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

''بھائی صاحب! بلا تکلف بتائیے۔ چائے چلے گی یا ٹھنڈا؟'' نعمان نے خوش خلقی سے دریافت کیا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' دانش نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''ہم آپ کی بیٹی سے کچھ ضروری بات کرنے آئے ہیں۔ اسے بلوائیے یہاں۔''

''اب وہ صرف میری بیٹی نہیں رہی۔ آپ کی وائف بن چکی ہے اور آپ کا حق سب سے پہلے ہے۔'' نعمان نے مسکرا کر اس کی رُکھائی نظر انداز کی۔

دانش تنفر سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

''اپنی بچی کو بلوائیے بھائی صاحب! کچھ معاملات ڈسکس کرنے ہیں۔'' حفصہ کے انداز میں بھی وہی رُکھائی تھی۔

نعمان اور سمیعہ کے علاوہ مریم بھی ٹھٹک سی گئی۔ مریم والد کے اشارے پر فائزہ کو لیے چلی آئی۔ فائزہ روایتی انداز میں سر پر پیار لینے کے لیے جھکی ہی تھی کہ دانش نے تندی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ان ڈرامے بازیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں بیٹھ جاؤ سامنے۔"

فائزہ کا چہرہ اہانت سے سرخ ہو گیا۔ اس نے ضبط کے لیے آنکھیں موند کر چند گہری سانسیں لیں اور مریم کے ہمراہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کتنے بوائے فرینڈز ہیں تمہارے؟" دانش نے بلالحاظ و تمہید دریافت کیا۔

فائزہ، مریم، نعمان اور سمیعہ حیرت سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"تمہارے والدین کو تو پتا ہی ہوگا۔ اسی لیے اتنی جلدی شادی کرنا چاہتے تھے تمہاری۔ کتنے بوائے فرینڈز ہیں تمہارے؟ کہاں اور کس کس کے ساتھ منہ کالا کر چکی ہو اب تک؟ اپنے تعلقات کی نشانیاں سنبھالی ہیں یا ضائع کروا دیں؟" وہ درشتی سے کہتا چلا گیا۔

"تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کیا فضول بکواس کر رہے ہو؟" نعمان کی آواز طیش سے بلند ہوگئی۔

"اور آپ دونوں خاموشی سے یہ سب سن رہے ہیں؟" سمیعہ نے طیب اور حفصہ کی جانب دیکھا۔ "کیا شریف اور خاندانی لوگوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں؟"

ان کے اس ردِعمل پر طیب اور حفصہ کی پیشانیاں شکن آلود ہوگئیں۔ انہیں گزشتہ رات بیٹے کی منتشر ذہنی کیفیت اور اس کی زبان سے سنے گئے زہریلے انکشافات کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

"شریف...... خاندانی۔" دانش نے ہر ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔ "کمال ہے یہ کہہ بھی کون رہا ہے جنہیں خود بھی ان الفاظ کا مطلب نہیں پتا ہوگا۔"

"تو تمہارا کیا مطلب ہے؟ ہم کوئی لچے ہیں؟" نعمان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"تم لوگ اس سے بھی آگے کی چیز ہو۔ تمہاری بیٹی غیر مردوں سے دوستیاں کرتی ہے، ساری ساری رات ان سے باتیں کرتی ہے، اپنی تصویریں بھیجتی ہے اور......" وہ بدلحاظی سے بولا۔

"بس! بہت ہوگیا۔ اب ایک اور لفظ منہ سے مت نکالنا۔" نعمان کی آنکھیں لہو رنگ ہونے لگیں۔

"کیا ہم نے تم لوگوں سے نہیں کہا تھا کہ ہمیں ایسی لڑکی چاہیے جو سوشل میڈیا کی لعنت سے دور ہو۔ نہیں کہا تھا؟" دانش نے ایک بار پھر بدلحاظی سے کہا۔

فائزہ کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ پردۂ تصور پر مریم اور اپنی شبیہہ لہرائی تھی۔

"یہ کیا فضول شرط ہے یار آپی؟ آج کے وقت میں سوشل میڈیا یوزر کون نہیں ہے بھلا؟ عجیب مینٹیلٹی ہے یہ۔" اس نے زچ ہو کر مریم سے کہا تھا۔

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں میری بہن! تم اپنی جگہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن اس وقت مما کی کنڈیشن بھی تمہیں پتا ہی ہے۔ انہیں یہ رشتہ اور وہ لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ وہ اسے گنوانا نہیں چاہتیں۔ تھوڑا بہت جھوٹ تو چلتا ہے اب۔ تم شادی کے بعد آرام سے کنوینس کر لینا اسے۔ اِٹس ناٹ آ بگ ڈیل۔"

مریم کی اس تاویل سے متفق نہ ہونے کے باوجود وہ خاموش ہوگئی تھی۔ وہ سوشل میڈیا بے دریغ استعمال کرتی تھی لیکن دانش کے عائد کردہ الزامات میں مکمل سچائی بہرحال نہیں تھی۔

"کیپ یور ڈرٹی ماؤتھ شٹ مسٹر دانش! اب ایک لفظ بھی منہ سے اور نکالا تو ہم بھی بھول جائیں گے کہ مہمان نوازی یا عزت کوئی شے ہوتی ہے۔" فائزہ نے چیخ کر کہا۔

"عزت کا لفظ تم جیسی کے منہ سے سننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی طوائف پارسائی کا دعویٰ کرے۔" دانش چلّایا۔

"بس! بہت ہوگئی۔" نعمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "تمہارے پاس اپنی اس بکواس کا کوئی ثبوت ہے دانش؟"

"ایک نہیں ہزاروں ثبوت ہیں۔ ہمت ہے دیکھنے کی؟" اس نے استہزائیہ نظروں سے انہیں دیکھا اور اگلے ہی لمحے ایک جانب تپائی پر رکھے ریموٹ سے ایک ایل ڈی آن کر کے اپنا موبائل فون منسلک کر دیا۔

اسکرین پر اب فائزہ کی تصویریں مختلف انداز میں جھلک دکھانے لگی تھیں۔ ان درجنوں تصاویر کے بعد چیٹنگ کے اسکرین شاٹس نمودار ہوئے۔ اس چیٹنگ میں فائزہ کی گفتگو کو نمایاں تر کیا گیا تھا۔ اس گفتگو میں بے باکی اور رومانویت عیاں تھی۔

"ویڈیوز بھی ہیں میرے پاس جس میں آپ کی بیٹی اپنے بوائے فرینڈز کو جسم کی نمائش کر رہی ہے۔ کہتے ہیں تو وہ بھی پلے کر دیتا ہوں۔" دانش نے ایک سلگتی نگاہ نعمان اور سمیعہ پر ڈالی۔

فائزہ سخت بے یقینی اور اُلجھن میں اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"نن...... نہیں۔" سمیعہ متوحش ہوئیں۔

"یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔" نعمان نے سر جھٹکا۔

"یہ سب ہو چکا ہے نعمان صاحب! آپ کی بیٹی آپ ہی کے ناک تلے یہ سب گل کھلا چکی ہے اور آئی ایم سوری ٹو سے! میں ایسی بدکردار لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"ایسا مت کہو پلیز!" سمیعہ کا وجود لرزنے لگا۔

"آپ اسے سمجھائیے پلیز!" وہ طیب اور حفصہ کی جانب متوجہ ہوئیں۔ "رشتے ایسے تو نہیں ختم ہوتے نا۔"

"ہم نے رات بھر اسے بہت سمجھایا ہے لیکن یہ سب دیکھ لینے کے بعد اب اور کیا گنجائش بچتی ہے؟" طیب نے رُکھائی سے جواب دیا۔

"اِن باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔" وہ سپاٹ انداز میں بولا۔ "میں دانش طیب اپنے ہوش و حواس میں فائزہ نعمان کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔"

ڈرائنگ روم میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ ہر چہرے پر بے یقینی، اضطراب اور ہیجان موجزن تھا۔

"ڈائیورس پیپرز بھی کچھ دن میں مل جائیں گے تم لوگوں کو۔" دانش نے رعونت سے کہا۔

"اور میرا حق مہر؟" فائزہ کی آواز مرتعش تھی۔

"ہاں وہ بھی مل جائے گا۔" دانش نے تنفر سے اس کی جانب دیکھا۔

"لیکن مجھے تو ابھی چاہیے۔" وہ اپنی نشست سے اٹھی اور مٹھیاں بھینچتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اگلے ہی لمحے ڈرائنگ روم ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز سے گونج اٹھا۔ دانش بے یقینی سے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھے فائزہ کو دیکھنے لگا جس کی آنکھوں میں شراروں کی لپک تھی۔

"یو بچ......" وہ بے قابو ہو کر آگے بڑھا ہی تھا کہ مریم برق رفتاری سے اٹھی اور فائزہ کو گھسیٹ کر پیچھے لے آئی۔

"آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔" نعمان نے تنفر سے کہا۔

دانش کینہ توز نظروں سے فائزہ کو دیکھتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دانش اور اس کے والدین کی روانگی کے بعد ڈرائنگ روم کی فضا کو مریم کی آواز نے مرتعش کیا۔

"تم ہوش میں تو تھیں فائزہ؟ کسی مرد کے منہ ایسے لگتے ہیں؟ یہ کیا حرکت تھی؟" وہ دبے لہجے میں چلائی۔

سمیعہ نے ایک شکوہ کناں نظر سے اپنی بڑی بیٹی کی جانب دیکھا اور صدمے سے گویا ہوئیں۔

"تم اس... حرکت کی بات کر رہی ہو؟ اور وہ جو اپنے موبائل فون میں اشتہار لیے پھر رہا ہے اس کا کون جواب دہ ہے؟"

"اللہ! میں کتنا منع کرتی تھی تمہیں کہ چھوڑ دو یہ سب جھنجھٹ۔ وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے یہ لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔" مریم نے تاسف سے سر ہلایا۔

"تم لوگ اپنی چخ چخ بند کرو گی کیا؟" نعمان نے دہاڑ کر کہا۔ "میں اس گھر کا بڑا ابھی زندہ ہوں۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔"

"اب بات کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے؟ ہائے اللہ جی! کیا ہو گیا یہ سب؟ کیا منہ دکھائیں گے ہم دنیا کو؟" سمیعہ کے آنسوؤں میں روانی آئی۔

"خاموش ہو جائیں سب۔ خدا کا واسطہ ہے خاموش ہو جائیں سب۔" فائزہ چلائی۔ "ہاں! تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" وہ مریم کی جانب متوجہ ہوئی۔ "کسی مرد کے منہ ایسے نہیں لگنا چاہیے۔ ارے! یہ آپ جیسی احمق اور احساسِ کمتری کا شکار عورتیں ہی ہوتی ہیں جنہوں نے مردوں کو سر چڑھا رکھا ہوتا ہے۔ عورت مرد سے برتر نہیں تو کسی صورت کمتر بھی نہیں ہے اور میں کسی بھی ایسے انسان کو سرے سے مرد ہی نہیں مانتی جو عورت کی عزت کرنا نہ جانتا ہو۔ باقی رہی بات سوشل اکاؤنٹس کی۔" اس نے ایک توقف کیا اور پھر مضبوط لہجے میں کہنے لگی۔

"ہاں! میں دھڑلے سے کہتی ہوں کہ میں سوشل اکاؤنٹس استعمال کرتی ہوں۔ سو واٹ؟ ساری دنیا کرتی ہے۔ میں نے کر لیا تو کون سی قیامت آ گئی؟ اور آپ تو مجھے اس طرح ٹریٹ کر رہی ہیں جیسے خود دودھ کی دھلی ہیں۔ ذرا کھولیے اپنا موبائل! انسٹاگرام اور اسنیپ چیٹ میں بیسیوں انجان مرد دکھا سکتی ہوں میں آپ کو۔ ٹک ٹاک پر بنائی ہوئی ویڈیوز میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں آپ۔ ہونہہ! بات کرتی ہیں۔ دکھا دیں کوئی ایسی لڑکی جس کا ایک بھی سوشل اکاؤنٹ نہ ہو۔" اس نے بات کے اختتام پر تلخی سے بڑی بہن کی جانب دیکھا اور اس کے بعد والدہ کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"آپ کیا فرما رہی تھیں؟ کیا منہ دکھائیں گے دنیا کو؟ یہی منہ دکھائیے گا جو میرے لیے اس سائیکو کیس کا رشتہ اوکے کرنے کے بعد سب کو دکھایا تھا۔ یہی منہ دکھائیے گا جو شادی ہو جانے کی صورت میں میری زندگی جہنم بننے کے بعد سب کو دکھاتیں۔ اچھا ہوا۔ بہت ہی اچھا ہوا وہ باسٹرڈ خود یہ رشتہ ختم کر گیا۔ اس کے ساتھ شادی ہو جاتی تو آئی سوئیر دو مہینے میں ہی پاگل ہو جاتی میں۔ وہ انسان نہیں۔ میں...... میں...... میں کی ریکارڈنگ مشین ہے۔"

"بہت زبان چل رہی ہے تمہاری۔" نعمان طیش زدہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "تمہارا تو علاج......"

"بس پاپا!" فائزہ نے انگشتِ شہادت اٹھا کر انہیں متنبہ کیا۔ "وہیں رک جایئے۔ اگر آپ کو لگتا ہے کہ مجھ پر چیخ چلا کر یا ہاتھ اٹھا کر اپنی فرسٹریشن نکال لیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ میں وہ سیونٹیز اور ایٹیز کی لڑکی نہیں ہوں جسے اس طرح رشتہ ختم ہونے پر پہلے فزیکل ٹارچر کیا جائے اور پھر اپنی سو کالڈ عزت بچانے کے لیے کسی سے بھی میری شادی کروا دیں گے۔ میں تو پہلے بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھی۔ میرے لیے ایجوکیشن سب سے زیادہ اہم تھی اور اب بھی میں اسی پر فوکس کروں گی۔ اگر آپ میں سے کسی کو بھی ایسا لگتا ہے کہ میں اس طلاق کا طوق گلے میں باندھ کر کوئی جوگ ووگ لے کر بیٹھ جاؤں گی تو یہ بھی بھول ہے آپ لوگوں کی۔ اور ہاں! اگر کسی نے بھی مجھے روکنے یا میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو میرے لیے ہاسٹلز یا این جی او سے رابطے کا راستہ کھلا ہے۔" فائزہ نے حتمی انداز میں کہا اور ایک طائرانہ نگاہ ان کے فق چہروں پر ڈالتی مضبوط قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

دوپہر کے سائے شام میں مدغم ہو رہے تھے۔ نعمان اور سمیعہ اپنی پُرخار سوچوں میں اُلجھے کمرے میں موجود تھے۔

"کچھ بولیں گے بھی یا یونہی گم صم بیٹھیں رہیں گے؟" سمیعہ نے شوہر کی مسلسل خاموشی سے جھنجلا کر کہا۔

"کیا بولوں؟ کچھ بولنے کے قابل چھوڑا بھی ہے تمہاری اولاد نے؟" انہوں نے زچ ہو کر کہا۔

سمیعہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے نعمان کو دیکھا اور ان کی اس بات پر اپنا روایتی جواب دینے کے بجائے گہری سانس لیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اولاد نے تو جو کیا سو کیا۔ اب کل کے لیے کیا کرنا ہے؟ کس طرح مینج کرنا ہے سب؟" وہ بات مکمل کرتے ہوئے ہانپنے لگی تھیں۔

"اسی بارے میں سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے کے قریب ہے میرا۔" انہوں نے اپنی پیشانی اور گردن مسلتے ہوئے کہا۔ "ایک ہی حل سمجھ آ رہا ہے فی الحال مجھے تو۔ فیملی گروپس میں ایک میسج کر دیتے ہیں کہ دانش کی فیملی میں کسی کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ کچھ بھی مطلب...... کسی کی بھی...... ہاں! یہ کہہ دیں گے کہ طیب کے ایک بھائی کی شادی حفصہ کی بہن سے ہوئی تھی۔ وہ دونوں اپنی فیملی کے ساتھ شادی اٹینڈ کرنے نکلے ہی تھے کہ روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تو دانش کی ساری فیملی اسلام آباد گئی ہے۔ شاید چہلم کر کے ہی وہاں سے آئیں گے۔"

نعمان کی تاویل میں سمیعہ کو منطق تو محسوس ہوئی تاہم اگلے ہی لمحہ خدشات ایک بار پھر ان پر غالب آ گئے۔

"پھر...... اس کے بعد؟ اس کے بعد کیا کہیں گے سب کو؟"

"کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں گے۔" نعمان نے بظاہر بے نیازی سے کہا لیکن ان کے لہجے کی کمزوری سمیعہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"آہ دانش! یہ کیا ظلم کر دیا تم نے؟ اللہ کرے مر جاؤ تم! دوسرا سانس بھی لینا نصیب نہ ہو تمہیں۔" سمیعہ نے تڑپ کر کہا۔

"اس معاملے میں اکیلا دانش قصوروار نہیں ہے۔ ہماری اولاد کے 'گند' نے ہی اسے یہ سب کرنے کا موقع دیا ہے۔ ایسی اولاد کی مزید زندگی سے تو صبر ہی اچھا ہے۔" نعمان کی تڑپ بھی دیدنی تھی۔

اپنی آہ و بکا، تڑپ و کرب اور مستقبل کے خدشات سے بوجھل دل و دماغ سنبھالتے ان دونوں کو علم ہی نہ ہوا کہ کاتبِ تقدیر نے ان کی دعاؤں پر قبولیت کی مہر ثبت کر دی۔ دانش اور فائزہ کے علاوہ کچھ اور زندگیاں بھی فنا کی لپیٹ میں آنے والی تھیں۔

☆☆☆

فائزہ اپنے کمرے میں شدید ذہنی انتشار کا شکار تھی۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد سب سے پہلے اپنے فون میں سوشل اکاؤنٹس کا جائزہ لیا تھا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد ہی جھنجلا کر فون ایک جانب پٹخ دیا۔ اس نے کچھ روز قبل ہی اپنی ساری چیٹس ڈلیٹ کی تھیں۔ وہ سوشل میڈیا پر چیٹنگ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی۔ چند ایک 'قریبی' افراد سے تصویروں کا تبادلہ بھی کیا تھا لیکن یہ سب کیا ہو گیا آخر؟

کہیں کچھ تو غلط ہوا تھا؟ لیکن کیوں؟ ساری دنیا سوشل اکاؤنٹس استعمال کیا کرتی ہے اسی کے ساتھ ایسا کیوں؟ کون تھا اس کا ذمے دار؟

کچھ دیر اور گزری تو کمرے میں موجود سامان اسے اپنا منہ چڑاتا محسوس ہونے لگا۔ دانش کے زہریلے الفاظ اور پُرتحقیر اندازِ تخاطب یاد آتے ہی ہیجان میں اضافہ ہونے لگتا تھا۔ دانش کی ذہنی کیفیت اور مخصوص اندازِ فکر سے اسے اتنا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خود بھی اسی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گا۔

''مجھے اس طرح ذلیل کر کے تم کیوں سکون سے رہو یوڈاگ! تمہیں بھی ساری دنیا کے سامنے ننگا ہونا چاہیے۔ تم کیوں دودھ کے دُھلے بنے پھرو بھئی؟''

فائزہ کے دل و دماغ انتقامی جذبات سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور 'پرنسز عینی' کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ یہ آئی ڈی اس نے بہت عرصہ قبل کسی 'ایڈونچر' کے لیے بنائی تھی۔ دانش کو تلاش کرنا اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے دانش کو پیغامِ دوستی ارسال کرنے سے قبل اپنے ذہن میں ایک مکمل حکمتِ عملی تیار کر لی تھی۔

☆☆☆

دانش اپنے کمرے میں کاؤچ پر نیم دراز تھا۔ اس کے اعصاب بھی سخت تناؤ کا شکار تھے۔ اسے حفصہ اور طیب کے خدشات نے کوفت زدہ کر رکھا تھا۔ انہیں خاندان بھر کو شادی کی منسوخی کا عذر دینے میں تامل محسوس ہو رہا تھا۔

''تم نے ہمیں دھوکے میں کیوں رکھا؟ تم ہمیں یہ کہہ کر وہاں لے گئے تھے کہ ان سے صرف بات چیت کر کے پریشر میں لیں گے۔ طلاق کی تو بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کیا کر آئے ہو تم؟ ایک بار رخصتی کروا کے گھر لے آتے۔ اس کے بعد کہہ دیتے کہ لڑکی کے موبائل میں کچھ دیکھا تھا تم نے۔ شک ہوگیا تھا تمہیں اس پر جو بعد میں یقین بن گیا۔ لڑکی کا پہلے سے ہی کہیں افیئر تھا وغیرہ۔''

''کچھ غلط نہیں کیا۔ آپ لوگوں کو کس چیز کا ڈر ہے بھئی؟ آپ لڑکے کے والدین ہیں۔ دبنگ ہو کے بات کہیے۔ آپ ہی سب کو صاف بتا دیجیے کہ لڑکی لوز کیریکٹر کی مالک تھی۔ وہ میرے ہی دوست کی گرل فرینڈ بھی تھی۔ میری غیرت نے برداشت نہیں کیا اور بس طلاق دے دی۔ اس میں غلط یا جھوٹ تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو میں خود فیملی گروپ میں سب کو بتا دیتا ہوں۔'' وہ اپنی مخصوص بدلحاظی سے بولا۔

''ولیمے کے لیے اتنا خرچہ کیا تھا۔ سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔'' حفصہ نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' طیب نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''آگے کی سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے؟ اب ایک بار پھر نئے سرے سے رشتے کی تلاش کرنی ہوگی۔ ویسے دانش! تم اپنی پسند سے کیوں نہیں کر لیتے شادی؟''

طیب نے اپنی وہی تجویز و استفسار دہرایا جو اس سے قبل بھی کئی بار اس کے گوش گزار چکے تھے۔

''ناٹ ایٹ آل!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''جو لڑکی میرے ساتھ سیٹ ہو سکتی ہے، وہ کسی کے بھی دام میں آسکتی ہے۔ میں اعتبار نہیں کر سکتا کسی پر بھی۔''

''اس طرح تو تمہیں کوئی بھی نہیں ملے گی پھر۔ یہ فرشتوں کی دنیا نہیں ہے۔ یہاں سب انسان بستے ہیں اور اس وقت ہر انسان اسی 'وبا' کی لپیٹ میں ہے۔'' طیب نے زچ ہو کر کہا۔

''اچھا چھوڑیں اس بات کو۔ اللہ نے ہمارے بیٹے کا کہیں نہ کہیں جوڑ لکھا ہی ہوگا۔'' حفصہ نے شوہر کا غصہ سرد کرنا چاہا۔ اس کے بعد وہ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

''جاؤ! اپنے کمرے میں آرام کرو جا کر۔ باقی معاملہ ہم دیکھ لیتے ہیں۔''

دانش نے کچھ بھی کہنے سے گریز ہی کیا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اسے اپنے رخسار پر آتشیں جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے رخسار سہلاتے ہوئے فائزہ کے لیے زیرِلب نازیبا ترین القابات دہرائے اور ذہنی ارتکاز تبدیل کرنے کے لیے موبائل فون نکال کر ڈیجیٹل دنیا کے مختلف گلی کوچوں کی سیاحت کرتے اسے ایک 'نوٹیفکیشن' نے چونکا دیا۔ کسی پرنسز عینی نے 'پیغامِ دوستی' ارسال کیا تھا۔ ایسے نام عموی طور پر لڑکے بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ دانش نے حسبِ عادت پروفائل کا مکمل جائزہ لیا۔ اس کی 'تجربہ کار' نگاہیں بھانپ گئی تھیں کہ اس آئی ڈی کے پیچھے کوئی لڑکی ہی ہے۔ ایسی لڑکی جسے صنفِ مخالف سے دوستانہ تعلقات کی چاہ بھی ہے اور وہ اپنی شخصیت کی پوشیدگی کا بھرم بھی رکھنا چاہتی ہے۔

دانش نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد وہ پیغامِ دوستی قبول کر لیا۔ سماجی روابط کے ان ناکوں پر وہ کسی بھی لڑکی سے ٹکراؤ بلاتامل قبول کر لیا کرتا تھا۔ وہ لڑکیوں کے ناز و انداز اور نخروں سے بخوبی واقف ہی نہیں بلکہ ان سے نمٹ کر اپنے

'ٹریک' پر لانے کے فن میں بھی طاق تھا۔ دانش نے اپنے ذہنی انتشار میں ہمواری کے لیے اس نئے پنچھی سے گفتگو کا ارادہ کرلیا۔ وہ درحقیقت اپنی توجہ بہرصورت اس حادثے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ فائزہ کے متعلق اس انکشاف نے اسے جذباتی دھچکا پہنچایا تھا اور اب اسے کسی نہ کسی طور کوئی مضبوط سہارا درکار تھا۔ یہ مضبوط سہارا صنفِ نازک کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

''ہائے!'' اس نے چند لمحوں بعد پہلا پیغام ارسال کیا۔

''وعلیکم ہائے!'' دوسری جانب سے موصول ہونے والے اس پیغام نے اسے زیرِلب مسکرانے پر مجبور کردیا۔ وہ ایک ہی پل میں اس لڑکی کی 'نوعیت' سمجھ گیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ شہزادی صاحبہ؟''

''بہت اچھی۔'' دوسرا جواب بھی حسبِ توقع تھا۔

''ہاں! وہ تو آپ یقیناً ہوں گی۔'' اس نے وارفتگی جتائی۔

''آئی ایم سوری پلیز۔'' اگلا پیغام حیران کن تھا۔

''فار واٹ؟'' اسے اچنبھا ہوا۔

''بائے مسٹیک فرینڈ ریکوئسٹ سینڈ ہوگئی آپ کو۔ ایکچوئلی میں اپنی ایک فرینڈ کے بھائی کو سرچ کررہی تھی۔''

اس عذر پر دانش ہنکارا بھر کے رہ گیا۔ اسے اب لڑکی کی نوعیت مزید واضح ہوگئی تھی۔ اسی اثنا میں اسے بلال کے ایک پیغام نے چونکا دیا۔ وہ اسے ملاقات کے لیے اپنے گھر بلا رہا تھا۔ دانش نے اسے اپنی آمد کا عندیہ دیا اور کچھ سوچتے ہوئے لکھنے لگا۔

''اِٹس او کے! اگر آپ کو میری ذات میں کوئی برائی محسوس ہوئی ہے تو آپ مجھے اَن فرینڈ کرسکتی ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا بائے۔'' دانش نے بھرپور متانت کا مظاہرہ کیا اور سائن آؤٹ کردیا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ عینی اسے کبھی 'اَن فرینڈ' نہیں کرے گی۔

☆☆☆

''یہ میں کیا سن رہا ہوں یار؟ انکل کا فون آیا تھا ابھی میرے پاپا کو۔ کیا ہوگیا؟ کس کی ڈیتھ ہوگئی وہاں؟'' بلال نے اسے دیکھتے ہی حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''کسی کی بھی نہیں۔ لیکن مر تو سبھی گئے ہوں گے اندر سے۔'' دانش زہرخند ہوا۔

بلال اُلجھن بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ دانش ان نظروں کا مفہوم بھانپ گیا۔ اس نے گہری سانس لی اور اطمینان سے بولا۔

''طلاق دے آیا ہوں میں اُسے۔ لیکن میرے والدین کو جانے کیوں شرافت کے جن نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ وہ اس معاملے کو اپنے طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو کہا تھا کیا ضرورت ہے اس سارے کھڑاگ کی؟ سیدھا سیدھا کہہ دو سب کو لڑکی کا کیریکٹر ہی ٹھیک نہیں تھا۔''

''کیا کہا تو نے؟ طلاق دے آیا ہے؟'' بلال کو حیرت کا بھرپور جھٹکا لگا۔

''ہاں! تو اور کیا کرتا؟ اس کا ڈھول اپنے گلے میں لٹکا کر پھرتا۔ میرے اندر تو اتنا اسٹیمنا نہیں ہے بھئی۔'' دانش نے کندھے اچکائے۔

''یار! بات اسٹیمنا یا برداشت کی نہیں ہے۔ تو ہے ہی سدا کا بے وقوف انسان۔'' بلال نے تاسف سے سر ہلایا۔

''اب میں نے کیا بے وقوفی کردی ہے اب؟'' اس نے قدرے بیزاری سے دریافت کیا۔

''سیدھا جا کر طلاق ہی دے آیا۔ یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ نکاح ہوچکا تھا نا تیرا۔ اسے رخصت کروا کے گھر لاتا۔ ایک دو مہینے عیش کرتا اس کے ساتھ پھر چھوڑ دیتا۔ ایک بار تیرے وجود کی مہر لگ جاتی اس پر تو یہ طلاق زیادہ تکلیف دہ ہوتی اُس کے لیے۔ ابھی اسے کیا فرق پڑا ہوگا؟''

بلال کی اس بات پر دانش جزبز ہوکر رہ گیا۔ اس پہلو کے متعلق تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا لیکن اب سوچ اور خلش کے نئے در وا کردیے تھے۔

''چلو خیر! اب تو جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ یہ بتا کوئی نیا پنچھی جال میں آیا ہے کہ نہیں؟'' بلال نے معنی خیزی سے آنکھ میچتے ہوئے کہا۔

دانش کا چہرہ اُلجھن و تاسف کی آماجگاہ ہی بنا رہا۔

''یار! ایک کام کرسکتا ہے تو؟ فائزہ کو کسی طرح ملنے کے لیے بلوا کہیں۔ تو سمجھ رہا ہے نا میری بات؟'' اس نے معنی خیزی سے بلال کی آنکھوں میں جھانکا۔

''فی الحال تو مشکل ہے جگر! اب تو وہ الرٹ ہوگئی ہو گی۔'' بلال نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''تو کسی نئی آئی ڈی سے ٹرائی کرلے نا۔ کمینی سے کچھ حساب تو چکانے بنتے ہیں۔'' دانش کا ہاتھ بے اختیار اپنا رخسار سہلانے لگا۔

''ٹھیک ہے! یہ بھی ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں۔ لیکن تجھے پتا ہے میں یہاں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہی اور رکوں

گا۔ اس دوران کام ہوگیا تو پارٹی کر لینا۔'' اس نے ایک بار پھر آنکھ دبائی۔

''ڈن ہو گیا۔ اور اگر اس دوران کوئی نیا پنچھی روسٹ ہونے کے لیے تیار ہوگیا تو تیرے لیے میری طرف سے ٹریٹ پکی۔'' دانش بھی خباثت سے مسکرایا۔

''اپنے پاسپورٹ کا بھی کچھ کر لے جلدی۔ میں تیرے ویزے اور جاب کا بندوبست کروا دوں گا۔'' بلال نے اسے ایک بار پھر یاددہانی کروائی۔

دانش نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں اب نئی ملازمت اور متوقع سیلری پیکج کے متعلق گفتگو کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

فائزہ نے اپنی 'تیاری' مکمل کر کے پرنسز عینی کا روپ دھارا اور دانش کی جانب سے موصول شدہ پیغام کھول لیا۔

''مجھے ان فرینڈ نہ کرنے کا شکریہ شہزادی صاحبہ!''

''مینشن ناٹ! کل تم سے بات کر کے سچ میں بہت اچھا لگا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوریئلی!! مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔'' دانش کی آنکھیں جگمگا ئیں۔ وجود میں موجزن ہونے والی بے چینی اور سنسناہٹ اسے تاحال مضطرب کیے ہوئے تھیں۔

''کیسا گزرا دن؟ نارملی کیا روٹین ہوتی ہے تمہاری؟'' دانش نے گفتگو آگے بڑھائی۔

''اگر جان لو گے تو دوبارہ شاید مجھ سے بات ہی نہ کرو تم۔'' پرنسز عینی کی جانب سے خدشات سے بوجھل اس جواب نے دانش کو لمحہ بھر کے لیے ٹھنکا دیا۔

''ایسا کیا کرتی ہو تم؟'' اس نے تجسس سے دریافت کیا۔

''نائن ٹو فائیو جاب کرتی ہوں۔ اس کے بعد گھر کے کام، ککنگ وغیرہ۔''

عینی کے اس انکشاف نے دانش کو اُلجھا دیا۔ اس معمول زندگی میں بھلا ایسی کیا قباحت تھی جس کے بعد وہ اس سے دوبارہ بات ہی نہ کرتا۔

''تمہارے گھر میں کون کون ہوتا ہے بائی دی وے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''میں اور میرے شوہر......بس۔''

عینی کے اس فقرے نے دانش کو حیرت سے اُچھلنے پر مجبور کر دیا۔

''تم......میریڈ......ہو؟''

''ہاں...... بدقسمتی سے۔'' دوسری جانب سے بیزاری کا بھرپور تاثر دیا گیا۔

''عمر کیا ہے تمہاری؟ سچ سچ بتانا۔''

''تم سے جھوٹ بول کر کون سا تمغا لے لینا ہے میں نے بھئی؟ بتیس سال کی ہوں میں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''ہمم......اور شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں؟'' وہ متجسس ہوا۔

''سات سال ہو گئے اس جہنم کا حصہ بنے۔'' اس نے تلخی سے بتایا۔

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' دانش کو یہ کردار اب کافی دلچسپ اور اپنے لیے 'سودمند' محسوس ہونے لگا تھا۔

''تو اور کیا کہوں؟ جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ خیر چھوڑو! میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ آج مینٹلی بہت ڈسٹرب تھی اس لیے تم سے یہ سب کہہ دیا۔''

''اِٹس او کے عینی! انسان کسی کو اپنا سمجھ کر ہی دل کی بات کہتا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا ورنہ سوشل میڈیا کے اس دور میں اپنی شادی کے متعلق کون کسی کو کچھ بتاتا ہے بھلا؟'' دانش نے ایک اور حقیقت بیان کی۔

''میں نے بھی آج تک یہ بات کسی سے نہیں کی لیکن کہا نا آج مینٹلی کچھ ڈسٹرب تھی تو تم سے کہہ بیٹھی۔''

''شوہر کیا کرتے ہیں تمہارے؟ بچے کتنے ہیں؟''

''بچے نہیں ہیں ہمارے۔'' اس نے مختصراً لکھا۔

''اور شوہر؟ وہ کہاں جاب کرتے ہیں؟''

''کہیں بھی نہیں۔ میری ہی قسمت خراب تھی کہ ایسے شخص کے پلّے بندھ گئی جو فنانشلی تو کیا کسی بھی طرح بیوی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔''

عینی کے اس طیش بھرے جواب پر دانش بے اختیار مسکرا اٹھا۔ اسے کہانی کا پس منظر مکمل طور پر سمجھ آ گیا تھا۔ عینی درحقیقت ایک تنہا، اُلجھنوں میں مبتلا اور بے پناہ ناآسودگیوں کا شکار ایک عورت تھی جو اپنی تشنگی ختم کرنے کے لیے ہی اس پلیٹ فارم پر موجود تھی۔

''ایسے مت کہو! قسمت کو کیوں الزام دے رہی ہو؟ شوہر کو تھوڑا وقت دو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' دانش نے دانستہ طور پر ہمدردانہ رویّہ اپنایا۔

''ہاں تم تو یہی کہو گے۔ مرد جو ٹھہرے۔ تم بھی کسی عورت کی تکلیف اور دکھ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم عورت جو نہیں ہو۔ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔'' وہ بھنائی۔

''اچھا! کیسے ہوتے ہیں ہم مرد بھلا؟'' دانش کی مسکراہٹ گہری ہوگی۔

عینی کے اس جواب نے اُسے باور کروادیا تھا کہ وہ پہلے بھی کئی مردوں کو آزما چکی ہے۔ ایسی ناآسودہ اور اپنے مدار سے بھٹکی ہوئی عورت کو اپنی راہ پر لانا دانش کے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔

''خودغرض...... مطلبی...... بے حس...... عورت کے جذبات کی گہرائی کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تم مردوں کے لیے عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ اسے انسان تو کبھی سمجھتے ہی نہیں ہو۔''

عینی کا بھنایا ہوا یہ پیغام پڑھ کر دانش کافی محظوظ ہوا۔

''ہاں اب کہہ دو کہ میں غلط کہہ رہی ہوں۔ مرد تو ایسے بالکل نہیں ہوتے اور جواب میں عورتوں کے نقص گنوانے شروع کردو۔ بس یہی کام تو آتا ہے تم مردوں کو۔'' عینی نے ایک توقف کے بعد مزید لکھا۔

دانش کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''نہیں! میں ایسا بالکل نہیں کہوں گا۔ تم اپنی جگہ سو فیصد ٹھیک کہہ رہی ہو۔ عورت کے لیے اس کی ساری دنیا صرف اس کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ اس سے مایوس ہونے کے بعد عورت کو ہر مرد ایک جیسا ہی لگتا ہے۔'' دانش نے اپنائیت سے اسے دلاسا دیا۔

''ارے نہیں بھئی! دیکھا ہے باقی مردوں کو بھی۔ یہاں سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ ذرا سی کسی سے بات کرلو فوراً آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ نمبر دے دیں اپنا۔ پک تو دکھائیں اپنی۔ ویڈیو کال پر ہی بات کرلیں۔ ہونہہ! فلینگو سے تو کسی کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔''

''تو تم نے دیا نہیں کبھی نمبر؟'' دانش نے زبان چڑھاتے ایموجی بھیجتے ہوئے دریافت کیا۔

''سیدھا بلاک لسٹ میں لینڈ ہوتی ہے پھر ان کی فلائٹ۔ ہونہہ!'' عینی نے منہ بنایا۔

''ویری گڈ! تمہیں ایسا کرنے کا پورا حق ہے۔'' اس نے انگوٹھے کے نشان کی بلندی سے اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔

''سوری یار! میں ذرا ہائپر ہوگئی تھی بس۔ آج دماغ بہت آؤٹ ہے۔'' عینی نے بے بسی ظاہر کرتے ہوئے معذرت کی۔

''اِٹس اوکے! آئی ڈونٹ مائنڈ۔ مگر میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مرد ہو یا عورت، سب ایک جیسے نہیں بھی ہوتے۔'' دانش نے دانستہ طور پر لکھا۔ وہ اس کے سامنے حتیٰ الامکان اپنا تاثر مثبت ہی رکھنا چاہتا تھا۔

''پتا نہیں! شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہوگے لیکن...... خیر چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔ اپنی فیملی کے متعلق بتاؤ کچھ۔ شادی ہوگئی تمہاری؟''

''نہیں! ابھی میرا شادی کا کوئی موڈ نہیں ہے۔ میں نے جاب کے لیے ابروڈ اپلائی کیا ہے۔ دیکھو! کیا ہوتا ہے۔''

''اور تمہاری فیملی؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''میں اکلوتا ہوں۔ جاب کے سلسلے میں یہاں رہتا ہوں۔ والدین گاؤں میں ہوتے ہیں۔ ہماری جدی پشتی زمینیں ہیں۔'' دانش نے فراٹے سے بتایا۔

''واؤ امپریسو!'' گرل فرینڈز تو ہوں گی ویسے تمہاری؟'' عینی نے شرارت دکھائی۔

''ہاں۔ ہلکے پھلکے افیئرز تو سبھی کے چلتے ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے؟ ایسی کوئی جوانی نہیں...... جس میں کوئی کہانی نہیں۔'' اس نے بھی شرارتاً جواب دیا۔

''صرف افیئرز...... یا کچھ اور بھی؟'' اس نے آنکھ میچتے ایموجیز سینڈ کیے۔

''ہاں! بہت کچھ۔ یہ سب تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔'' اس نے بھی آنکھ میچی۔

''بہت لکی ہوگی پھر وہ لڑکی جو تمہاری لائف پارٹنر بنے گی۔ اسے ہر وہ خوشی اور سکون ملے گا جو مجھے نہیں مل سکا۔'' عینی نے افسردگی پر مبنی ایموجیز کی ایک طویل قطار بھیجی۔

''اچھا؟ تمہیں کیسی خوشی اور سکون چاہیے؟'' دانش کا وجود سنسنانے لگا تھا۔

عینی نے اپنی تشنہ آرزوؤں کا احوال بیان کرنا شروع کردیا۔ دانش کے رگ وپے میں موجزن تلاطم اب بے قابو ہونے لگا تھا۔ وہ بلاسوچے سمجھے ایک طاقتور رو میں بہتا چلا گیا۔ اس کی فہم وادراک ہر نتیجے سے بے نیاز ہوچکی تھی۔

☆☆☆

فائزہ کی آنکھ اگلی صبح قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ گزشتہ رات دانش سے گفتگو کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر بیدار رہی تھی۔ فائزہ نے اس کا ہر ایک میسج سہ بار پڑھا تھا۔ دانش کے متعلق اس کا ہر اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس کی بدکرداری ہی نفسیاتی کجی کا سبب تھی۔ اس کے علاوہ بیرون ملک منتقل ہونے کے انکشاف نے اسے تشویش زدہ

کر دیا تھا۔ اسے اپنی حکمتِ عملی پر جلد از جلد عمل کرنا تھا۔ اس کے بعد مزید مجرموں کی تلاش بھی باقی تھی۔ فائزہ کے ان خیالات میں یکدم کسی نامانوس شور سے خلل پیدا ہو گیا۔ اسے ڈرائنگ روم سے تند و تیز آوازیں بلند ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس پر ساری صورتِ حال واضح ہو گئی۔ عبید، مریم اور نعمان میں کسی بات پر بحث جاری تھی اور موضوعِ گفتگو اسی کی ذات تھی۔

''آپ کب تک اس بات کو چھپا کر رکھیں گے انکل؟ کبھی نہ کبھی تو سچ سامنے آئے گا ہی۔ میرے والدین بھی یہی سوال کر رہے تھے کہ پہلے تو دانش کے کسی چچا یا خالہ کا ذکر نہیں سنا تھا۔ اب کون سے رشتے دار سامنے آ گئے؟'' عبید نے استہزائیہ کہا۔

''ابھی کچھ وقت تو ایسے ہی نکالنا پڑے گا۔'' نعمان جز بز ہوئے۔

''اور اس کے بعد کیا کریں گے؟ کب تک اپنی بیٹی کے کرتوتوں پر پردہ ڈالیں گے؟'' اس نے مزید حظ اٹھایا۔

نعمان اور مریم سے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''ویسے اس میں قصوروار آپ بھی ہیں۔ جب اولاد کے ہاتھ میں موبائل دے کر بے پروا ہو جائیں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں تو ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ آج کل پارسا وہی ہے جسے 'موقع' نہیں ملتا اور جسے موقع مل جائے وہ پارسا رہ ہی نہیں سکتا۔''

عبید کی یہ منطق سن کر فائزہ کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ تنتناتی ہوئی اٹھی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بلا لحاظ و تمہید کہنے لگی۔

''ٹھیک کہا آپ نے! پارسا وہی ہے جسے موقع نہ ملے۔ لیکن ایسے 'عقلمند' کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو اپنی اولاد کو خود یہ موقع فراہم کرے۔ ذرا بتائیں گے مجھے کہ آپ کی چھ سالہ بیٹی اور چار سالہ بیٹا ہر وقت موبائل میں گھسے کیا کرتے رہتے ہیں؟ انہیں تو موبائل کے بغیر نیند آتی ہے نہ ہی کھانا کھایا جاتا ہے۔ چلیں ان کو بھی چھوڑیں! وہ آپ کی چھوٹی بہن ابھی ابھی کالج گئی ہے نا؟ میری مہندی والے دن اس نے درجنوں سیلفیز لے کر اپنی ویڈیوز بھی بنائی تھیں۔ اپنے لیے تو نہیں بنائی ہوں گی۔ دیکھنا تو تھا کسے بھیجی ہیں؟ کسی کو دکھائی ہی ہوں گی نا۔''

''زبان دیکھی ہے تم نے اپنی بہن کی؟'' عبید نے بھڑکتے ہوئے مریم کو مخاطب کیا اور تن فن کرتے وہاں سے چل دیا۔

''تم...... کیا چاہتی ہو آخر؟ اپنا گھر تو اُجاڑ ہی لیا ہے۔ اب میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟'' مریم نے طیش سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیوں؟ میں نے کیا غلط کہا ہے؟ میرے بارے میں جس کا جو دل چاہے، بولتا رہے لیکن میں کچھ کہوں یا حقیقت بیان کروں تو سب مرچیں چبانے لگتے ہیں۔ بات کرنی ہے تو بات سننے کا حوصلہ رکھیں۔ جب کسی پر انگلی اٹھاتے ہیں تو باقی چار انگلیاں اپنی جانب اشارہ کرتی ہیں۔'' اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''اس کا کوئی بندوبست کر لیں جلد از جلد۔ ورنہ بہت مسائل کھڑے ہوں گے۔ چلتی ہوں میں بھی۔'' مریم نے شکوہ کناں نگاہوں سے والد کو دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

☆☆☆

دانش اپنے کمرے میں لیٹا سخت بیزاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی شادی کے لیے دو ہفتے کی چھٹیاں لے رکھی تھیں تا کہ تقریبات کے اختتام پر 'ہنی مون' کا معاملہ بھی بخوبی نمٹ جائے۔ اب شادی کا معاملہ ہی ختم ہو جانے کی صورت میں وہ بیزاری، بوریت اور اندرونی اضطراب و خلش کا مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ دوست احباب سے ملاقات یا گفتگو پر بھی دل مائل ہو کے نہ دیتا۔

اس بیزاری کے عالم میں اس نے بلا ارادہ فون اٹھایا تو اسکرین پر دکھائی دینے والی تاریخ نے دل و دماغ مزید مضطرب کر دیے۔ اس روز ان کی ہنی مون کے لیے روانگی طے تھی۔ اسے فائزہ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے جانا تھا۔ اس نے سفر کے علاوہ وہاں رہائش کے بھی سبھی انتظامات طے کر رکھے تھے۔ یہ خیالات در آتے ہی اس کا ذہنی ارتکاز ایک بار پھر اسی کیفیت میں لوٹ گیا جو آج کل اس کے لیے باعث آزار بنی ہوئی تھی۔

اس نے خلفشار سے گھبرا کر دو گلاس پانی پیا اور پھر کمرے سے ملحقہ واش روم میں جا کر شاور تلے کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈے پانی کی پھوار جسم پر پڑتے ہی سوختگی فزوں تر ہو گئی۔ دماغ کسی غدار ساتھی کی طرح ماضی قریب میں تراشے گئے تخیلات پردۂ تصور پر لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے کمرے میں آیا تو موبائل فون پر بجنے والی مخصوص گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اسکرین پرنسز عینی کی جانب سے کسی پیغام کی موصولی کا اشارہ دے رہی تھی۔ دانش نے بے تابی سے موبائل تھام کر وہ پیغام

کھول لیا۔

☆☆☆

اپنے کمرے کی نیم تاریکی میں لیٹی فائزہ سخت طیش زدہ تھی۔ عبید کی جانب سے عائد کردہ ان الزامات اور اس کی مخصوص ذہنیت نے اس کے دماغ میں ایک آتش فشاں برپا کر رکھا تھا۔

"ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ یہ تو بس شروعات ہے۔" اس کے ذہن میں مخصوص لے کے ساتھ یہ فقرات گونجے تو وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

"اس میں غلط کیا ہے بھئی؟" اس کی سوچ نے دوبارہ کچوکا لگایا۔ "ابھی تو صرف ایک زبان کھلی ہے۔ ابھی تو جگ ہنسائی کا ایک پورا میچ کھیلا جائے گا۔ دنیا کی زبانیں تو نہیں روکی جاسکتی نا؟"

اس سوال کے ساتھ ہی دانش کا خیال اسے مزید تلملاہٹ میں مبتلا کرنے لگا۔

"طلاق شدہ عورت کے لیے یہ وقت بہت تلخ ہوتا ہو گا یقیناً..... لیکن بیوہ کے ساتھ تو ہمدردی کی جاتی ہے نا۔" اسے ایک اور راہ سُجھائی دی۔ "اگر یہ بات پھیلنے سے پہلے بیوگی کی اسٹیمپ مل جائے تو ایک تیر سے دو نشانے لگ سکتے ہیں۔ تیرا مجرم بھی سزا پالے گا اور اس کم بخت دنیا کے منہ بھی بند ہو جائیں گے۔"

"دنیا کے منہ بند ہوں یا نہ ہوں۔ اس ذلیل کا غرور توڑنا ہے کسی بھی طرح۔" فائزہ نے اپنے عزم کا اعادہ کیا اور موبائل فون اٹھا کر پرنسز عینی کا روپ دھار لیا۔

"کیسے ہو دانی ڈیئر؟ آج کسی اپنے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی تو جانے کیوں سب سے پہلے تمہارا خیال ہی ذہن میں آیا۔ پہلے سوچا کہ تم کیا سوچو گے کیسی مصیبت گلے پڑ گئی ہے؟ اس کے تو رونے دھونے ہی ختم نہیں ہوتے۔ پھر سوچا کہ شاید تم ایسا نہ سوچو کیونکہ تم ہی تو کہتے ہو کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

یہ پیغام بھیج کر اس نے بستر کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موند لیں۔ اب اسے دانش کے جواب کا بے چینی سے انتظار تھا۔

☆☆☆

دانش نے عینی کا پیغام پڑھا تو بین السطور پوشیدہ تڑپ اور طلب محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اسے اپنی لائن پر لانا ہی ہو گا دانی! اس وقت تیرے 'علاج' کے لیے اس سے بہتر کوئی آپشن نہیں ہے۔" اس کے ذہن نے فوراً راہ سُجھائی۔

کسک، اضطراب و تشنگی سے بے حال ہو کر وہ ہانپتے ہوئے بستر پر بیٹھا اور کچھ سوچتے ہوئے جوابی پیغام لکھنے لگا۔

"مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم مجھے اپنا سمجھتی ہو۔ ایسی فضول بات تمہارے ذہن میں آئی بھی کیسے کہ میں تمہارے لیے کچھ الٹا سیدھا سوچوں گا۔ کسی بھی مصیبت یا پریشانی میں آخر دوست ہی تو دوستوں کے کام آتے ہیں۔ بتاؤ! کیا ہوا ہے ایسا جس نے تمہیں اتنا ڈسٹرب کر دیا ہے۔"

"ایک عورت کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے؟ اسے اس سوسائٹی میں معتبر رہنے کے لیے پہلے شادی کرنی پڑتی ہے پھر اولاد کی اسٹیمپ بھی چاہیے ہوتی ہے۔"

"ہاں! کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔ میں بھی اکثر یہی سوچتا ہوں کہ عورت کے لیے سروائیو کرنا بہت مشکل ہے۔" دانش نے فوراً ہمدردی جتائی۔

"اولاد نہ ہونے کا سارا ملبا عورت کے سر ڈال دینے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس معاملے میں مرد بھی تو قصوروار ہو سکتا ہے۔ ایک تو عورت ادھورے پن کا عذاب سہے پھر دوسروں کی بکواس اور طعنے بھی وہی سنے۔ یہ تو کہیں کا انصاف نہیں ہے۔" عینی آزردہ ہوئی۔

"بالکل نہیں ہے لیکن ایک بات کہوں؟ خاموش رہ کر برداشت کرتے رہنا بھی عورت کی ہی غلطی ہوتی ہے۔ بھئی ایسی بھی کیا مجبوری ہے کہ وہ اپنی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی ہر بات برداشت کرے۔ احتجاج کرنا اور اصل گناہ گار بے نقاب کرنا تو اس کا حق ہے۔" دانش نے شہ دی۔

"بعض اوقات کوئی مجبوری ایسی بھی ہوتی ہے جو عورت کو کوئی احتجاج کرنے سے روک لیتی ہے اور وہ چاہ کر بھی اپنے گلے پڑی مصیبت سے جان نہیں چھڑوا سکتی۔ میری چھوٹی بہن اور بابر کے بھائی کی شادی بھی ایسی ہی ایک مجبوری ہے۔ میرا کوئی بھی احتجاج یا بغاوت ایک کی لائف اَپ سیٹ کر دے گی یا شاید ختم ہی کر دے۔"

"او گاڈ! یہ کیسی جہالت ہے یار؟ تو کیا تم اسی طرح ادھورے پن کا عذاب سہتے ہوئے سلگتی رہو گی؟" دانش نے اسے مزید شہ دی۔

"نہیں۔ اب نہیں۔ میں مزید یہ تپش اور بے سکونی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس طرح گھٹ گھٹ کر جینا مجھے بالکل قبول نہیں۔"

عینی کے اس جواب سے دانش کے دماغ میں

چنگاریاں چھٹنے لگیں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مزید سلب ہو گئی تھی۔

''اچھا! تو کیا کرو گی تم؟'' اس نے اپنایت کا مظاہرہ کیا۔

دوسری جانب چند لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دانش سخت اضطراب محسوس کرنے لگا۔

''کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو گیا۔ کچھ زیادہ تو نہیں بول گیا میں؟'' اس نے اپنے ارسال شدہ پیغامات پر دوبارہ نظر ڈالی۔ بظاہر کہیں کسی غلطی کا امکان نہیں تھا۔

''عورت ذات کا کیا کیجیے؟ اسے کوئی معمولی اور بے ضرر بات بھی پہاڑ کی طرح محسوس ہو سکتی ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ دانش کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

☆☆☆

فائزہ اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیل رہی تھی۔ اس نے دانش پر قائم کردہ تاثر بہر صورت برقرار رکھنا تھا۔ اسے علم تھا کہ کوئی بھی مرد تنہا اور تشنہ عورت کی خدمت گزاری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ دانش کے بارے میں بھی اس کا اندازہ یہی تھا کہ اس کی تندی اور درشت مزاجی کے عقب میں یہی عوامل کارفرما ہوں گے کہ وہ درونِ پردہ ایسی ہی سماجی خدمت کی طرف مائل ہے۔ فائزہ کی توقعات اور اندازے بالکل درست ثابت ہوئے تھے۔ اب اسے بلی کو تھیلے سے باہر نکالنا تھا اور اس کے لیے بھی حکمتِ عملی طے شدہ ہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کے بجائے جسمانی خطوط کی نصف درجن ہیجان انگیز تصاویر پہلے ہی تیار کر رکھی تھیں۔ دانش کی بے چینی اور تحریک بھری وہ تسلی و تشفی محسوس کرتے ہی اس نے اپنی تصاویر ارسال کر دیں۔ اسے یقین تھا کہ دانش کے ہوش و حواس یقیناً مختل ہو گئے ہوں گے۔

''یہ...... تم...... ہو...... عینی؟'' دانش کی جانب سے رومانوی ایموجیز سے لتھڑا ایک پیغام موصول ہوا۔

''کوئی شک ہے؟'' اس نے اٹھلا کر پوچھا۔

''نہیں۔ بائے گاڈ! تم تو ایک قیامت ہو۔'' دانش کی رال ٹپکنے لگی۔

''ہاں! ایسی قیامت جو کسی پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب ہے۔'' عینی نے بے باکی سے جواب دیا۔

''اوہ...... ڈیئر...... تم تو کسی بھی اینگل سے تیس بتیس کی نہیں لگتی ہو۔'' ان ہیجانی تصاویر نے دانش کے وجود میں

## نہیں تو

ایک گرجا کی دیوار پر لکھا تھا...... ''اگر گناہ سے تھک گئے ہو تو اندر آ جاؤ۔'' اس کے نیچے لپ اسٹک سے لکھا تھا۔ ''اگر نہیں تو اس پتے پر آ جاؤ۔'' اس کے نیچے لڑکی کا نام اور پتا لکھا تھا۔

## عورت

ایک نظر نہ آنے والی چیز جس کا نام نغمہ ہے یا دل ہے یا خوب صورتی ہے، اس نظر آنے والی چیز سے مات کھا جاتی ہے جس کا نام روپیہ ہے اور نغمہ روپے سے اس لیے کمتر ہے کیونکہ تم اسے بینک میں جمع نہیں کر سکتے اور جذبہ اس لیے کہ تم اس کے عوض بازار سے کچھ خرید نہیں سکتے اور خوب صورتی اس لیے کہ روپے کی طرح وہ کسی لکھ پتی کی مٹھی میں نہیں آ سکتی۔ حیرت ہے کہ کس طرح کی دنیا ہے اور کیسی اس کی قدریں ہیں۔

عورت تو وہ آگ ہے جو دھیمے دھیمے سلگنے والے فن کو شعلے کی طرح بھڑکا دیتی ہے۔

## کن لوگوں کے لیے

ایک پستہ قد تاجر انکم ٹیکس کے دفتر گیا۔ وہاں وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص نے کہا۔ ''جناب، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں، آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''کسی سے بھی نہیں۔'' تاجر نے کندھے ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ میں کن لوگوں کے لیے دن بھر کام کرتا ہوں۔''

## بے فکری

تین مرد ٹرین میں بیٹھے تھے۔ قریب ہی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ایک مرد نے برہم لہجے میں خاتون سے کہا۔

''آپ اپنا سوٹ کیس یہاں سے اٹھا لیں۔''

''کیوں جناب؟'' خاتون نے حیرانی اور غصے سے کہا۔

''وہ اس لیے کہ کہیں میرے سر پر نہ گر جائے۔''

خاتون بے نیازی سے بولیں۔ ''آپ فکر نہ کریں اس میں کوئی چیز ٹوٹنے والی نہیں ہے۔''

(حنا عزیز کی ڈائری سے)

ایک نئی سوختگی پیدا کر دی تھی۔ ''تم بائیس، تیئس سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ اب پلیز! اپنی پوری پکچر بھی دکھا دو نا؟''

''نہیں! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ چہرہ دیکھے بغیر رومانس کا مزہ ہی اور ہوتا ہے اور میں کچھ دیر اسی رومانس کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں تم پر بہت اعتبار کرتی ہوں۔ اس اعتبار کو پکچرز اور ویڈیو کال کی ڈیمانڈ سے شیک نہ کرنا۔ میں سکون چاہتی ہوں۔ تنہائی کے اس عذاب سے نجات چاہتی ہوں۔ تم ایسی کوئی ڈیمانڈ کر کے مجھے مزید تنہا مت کرنا۔'' عینی نے بھرپور جذباتیت کا مظاہرہ کیا۔

موبائل کی چمکتی اسکرین پر بے چینی سے نظریں جمائے اب وہ دانش کے جواب کی منتظر تھی۔

☆☆☆

دانش کے ہیجان میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ ہو چکا تھا۔ رومانس کے متعلق عینی کی منطق محض ایک بھرم تھی۔ وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کے لیے بے تاب تھی اور دانش کی بے تابی تو یوں بھی حواس مختل کر ہی چکی تھی۔

''سکون اور نجات کبھی کبھی بہت بڑی قیمت طلب کر لیتے ہیں۔'' اس نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

''ہاں! میں جانتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ بھلا یہ بات کون جان سکتا ہے؟'' عینی کی جانب سے ایک بار پھر بے بسی کا اظہار ہوا۔

''تو کیا تم یہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو؟'' اس نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

''ہاں بالکل تیار ہوں۔ بولو؟ کہاں ملنے آؤں میں تمہیں؟''

عینی کے اس اعتراف اور استفسار نے دانش کی عقل بالکل ہی سلب کر لی۔ اس نے بلا سوچے سمجھے عجلت میں لکھا۔

''جہاں بلاؤں گا، آجاؤ گی؟''

''ہاں! آجاؤں گی۔ اب آگے میری قسمت کہ مجھے تم ملتے ہو یا کوئی گینگ جو باقاعدہ ریکارڈنگ کا بندوبست کر کے مجھے مستقبل میں بلیک میل کرنے یا کسی ویب سائٹ پر اپلوڈ کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہو۔ اس رسک کے باوجود آ تو میں جاؤں گی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

دانش اس جواب پر لحہ بھر کے لیے متذبذب ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بھی چند ایک اندیشے سرسرانے لگے تھے۔ عینی کے درپردہ کوئی ایسا گروہ بھی تو ہو سکتا تھا جو جسمانی اعضا کی فروخت یا بردہ فروشی میں ملوث ہوتا......

''ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے روپ میں کوئی لڑکا بھی سامنے آسکتا ہے۔''

''کیا کروں؟ کیا کروں؟'' اس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

''رسک تو لینا پڑے گا ورنہ میں خود بھی عذاب کا ہی شکار رہوں گا۔ شاید قدرت نے مجھ پر مہربان ہو کر ہی یہ وسیلہ بنایا ہے۔'' دانش نے خود کو تسلی دی اور اگلے ہی لمحے چونک گیا۔

☆☆☆

فائزہ کی حسیات مکمل طور پر دانش کی گفتگو پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کے الفاظ کی جنبش سے اندرونی خلفشار بھانپ چکی تھی۔

''کیا بات ہے؟ کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟ کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ پرنسز عینی کے روپ میں کوئی پرنس علی نہ چلا آئے۔''

عینی کے اس سوال نے دانش کو گڑبڑا دیا۔

''کہیں یہ میری مائنڈ ریڈنگ تو نہیں کر رہی؟'' وہ بڑبڑایا۔

''نہیں! غلط سوچ رہے ہو۔ مجھے مائنڈ ریڈنگ نہیں آتی۔ میں تو بس تم مردوں کی فطرت بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اب یقیناً میری کوئی مکمل تصویر مانگنے کے چکروں میں ہو گے۔ ہے نا؟''

عینی کے اس سوال نے دانش کو ایک بار پھر گڑبڑا دیا۔ اس کے ذہن میں حقیقتاً یہی خیال چکرا رہا تھا۔

''نہیں! تم غلط سوچ رہی ہو۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''اگر ایسا ہے تو بہت اچھی بات ہے ورنہ میں مایوس ہو کر کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتی۔'' وہ بلا لحاظ کہنے لگی۔

''تم بھی ویسے بہت عجیب ہو عینی! ایک طرف اتنا اعتبار بھی کر لیا اور دوسری طرف اتنی بے اعتباری۔'' دانش نے اپنی الجھن کو گویائی دی۔

''ہاں! بس عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اعتبار کر کے بھی کسی نہ کسی کسوٹی پر پرکھنا اپنا حق سمجھتی ہے۔ میں تمہیں پک نہیں بھیجوں گی۔ بس تم کل لائیو جلوہ دیکھنا۔''

''اُف! کل تک وقت کیسے کاٹوں گا؟'' دانش نے ایک بے ہودہ ایموجی ارسال کرتے ہوئے اس کے جذبات برانگیختہ کرنے چاہے۔

''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے سویٹ ہارٹ!'' دوسری

جانب سے بھی انہی ایموجیز کے سگنوں میں ادائیگی ہوئی۔

''میں کل ہوٹل ڈریم لینڈ میں کوئی روم بک کروالیتا ہوں۔ اب انتظار نہیں ہوگا ڈارلنگ۔ پتا نہیں یہ رات کیسے کٹے گی؟'' عینی کی وارفتگی نے اس کا نفس بے ربط کر دیا تھا۔

''سیم ہیئر سویٹ ہارٹ!'' میں کل صبح گیارہ بجے پہنچ جاؤں گی۔ میرے موبائل کی بیٹری اب ڈیڈ ہونے والی ہے۔ صبح ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔''

عینی کے اس جواب پر دانش دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ ابھی گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید سنسنی اور لذت محسوس کرنا چاہتا تھا۔

''او کے! سی یو۔'' وہ بے دلی سے بولا اور موبائل بند کر کے رکھ دیا اور بستر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

فائزہ اگلے روز علی الصباح ہی اٹھ گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں شدید اضطراب اور کشمکش برپا تھی۔ مزاج پر ایک عجیب خاموشی اور افسردگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ ایک بڑی سی چادر اوڑھے اپنے کمرے سے نکلی تو نظریں بے اختیار والدین کے کمرے کی جانب اٹھ گئیں۔ دروازہ خلافِ معمول نیم وا تھا۔ فائزہ اچنبھے کے عالم میں آگے بڑھی اور کمرے میں داخل ہوگئی جہاں نیم تاریکی میں بستر پر سلوٹیں واضح محسوس ہو رہی تھیں۔

''یہ کہاں گئے ہیں؟ اللہ خیر! سب ٹھیک ہو۔'' اس نے ہول کر سوچا۔

اگلے ہی لمحے ایک خیال کے تحت اس نے سائڈ ٹیبل کی ایک مخصوص دراز کھول لی۔ اس کا اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ وہاں سمیعہ کی رپورٹس موجود نہیں تھیں۔ رات کے کسی پہر غالباً طبیعت کی خرابی کے باعث نعمان انہیں اسپتال لے گئے تھے۔

''مجھے بتانا یا جگانا بھی ضروری نہیں سمجھا آپ لوگوں نے؟ اپنی اولاد پر اتنی بے اعتباری؟ اتنی نفرت؟'' اس نے کمرے کی مشرقی دیوار پر نصب والدین کی تصویر سے مخاطب ہو کر کہا۔ دل میں کرب کی ایک شدید ٹیس اٹھی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے نعمان کا نمبر ملایا لیکن دوسری جانب سے کال منقطع کر دی گئی۔ فائزہ کی بے بسی طیش میں ڈھلنے لگی۔ وہ بھناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ ٹی وی لاؤنج میں آتے ہی شادی کی تیاریوں کے مناظر پردۂ تصور پر اُجاگر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد دانش سے آخری ملاقات یاد آئی تو دل و دماغ میں آتش فشاں کھولنے لگا۔

''نہیں! وہ آخری ملاقات نہیں تھی۔ آخری ملاقات تو آج ہونی ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

اسی اثنا میں اپنے موبائل پر دانش کا پیغام موصول ہوا۔

''میں نے بکنگ کروالی ہے ڈارلنگ! ٹاپ فلور پر لیا ہے روم۔ مکمل پرائیویسی ہوگی وہاں۔''

''سو اسمارٹ! میں بس نکلتی ہوں تھوڑی دیر تک۔''

فائزہ نے رومانوی اسمائلز کا تڑکا لگایا اور ہر خیال و تناؤ کو سر سے جھٹکتے ہوئے اپنی تیار کردہ لسٹ کے بارے میں سوچنے لگی۔ وقت کم تھا اور اسے کچھ ضروری خریداری بھی کرنی تھی۔

☆☆☆

دانش ہوٹل ڈریم لینڈ کے اس کمرے میں اسی اضطراب کا شکار تھا جس نے اسے کئی روز سے ایک آزار میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ وہ اس وقت دہری کشمکش کا شکار تھا۔ عینی کے روپ میں کسی اجنبی پر اعتبار کر کے یہاں تک چلے آنا بلاشبہ حماقت کی حد تک ایک بہت بڑا رسک تھا لیکن اس آزار نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل چھوڑا ہی کہاں تھا؟ اسے بہر صورت اس کسک سے نجات درکار تھی۔ اس نے یہاں آمد سے پہلے بلال کو اشارتاً اپنے 'ایڈونچر' کا عندیہ دے دیا تھا۔

''میں ایک پارٹی کی تیاری کے لیے جا رہا ہوں۔ ریڈی رہنا تجھے بھی یہاں کی لوکیشن سینڈ کر دوں گا۔''

بلال کو یہ پیغام بھیجنے کے بعد اُس کی ذہنی رو والدین کی جانب منتقل ہو گئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے طیب نے اسے سخت سست سنائی تھیں۔

☆☆☆

فائزہ ایک آن لائن ٹیکسی میں ہوٹل ڈریم لینڈ کے باہر پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنا حلیہ مکمل طور پر تبدیل کر رکھا تھا۔ کھلے عبایہ، اسکارف سے کیے گئے نقاب اور آنکھوں پر سیاہ چشمے نے اسے ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ ہوٹل کے ٹاپ فلور پر پہنچ کر اس نے اپنی فون گیلری کھولی اور چند تصویریں منتخب کرنے کے بعد دانش کو ایک پیغام کے ساتھ ارسال کرتے ہوئے لکھا۔

''میں آ گئی ہوں۔ اب وعدے کے مطابق سرپرائز تمہارا حق ہے۔''

اسے یقین تھا کہ یہ تصویریں دیکھ کر دانش انگاروں پر لوٹنے لگے گا۔

☆☆☆

دانش کا تنفس دھونکنی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اسے اپنی بصارت پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے اپنی ہی بہن کی تصاویر تھیں۔ مختلف انداز سے مختلف فلٹرز لگا کر لی جانے والی وہ تصاویر خاصی نجی نوعیت کی تھیں۔ دانش کا دماغ کھولنے لگا۔ اس کی زبان سے بے اختیار مغلظات برآمد ہونے لگی تھیں۔ اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ یہ غصہ پہلے عینی پر نکالے یا بہن کو فون کر کے اسے سخت سست سنائے۔ عینی اور ان تصاویر کا آخر آپس میں کیا ناتا تھا؟ اسی لمحے دروازے پر مدھم دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے بھنا کر دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک پھوار چہرہ شرابور کرتے ہوئے اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کر گئی۔

☆☆☆

دانش کے تیورا کر زمین پر گرتے ہی فائزہ نے دائیں بائیں راہداری کا جائزہ لیا اور فوراً کمرے میں داخل ہو کر دروازہ مقفل کر دیا۔ اس نے چند گہرے سانس لیتے ہوئے خود کو پُرسکون کرنا چاہا لیکن دانش کو دیکھ کر طیش پر قابو پانا ممکن ہی نہیں ہو رہا تھا۔ فائزہ نے تنفر سے دانش کے چہرے پر تھوکا اور اس کے بدن پر بے دریغ ٹھوکریں رسید کرنے لگی۔ نفرت وطیش کی یہ لہر تھمی تو وہ اپنے بیگ سے مخصوص سامان نکالنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کے دستانے تا حال نہیں اتارے تھے۔ وہ اس کمرے میں کسی بھی مقام پر اپنی انگلیوں کے نشان ثبت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دانش کے لیے نفرت وغیظ سے مغلوب ہو کر فائزہ نے پہلے اسے بازوؤں سے اٹھا کر کمرے میں موجود واحد کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن اس کا بے ہوش وجود مزید وزنی ہو جانے کے باعث ایک دوانچ سے زیادہ نہ سرکا سکی۔

”زیادہ تارزن یا سُپر وومن بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی انرجی بچا کر رکھو۔“ اپنی اس ناکام کوشش میں ہانپنے کے بعد وہ کمر پر ہاتھ رکھے سیدھی کھڑی ہوئی اور سر جھٹکتے ہوئے خودکلامی کرنے لگی۔

کچھ لمحوں تک اپنا تنفس ہموار کرنے کے بعد اس نے اپنا بیگ کھول لیا جو اس وقت عمرو عیار کی زنبیل کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا۔ فائزہ نے نہایت مشقت سے دانش کو کسی طرح بستر کے سہارے فرش پر ہی نیم دراز کیا اور بیگ سے مخصوص ٹیپ کے علاوہ رسی کے ٹکڑے بھی نکال لیے۔

صید کو گرفت میں جکڑنے کا یہ طریقہ اس نے گزشتہ رات ہی انٹرنیٹ سے تلاش کر کے سیکھا تھا۔ اس لمحے فائزہ کے وجود میں برق کوندر ہی تھی۔ وہ اپنا کام حتی الامکان تیزی سے نمٹا رہی تھی کیونکہ چھڑکاؤ شدہ محلول کا اثر نصف گھنٹے سے پہلے ہی زائل ہو جاتا تھا۔

اس کام سے فراغت کے بعد فائزہ نے دانش کا موبائل فون تھام لیا۔ دانش کی سابقہ منگیتر اور ایک روزہ بیوی ہونے کے باعث اسے علم تھا کہ اس کا موبائل انگشتِ شہادت کے لمس سے غیر مقفل ہوتا ہے۔ فائزہ نے بڑی سہولت سے یہ مرحلہ بھی نمٹایا اور اس کے فون سے پرنسز عینی کا ہر نام ونشان مٹا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی ان تصاویر اور ویڈیوز کا جائزہ لینا ہی چاہتی تھی جن کی بنا پر دانش نے اسے بدنامی کا داغ لگا کر اپنے رشتے سے آزاد کیا تھا لیکن اسی لمحے دانش کے وجود میں کسمساہٹ پیدا ہونے لگی۔ فائزہ کی حسیات مکمل چوکنا ہو گئیں۔ اس نے اپنے بیگ سے فوری طور پر دو آہنی پنجے نکالے اور ہاتھوں پر چڑھا لیے۔ اس دورانیہ میں اس نے ایک لحہ کے لیے بھی اپنا چہرہ اور ہاتھ بے نقاب نہیں کیے تھے۔

”تم...... کون...... وہ...... پکس......“ دانش کا شعور اب دھیرے دھیرے بیدار ہونے لگا تھا۔

”کیسی لگیں اپنی بہن کی پکس؟ پسند آئیں نا؟ یہاں آنے کا مقصد تو پورا ہو ہی گیا ہوگا تمہارا؟“ فائزہ نے سرد مہری سے دریافت کیا۔

”تم...... تم......“ دانش کے ذہن پر چھائی دُھند کم ہونے لگی تو اسے آواز بے حد مانوس معلوم ہوئی۔

”ہاں...... میں...... کیوں؟ اتنی جلدی بھول گئے مجھے؟“ فائزہ نے اپنے چہرے سے نقاب سرکایا۔

دانش کا چہرہ حیرت اور تنفر سے بگڑ کر رہ گیا۔

”تم...... فاحشہ...... پرنسز عینی...... تم......“

دانش کے اس اندازِ تخاطب نے فائزہ کا دماغ الٹا دیا۔ اس نے آہنی پنجے سے دانش کے دائیں رخسار پر بھرپور ضرب لگائی۔ دانش کا چہرہ لہورنگ ہونے لگا۔ فائزہ نے سرعت سے اس کے منہ میں ایک رومال ٹھونس دیا تاکہ کسی بھی قسم کی آواز بیرونی مداخلت کا سبب نہ بنے۔ دانش کے لہو آلود چہرے اور تڑپتے بدن نے فائزہ کو اس قدر سکون فراہم کیا کہ وہ اس کے چہرے، بازوؤں اور بدن پر پے در پے آہنی گھونسے برساتی چلی گئی۔

”مجھے گالی دیتا ہے...... مجھے بدنام کرتا ہے...... تو خود

ایک گالی ہے...... سراپا گالی...... غلیظ اور گھٹیا انسان ہے۔"
اس نے ہانپتے ہوئے دانش کے چہرے پر تھوکا۔

دانش کا بدن بے طرح مچل کر رہ گیا۔ فائزہ نے اس آہنی زدوکوب کا ایک اور بھرپور 'راؤنڈ' کھیلا اور اپنا تنفس متوازن کرنے کے لیے اس کا موبائل کھول لیا۔ اسے اپنی تصاویر اور ویڈیوز کی تلاش تھی۔ فائزہ کی یہ تلاش زیادہ طویل ثابت نہ ہوئی۔ اسے اپنا مطلوبہ مواد ایک فولڈر میں مل گیا تھا۔

"کس نے بھیجا تھا یہ تجھے؟ کس نے دکھایا تھا تجھے یہ سب؟" اس نے دانش کے منہ سے رومال نکالنے کے بعد اس کی گردن آہنی پنجے کی زد میں رکھ لی۔

"جلدی بول کتّے! کس نے بھیجا تھا یہ سب؟" اس نے پنجے کی نکیلی دھار دانش کے حلق میں گاڑ دی۔

"بلال...... بلال نے۔" دانش کے حلق سے خرخراہٹ برآمد ہوئی۔

"کون بلال؟" فائزہ چونکی۔ "اوہ...... اچھا...... وہ...... جسے تو نے اسٹیج پر مجھ سے ملوایا تھا۔"

دانش نے اذیت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فائزہ نے ایک بار پھر اس کے حلق پر اپنی گرفت میں اضافہ کیا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی۔

"اسے یہاں کسی طرح بلا سکتے ہو؟ لیکن یاد رکھنا! اگر کوئی بھی اشارہ دینے کی غلطی کی تو اسی وقت تیرا حلق چیر کر رکھ دوں گی۔"

دانش نے ملتجی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور تعاون کا عندیہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "اگر اسے یہ کہوں کہ یہاں ایک لڑکی موجود ہے۔ اس کے ساتھ پارٹی کی جا سکتی ہے تو وہ فوراً چلا آئے گا۔"

دانش کے اس جواب پر فائزہ کی آنکھوں میں تنفر مزید گہرا ہو گیا۔ اس نے دانش کے منہ میں رومال ٹھونسا اور سابقہ عمل دہراتے ہوئے اس کا موبائل غیر مقفل کر لیا۔ دانش کی واٹس ایپ چیٹنگ سے بلال کا نمبر تلاش کرتے ہوئے وہ لمحے بھر کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد الفاظ مجتمع کیے اور دانش ہی کے انداز میں لکھنے لگی۔

"ہوٹل ڈریم لینڈ میں چلے آؤ! پارٹی کا پورا انتظام ہے۔ یہاں آ کر کال یا واٹس ایپ مت کرنا۔ پارٹی پوری کی پوری چالو ہے۔ جلدی آ جا! میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

"آئے...... ہائے...... ہائے...... ابھی آیا میں جگر! آج تو پارٹی کے لیے میرا بھی سخت موڈ ہے۔" بلال کی جانب سے آنکھ میچتے ہوئے فوراً جواب آیا۔ "لوکیشن سینڈ کر۔ میں تو کب سے ریڈی ہوں۔"

"اوکے! کال مت کرنا آ کے۔ دروازے پر تین بار ناک کر دینا۔ ٹاپ فلور روم نمبر سکس۔" فائزہ نے لوکیشن بھیجتے ہوئے لکھا۔

اس کام سے فراغت کے بعد وہ موبائل کے ہر ممکنہ کونے سے اپنی ویڈیوز اور تصاویر کے نشانات مٹانے لگی۔ یہ کام مکمل کر کے اس نے دانش کی ملتجی نگاہوں اور تڑپ و بے بسی کو محظوظ نگاہوں سے دیکھا اور اپنے آہنی پنجے سے اس کے چہرے و گردن پر مزید نقش و نگار بناتے ہوئے سرد مہری سے کہنے لگی۔

"بس تھوڑی دیر صبر کر لو۔ پھر تمہیں آزادی مل جائے گی۔"

دانش کے حلق سے بے معنی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ اسی لمحے دروازے پر ہونے والی مخصوص دستک نے اسے مزید چوکنا کر دیا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک بار پھر وہی اسپرے برآمد کیا اور دبے قدموں سے چلتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

بلال نے دستک دینے سے پہلے محتاط نگاہوں سے راہداری کا جائزہ لیا اور مکمل سکوت پا کر قدرے پُرسکون ہو گیا۔ اس کے وجود میں ہلکورے لیتی سنسنی شدید ہونے لگی تھی۔

"لگتا ہے کوئی کراری پارٹی پھانسی ہے سالے نے۔ اس لیے رازداری کا اتنا بندوبست کیا ہوا ہے۔" اس نے محظوظ ہوتے ہوئے خود کلامی کی۔

بلال اور دانش بچپن کی دوستی کے ناتے اپنے 'معاملات' ایک دوسرے سے خفیہ رکھ ہی نہیں پاتے تھے۔ وہ دونوں حقیقی معنوں میں کرائم پارٹنر تھے۔ انہوں نے اسکول کے زمانے سے ہی صنفِ نازک میں دلچسپی اور رومانوی تعلقات کا آغاز کر دیا تھا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد یہ لت مزید بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے بہترین برادرانہ تعلقات کا ثبوت دیتے ہوئے کئی بار شکار مل بانٹ کر بھی کھایا تھا۔

بلال نے قرب و جوار کا محتاط انداز میں جائزہ لیتے ہوئے مخصوص دستک دی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھلتے ہی بلال نے مضطرب ہو کر قدم اندر رکھے ہی تھے کہ اُس کے چہرے پر کسی سیال کی تیز دھار پھوار پڑی اور وہ تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔

☆☆☆

فائزہ کا ہیجان شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے بلال کو بھی مخصوص انداز میں رسن بستہ کیا اور اسے دانش کے ساتھ ہی بٹھا کر اس کے موبائل فون کا جائزہ لینے لگی۔ اس موبائل کو غیر مقفل کرنا بہرحال ممکن نہیں تھا۔ وہ صبر و سکون سے بلال کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔ مقررہ وقت کے بعد اس کے وجود میں کسمساہٹ محسوس کرتے ہی فائزہ نے اپنے 'ہتھیار' تیار کر لیے۔

''کون...... ہو...... تم؟'' بلال نے شعوری رو بیدار ہوتے ہی فائزہ سے استفسار کیا۔

''تمہاری گرل فرینڈ...... پہچانا نہیں مجھے؟'' وہ زہر خند ہوئی اور لمحہ بھر کے لیے اپنا نقاب سرکا دیا۔

بلال اسے دیکھ کر بے طرح چونک گیا۔ اسی لمحے اس کے موبائل پر بجنے والی مخصوص گھنٹی نے اسے مزید حیرت زدہ کر دیا۔

''بتا مجھے؟ کیسے کھلے گا یہ؟ میں بھی تو دیکھوں کس کا میسج ہے؟'' فائزہ نے اس کا حلق آہنی پنجے کی گرفت میں لیا۔

فائزہ کی سرد مہری اور خونخواری نے بلال کو گنگ کر دیا تھا۔ اس نے سراسیمگی سے موبائل غیر مقفل کرنے کا طریقہ بتا دیا۔ فائزہ نے تلخی سے ہنستے ہوئے اسکرین کا رخ اس کی جانب کر دیا۔

''یہ...... تو...... تم...... نے ہی میسج کیا ہے مجھے۔'' بلال کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

''ارے واہ! لیکن میں تو یہاں بیٹھی ہوں۔ میں تمہیں میسج کیسے کر سکتی ہوں بھلا؟'' وہ زہر خند ہوئی۔

دانش کے چہرے پر بھی حیرت و اُلجھن در آئی۔

''تم نے اپنی یہ آئی ڈی کسی کو دے دی ہو گی تا کہ تم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکو۔'' بلال نے حقارت سے اس کی جانب دیکھا۔

فائزہ اس منطق پر سخت بھنا گئی۔ اس نے بلال کے منہ میں رومال ٹھونسا اور اس کے بدن کو آہنی ضربات کی زد میں رکھ لیا۔ اس کی وحشت اور ضربات سے بلال مچل کر رہ گیا۔

''کب سے چیٹنگ کر رہے تھے تم مجھ سے؟'' اس نے بلال کے منہ سے رومال نکالتے ہوئے اس کے حلق پر آہنی پنجے کی گرفت بڑھائی۔

''تین ہفتوں سے۔'' بلال نے بدقت کہا۔

دانش حیرت سے اُس کی جانب دیکھنے لگا۔

''کتنی بار آڈیو یا ویڈیو کال پر بات کر چکے ہو مجھ سے بائی دی وے؟'' فائزہ نے تلخی سے دریافت کیا۔

''ایک بار آڈیو اور ایک بار ویڈیو۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تو نے مجھے ویڈیو کال پر دیکھا تھا؟'' فائزہ نے اپنی گرفت بڑھائی۔

''نن...... نہیں...... کال کنیکٹ ہوتے ہی لائٹ چلی گئی تھی دوسری طرف۔ تو میں نے ویڈیوز مانگ لیں۔'' بلال سے اپنی بات مکمل کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

فائزہ نے اس کے چہرے کی شناخت کروا کے ایک بار پھر موبائل غیر مقفل کروایا اور میسنجر کھول کر کہنے لگی۔

''میں اسے آڈیو کال ملانے لگی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ویڈیو کال تو کبھی بھی ریسیو نہیں ہو گی۔ تم اس سے بات کرو اور میرے پوچھے گئے سوالوں کے جواب لو۔ اس کے بعد میں تم دونوں کو آزاد کر دوں گی۔ اگر کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو یہیں کے یہیں دفن کر دوں گی میں تمہیں۔'' فائزہ کے چہرے پر چھائی خونخواری نے انہیں سراسیمہ کر دیا۔

اس نے اگلے چند منٹوں میں بلال کو کچھ ہدایات دیں اور کال ملا کر اسپیکر کھول دیا۔

''ہائے بے بی!'' دوسری جانب سے ایک نرم اور شیریں آواز سنائی دی۔

''ہائے مائی سوئٹ ہارٹ! کیسی ہو؟'' بلال نے وارفتگی سے کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ سے سخت ناراض ہوں۔''

روٹھے پن سے دیا گیا یہ جواب سن کر فائزہ کے چہرے پر کشمکش دکھائی دینے لگی۔

''او مائی بے بی! کیا ہوا؟ کیوں ناراض ہے میری بے بی مجھ سے؟'' بلال کا والہانہ پن دیکھ کر فائزہ کو کراہت محسوس ہونے لگی۔

''آپ نے میرا میسج سین کر کے بھی ریپلائی نہیں کیا اور اب کال کر دی ہے۔ آپ کو پتا بھی ہے میرے لیے کالج ٹائم میں کال سننا کتنا مشکل ہے۔''

''اوہ! سوری بے بی! میں تو بس تمہیں مس کر رہا تھا اس لیے کال کر دی۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ پلیز!'' بلال ملتجی ہوا۔

''ہائے اللہ جی! ابھی تو ہماری فرینڈ شپ ہوئی ہے اور آپ نے اتنی جلدی ملنے کی فرمائش بھی کر دی؟''

یہ فقرہ سنتے ہی فائزہ کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اس کا چہرہ متزلزل دکھائی دینے لگا۔

''نہیں!'' فائزہ نے سر جھٹکا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا کروں؟ تم نے دیوانہ ہی اتنا کر دیا ہے۔'' بلال نے خالصتاً لوفرانہ انداز میں کہا۔

''ہائے اللہ جی! آپ نا...... بڑے وہ ہیں۔''

اس فقرے کے بعد فائزہ کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے بالآخر اپنے ایک اور مجرم کی شناخت کر لی تھی۔ ذہن میں بے یقینی اور تاسف کے جھکڑ رواں ہو چکے تھے۔ اس نے ایک جھٹکے سے فون پیچھے کیا اور کال منقطع کر دی۔ وہ لمحات بہت عجیب تھے۔ فائزہ کا وجود ایک بھرپور وحشت کی زد میں تھا۔ اس نے بلال کے منہ میں ایک بار پھر رومال ٹھونسا اور اپنے بیگ سے تقریباً دو فٹ طویل تیز دھار خنجر برآمد کر لیا۔ بلال اور دانش کے چہروں پر زلزلے کے آثار تھے۔ ان کے بدن وحشیانہ انداز میں مچل رہے تھے۔ فائزہ نے ان دونوں کی جانب نفرت سے دیکھا اور بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے گردنوں پر یکے بعد دیگرے دائیں سے بائیں رخ وہ خنجر پھیر کر نرخرہ ادھیڑ دیا۔ ان کے وجود کے گرد لہو کا تالاب بنتے دیکھ کر فائزہ کے دل میں سکون کی لہریں سرایت کرنے لگی تھیں۔ اس نے جائے واردات کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور لمحاتی سوچ بچار کے بعد ان دونوں کے موبائل فون بھی اپنے ہمراہ رکھ لیے۔ وہ انہیں ٹھکانے لگانے کے لیے راستے میں دکھائی دینے والی ایک کچرا کنڈی کا انتخاب کر چکی تھی۔ مقصد بہرحال یہی تھا کہ پولیس کو لاشوں کی بازیابی کے بعد اس کے اصل مجرم کا کوئی سراغ نہ مل جائے۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے حلق میں شدید کانٹے اُگ آئے تھے۔

☆☆☆

اس کا مزاج سخت برہم ہو چکا تھا۔ بلال کی جانب سے وہ غیر متوقع فرمائش اور پھر یکدم کال منقطع کیے جانے کے بعد اسے شدید اہانت محسوس ہوئی تھی۔

''لے دے کے تان یہیں کیوں ٹوٹتی ہے بھئی؟ ملاقات کا راستہ کیسے نکالوں میں؟'' اس نے جھنجلا کر سوچا۔

''دل تو خیر تمہارا بھی مچلتا ہی ہے ان ملاقاتوں کے لیے۔'' اسے ایک سوچ نے کچوکا لگایا۔

''ہاں! مچلتا تو ہے لیکن مجبوری ہمیشہ روک لیتی ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''اس مجبوری کا خیر اب کوئی علاج نہیں۔''

''تو کیا سب کچھ یونہی چلتا رہے گا؟ کوئی تو حل ہونا چاہیے۔ کوئی تو آخر؟'' جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی لیکن کہیں کوئی درماں نہیں تھا۔

☆☆☆

ہوٹل سے نکلتے ہی فائزہ کے وجود پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس کے معدے میں ایک عجیب سی اینٹھن ہونے لگی تھی۔ وہ اپنا غیر متوازن تنفس ہموار ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ دانش اور بلال کے لہو میں لت پت جسم پردۂ بصارت پر گویا ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ قدموں میں شدید ڈگمگاہٹ در آنے لگی تو وہ دیوار کا سہارا لیے اکڑوں بیٹھ گئی۔ اسے قرب و جوار میں موجود ہر شخص کی نگاہ اپنے وجود پر ہی محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ دیکھو ذرا اس کو۔ یہ وہی ہے نا جو مرڈر کر کے آئی ہے۔''

فائزہ کو اپنے اردگرد دکھائی دینے والی ہر جامد اور متحرک شے سے یہی صدا سنائی دے رہی تھی۔ معدے کی اینٹھن شدید تر ہونے لگی۔ وہ سڑک پر ہی دہری ہو گئی۔ اسے اپنے حلق میں لہو کا ذائقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ سرخ، گاڑھا، گرم لہو۔ اس سرخی نے حسیات پر اس شدت سے غلبہ پایا کہ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے وہیں دہری ہو گئی۔ حلق سے بدبودار سیال نکل کر سڑک پر بہہ نکلا تھا۔

''ہمت کر فائزہ! یہ وقت کمزوری دکھانے کا تو نہیں ہے۔ ہمت کر! ابھی تو تجھے ایک اور مجرم کی گردن بھی دبوچنی ہے۔ اسے بھی سزا دینی ہے۔ ایسے کیسے چلے گا؟ ہمت کر۔ ہمت کر بس۔'' اس نے ہانپتے ہوئے خودکلامی کی اور اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اپنے گرد آلود غلاظت میں لتھڑے عبایہ اور بیگ میں موجود بقیہ سامان سے بھی نجات حاصل کرنی تھی۔

☆☆☆

فائزہ کی گھر واپسی شام سے پہلے ہوئی تھی۔ مرکزی دروازے کے پاس نعمان کی گاڑی موجود نہ پا کر اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔ اس نے اپنے کمرے میں جانے سے قبل

ایک بار پھر نعمان کا نمبر ملایا لیکن دوسری جانب سے حسبِ سابق کال منقطع کردی گئی۔ فائزہ کے اعصاب پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ پاؤں پٹختی کمرے میں آئی اور کسی سوچ کے تحت مریم کا نمبر ملالیا۔ اس کال کے ساتھ بھی سابقہ سلوک دہرایا گیا تو جھنجلاہٹ بیزاری اور طیش میں منتقل ہونے لگی۔ ذہنی رو ایک بار پھر اپنے مجرم کی جانب مرکوز ہو گئی۔

''اسے اپنے مقصد میں استعمال کے لیے میں ہی ملی تھی کیا؟ میں ہی کیوں آخر؟ ساری دنیا یہ ایپس استعمال کرتی ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ اپلوڈ کرتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟''

اُس کے حلق اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی سے جلن پیدا ہونے لگی تھی۔ ہاتھوں پر لگی مہندی دیوانہ وار کھرچتی اب وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اس تڑپ میں دانش سے رشتہ ختم ہو جانے کی کسک نہیں بلکہ اپنے خونی رشتوں سے دوری کی اذیت تھی۔

اس گریہ زاری میں جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

''فائزہ! اٹھو...... جلدی کرو۔'' اسے کہیں دور سے مریم کی آواز آتی محسوس ہوئی۔ دل یکایک اندیشوں سے لبریز ہوگیا۔ ذہنی رو فوراً سمیعہ کی جانب منتقل ہوئی تھی۔

''تمہیں ماما اور پاپا نیچے بلا رہے ہیں۔ جلدی چلو!''

مریم کے اس فقرے نے اس کے سبھی اندیشے پل بھر میں ہی زائل کردیے۔ وہ کسلمندی سے اٹھی اور اس کی معیّت میں والدین کے پاس چل دی جہاں نعمان اور سمیعہ کے چہرے عجیب سنسنی، تناؤ اور تشکر کی آماہ جگاہ بنے ہوئے تھے۔

''کب آئے آپ لوگ؟ میں نے کتنی کالز کی تھیں آپ سب کو۔'' وہ شکوہ کناں ہوتے اس طلبی کی وجہ سمجھنے سے بھی قاصر تھی۔

''دانش کا مرڈر ہوگیا ہے۔''

نعمان کے اس انکشاف نے اسے فطری طور پر ہی سراسیمگی میں مبتلا کردیا۔ دل یکدم ہی اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

''کب؟ کیسے؟'' اس نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔

''اِن باتوں کو چھوڑو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، اسے دھیان سے سنو اور حرف بہ حرف عمل کرنا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

فائزہ اُلجھ کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔

☆☆☆

گھر میں تعزیت کے لیے مہمانوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ عزیز و اقارب اور احباب دلی طور پر تاسف زدہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے اس بات کا بھی گلہ کیا کہ انہیں بروقت اطلاع کی جاتی تو وہ بھی جنازے میں شریک ہوجاتے۔

''بس اس وقت کچھ سوجھا ہی نہیں۔ قیامت ہی ایسی ٹوٹی تھی۔'' نعمان اور سمیعہ مختصراً کہہ کر دامن بچالیتے۔

''یہ بھی بہتر ہی ہوا کہ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ اگر بچی وہاں چلی جاتی تو زیادہ مشکل ہوسکتی تھی۔'' چند ایک نے خدشہ ظاہر کیا۔

''بس اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہی ہوتی ہے۔'' سمیعہ اپنے تشکرانہ جذبات پوشیدہ رکھتے ہوئے جواب دیتیں۔

کچھ ہی روز گزرے تھے کہ سمیعہ اور نعمان کے ویزے کا بندوبست بھی ہو گیا۔ سمیعہ کے چھوٹے بھائی نے انہیں بغرض علاج کینیڈا طلب کیا تھا۔ یہ خبر سننے کے بعد سب سے پہلے ملاقات کے لیے آنے والی 'ہستیوں' کو دیکھ کر فائزہ کے رگ و پے میں چنگاریاں چٹخنے لگیں۔

''فائزہ اپنی عدت یہیں پوری کرے گی کیا؟'' مدیحہ نے تجسّس سے دریافت کیا۔

''میں تو چاہتی تھی کہ روانگی سے پہلے میری بچی اپنے گھر کی ہوجاتی لیکن اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔'' سمیعہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''مریم آجائے گی یہاں ویسے۔''

''اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بلا جھجک ہمیں یاد کرلینا۔'' مدیحہ نے خلوص سے پیشکش کی۔

فائزہ کو ان کے خلوص اور نیک نیتی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اس کے ہمراہ لاتعلقی اور بے نیازی سے بیٹھے وجود کو دیکھ کر اپنے طیش کو بمشکل ضبط کر پا رہی تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اس کی گردن ہی دبوچ لے۔ اسی لمحے سمیعہ کے موبائل پر ان کے بھائی جنید کی کال موصول ہوئی تو مدیحہ بھی الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بعد اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''مجھے اجازت دیجیے۔ اُجالا کو ڈاکٹر کے بھی لے کر جانا ہے۔ پروردگار آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔'' مدیحہ نے فائزہ کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔

فائزہ کی نظروں میں سلگتی چنگاریاں دیکھ کر اُجالا جزبز ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

اُجالا کے مزاج پر آج صبح سے نہایت پژمردگی طاری تھی۔ یہ کیفیت اس کے لیے انوکھی بہرحال نہیں تھی۔ وہ گزشتہ کچھ عرصے سے اسی تلاطم کا شکار تھی تاہم اس لمحے اس کیفیت میں اضطراب اور جھنجلاہٹ بھی در آئے تھے۔

”کہیں اسے کوئی شک تو نہیں ہوگیا؟“ ذہن میں بار بار ایک ہی سوچ دستک دے رہی تھی۔

’کیسے شک ہوسکتا ہے؟ میں نے کوئی کچی گولیاں تو نہیں کھیلی تھیں۔“ اس نے خود کو دلاسا دیا۔

”تو پھر وہ اس طرح بی ہیو کیوں کر رہی تھی؟ پہلے تو اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“ خدشات قطار در قطار اُمڈتے آرہے تھے۔

”اس کی ذہنی حالت ہی ایسی ہے۔ مجھ پر شک بھلا کیسے ہوسکتا ہے اسے؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”یہ بلال کہاں دفع ہوگیا ہے؟ اتنے دن سے اس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں۔ الو کا پٹھا میسج بھی سین نہیں کر رہا۔“ ذہنی رو دوسری جانب منتقل ہوئی۔

”خواہ مخواہ ایٹی ٹیوڈ دکھا رہا ہے۔ ویڈیو کالز اور ملنے کے لیے پریشر بنانا چاہ رہا ہے۔“ اجالا کو طیش آیا۔

”یہی مصیبت ہے۔ بات ابھی شروع نہیں ہوتی اور ان کی ویڈیو کالز کی رٹ لگ جاتی ہے۔“ وہ جھنجلائی۔

”فائزہ کی آنکھوں میں کسی چیز کا تو غصہ تھا آج۔ کہیں اسے واقعی شک تو نہیں ہوگیا؟“ سابقہ سوچ نے ایک بار پھر آنکھ مچولی کا آغاز کیا۔

”مضبوط بنو اُجالا! اس رستے پر قدم رکھے تھے تو اب حوصلہ بھی کرو۔“ اس نے خود کو ہی گھرکا اور موبائل فون کی جانب متوجہ ہوگئی۔

اُجالا روشن میانہ قامت اور قدرے فربہ بدن کی مالک تھی۔ اس کے سیاہ بال کسی آبشار کی طرح کمر ڈھانپ لیا کرتے تھے۔ سیاہ بڑی آنکھیں روشن ہی نہیں بلکہ سحر انگیز بھی تھیں۔ ان شخصی خوبیوں کے ساتھ وہ بلاشبہ بہت خوش قسمت تصور کی جاسکتی تھی لیکن قدرت کی ستم ظریفی کا کیا کیجیے کہ وہ بشر کو کبھی بھی مکمل جہان نہیں دیتا بلکہ کسی نہ کسی کسک میں مبتلا رکھ کر اسے اپنی ’اوقات‘ فراموش نہیں ہونے دیتا۔ اجالا کا المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے نام سے بالکل متضاد تھی۔ اس کا چہرہ اور نقوش نسوانی دلکشی سے محروم تھے۔ اس کی ناک قدرے ٹیڑھی اور لٹکے ہوئے ہونٹ بے حد بھدے تھے۔ کانوں کی ساخت بھی انوکھی ہی تھی۔ اندرونی سمت کھڑے رہنے والے یہ کان دیکھ کر اکثر عزیز و اقارب اور احباب اسے پڑوسی ملک کی ایک مشہور فلم کے اس کردار سے تشبیہ دے کر چھیڑا کرتے جو کسی دوسرے سیارے سے زمین پر وارد ہوا تھا۔

اپنی ظاہری شخصیت کے متعلق تناؤ کا شکار رہنے والی اُجالا کا دوسرا المیہ یہ تھا کہ اس کے وجود میں بیک وقت ایک بھوک اور پیاس موجزن تھی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس پر بھی ستم ظریفی یہ تھی کہ اجالا کو اس راہ پر دھکیلنے والے اس کے اپنے والدین تھے۔

اُجالا کی زندگی میں اس کشمکش کی ابتدا کے متعلق اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہاں اگر ماضی کی کڑیاں جوڑنے کا مرحلہ آتا تو اجالا کا لاشعور لڑکپن کا ایک تناؤ زدہ منظر اجاگر کر دیتا۔ گو وہ اس منظر کا خاموش حصہ تھی تاہم اس سے وابستہ ہولناکی آج بھی اسی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

اس منظر میں متحرک عناصر اس کے والدین روشن اور مدیحہ تھے۔ اس روز ان دونوں میں کسی بات پر تلخ کلامی ہوئی تھی جو بڑھتے بڑھتے جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی۔ کچھ ہی دیر میں یہ جھگڑا اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ روشن نے مدیحہ کو طمانچہ رسید کر دیا۔ کمرے کے ایک کونے میں کھڑی اجالا یہ منظر دیکھ کر سراسیمگی میں مبتلا ہوگئی۔ اجالا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ روشن ایک رکشا ڈرائیور تھا جو محدود آمدنی کے باوجود اہلِ خانہ کو زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ان کا گھر دو کمروں اور ایک مختصر برآمدے پر مشتمل تھا۔ ایک کمرا روشن کے والدین جبکہ دوسرا ان تینوں کے زیر استعمال تھا۔ زندگی بہت پُرسکون انداز میں رُواں تھی کہ اجالا کی زندگی میں وہ لمحہ چلا آیا جو اس کے لیے ’بلائے جاں‘ ثابت ہوا تھا۔

والدین کی اس لڑائی کے بعد اُجالا اس قدر ذہنی تناؤ کا شکار تھی کہ نیند آنکھوں میں پڑ کے ہی نہ دے رہی تھی۔ اس کا اضطراب بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ وہ زیادہ کروٹیں بدلنے سے بھی گریز ہی کر رہی تھی کیونکہ اس صورت میں دائیں جانب بیڈ پر محوِ خواب روشن کی نیند میں خلل پیدا کر کے اسے خاصا برافروختہ کر دیا کرتی تھی۔ اجالا نے بے چینی کے عالم میں نہایت احتیاط سے دائیں طرف کروٹ لی ہی تھی کہ اسے مدیحہ کی جانب ہاتھ بڑھاتے روشن کی دید نے

ٹھٹکا دیا۔ اجالا کے ذہن میں شام کو ہونے والی لڑائی اور مدیحہ کے چہرے پر رسید ہونے والا طمانچہ اجاگر ہوگیا۔ اس کا دل یکدم سہم کر رہ گیا۔ اس وقت تو دادا دادی نے ان کا جھگڑا رفع دفع کروا دیا تھا لیکن اب تو وہ خود بھی محوِ خواب تھے۔

اُجالا نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس کی سماعت تلخ کلمات کے تبادلے کی منتظر ہی تھی کہ چند حیران کن سرگوشیوں نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سامنے بستر پر دکھائی دینے والا منظر انوکھا اور شدید سنسنی آمیز تھا۔ روشن اور مدیحہ ایک دوسرے کی ذات میں گم دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ اجالا کا رُواں رُواں ایک عجیب سنسنی کی زد میں تھا۔ بدن کا تمام تر لہو سمٹ کر سر میں سنسنانے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں تو نیند سے مغلوب ہو گئے لیکن اجالا کی آنکھوں سے نیند کا نام و نشان ہی مٹ چکا تھا۔

اس کے بعد یہ ایک معمول بن گیا۔ اُجالا کے لیے تقریباً ہر رات ہی 'بلائے جان' ثابت ہونے لگی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ ان مخصوص لمحات میں وہ کیونکر از خود بیدار ہو کر اس منظر اور سنسنی کا حصہ بن جایا کرتی تھی۔ صبح ہونے کے بعد وہ والدین سے نظریں ہی نہیں ملا پاتی تھی۔

''یہ اپنی اُجالا کو کیا ہوگیا ہے؟ اتنی گم صم اور بیزار کیوں رہنے لگی ہے؟'' دادی نے ایک روز روشن سے استفسار کیا۔

''ہاں! اس کی صحت بھی کافی ڈاؤن ہوتی جا رہی ہے۔ بہت کمزور دکھائی دینے لگی ہے۔'' دادا نے بھی تشویش جتائی۔

''مجھے کیا پتا ہو؟ میں سارا دن کام دھندا کروں یا یہ سب بھی دیکھتا پھروں؟'' روشن نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''یہ تو ماؤں کی ذمے داری ہوا کرتی ہے کہ اولاد کی صحت کا خیال رکھے۔''

''ماؤں کے لیے اور بھی بہت جنجال ہوتے ہیں اور اولاد صرف ماؤں کی ہی ذمے داری نہیں ہوتی۔ باپ کے بھی کچھ فرائض ہوا کرتے ہیں۔'' مدیحہ نے حسبِ عادت چیخ کر جواب دیا۔

اس کے بعد دونوں میں تلخ کلامی کا آغاز ہوگیا۔ اجالا خاموشی اور بے نیازی سے ان کی گفتگو سنتی رہی۔ اسے علم تھا کہ اس جھگڑے کے بعد آج رات پھر ایک بھرپور سنسنی خیز اور لذت آمیز منظر اس کا منتظر ہوگا۔ یہ معمول کافی عرصہ تک یونہی جاری رہا۔ اس دوران اجالا مرد و زن کے اس فطری تعلق کے ہر پیچ و خم سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اس معمول میں خلل اس وقت پیدا ہوا جب مختصر علالت کے بعد دادا نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اجالا کو دادی کی تنہائی بانٹنے کے لیے ان کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

اُجالا کے دل و دماغ میں ایک ناقابلِ فہم و بیان انتشار پیدا ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وجود میں کوئی خلا پیدا ہوگیا ہو۔ اس کی نیند ایک مخصوص وقت پر کھل جاتی اور وہ والدین کے کمرے کی جانب دیکھتے چشمِ تصور سے ان مناظر کا اعادہ کرنے لگتی۔ ان دنوں اُجالا کی زندگی میں چاہ کن را چاہ در پیش کی کیفیت در آئی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ مرحوم دادا کا موبائل فون آ چکا تھا۔ دادی اپنی علالت اور ذہنی و جذباتی شکستگی کے باعث نیند کی گولی لے کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتیں اور اجالا موبائل فون کی سیاحت میں مگن ہو جاتی۔ اس سیاحت کے دوران اجالا نے اپنی زندگی میں در آنے والے خلا کا شافی 'علاج' تلاش لیا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے مختلف مخصوص ویڈیوز سے دل بہلایا کرتی لیکن یہ اطمینان بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بلائے جاں بھی اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

اُجالا کے اطراف میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس اندھیرے میں ہر سُو عجیب چیختا چنگھاڑتا شور تھا جو اعصاب کے لیے ایک سخت آزار بنا ہوا تھا۔ گو یہ عذاب اور آزار اس کے لیے کوئی نئی شے نہیں تھے لیکن اب جانے کیوں یہ سب ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔ سنسنی خیز مناظر ہمہ وقت پردۂ تصور پر لہراتے اسے عجیب کاہلی اور بے چینی میں مبتلا رکھتے تھے۔

وقت نہایت سست روی سے اُجالا کے اعصاب و برداشت کا کڑا امتحان لیتے گزر رہا تھا۔ اس کے وجود میں ایک ناقابلِ مزاحمت 'بھوک' اور 'پیاس' اجاگر ہو چکی تھی لیکن اس تشنگی کا خاتمہ کرنے کی کوئی صورت ہی میسر نہیں آ رہی تھی اور پھر قدرت اس پر مہربان ہو ہی گئی۔

''کمال ہے! یہ راستہ مجھے پہلے کیوں نہیں دکھائی دیا؟'' اس نے حیرت سے سوچا۔

''چلو! دیر آئے درست آئے۔ تب نہ سہی اب سہی۔''

☆☆☆

اُجالا کے سامنے ایک 'دوراہا' تھا۔ دل و دماغ سخت

اُلجھن میں مبتلا تھے۔ اس دوراہے کی پہلی راہ پرویسی ہی تاریکی تھی جو اَب تک اس پر مسلط تھی اور اب شدید ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ دوسری راہ پر ایک خوش کن اور مسحور کن اُجالا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اجالا اس کے لیے ایک بالکل انوکھی شے تھی۔ ایسی خوشنمائی اور سحر اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی ـــ دھیرے دھیرے وہ مخملیں اجالا اس کا دل للچانے لگا۔

''اس راہ پر قدم رکھنا آسان نہیں ہے۔ کیسے مینج ہوگا سب کچھ؟'' اس نے مضطرب ہو کر سوچا۔

اس اضطراب میں بے بسی بھی واضح تھی اور یہی بے بسی اسے نئی مسافت اختیار کرنے پر اکساتی تھی۔

''ہو جائے گا مینج۔ تم کوشش تو کرو۔ آغاز میں کچھ مشکل تو ہوگی لیکن تم ہمت کر لینا۔ یہ سب کچھ تمہاری ہمت پر ہی منحصر کرتا ہے۔ اگر مینج کر لیا تو پھر اس عذاب سے تو جان چھوٹ جائے گی۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔

مسافت اب آسان دکھائی دینے لگی تھی۔

☆☆☆

اُجالا نے اپنی متذبذب کیفیات پر قابو پا کر سوشل میڈیا کے تقریباً ہر پلیٹ فارم پر اکاؤنٹ بنا کر ایک نئی مسافت کا آغاز کر دیا۔ یہ مسافت اختیار کرتے ہی وہ بے حد خوش و مطمئن تھی۔ اب وہ بھی سنسنی ولذت کا براہ راست حصہ بن سکتی تھی۔ لیکن اس زندگی کا کیا کیجیے؟ یہ کبھی بھی کوئی بھی شے پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کرتی۔ اس نے اپنے احباب کے علاوہ ان کے بھی مشترکہ دوست 'ایڈ' کر تو لیے تھے لیکن اب ایک نیا امتحان درپیش تھا۔ کسی بھی لڑکے سے گفتگو کا آغاز ہوتے ہی فون نمبر، تصاویر اور ویڈیو کال کا مطالبہ ہونے لگتا۔

''اُف! کیسے دکھاؤں اپنی کوئی تصویر؟'' وہ جھنجلا جاتی۔ ''فون نمبر کی حد تک تو چلو ٹھیک ہے۔ ویڈیو کال کیسے کروں؟ کیا کروں؟ میری قسمت میں سکون نام کی شے لکھی بھی ہوئی ہے یا نہیں؟'' وہ بے بسی سے رونے لگی تھی۔

''کیا کروں میں؟ اس عذاب سے کیسے جان چھڑواؤں؟ کیا کروں میں؟ اردگرد کوئی بھی لڑکا دوسری نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتا مجھ پر۔ اور یہاں سوشل میڈیا پر بھی سب کی اپنی ہی ڈیمانڈز ہیں۔ کیا کروں میں؟ کہاں چلی جاؤں آخر؟'' اس کی تڑپ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور پھر اسے ایک راہ سُجھائی دے ہی گئی۔

کمال تو یہ تھا کہ یہ راہ اسے بلال نے سُجھائی تھی۔

## انمول پارے

محترم خاتون! اپنی نظر کے سامنے ہمیشہ پیسا کے ترچھے ٹاور کی مثال رکھیے۔ اگر وہ سیدھا ہوتا تو کوئی شخص بھی اس پر دوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کرتا...... دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے آپ بھی اپنے اندر تھوڑی سی انفرادیت پیدا کر کے ترچھی ہو جائیے۔

★★★

آج کے دور میں شوہر بننا کسی دوسری ملازمت سے مختلف نہیں ہے۔ اگر تک چڑھے باس کے احکامات کی بجا آوری کر سکتے ہو تو زندگی سکون کے ساتھ گزرے گی۔

### عدم

پنڈت ہری چند اختر نے عبدالحمید عدم کو طویل مدت کے بعد کسی مشاعرے میں دیکھا لیکن پہچانا نہیں کیونکہ عدم صاحب بہت موٹے ہو چکے تھے۔ عدم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اختر صاحب نے انہیں پہچانا نہیں ان سے کہا:

''پنڈت جی! میں عدم ہوں۔''

اختر صاحب نے بے ساختہ فرمایا۔

''اگر یہی عدم ہے تو وجود کیا ہوگا؟''

### سود مرکب

دو دوست اپنے خریدے ہوئے قیمتی زیورات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

''تم نے سب سے قیمتی زیور کون سا خریدا ہے؟''

''شادی کی انگوٹھی۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''کیونکہ اس کے بعد سے میرا ہر ہفتے کا خرچ سو روپے بڑھ گیا ہے۔''

### عاشقی

ایک پڑوسن نے دوسری سے کہا۔ ''میرے شوہر تم پر عاشق ہو گئے ہیں۔''

یہ سن کر پڑوسن آپے سے باہر ہو گئی اور دوسری کے شوہر کو جی بھر کے گالیاں، کوسنے اور بددعائیں دیں۔ جب وہ اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر چکی تو پہلی ہمسائی نے کہا۔

''اپنے شوہر کو بھی ذرا سمجھانا، وہ مجھ پر عاشق ہے۔''

مرسلہ، رقیہ خانم، کراچی

بلال سے دوستی کا آغاز نہایت روایتی انداز میں ہوا تھا۔ انسٹاگرام نے روایتی 'وچولن' کا کردار ادا کرتے ہوئے بلال کو اس کی وہاں موجودگی کی خبر دیتے ہوئے تجویز دی تھی کہ وہ اس 'دنیا' میں نووارد ہے لہٰذا اس کا ہاتھ تھامنا بلال کا فرض ہے۔ بلال ابتدائی دو تین روزہ گفتگو کے بعد اپنی اصل جون میں آ گیا تھا۔

''تم باتیں تو بہت کیوٹ کرتی ہو بھئی!'' اس نے لکھا تھا۔

''میں خود بھی کم کیوٹ نہیں ہوں۔'' اجالا نے اترا کر جواب دیا۔

''ہاں! مجھے بالکل اندازہ ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں الفاظ سے انسان کی پرسنالٹی کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔'' بلال نے تفاخر جتایا۔

''آئی سی! تو ذرا بتایئے۔ میری پرسنالٹی کیسی ہے؟'' اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

''بہت چارمنگ۔ میں تمہیں اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھیں اور بال شہد رنگ ہوں گے۔ رنگت گلابی، ہونٹ کٹاؤ دار اور گردن تو یقیناً کسی صراحی سے کم نہ لگتی ہوگی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' بلال نے یقیناً مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔

اجالا کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور اپنی پڑوسن فائزہ کا سراپا نظروں کے سامنے لہرانے لگا۔ وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ اجالا کے ذہن میں اپنے موجودہ مسئلے کا بہترین حل از خود ہی در آیا۔ اس نے سرعت سے فائزہ کا ایک اکاؤنٹ کھولا اور اس کی چند ایک تصویریں اپنے پاس محفوظ کر لیں۔

''ہائے اللہ جی! یو آر رائٹ۔ لیکن آپ کو کیسے پتا لگا؟'' وہ محظوظ ہوئی۔

''بس دیکھ لو! میں نے کہا نا کہ تمہیں دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں۔'' اس نے اترا کر جواب دیا۔

''مان گئی بھئی میں آپ کو؟'' اجالا بے ساختہ ہنسی۔

''اگر مان گئی ہو تو اپنی پک نہیں دکھاؤ گی مجھے؟ میں جانتا ہوں تم میرے تخیل سے زیادہ خوب صورت ہوگی۔ بالکل کسی شاعر کی غزل جیسی۔''

بلال کی اس بے ساختگی پر اجالا نے پہلے روایتی ناز و نخروں کا مظاہرہ کیا۔

''اب بھیج بھی دو نا پک۔'' وہ اس کی خاموشی سے جھنجلا کر بولا تھا۔

''پرامس کریں کہ دیکھ کر ڈیلیٹ کر دیں گے۔'' اجالا نے ایک اور روایتی پیمان لیا۔

''گاڈ پرامس۔'' بلال نے جھٹ جواب دیا۔

اجالا نے اسے فائزہ کی ایک تصویر بھیج دی۔ بلال تصویر دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کی والہانہ توصیف پر اجالا دل مسوس کر رہ جاتی۔ یہ توصیف و ستائش اس کے لیے ہوتے ہوئے بھی اس کی نہیں تھی۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ بلال نے ویڈیو کال پر بات کرنے کی فرمائش جڑ دی۔ اجالا کے لیے یہ بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ وہ پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیتی رہی پھر اس کے ذہن میں ایک خیال در آیا۔ اس نے ویڈیو کال موصول کرتے ہی کمرے کی روشنی گل کر دی۔ لوڈ شیڈنگ اور یو پی ایس کی ان دنوں خرابی بہترین عذر ثابت ہوا تھا۔

بلال نے اس وقت تو یہ عذر تسلیم کر لیا تاہم اگلے روز مخصوص 'ویڈیوز' کی فرمائش کر دی جس کی تکمیل میں اجالا کو کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ اس نے اپنے جسمانی نشیب و فراز کی ہیجان انگیز ویڈیوز بھیج کر بلال سے مطلوبہ سنسنی و لذت کشید کر لی۔

اُجالا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے اپنی نئی مسافت کے بیشتر پیچ و خم 'سیکھ' لیے تھے اور اب یہ سفر بے حد فرحت بخش اور سنسنی خیز محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے فیس بک، انسٹاگرام اور اسنیپ چیٹ پر تین مختلف شناسا لڑکیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ ماہم جاوید، ہانیہ ایمان اور عائشہ خان کے فرضی ناموں سے ان لڑکیوں کا روپ دھارے وہ اپنے جسمانی نشیب و فراز کی نمائش میں کوئی قباحت نہیں سمجھتی تھی۔ لذت و سُرور کے اس سفر میں وہ بہت سرپٹ رواں تھی۔

یہ مسافت اختیار کرنے کے بعد اس کی ظاہری شخصیت میں بھی تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ اس کا جسم فربہی مائل ہونے لگا تھا۔ چہرے پر کیل مہاسوں کی تعداد بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ باطنی کیفیات کا احوال یہ تھا کہ کسی ناسور کی طرح اس کے وجود سے چمٹے اس آزار سے خلاصی کے لیے اسے اب 'عملی' اقدامات کی طلب ہونے لگی تھی۔ وہ درون پردہ ایک ناآسودہ اور تشنہ لب عورت بن چکی تھی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ اس پُرخار وادی میں سرپٹ دوڑتی اجالا روشن کی عمر محض پندرہ برس تھی۔

☆☆☆

نعمان اور سمیعہ بغرض علاج کینیڈا روانہ ہو چکے تھے۔ روانگی سے قبل انہیں فائزہ کی 'عدت' کے لیے بہت

خدشات لاحق تھے۔ اس موقع پر نعمان نے عبید سے التجا کر کے مریم کو مخصوص عرصے کے لیے ان کے گھر قیام کے لیے راضی کر لیا تھا۔ عبید کے دل میں تا حال فائزہ کے لیے بہت بغض تھا۔ اس نے نعمان کا بھرم رکھنے کے لیے وقتی طور پر تو ہامی بھر لی تاہم ان کی روانگی کے بعد مریم کو دن بھر اپنے گھر اور رات فائزہ کے پاس قیام کا پابند کر دیا۔ فائزہ کے لیے یہ صورتِ حال بہت مثالی تھی۔ وہ ہمہ وقت اپنے سر پر کسی کی 'چوکیداری' برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت خاصی شکستہ اور دگرگوں ہو چکی تھی۔ اپنے آخری مجرم کو سزا دینے کے لیے بھی تنہائی اور سکون ہی درکار تھا۔

فائزہ نے اگلے چند روز اُجالا کی مصروفیات اور آمدورفت کا باریک بینی سے مکمل مشاہدہ کیا اور ایک روز اسے گھر سے چند گز کی دوری پر واقع اس پارک میں جا لیا جہاں وہ اپنی اکیڈمی سے واپسی پر پندرہ بیس منٹ لازماً بسر کرتی تھی۔ اس پارک میں آنے کا مقصد اپنے وجود کے خلاء اور چنگھاڑتی تنہائی سے فرار کی کوشش کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لمحے بھی وہ ایک سنگی بینچ پر بیٹھی خلا میں نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اپنے چہرے پر موجود پچاسیوں کیل مہاسوں کی پوشیدگی کے لیے اس نے باقاعدہ نقاب لینا شروع کر دیا تھا۔ انہی داغ دھبوں کی وجہ سے اس کی تمام تر سماجی سرگرمیاں و میل جول محدود ہو چکے تھے۔ فائزہ دبے قدموں چلتی اس کے دائیں جانب آ کھڑی ہوئی۔

"ہائے اللہ جی! اجالا تم اکیلی یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" فائزہ اس کا مخصوص اندازِ تکلم اختیار کرتے ہوئے بولی۔

اُجالا اس کی آمد پر بےساختہ چونک گئی۔

"آپ یہاں کیسے؟ آپ تو عدت میں ہیں غالباً۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"بُری بات! پہلا سوال میں نے کیا ہے تو اچھے بچوں کی طرح مجھے جواب دو۔ الٹا سوال کرنا بیڈ مینرز ہوتے ہیں۔" فائزہ کے لہجے میں سرد مہری واضح تھی۔

اُجالا ایک بار پھر مخمصے کا شکار ہو گئی۔

"کہیں اسے کوئی شک تو نہیں ہو گیا؟ لیکن کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کوئی کچی گولیاں تو نہیں کھیلی تھیں۔ اس کے فرشتوں کو بھی کبھی علم نہیں ہو سکتا۔" اس نے خود کو دلاسا دیا۔

"ویسے یہ نقاب لینا کب شروع کیا تم نے؟" فائزہ نے ایک اور کچوکا لگانے کی تیاری کی اور اجالا کے کوئی بھی جواب دینے سے قبل اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔ "انسان ایسے کرتوت ہی نہ دکھائے جس کی وجہ سے اسے اپنا منہ چھپاتے پھرنا پڑے۔"

فائزہ کے اس طنز پر اجالا کے وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ ہتھیلیاں یکدم ہی پسینے سے بھیگ گئی تھیں تاہم یہ ایسی کمزوری دکھانے کا وقت نہیں تھا۔

"لگتا ہے شوہر کے انتقال سے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" اس نے بھی جوابی طنز کیا۔ "اینی ویز! مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے اپنا بیگ سنبھالنا چاہا لیکن فائزہ کے اگلے فقرے نے اسے سراسیمگی سے ساکت کر دیا۔

"بلال سے بات کرنی ہوگی جا کر۔ ہے نا؟ بہت مس کر رہی ہوگی نا اسے؟ آفٹر آل کتنے دن ہو گئے اس کی میٹھی چکنی چپڑی باتیں سنے اور اس کے سامنے خود کو کسی طوائف کی طرح پیش کرتے ہوئے۔"

"شٹ اَپ......" اجالا اس کی گالی برداشت نہ کر سکی۔ اس کے وجود پر لرزش طاری ہونے لگی تھی۔ فائزہ کی زبان سے بلال کا ذکر سننا کسی ہولناکی سے کم نہیں تھا۔

"یو شٹ اَپ! یو......" فائزہ نے ایک اور لغو لفظ استعمال کیا اور ایک توقف سے کہنے لگی۔ "ویسے بلال کا انتظار کرنے کے بجائے کسی اور کو پھانس لو اب۔ وہ تو ایسی جگہ پہنچ چکا ہے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہوتی۔" اس نے حلق پر مخصوص انداز میں انگلی پھیرتے ہوئے بتایا۔

اُجالا کا بدن ساکت ہو گیا۔ بلال کے اس انجام نے اس کی گویائی اور حواس مکمل سلب کر لیے تھے۔ اس پر مستزاد فائزہ کا سرد مہر انداز، آنکھوں سے جھلکنے والی خونخواری اسے ہزار ہا اندیشوں میں مبتلا کر رہی تھی۔ اجالا کا ہاتھ غیر محسوس طریقے سے اپنے بیگ کی داہنی سمت مخصوص زپ کی طرف بڑھنے لگا۔

"کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟ کیا حق تھا تمہیں میری زندگی برباد کرنے کا؟ یو بچ! تم نے مجھے زندگی میں ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں سکون سے سانس بھی نہیں لے پا رہی۔ رات دن ان دونوں کی لاشیں میرے سامنے کھڑی ہو کر ناچنے لگتی ہیں۔ ہر ایک لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ پولیس مجھے تلاش کرتی یہاں نہ چلی آئے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے۔" فائزہ اس کی جانب رخ کیے ہذیانی انداز میں کہتی چلی گئی۔ اس کی اندرونی گھٹن حقیقتاً 'بلائے جاں' بنی ہوئی تھی۔

اُجالا بےیقینی سے فائزہ کی جانب دیکھنے لگی۔

"دو لاشیں؟ کس کا قتل کیا ہے اس نے؟ کیا اپنے

شوہر کا؟ اور بلال کا بھی؟ او مائی گاڈ! کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟‘‘ اس کا دماغ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس کے سامنے فائزہ کے اس اعتراف کا یہی مطلب تھا کہ وہ اپنے ذہن میں کوئی نہ کوئی منصوبہ تیار کیے ہی یہاں آئی ہے۔ اجالا نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔ فائزہ نے اپنے بدن کے گرد بڑی سی چادر نہایت سلیقے سے اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے دائیں کندھے پر مخصوص ابھار کسی بیگ کی نشاندہی کر رہا تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ فائزہ نے اپنی چادر تلے یا بیگ میں کوئی ہتھیار چھپایا ہو۔ اجالا کا وجود اضطراب کی زد میں آ گیا۔ اس نے اپنے بیگ کی مخصوص زپ کھولتے ہوئے کچھ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ فائزہ نہایت وحشت و خونخواری سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بھی سرعت سے بیگ کی طرف بڑھا تھا۔ اجالا کے پاس وقت بہت کم اور موقع نہایت نادر تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں مخصوص دہری نوک والی ’پرکار‘ تھامی اور اس کی نوکیں یکساں مقام پر رکھتے ہوئے سرعت سے فائزہ کی بائیں آنکھ میں پیوست کر دیں۔

فائزہ کے حلق سے ایک ڈکراہٹ بلند ہوئی لیکن اس صدا کو سننے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پارک کا وہ مخصوص گوشہ قدرے متروک سمجھا جاتا تھا۔ اجالا نے لہو آلود وہ نوکیں فائزہ کی آنکھ سے نکالیں۔ فائزہ کے ہاتھ بے اختیار اپنی آنکھ کی جانب بڑھ گئے۔ وہ کرب و اذیت سے دہری ہو گئی تھی۔ اس کشمکش میں اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ مخصوص تیز دھار خنجر زمین بوس ہو گیا تھا۔ اجالا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سرعت سے وہ خنجر تھاما اور لرزیدہ ہاتھوں سے فائزہ کے حلق میں پیوست کر دیا۔ فائزہ کا بدن اب جھٹکوں کی زد میں تھا۔ اجالا نے بے یقینی سے اس خنجر اور فائزہ کے لہو آلود جسم کو دیکھا اور خوفزدہ ہو کر خنجر اس طرح نیچے پھینکا گویا کوئی انگارا ہاتھ جلا رہا ہو۔

’’یہ...... میں...... نے کیا کر دیا؟ یہ...... یہ...... میں...... نے...... قتل......‘‘ اجالا کے حلق میں یکدم ہی کانٹے اُگ آئے تھے۔

اس نے ہذیانی انداز میں قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ شام کے سائے اپنے پر پھیلانے لگے تھے۔ پارک کے اس مخصوص گوشے کی ویرانی میں مزید اضافہ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اجالا نے اپنا بیگ سنبھالا اور وحشت کے عالم میں وہاں سے چلی آئی۔ کچھ دور جاتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ وہ فوراً عقبی سمت مڑی اور وہ خنجر فائزہ کی چادر سے صاف کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ اس کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔

☆☆☆

اسپتال کے کمرے میں لیٹی سمیعہ کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وجود خاصی نقاہت کا شکار ہو چکا تھا۔ ڈاکٹرز ان کے علاج کی بابت خاصے پُرامید دکھائی دیتے تھے۔ سمیعہ بھی اپنی بساط بھر قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر رہی تھیں لیکن اس روز ان کی طبیعت خاصی پژمردہ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد نعمان بھی نماز کی ادائیگی کے بعد وہاں چلے آئے۔

’’گھر بات ہوئی آپ کی؟‘‘ سمیعہ نے شوہر سے استفسار کیا۔

’’نہیں! میں نے کافی دفعہ ٹرائی کیا تھا لیکن فون رنگنگ کے بجائے کالنگ پر ہی ملتا رہا۔ شاید انٹرنیٹ ایشو ہو گا۔‘‘ انہوں نے اہلیہ کو بتاتے ہوئے ایک بار پھر موبائل فون اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

’’پتا نہیں کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ فائزہ سے بات کرنے کی بہت بے چینی ہو رہی ہے۔‘‘ سمیعہ نے اپنا سینہ مسلا۔

’’ہمت کرو یار! ابھی تو یہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں اور تم یوں بچوں کی طرح بی ہیو کرنے لگی ہو۔ اپنا دل مضبوط کرو۔ وہاں انٹرنیٹ ایشوز کا تمہیں پتا تو ہے۔ وہ کر لیں گی خود ہی فون۔ تم آرام کرو۔‘‘ نعمان نے نرمی سے سمجھایا اور اپنے فون کی جانب متوجہ ہو گئے۔

’’عائشہ خان سے شاید آپ شناسا ہوں۔ انہیں پیغامِ دوستی ارسال کیجیے۔‘‘

اس پیشکش نے نعمان کو قدرے پُرجوش کر دیا۔ وہ گزشتہ کچھ عرصہ سے سماجی روابط کی ان ویب سائٹس کی طرف خاصے مائل ہو چکے تھے۔ اپنے احباب سے ان سائٹس کے پیچ و خم کی گفتگو سنتے انہوں نے ہمیشہ اپنے عہدِ شباب کی تصاویر ہی اپلوڈ کرتے عزیز و اقارب کو اس ڈگر کی بھنک بھی نہ لگنے دی تھی۔

’’آپ کی پروفائل بہت انٹرسٹنگ ہے۔ پیغامِ دوستی قبول کیجیے گا پلیز!‘‘ انہوں نے فوری طور پر انباکس کا در کھٹکھٹا دیا۔ انہیں امید تھی کہ جواب بھی جلد موصول ہو جائے گا۔

اس کام سے فراغت کے بعد انہوں نے سمیعہ کے تشویش زدہ چہرے کو دیکھا اور فائزہ کا نمبر ملا دیا۔ فون تاحال رنگنگ کے بجائے کالنگ موڈ پر تھا۔

❖❖❖

دعا ایک دھاگے کے مانند ہے جس سے اللہ اور بندے کا تعلق سِلتا ہے... دعا کے کئی رنگ ہیں... دھاگوں کی طرح... اور وہی لوگ مانگتے ہیں جو رب کا بھید پالیتے ہیں... ایسی خالص دعا مانگنے سے پہلے روح کو طلب، حقیقت اور معرفت کی آگ پر پکانا پڑتا ہے دھیان رکھنا پڑتا ہے... نفس کو مارنا پڑتا ہے... اپنی روح کی پرچھائیں میں کھڑا ہو کر اپنا پہرا دینا پڑتا ہے... خود کو پہچاننا پڑتا ہے... پھر بندہ رب کا بھید پالیتا ہے... پھر اپنی ذات کو دوسروں کی پریشان حالی اور دادرسی کے لیے مخصوص کر دیتا ہے۔ ماضی کے ایک پرانے واقعے سے جڑی کہانی کے اسرار و رموز... ایک طرف شیطانی قوتیں تھیں اور دوسری طرف ایک بزرگ ہستی کا مضبوط سایہ... معرفت کے لیے کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے خوف... ڈر اور محبت کے کئی راستوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اس شیطانی فتنے کو جکڑ سے اکھاڑنے کے لیے وہ بھی نہایت کھٹنائیوں سے گزر رہے تھے...

حصولِ جستجو میں تمام حدیں پار کر لینے والی نیکی اور بدی کی خوفناک معرکہ آرائی

# آخری قفل

امجل بھٹی

گہری ہوتی شام گھنے بادلوں کے سبب سیاہ رات میں بدلتی جا رہی تھی۔ رہ، رہ کر زور سے بجلی چمکتی تھی اور زوردار کڑاکے کے ساتھ آسمان کے کنارے روشن ہو جاتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کے دروازے کھل گئے اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ پنجاب کے وسطی علاقوں میں اس دفعہ ساون رُت خوب کھل کر برس رہی تھی۔ اس بارش میں ایک ٹرین گرجتی، برستی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ یہ 1976ء کی بات تھی۔ اس دور میں قیدیوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی ٹرینوں کے ذریعے ہوتی تھی اور

ذرائع آمدورفت میں ٹرینوں کو غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔

اس وقت بھی ٹرین کی پولیس والوں کے لیے مخصوص بوگی میں ایک مفرور موجود تھا۔ جسے اندرونِ سندھ سے گرفتار کر کے لاہور منتقل کیا جارہا تھا۔ بوگی میں ریلوے پولیس کے اہلکاروں کے ساتھ پنجاب پولیس کے بھی دو اہلکار تھے جو مفرور کو لاہور پہنچانے کے ذمّے دار تھے جہاں اس مفرور کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔

مفرور کا نام ظلِ شاہ تھا۔ دُبلے پتلے گورے اور شربتی آنکھوں والے اس نوجوان پر دوہرے قتل کی ایف آئی آر...... تھانہ نواں کوٹ لاہور میں درج تھی۔ ظلِ شاہ کا تعلق نواں کوٹ کے ایک معروف مذہبی خاندان سے تھا۔ نواں کوٹ کے پرانے باشندوں میں اس خاندان سے محبت، عقیدت کا سلسلہ نسلوں سے خون میں سفر کررہا تھا اور یہ جڑا تھا سید کرم شاہ شہید کے مزار سے جو مرجع خلائق وعام تھا اور عرفِ عام میں ''شہید شاہ کا آستانہ'' کہلاتا تھا۔ یہی شہید بزرگ ظلِ شاہ کے جدِامجد تھے۔

بارش سے بھیگی ٹھنڈی ہوا بوگی میں فرائے بھرتی ہوئی داخل ہوئی تو سندھ کے جھلسے میدانوں سے آنے والے پولیس اہلکاروں نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ پسینے میں بھیگے جسموں میں زندگی اور امنگ، ترنگ دوڑ گئی تھی۔ موسم کے ساتھ ہی اندر کا موسم بدلا تو ظلِ شاہ کے سامنے بیٹھے نوجوان پولیس اہلکار نے کان پر ہاتھ رکھا اور تان بلند کی۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز بلند ہونے لگی اور ٹرین کے شور پر حاوی ہونے لگی۔ یہ ایک مدھر علاقائی گیت تھا۔

یکسانیت بھری فضا میں ہلچل مچ گئی۔ ایک اہلکار نے بلند آواز میں داد دی۔ ایک نے ڈبے کی دیوار پر ہاتھ چلاتے ہوئے تال دینے کی ناکام کوشش کی۔ ظلِ شاہ نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی شربتی آنکھوں میں وحشت تھی۔

ٹرین لاہور کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسی وقت تان بلند کرنے والے کی نظر ظلِ شاہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دائیں کان سے نقرئی سا مادہ بہتے ہوئے باہر نکلا ہو۔ اس نے پلک جھپکی تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس نے وہم جان کر دوبارہ تان بلند کی۔ اس دفعہ تان درمیان میں ہی دم توڑ گئی۔ ایک ریلوے اہلکار ملحقہ ڈائننگ والے ڈبے سے میلی سی اسٹیل کی ٹرے میں چائے کے بھاپ اُڑاتے کپ لیے آدھمکا تھا۔ اس کا نعرہ ''اوئے! چاہ آگئی ہے'' مدھر گیت پر غالب آگیا اور سبھی چائے کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

ظلِ شاہ نے پلکیں جھکائیں۔ شربتی آنکھوں میں جو بیگانیت آمیز وحشت چھائی ہوئی تھی، وہ تیزی سے کم ہونے لگی۔ پھر ان آنکھوں میں شدید ترین حیرت چمکی۔ اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے اس ماحول و منظر کو دیکھا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ہوش میں آیا ہو۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت دوچند ہوگئی۔ اس نے ہاتھ بلند کرنے کی کوشش کی تو لگا جیسے جسم مفلوج ہے۔ اس نے دوبارہ کوشش کی مگر اس پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ ہاتھ سمیت وہ جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دینے سے قاصر ہے بلکہ اس کوشش میں سر میں شدید قسم کی درد کی ٹیس اٹھی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو زبان گنگ۔ بے بسی کے احساس نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ کوئی گرم سیال اس کے کندھے سے بہتا ہوا ہاتھ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ دونوں ہاتھ اس کی نگاہوں کی زد میں تھے۔ اگلا لمحہ اس کے لیے حیرت واستعجاب کے نئے دروازے کھولنے لگا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر ایک ننھا سا نقرئی سانپ نظر آیا جس کی موٹائی ایک دیا سلائی سے بھی نصف تھی۔ اس کا گرم اور کھردرا لمس وہ اپنی روح تک پر محسوس کررہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ اس کے ہاتھوں سے گزرتا ہوا ہتھکڑی کے چابی والے سوراخ میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

درد کی ٹیسوں کے دوران میں ظلِ شاہ کی یادداشت متحرک ہوئی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ یہ سانپ بلکہ اس جیسا ایک اور سانپ اس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے ایک چمکتا ہوا نقرئی سکہ آگیا۔ اس سکے کے عین درمیان ہرم نما عمارت بنی ہوئی تھی اور دونوں ننھے نقرئی سانپ اس عمارت کو اس طرح سے گھیرے ہوئے تھے کہ ان کے منہ اور دمیں سکے کی گولائی میں آپس میں ملی نظر آتی تھیں۔ بادی النظر میں یہی لگتا تھا کہ جیسے یہ ننھے سانپ اس ہرم نما عمارت کی حفاظت کررہے ہوں...... اس نے یہ سکہ کہاں دیکھا تھا؟ اس نے دماغ پر مزید زور دینے کی کوشش کی تو اتنی شدید درد کی لہر اٹھی کہ زبان و جسم اس کے کنٹرول میں ہوتے تو وہ زوردار چیخ مار کر گر کر تڑپنے لگتا۔

اس کے بعد اسے دوبارہ سانپ کا گرم اور کھردرا لمس ہاتھوں پر محسوس ہوا۔ کپڑوں کے اندر سرسراتا لمس بازو، کندھے اور پھر کان پر محسوس ہوا۔ اگلے پل اس کی روح تک لرزنے لگی۔ وہ لمس اس کے کان میں داخل ہورہا تھا۔ پھر اس کے جسم کو خفیف سا جھٹکا لگا اور وہ دوبارہ خود سے

بیگانہ ہوگیا۔

اس وقت ٹرین ایک دریا جیسی جسامت والے برساتی نالے کے اوپر سے گزر رہی تھی جو بپھرا ہوا تھا۔ برساتی نالے کے اوپر حال ہی میں نیا پل بنایا گیا تھا۔ تعمیراتی کام ابھی باقی تھا۔ پل کے دونوں طرف حفاظتی جالی لگنا ابھی باقی تھا۔ ٹرین سست روی سے پل پر داخل ہوئی تھی۔ وہ نصف پل پر ہی تھی کہ ظل شاہ کے وجود میں بجلی دوڑی۔ اس نے کلائیوں کو جھٹکا دیا۔ ہتھکڑی جیسے جادو کے زور سے اس کی گود میں جاگری۔ وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا تو ہتھکڑی اس کے قدموں میں...... سامنے بیٹھا پولیس اہلکار چونکا۔ ہاتھ میں پکڑا کپ پھینک کر وہ ظل شاہ پر جھپٹا۔ وہ، ظل شاہ کی جھک کر کمر تھامنا چاہتا تھا مگر ظل شاہ کے وجود میں تو بجلی بھر گئی تھی۔ اس نے زقند بھری اور جھکے ہوئے اہلکار کے سر کے اوپر سے نکل گیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ڈبے کے دروازے پر نظر آیا۔ اگلے ہی لمحے اسے تاریکی نے نگل لیا تھا۔ اسی وقت بجلی بڑے زور سے چمکی...... جھپٹا مارنے والے اہلکار نے جلدی سے گھوم کر ڈبے کے دروازے سے جھانکا۔ لحظہ بھر کی چمک میں اسے ظل شاہ کا سر نظر آیا۔ بپھرا ہوا برساتی نالا لحظہ بھر میں اسے بہا کر کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔

☆☆☆

نواں کوٹ تھانے کے انچارج انسپکٹر ماجد خان نے ظل شاہ کے فرار ہونے کی خبر بڑے اچنبھے کے ساتھ سنی تھی۔ ہتھکڑی کھول کر کسی زیرِحراست ملزم کا فرار ہونا کسی ملی بھگت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ابتدائی طور پر ظل شاہ کو لانے والے دونوں اہلکاروں کو اسی بنیاد پر حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ان سے تفتیش جاری تھی۔

ماجد خان کو یہ خبر تھانے سے ملحقہ اپنے کوارٹر میں ملی تھی اور اس نے سر تھام لیا تھا۔ یہ کیس ابھی تک اس کے لیے معما ہی تھا۔ امید تھی کہ ظل شاہ کے ہاتھ آنے کے بعد بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے مگر دلی ہنوز دور است...... اس کے علاوہ وہ، ظل شاہ کی زندگی کی طرف سے بھی قدرے مایوس ہوگیا تھا جس طرح برساتی بپھرا ہوا نالا اسے بہالے گیا تھا، اس کے بعد ظل شاہ کا سلامت نالے سے نکلنا خاصا مشکل تھا۔ بہرحال قانون حرکت میں آچکا تھا۔ اس کی ایما پر ایس پی صاحب نے ضلعی ناکا بندی کا حکم دیا تھا اور اس وقت پورے ضلع کی پولیس حرکت میں آچکی تھی۔ نالے کے اطراف مخبروں کو بھی چوکس کیا جارہا تھا اور پولیس کی توجہ بھی برساتی نالے کی طرف ہی تھی۔

برستی بارش میں چھاتا لے کر ماجد خان تھانے سے دوبارہ کوارٹر میں آگیا تھا۔ جہاں اس کے اردلی مختیار علی نے رات کا کھانا رکھ لیا تھا۔ ماجد خان کا تعلق بہاولپور سے تھا اور اس کے بیوی بچے وہیں تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے اس کا دماغ اسی کیس میں اُلجھا ہوا تھا۔ ظل شاہ کے سنگین اقدام کے سبب نواں کوٹ کا سب سے معزز اور معتبر خاندان منقسم ہوگیا تھا۔ ظل شاہ نے نصف رات کے بعد اپنے چچا کے گھر میں گھس کر اپنے چچا زاد بھائی اور چاچی کو خنجروں کے وار کر کے قتل کر دیا تھا۔ فرار ہوتے ہوئے جو بھی اس کی راہ میں آیا گھائل ہوا۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ظل شاہ اس وقت بالکل جنونی ہو رہا تھا۔ ماجد خان تجربہ کار آفیسر تھا۔ قتل کے کیس میں سب سے پہلے وجۂ قتل پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہاں سرے سے بظاہر کوئی وجۂ قتل تھی ہی نہیں۔ دونوں بھائی شیر و شکر تھے۔ شہید شاہ کے آستانے سے ملحق وسیع احاطے میں دونوں کے گھر تھے۔ بڑا بھائی چارہ تھا۔ حتیٰ کہ ظل شاہ کی منگنی بھی چچا کے گھر ہو چکی تھی۔ سالانہ میلے کے بعد شادی کا حتمی پروگرام تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ظل شاہ نے اپنے ہی خون سے ہاتھ رنگ لیے اور یہ خاندان تقسیم ہوگیا۔

ظل شاہ کا چچا پیر نصیر شاہ جب بھی تھانے آتا تھا۔ آگ کا گولا بن کر ہی آتا تھا۔ سنا تھا کہ ظل شاہ کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی اس کے گھر والوں نے باقاعدہ پٹاخے پھوڑے تھے۔ اب ظل شاہ کے فرار کی خبر یقیناً ان لوگوں پر بجلی بن کر گری ہوگی۔ آگ کا گولا کسی بھی وقت دوبارہ تھانے نازل ہونے والا تھا۔

دوسری جانب بیٹے کے اقدام کے سبب پیر بصیر شاہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں اور گم صم سا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھی تھانے نہیں آیا تھا۔ تفتیش کے سلسلے میں ماجد خان کئی دفعہ اس کے گھر گیا تھا۔ وہ بات بات پر ٹھنڈی سانس لیتا تھا اور آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ یہ بھی سنا تھا کہ اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

دونوں بھائیوں کے درمیان دراڑ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ نصیر شاہ کے بیٹوں نے دربار کے معاملات سے تایا اور تایا زاد بھائیوں کو زبردستی ہٹا کر سارے معاملات عملی طور پر سنبھال لیے تھے۔ اس موقع پر گرما گرمی بھی ہوئی تھی مگر بصیر شاہ نے بیٹوں کو سختی سے واپس بلا لیا تھا۔

ماجد خان ابھی تک قتل کی وجہ ہی نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔ نصیر شاہ اور بصیر شاہ بھی علیحدہ علیحدہ ملاقاتوں میں ظل شاہ کے قتل کی کوئی وجہ بتانے میں ناکام رہے تھے۔ ماجد خان کے سامنے صرف مفروضے تھے۔ ان میں سے ایک مفروضہ سب سے طاقتور اور دل کو لگنے والا تھا۔ نواں کوٹ کی عورتوں میں چہ میگوئیاں چل رہی تھیں کہ ظل شاہ رات کی تاریکی میں اپنی منگیتر سے ملنے گیا تھا۔ چاچی اور اس کے چھوٹے بیٹے نے دونوں کو نازیبا حالت میں دیکھ لیا تھا جس کے سبب وہ دونوں کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔

ماجد خان نے اس مفروضے پر تفتیش کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی اور ظل کی منگیتر نورالعین کو شاملِ تفتیش کرنا چاہتا تھا مگر نصیر شاہ نے سخت برا منایا اور اس کا اثر ورسوخ حرکت میں آ گیا۔ ایس پی صاحب کی طرف سے ہدایت آ گئی کہ فی الحال وہ اپنی تمام تر توجہ ظل شاہ کی گرفتاری پر مرکوز رکھے۔

ظلِ شاہ بھی قسمت کی یاوری یا پھر اپنی بدقسمتی کے سبب گرفتار ہوا تھا۔ وہ کھوکھرا پار اور مونا باؤ کے بارڈر پر رینجرز کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ وہ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قیاس یہی تھا کہ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ انڈیا جانے کی کوشش میں تھا۔ گرفتاری اور تفتیش کے مختلف مراحل کے دوران اس کی شناخت ایک مفرور کے طور پر ہو گئی تھی اور رینجرز نے باقاعدہ طور پر پنجاب پولیس کو اطلاع دے کر مفرور ملزم ان کے حوالے کر دیا تھا مگر مفرور اب دوبارہ سے مفرور تھا۔

کھانے کے بعد وہ دوبارہ سے تھانے آ گیا۔ بارش اب دم توڑ رہی تھی۔ ہوا بادلوں کو کہیں اور اڑائے جا رہی تھی اور یہ ہوا وجود کو بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔

ماجد خان نے برآمدے میں ہی میز لگوا لی۔ روزنامچے پر نگاہ ڈال کر اس نے روزمرہ کے معاملات دیکھے۔ اس دوران ڈی ایس پی صاحب راؤنڈ پر تشریف لے آئے۔ دو دن پہلے ڈاکوؤں کا ایک گینگ ماجد خان نے گرفتار کیا تھا۔ یہ چاروں ڈاکو حوالات میں ہی تھے۔ ڈی ایس پی صاحب کچھ دیر ان سے تفتیش فرماتے رہے۔ ڈاکوؤں کے جرائم کی فہرست خاصی طویل تھی اور یہ دیگر کئی تھانوں کو بھی مطلوب تھے۔ اس کے علاوہ ان سے لوٹ مار کا خاصا سامان برآمد ہوا تھا جس میں تیس تولے کے لگ بھگ سونا تھا۔ ابھی ڈاکوؤں سے مزید برآمدگی کی قوی امید تھی۔

بعد میں ڈی ایس پی کی ہدایات سنتے ہوئے ماجد خان کا حلق کڑوا ہو گیا۔ ڈی ایس پی صاحب کی تمام تر توجہ کا محور و مرکز برآمد شدہ سونا تھا۔

ماجد خان کی بھرپور کوشش رہتی تھی کہ اس کے بچوں کے منہ میں لقمۂ حرام نہ جائے۔ اس کوشش میں وہ کامیاب تو تھا مگر ضمیر ضرور ملامت کرتا تھا کہ اسے اپنی کھال بچانے کے لیے بہت سے معاملات سے چشم پوشی کرنا پڑتی تھی۔ اسی چشم پوشی کے سبب وہ اس محکمے میں ابھی تک ٹکا ہوا تھا۔ اس کی شہرت البتہ ایمان دار پولیس آفیسر کی تھی۔ افسران بھی اس کی عزت کرتے تھے۔

ماجد خان کے سامنے ٹیبل پر برآمد شدہ سونے کے زیورات بکھرے ہوئے تھے۔ اسے ان زیورات سے کراہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ زیورات ڈی ایس پی صاحب کی "رال" سے لتھڑے ہوئے تھے۔ زیورات کو غیر ارادی طور پر دیکھتے ہوئے ماجد خان چونکا۔ اس کی نظر ایک چمک دار نقرئی سکے پر جم گئی۔ بلب کی روشنی میں وہ چمک رہا تھا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر وہ سکہ اٹھا لیا۔ سکے نے اس کی پوری توجہ کھینچ لی۔ جو رخ سامنے تھا اس پر ایک ہرم نما سیاہ عمارت کا بڑا واضح چھاپا تھا۔ سکے کی گولائی کے اطراف ننھے سے گڑھے تھے جیسے وہاں کچھ کھدا ہو جو بعد میں کسی نے اکھیڑ لیا تھا یا امتدادِ زمانہ سے خود ہی جھڑ گیا تھا۔ ان گولائی نما لکیروں کی موٹائی دیا سلائی سے بھی نصف تھی۔ ان گڑھے نما لکیروں کی شکل ایسے تھی جیسے انہوں نے اس ہرم نما عمارت کو اپنی حفاظت میں لے رکھا ہو۔

ماجد خان نے سکے کو گھمایا۔ دوسری طرف ایک غیر انسانی مکروہ چہرہ کندہ تھا جس کے اطراف میں نامعلوم زبان میں کچھ کندہ تھا۔ مکروہ چہرے پر بھیڑیے کا سا گمان ہوتا تھا مگر وہ بھیڑیے کی شبیہ نہیں تھی۔ ماجد خان حیران ہوا یہ سکہ فنِ ٹکسالی کا شاہکار تھا۔ پر مکروہ چہرے کی جزئیات خاصی واضح تھیں خاص طور پر اس کی آنکھیں...... ان آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ماجد خان کو اپنے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ اس نے سکے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ زبان بالکل نامانوس تھی۔ بناوٹ سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ سنسکرت تھی۔

ماجد خان کی حیرانی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ ماضی اور حال میں سکے رائج تھے اور کرنسی کے طور پر استعمال ہوتے تھے مگر اس سکے پر ایسی کوئی بظاہر علامت نہیں تھی کہ یہ کتنی مالیت کا سکہ ہے۔ ماجد خان نے خیال کیا کہ شاید یہ نامعلوم

وقتوں میں ڈھالا گیا کوئی یادگاری سکہ تھا۔ اس کی دلچسپی سکے میں بڑھ گئی۔ اس نے بے اختیار سکہ جیب میں ڈال لیا مگر اگلے ہی پل ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سکہ نکال کر دوبارہ مسروقہ سامان میں رکھ دیا۔ ساتھ ہی وہ کشمکش کا شکار ہوگیا۔ پھر بطور امانت کا سوچ کر اس نے سکہ جیب میں ڈال لیا۔ سکے کو لے کر وہ متجسس ہو چکا تھا۔ اس نے سکے کے بارے میں ڈاکوؤں سے بھی پوچھ گچھ کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں سے اٹھ کر اس نے حوالات کا رخ کیا۔ حوالات میں فی الوقت وہی چار ڈاکو ہی تھے۔ وہ چاروں کھانے میں مصروف تھے۔ ماجد خان کے تاثرات میں خود بخود ہی سختی نمودار ہوگئی۔ وہ چاروں چار روزہ جسمانی ریمانڈ پر تھے اور ماجد خان کی سختی ملاحظہ کر چکے تھے۔ ماجد خان کو دیکھتے ہی ان کے کُتے ہوئے چہروں پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔

ماجد خان نے کڑکتے ہوئے لہجے میں سکہ ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہاں سے لیا تھا تم لوگوں نے؟ یقیناً سرقہ بالجبر ہی کیا ہوگا۔''

ڈاکوؤں کے کس بل خاصی حد تک نکل چکے تھے۔ ایک قدرے نوجوان اور دُبلے پتلے ڈاکو نے بمشکل لقمہ نگلتے ہوئے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! یہ ایک پاگل سے نوجوان کی جیب سے میں نے نکالا تھا۔ دھوبی گھاٹ کے پرانے پُل کے نیچے ہم نے گھات لگائی تھی۔'' اس نے کپکپاتے لہجے میں پوری تفصیل بتادی۔

ماجد خان نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوالات کر کے پوری تفصیل معلوم کر لی مگر جس نوجوان سے یہ سکہ چھینا گیا تھا، اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس نوجوان کی جیب سے معمولی سی رقم بھی ڈاکوؤں کے ہاتھ لگی تھی۔

عشا کی نماز کے وقت ماجد خان کے ساتھ عجیب سا معاملہ ہوا۔ تھانے کی مرکزی عمارت سے بمشکل فرلانگ بھر دور ایک قدیمی اور سادہ سی مسجد تھی جس پر ایک بے حد گھنا پیپل کا درخت سایہ فگن تھا۔ شاید اسی کی نسبت سے اسے ''پیپل والی مسجد'' کہا جاتا تھا۔ ماجد خان باجماعت نماز کی بھرپور کوشش کرتا تھا اور زیادہ تر کامیاب بھی رہتا تھا۔

بارش کا زور ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کوارٹر سے ہی وضو کر کے رم جھم میں چھاتا لے کر مسجد کی طرف چل دیا۔ پکی اینٹوں کی سوانگ قدرے بلند تھی۔ جس کے سبب وہ برساتی پانی سے بچتا ہوا مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ مسجد کے صحن اور اندر والے حصے کی روشنیاں نمازیوں کو جیسے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اذان پہلے ہو چکی تھی۔ جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ اس سبب ماجد خان کے قدموں میں تیزی آگئی۔ اِکا دُکا نمازی اینٹوں والے محرابی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس دروازے کی مرمت ماجد خان نے پچھلے ماہ کی تنخواہ سے کروائی تھی۔ مسجد کے امام سائیں قاسم کے سامنے جب اس نے دروازے کی مرمت کی ذمے داری لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو ان کے چہرے پر تردّد ظاہر ہوتے دیکھ کر اس نے دبی آواز میں کہا تھا۔

''سائیں! صرف اتنا کہوں گا...... میرے باپ نے مجھے حرام نہیں کھلایا اور باپ کی اس سنت کو میں بھی آگے بڑھانے کی کوشش مرتے دم تک جاری رکھوں گا۔''

سائیں قاسم کے روشن چہرے پر تبسم چمکا تھا۔ انہوں نے اجازت دیتے ہوئے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ''پتر! تو نے باپ کی پیٹھ نہیں لگنے دی۔ خدا تیری نہیں لگنے دے گا۔''

وجدانی لہجے میں دی گئی اس دعا نے جیسے ماجد خان کے وجود میں توانائی کی نئی روح پھونک دی تھی۔ اس نے عقیدت سے سائیں قاسم کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

سائیں قاسم کی شخصیت کے گرد عقیدت کے ساتھ ساتھ اسرار کا بھی ہالہ تھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے آئے تھے۔ اس بے آباد مسجد کو آباد کر کے اس کی امامت کی ذمے داری خود سنبھال لی تھی۔ عمر کا اندازہ ساٹھ سے اوپر کا تھا۔ اکہرا بدن، سیدھی کمر، روشن چہرہ، وجود میں اتر جانے والی آنکھیں اور سفید ریش۔ ان کے قرب میں بڑا ہی سکون تھا۔ دھیما لہجہ دل میں گداز جگا کر گناہوں کے زنگ پر ضرب لگاتا تھا۔ اہلِ علاقہ کی طرح ماجد خان بھی ان کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ دل میں خود بخود ہی احترام جاگا تھا اور پھر سر اس ولی کے سامنے جھک گیا تھا۔ چوتھے دن اس سر کو مہربان ہاتھ کا لمس نصیب ہوا تھا۔ وہ مہربان لمس آج بھی طاقتور احساس کے ساتھ ماجد خان کو محسوس ہوتا تھا۔

بات ہو رہی تھی ماجد خان کے ساتھ پیش آنے والے عجیب واقعے کی۔ جیسے ہی اس نے محرابی دروازے سے قدم اندر رکھنا چاہا اسے بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ بعینہٖ ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اسے زور کا دھکا دیا ہو۔ وہ پشت کے بل نمازیوں کی جوتیوں پر گرا۔ دھکا دینے والا نظر نہیں آیا تھا۔ صحن اور دروازے پر روشنی کا خوب انتظام تھا۔ معاملہ کچھ

اور تھا۔

ماجد خان نے شاک کی سی کیفیت میں تسلی کی مگر سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔ خجالت اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ وہ اٹھا۔ کپڑے خراب ہو چکے تھے۔ نماز کا اب سوال ہی نہیں تھا۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ ایک طرف پڑا چھاتا اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا شاید پاؤں رپٹ گیا تھا مگر یہ محض خود کو دھوکا دینے والی بات تھی۔ سینے پر ابھی تک گرم سا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اٹھ کر اس نے دوبارہ قدم بڑھایا۔ اس دفعہ دھکا پہلے سے بھی زوردار تھا۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس دفعہ گرم ہاتھ عین دل کے مقام پر لگا تھا۔ دھڑکن بے حد تیز ہو گئی اور جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ پیغام بے حد واضح تھا۔ اسے مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔

ماجد خان بخوبی جانتا تھا کہ اس دنیا میں کئی متوازی نظام چل رہے تھے۔ دیدہ بھی اور نادیدہ بھی۔ اچھائی، برائی ہر نظام میں برسرِ پیکار تھی مگر اس کے ساتھ یہ کیا انہونی ہوئی تھی۔ اسے مسجد میں داخل ہونے سے کیوں روک دیا گیا تھا۔ اس سے کون سا گناہ یا کوتاہی ہوئی تھی؟ خدا کی ناراضگی کے احساس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ ان بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا۔ رم جھم نے اس کا چہرہ بھگو دیا۔ ان بھیگی آنکھوں نے یقیناً مالکِ ارض و سما کی بارگاہ میں ہلچل مچائی تھی۔ مٹھی میں جکڑے دل پر سے جیسے گرفت ختم ہو گئی اور ایک اطمینان سا اتر آیا۔ سامنے کھلے دروازے سے جماعت کا منظر نظر آ رہا تھا۔ وہ چھاتا سنبھال کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

سلام پھیرتے ہی خلافِ توقع سائیں قاسم باہر کی طرف لپکے۔ چھ، سات نمازیوں نے انہیں اچنبھے سے دیکھا۔ ان کی نگاہیں تعاقب میں دوڑیں۔ سائیں سیدھے مسجد کے دروازے کی طرف آئے۔ انہیں آتا دیکھ کر ماجد خان کی آنکھیں دوبارہ چھلک اٹھیں۔ یقیناً خدا کے دوست سے اس کی کیفیت چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ روشنی میں ماجد خان کو ان کے چہرے پر اضطراب آمیز فکر نظر آئی۔ دروازے کے پاس رک کر انہوں نے ناک سکیڑی...... پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ، ماجد خان سے مخاطب ہوئے۔

"پتر غسل کر کے دوبارہ آ......"

ماجد خان کے بولنے سے پہلے وہ واپس پلٹ گئے تھے۔

واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بوجھل قدموں سے واپس جاتے ہوئے اس کے دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ پاکی و پلیدگی کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ وہ اپنے گزرے وقت کا احتساب کرنے لگا۔ اسے کہیں بھی کوتاہی نظر نہیں آئی اور کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے مغرب کی نماز ادا کی تھی۔ اس کا مطلب تھا جو کچھ تھا وہ مغرب و عشا کے درمیان ہوا تھا۔

کوارٹر تک پہنچتے پہنچتے اس کا دماغ پھوڑے کے مانند دکھنے لگا تو اس نے مزید الجھنے کے بجائے حکم بجالانے کو اہمیت دی اور غسل کر کے کپڑے تبدیل کر کے فوراً مسجد کا رخ کیا۔ بارش رک چکی تھی مگر احتیاطاً اس نے چھاتا ہمراہ لے لیا۔ ساون کی بارش تھی۔ بادل تنے کھڑے تھے۔ ٹوٹا سلسلہ دوبارہ جڑ سکتا تھا۔

اس دوران اس کی ہدایت کے مطابق اردلی نے چھاتے کو بھی اچھی طرح سے صاف کر دیا تھا۔ وہ مسجد کے قریب پہنچا تو نمازی رخصت ہو رہے تھے۔ وہ بھی اسے جانتے تھے۔ چند ایک نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔ ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ سائیں مسجد کے دروازے کے پاس ٹہل رہے تھے۔ ان کے انداز سے بے چینی ہویدا تھی۔ ماجد خان کے قدموں میں تیزی آ گئی۔

سائیں اسے دیکھ کر محرابی دروازے میں ہی جم گئے۔ ماجد خان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے ناک سکیڑی مگر اس دفعہ ناگواری کی سلوٹ نمودار نہیں ہوئی۔ دروازے کے پاس ماجد خان جھجک کر رک گیا۔ پہلے والا دھکا یاد آیا۔ ساتھ ہی سائیں کی مہربان آواز ابھری۔

"بے دھڑک چلے آؤ۔"

ماجد خان نے قدم اٹھایا۔ اگلے ہی پل وہ مسجد کے اندر تھا۔ سائیں نے ہاتھ بڑھایا۔ ماجد خان نے ڈوبتے ہوئے شخص کے مانند وہ ہاتھ تھام لیا۔

"سا...... ئیں...... یہ...... م...... میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟" حیرت و فکر نے مل کر اس کی زبان کو حرکت دی تھی۔

سائیں کی نگاہوں میں فکرمندی تھی۔ "تو پلید تھا...... یا پھر تیرے ساتھ کوئی پلیدگی تھی...... اس لیے روکا گیا تھا تجھے۔"

ماجد خان گنگ سا ہو گیا۔ بمشکل اس نے اپنی صفائی دی۔ "مم...... مگر میں نے اپنا احتساب کیا ہے...... میں پاک تھا اور مغرب بھی تو آپ کے ساتھ پڑھی تھی۔"

سائیں نے اَن سنی کرتے ہوئے اپنے پہلو میں نظر ڈالی اور زیرِلب کچھ کہا۔ جو ماجد خان نہیں سن پایا تھا۔ وہ مزید استعجاب میں ڈوب گیا۔ سائیں کے آس پاس تو کوئی بھی نہیں تھا۔

سائیں نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''جماعت تو اب کسی اور مسجد میں بھی نہیں ملے گی۔ اکیلے پڑھ کر میرے حجرے میں آجاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ مسجد کے ایک کونے میں بنے کچی دیواروں والے اپنے حجرے کی طرف چل دیے۔

ماجد خان نے بھرپور کوشش کر کے یکسوئی حاصل کی اور نماز کی ادائیگی کے بعد سائیں کے حجرے کی جانب چل دیا۔ حجرے میں مٹی کے تیل سے جلنے والے چولھے کی ہمک تھی۔ چولھا جل رہا تھا اور اس پر چائے کی صاف، ستھری کیتلی دھری تھی۔

سائیں کے ہاتھ کی چائے اور کھانا وہ متعدد دفعہ کھا چکا تھا۔ اس حجرے میں پہلے بھی اس کی کئی مرتبہ آمد ہو چکی تھی۔ ایک کونے میں فرشی بستر، لوہے کا ایک ٹرنک، چند برتن اور ایک ریک میں بچی چند کتابیں اس مردِ درویش کا کل اثاثہ تھیں۔ گرمیوں میں وہ مچھردانی لگا کر مسجد کی چھت پر سوتے تھے۔ بارش کے سبب آج حجرہ آباد تھا۔ دروازے اور کھڑکی سے آنے والی ہوا کے سبب حجرے میں گرمی کا احساس قدرے کم تھا۔

ماجد خان بستر کے سامنے چٹائی پر مؤدبانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ دو کپوں میں چائے انڈیلتے ہوئے سائیں نے کہا۔

''تکیہ لے، لے...... کمر کو نہ تھکا۔''

ماجد خان نے بے تکلف بستر پر ترتیب سے پڑے دو گول تکیوں میں سے ایک کھینچ کر کمر کے نیچے لگالیا۔ سائیں نے ایک کپ اس کے سامنے رکھا اور دوسرا خود تھام کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کی نگاہیں ماجد خان کے چہرے پر تھیں۔ ان کی آواز بلند ہوئی۔

''مغرب اور عشا کے درمیان کا لمحہ لمحہ بیان کر۔''

ماجد خان نے کپ اپنے سامنے رکھا۔ دماغ پر زور دینے والی بات تھی نہیں۔ اس نے بیان شروع کر دیا۔ سائیں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔ جب مکروہ شبیہ والے سکے کا ذکر آیا تو ماجد خان کے دماغ میں بھی روشنی کا کوندا سا لپکا اور سائیں نے بھی پہلو بدلا تھا مگر بولے کچھ نہیں۔

ماجد خان پر انکشاف ہوا کہ جو بھی گڑبڑ تھی اسی سکے کے سبب تھی پھر وہ گڑبڑایا۔ اگر سکے کا موجب فساد تھا تو اس دفعہ اسے دروازے پر روکا کیوں نہیں گیا؟ اگلے ہی لمحے یاد آیا کہ سکہ اتارے جانے والے کپڑوں کی جیب میں ہی رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً سکے کے حوالے سے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چائے پینے کے لیے کہا اور پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ سکہ؟''

''کوارٹر میں...... پرانے کپڑوں کی جیب میں پڑا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد سائیں اور ماجد خان تیز قدموں کے ساتھ کوارٹر میں داخل ہو رہے تھے۔ کوارٹر میں داخل ہوتے ہی سائیں نے ناک سکیڑی...... ناگواری کی سلوٹ نمودار ہوئی، وہ بولے۔ ''یہاں مکروہ پلیدگی ہے۔ نکال اس سکے کو۔''

ماجد خان نے ٹٹول کر پرانے کپڑوں کی جیب سے وہ سکہ نکال کر سائیں کے سامنے کر دیا۔ اُن کے چہرے پر شدید ناگواری نظر آئی۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر انہوں نے اپنے عمامے کے پلو سے ناک ڈھانپ لی۔

ماجد خان نے کسی ناخوشگوار بُو کو سونگھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

سائیں نے ہاتھ آگے بڑھانے کے بجائے ماجد خان کے ہاتھ میں ہی اس سکے کا جائزہ لیا۔ ہرم نما عمارت دیکھتے ہوئے وہ چونکے اور پھر سکے کے اطراف کی خالی لکیریں...... ان کے کہنے پر ماجد خان نے سکے کو پلٹا تو بھیڑیے نما مکروہ شبیہ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر فکرمندی نظر آنے لگی۔ چند لمحوں کے جائزے کے بعد انہوں نے کہا۔

''اس لعنت کو وہیں رکھ دو۔'' ان کے لہجے میں واضح کبیدگی تھی۔

سکہ دور ہوتے ہی سائیں نے ناک سے پلو ہٹا دیا۔ ماجد خان واپس پلٹا تو سائیں کے تاثرات دیکھ کر وہ فکرمند ہو گیا۔ اس نے بے اختیار پوچھا۔

''سائیں! یہ کیا بلا ہے؟ میں ڈرنے والا نہیں ہوں مگر میرا دل کانپ رہا ہے۔ خدا خیر کرے...... کیا چکر ہے؟''

سائیں نے اپنے تاثرات سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو اندھیرا ہے۔ کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں...... تو فکر نہ کر اور کچی اینٹ کہیں سے ڈھونڈ لا!''

ماجد خان نے اردلی کو حکم دیا۔ چند منٹ میں پاک مٹی کی کچی اینٹ آ گئی۔ ماجد خان نے اینٹ تھامنے کے لیے

ہاتھ بڑھایا تو سائیں نے اسے منع کر دیا اور خود اردلی کے ہاتھ سے اینٹ تھام لی۔

اردلی چہرے پر حیرت اور تجسس لے کر رخصت ہو گیا۔

سائیں نے کوارٹر کے صحن میں لگے امرود کے پودے سے ایک مضبوط قلم کے سائز کی شاخ توڑی اور اس کی مدد سے پکی اینٹ پر کچھ کریدنے لگے۔ انداز ایسے تھا جیسے کچھ لکھ رہے ہوں پھر انہوں نے سر اٹھا کر ماجد خان کی طرف دیکھا۔

''یہاں کوئی ایسا کمرا ہے جس میں کوئی آتا جاتا نہ ہو؟''

ماجد خان نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی سائیں! اوپر ایک چھوٹا سا اسٹور ہے۔ کاٹھ کباڑ ہی بھرا ہے اس میں۔ اردلی کو میں اُدھر جانے سے منع کر دوں گا۔''

سائیں نے آمادگی کا اظہار کیا تو دونوں چھت پر آ گئے۔ اسٹور کا زنگ آلود کنڈا کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ ماجد خان آج پہلی دفعہ اسٹور میں آیا تھا۔ اس نے اندازے سے بغلی دیوار ٹٹولی تو اس کی انگلیاں سوئچ بورڈ سے ٹکرائیں۔ اس نے سارے ہی بٹن آن کر دیے۔ اسٹور میں لگا بلب آن ہو گیا اور بیمار سی زرد روشنی میں اسٹور کا منظر نمایاں ہو گیا۔ ہر طرف مکڑی کے جالے اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر...... بچوں کی سائیکلوں کے ڈھانچے اور لوہے کی ایک انگیٹھی اس اسٹور کا سامان تھا۔

سائیں نے ایک جگہ منتخب کی اور ماجد خان کو سکہ وہاں رکھنے کے لیے کہا۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔ سائیں نے ناک پر دوبارہ پلو لپیٹا اور منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے اینٹ اس سکے کے اوپر رکھ دی۔ اس وقت ماجد خان نے دیکھا کہ سائیں نے اینٹ کے اوپر تعویذ کی شکل کا ایک نقش بنایا تھا۔ الفاظ کی بناوٹ عربی سے مشابہت رکھتی تھی۔

کمرے سے نکل کر سائیں نے ناک سے پلو ہٹایا اور تیز لہجے میں بولے۔ ''اس کمرے کو فوراً اپنے ہاتھ سے مضبوط تالا لگا اور چابی فجر کے وقت میرے پاس لے آنا۔'' ساتھ ہی انہوں نے اپنے ہاتھ سے کنڈا لگا دیا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے انہوں نے ہدایت دی۔ ''جن کپڑوں سے یہ منحوس سکہ مس ہوا ہے۔ انہیں جلا دے اور دوبارہ غسل کر کے آیت الکرسی کا حصار کر کے سونا۔''

دماغ میں چکراتے سوالات کے درمیان اس نے تابعداری سے سر جھکایا۔ رخصت ہوتے ہوئے سائیں نے جیسے اس کے دماغ میں چکراتے سوالات پڑھ لیے۔

''کہا نا ابھی اندھیرا ہے...... صبح اُجالے کی امید ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چل دیے۔

ماجد خان، سائیں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سو گیا۔

دوسری جانب سائیں اپنے حجرے میں ایک دِیا جلائے بیٹھے مسلسل کچھ پڑھے جا رہے تھے۔ یہ آواز محض بھنبھناہٹ سے مشابہ تھی۔ سائیں کے چہرے پر دیے کی لو میں پیشانی پر ابھری ایک نس نمایاں تر ہو رہی تھی۔ وہ سیدھی کمر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے پڑھنے کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی اور آسمان پر بادلوں کی گھن گرج دوبارہ سے شروع ہو چکی تھی۔ بارش کسی بھی لمحے متوقع تھی۔

پھر اچانک ہی دِیا بجھ گیا۔ حالانکہ دروازہ اور کھڑکی بند تھے۔ حجرے میں ہوا کا گزر نہیں تھا۔ اسی وقت حجرہ ایک الوہی خوشبو سے بھر گیا۔ سائیں نے وِرد موقوف کیا اور ادب سے دوزانو ہو گئے۔ حجرے کی بند فضا میں ایک مدّھم سی سرگوشی ابھری۔ انداز بڑا محبت آمیز تھا۔

''ہماری یاد کیسے آ گئی آج ننگے؟''

سائیں نے عاجزی سے کہا۔ ''ہمیشہ کی طرح آج بھی بڑی مجبوری میں آپ کو تکلیف دی ہے۔''

سرگوشی اُبھری۔ ''تکلیف کیسی...... تو نے خود کو تیاگ دیا ہے...... اپنے لیے تو کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔'' انداز شکوہ آمیز ہوا۔

سائیں کا سر مزید جھک گیا۔ انداز عاجز تر ہو گیا۔

''اس پاک ذات کا بڑا کرم ہے۔ اس نے ہر طرف سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کی مخلوق کے کسی کام آ جاؤں، اس سے بڑھ کر کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔''

سرگوشی شبیہ آمیز ہوئی۔ ''بے نیازی...... خاک کی صفت نہیں ہے...... نیازمند ہو جا!''

سائیں کا پورا وجود لرز گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گال پیٹے اور خود کلامی کے انداز میں ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہائے...... یہ ''میں'' میرے ساتھ ہی ختم ہو گی۔'' پھر اس کا انداز بدلا۔ ''میرے لیے نیازمند ہونے کی دعا ضرور فرما دیں۔ میں بربادی کے راستے پر دوڑا جا رہا ہوں۔''

سرگوشی نے ہنکارا سا بھرا۔ ''زیادہ فکرمند نہ ہو۔ تیرا کلا (کھونٹا) مضبوط ہے۔ اب کام بتا!''

"سائیں نے ماجد خان کا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا۔ "مجھے اُس کی فکر ہے۔ کوئلے کی کان میں وہ ہیرا ہے۔ اس کے معاملے پر ذرا نگاہ ڈالیں۔"

جواب میں تاریک تر حجرہ گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ باہر بارش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بادل رہ رہ کر گرجتے تھے اور دل دہل جاتے تھے۔ سائیں کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔ پھر تاریکی میں سرسراہٹ سی ابھری۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے پہلو بدلا ہو۔ پھر مدّھم سرگوشی بلند ہوئی۔

"ایک شیطان پرست صدیوں سے مقیّد بدی کی ایک طاقت کو آزاد کروانے کے لیے بڑی تپسیا کر رہا ہے، سارے تالے اس نے توڑ لیے ہیں۔ آخری تالا رہ گیا ہے۔ "ہیرا" بس اتفاق سے ہی راستے میں آگیا ہے تو نے جو بند باندھا ہے، اس نے شیطان کو چونکا دیا ہے۔ معاملہ تیری طرف پلٹے گا...... رات کا سونا کم کردے۔"

"میری فکرمندی کا شکریہ! آخری تالا بچانے کی کوئی سبیل کریں۔"

اس دفعہ حجرے میں دھیمی سی ہنسی ابھری۔ "تیرے سینے کا درد ہی ہے ملنگے! جو تیرے بلاوے پر کھینچ لاتا ہے...... ذرا دھیان سے سن...... بدی کی وہ قوت شہید شاہ کی باندھی ہوئی ہے۔ انہی کے خون سے آخری تالا کھل سکتا ہے۔ چابی بھی اسی خاندان کے پاس چلی آرہی ہے چابی اور خون کو بچا سکتا ہے تو بچالے ورنہ جس مخلوق کا درد تیرے سینے میں چھپا ہے، اس پر بڑا کڑا وقت آجائے گا۔"

"مزید کچھ رہنمائی فرمائیں۔"

حجرے میں دوبارہ بوجھل خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد سرگوشی ابھری۔ "صدیوں پرانا قصہ ہے۔ شہید شاہ نے بھوج پور میں بدی کی طاقت کو مقیّد کیا تھا۔ شیطان پرست بھوج پور میں بیٹھا ڈوریاں ہلا رہا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی حجرے میں سرسراہٹ ابھری اور بجھا ہوا دیا دوبارہ سے جل اٹھا۔ سائیں نے سر اٹھایا۔ حجرہ خالی تھا۔ آنے والا واپس جا چکا تھا مگر سائیں کو بھنور کے حوالے کر گیا تھا۔ جانے والے کے ساتھ الوہی خوشبو بھی رخصت ہوگئی تھی۔

☆☆☆

نواں کوٹ سے سیکڑوں کلومیٹر دور بھوج پور کی پہچان دُرگا مندر کے تہ خانے میں مندر کا مہمان پجاری وِش مہاراج ایک نوجوان کنیا کو بانہوں میں جکڑے تھا۔ وِش مہاراج کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی مگر جسم چھریرا اور نوجوانوں کے مانند مضبوط نظر آتا تھا۔ یوگا کی قدیم اور کڑی مشقوں نے اسے فولاد کی طرح اندر باہر سے مضبوط بنا دیا تھا۔ سر اور چہرے کے علاوہ وہ بھوؤں پر بھی روز استرا پھیرتا تھا۔ اس حلیے میں وہ مضحکہ خیز نظر آتا تھا مگر بھوج پور کے باسی اس کے قہر سے پناہ مانگتے تھے۔ وہ شیطانی طاقتوں کا مالک تھا اور درحقیقت بدی کی سب سے بڑی قوت "اشک ستر" کا پجاری تھا۔ درگا مندر کے خفیہ اور قدیم ترین تہ خانوں میں اشک ستر کی پرستش ہوتی تھی۔

وِش مہاراج کی رنگین مصروفیات کا اختتام ہوا۔ کنیا اپنی گوری پنڈلیوں پر لہنگا درست کرتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

وِش مہاراج لکڑی کے تخت پر چت پڑا تھا۔ اسی وقت اس عیش گاہ کی روشنیاں تیزی سے مدّھم ہوتی چلی گئیں۔ وِش مہاراج چونک کر اپنی دھوتی سنبھالتا سیدھا ہو بیٹھا۔

روشنیاں مزید مدّھم ہوگئیں۔ عیش گاہ ایک ناقابلِ برداشت بدبو سے بھر گئی تھی مگر مہاراج کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ تخت پر مخصوص آسن جما کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے پیشانی پر رکھ لیے تھے۔

اسی بُو کے درمیان سانپ کی تیز پھنکار ابھری اور دیوار پر ایک مہیب سانپ کا سایہ لہرایا۔ پھر ایک پھنکارتی ہوئی غیر انسانی آواز گونجی۔ "سانچی اور موہری کا واپسی کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔"

مہاراج کو جیسے بجلی کی ننگی تار نے چھو لیا۔ "یہ اُپائے کیونکر ہوا پربھو؟ کس نے راہ کاٹی ہے میری؟" آخر میں اس کے لہجے میں زہر گھلنے لگا تھا۔

پھنکارتی آواز نے کہا۔ "روشنی والے حرکت میں آگئے ہیں مگر وہ جانیں اور تو جانے...... سانچی اور موہری کی شکتی دروازہ بند ہوتے ہی نام کی رہ گئی ہے۔ مجھے دونوں جلد واپس چاہئیں۔" پھنکارتی آواز میں سختی در آئی۔

مہاراج جھکتے ہوئے گھگھیایا۔ "مجھے سمے دے پربھو! میں روشنی والوں کا اتم سنکار کر کے دروازہ کھول دوں گا۔"

آواز کی پھنکار کے ساتھ ہی مہیب سانپ کا سایہ لہرایا۔ "تو کیا...... کیا کرے گا...... سمے بیت رہا ہے۔ اندر دھنش میں منگل اور چندرما کا جنم ہو چکا ہے۔ اسی اماوس کو تو نے وجے سمیٹ لی تو اشک ستر کی داسی صدیوں کی بندش سے رہا ہو کر تیری شکتی بن جائے گی ورنہ اشک ستر کے آتشی آنسو تجھے بھسم کر دیں گے۔"

مہاراج جی جان سے کانپ اٹھا۔ ''دیا پربھو...... دیا۔'' اس کا سر جھکتے ہوئے تخت کو چھونے لگا۔

پھنکارتی آواز نے جیسے اس کی سنی ہی نہیں۔ ''اماوس کے بعد دوبارہ میگل اور چندرما کا ایک ساتھ جنم دو صدیوں بعد ہوگا۔ اشک ستر کی داسی کو مکتی دلانے کے لیے تپسیا تو نے شروع کی تھی۔ اب اشک ستر کو کیا منہ دکھائے گا یا تو اسی اماوس کو وجئی ہو یا پھر اشک ستر کے قہر سے بچنے کے لیے دو صدیاں پاتال میں اتر جا۔''

اس کے ساتھ ہی عیش کدے کی بُو تیزی سے کم ہونے لگی۔ سانپ کا مہیب سایہ غائب ہوگیا۔ روشنیاں دوبارہ سے جان پکڑنے لگیں۔

وش مہاراج ''پربھو...... پربھو......'' پکارتا رہ گیا تھا۔

وش مہاراج سفید بالوں سے بھرا سینے مسلنے لگا۔ سینے میں جیسے انگارے سے جل اٹھے تھے۔ پھر اس نے گہرے گہرے مخصوص انداز میں سانس لینے شروع کر دیے۔ رفتہ رفتہ طیش آمیز مایوسی دم توڑنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مکمل طور پر پُرسکون ہو چکا تھا۔ دماغ پر چھائی طیش کی چادر ہٹتے ہی اس نے دماغی طاقت سے کام لیتے ہوئے کسی سے رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر کی کوشش سے اس کے دماغ میں ایک مترنم نسوانی آواز گونجی۔

''وش مہاراج کی جے ہو۔''

مہاراج نے کہا۔ ''کالکی! کوئی شبھ منتر سنا۔''

کالکی کی مترنم ہنسی اس کے دماغ میں اُبھری۔ ''شبھ ہی شبھ ہے مہاراج! بلی نے ریکھا پار کرلی ہے۔ ہارون آباد اور فقیر والی ریکھا سے اس طرف وہ کنگنی آ پہنچا ہے۔''

مہاراج کا وجود اطمینان سے بھر گیا۔ ''تو دیر کا ہے کی ہے؟ اسے ہاتھ میں کو...... میں، تیری راہ دیکھ رہا ہوں۔''

''اطمینان رکھو مہاراج! میں بس بلی کو تھام کر چرن چھونے حاضر ہوتی ہوں۔''

مہاراج نے دماغی رابطہ ختم کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر حاضر ہوا ہی تھا کہ عیش کدے کے دروازے پر مدھم سی دستک ہوئی۔ مہاراج اس دستک کو پہچانتا تھا۔ اس نے کہا۔

''اندر آجا۔''

دھیرے سے لکڑی کا وزنی دروازہ کھلا اور ایک عجیب الخلقت مخلوق اندر داخل ہوئی۔ دیکھنے میں یہ ایک بونا تھا محض بالشت بھر کا زیریں جسم ایک لنگوٹ میں چھپا تھا مگر اس کی جلد کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ترچھی آنکھوں...... ناک کی جگہ محض گڑھا اور چری ہوئی باچھوں سے جھانکتے نکیلے دانتوں کے سبب اسے انسان کہنا مشکل تھا۔

مہاراج کی سوالیہ نظریں اس بونے پر جمی تھیں۔ نگاہوں کے مفہوم کو بھانپتے ہوئے بونے نے باریک سی فکرمند آواز میں کہا۔ ''مہاراج! اسے کا گھنٹا چل پڑا ہے۔''

یہ سنتے ہی مہاراج کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں آتا ہوں۔''

بونا واپس دروازے کے دوسری طرف غائب ہو گیا۔

مہاراج نے جلدی سے لنگوٹ کسا اور پھر عیش کدے سے باہر نکل آیا۔ اس کے جسم پر محض اب لنگوٹ ہی تھا۔ باہر پتھریلی راہداری میں پُرہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مہاراج منہ ہی منہ میں ایک منتر کا جاپ کرتے ہوئے راہداری میں ایک طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں راہداری کا اختتام ایک سنگِ سیاہ دیوار پر ہوا، اس دیوار کے دونوں اطراف چھوٹے چھوٹے سنگِ سیاہ کے چبوترے تھے جن پر چھوٹے سائز کے دو مجسمے کسی پہرے دار کے انداز میں آویزاں تھے۔ یہ مجسمے بھی سنگِ سیاہ سے تراشے گئے تھے اور کسی بھیڑیے کے مانند نظر آتے تھے مگر ان کی پچھلی ٹانگیں ضرورت سے زیادہ بڑی تھیں اور چہرہ انسان اور حیوان کا امتزاج نظر آتا تھا۔ آنکھوں کی جگہ سرخ یاقوت جڑے تھے جن کی چمک ایک خوفناک تاثر کے ساتھ نمایاں تھی۔

مہاراج نے جھک کر باری باری دونوں بھیڑیوں کے قدم چھوئے۔ اگلا پل بڑا حیرت انگیز تھا۔ دونوں مجسموں کے سر بالکل قدرتی انداز میں ایک دوسرے کی طرف گھوم گئے۔ دونوں کی آنکھیں ملیں، فضا میں ایک ڈراؤنی غراہٹ ابھری اور سنگی دیوار کا ایک حصہ نیچے دھنسنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ مہاراج آرام سے دوسری طرف جا سکتا تھا۔ اس کے خلا سے دوسری طرف جاتے ہی مجسموں کے سر دوبارہ گھومے اور خلا برابر ہوگیا۔

دوسری جانب ایک حمام تھا۔ پتھروں سے تراشا کمرا تھا مگر یہاں بُو ناقابلِ برداشت تھی۔ مختلف حوض ہمہ قسم کی گندگی سے بھرے ہوئے تھے۔ وہی سبز بونا اس حمام میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے سبز رنگ کے پاؤں کسی جوتے وغیرہ سے عاری تھے اور حیرت انگیز طور پر غیر معمولی بڑے تھے۔

مہاراج، بونے کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک حوض

میں اتر گیا۔ یہ حوض سرخ خون سے بھرا تھا اور اس کی سڑاند کسی بھی ہوش مند انسان کی جان لے سکتی تھی۔

مہاراج ناف تک اس حوض میں اتر گیا۔ منہ ہی منہ میں نامعلوم اشلوک بڑبڑاتے ہوئے وہ حوض میں بیٹھتا چلا گیا۔ پھر وہ مکمل طور پر غوطہ زن ہو گیا۔ اس دوران بونے نے فرش میں پتھر کی ایک سلیب کو دبایا تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ نیچے تاریک خلا نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مہاراج حوض سے نکلا تو خون میں بھیگ کر کسی خون آشام درندے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے تاریک خلا میں اتر گئے۔ ان کے سروں کے اوپر سلیب برابر ہو گئی تھی۔

یہ نم آلود تاریک تر جگہ تھی۔ کسی جگہ سے داخل ہونے والی ہوا پُر ہول فراٹے کے مانند چکراتی ہوئی ان دونوں کے جسموں سے ٹکرائی۔

مہاراج نے ٹٹول کر بونے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اگلے ہی لمحے بونا اس تاریک تر خلا میں گھوڑے کے مانند بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

مہاراج نے محض اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کا جسم غیر ارادی طور پر بونے کے برق رفتار قدموں کا ساتھ دے رہا تھا۔ بونے کی رفتار بڑھتے بڑھتے بگولے کے مانند ہو گئی۔ مہاراج کا جسم اس بگولے کے ساتھ اُڑا جا رہا تھا۔

نامعلوم وقت تک یہ حیرت انگیز سفر جاری رہا پھر اچانک ہی بونے کے قدم رک گئے۔ وہ بدستور تاریک خلا میں ہی تھے۔ بونے کے قدموں نے ایک بے ڈھنگی سیڑھیوں کو چھوا جو اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ تاریکی کے باوجود جیسے وہ منظر آرام سے دیکھ رہا تھا۔

سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی چھت کا ایک ٹکڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا جس سے ستاروں بھرے آسمان کا ایک ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ آخری سیڑھی کے بعد ایک چبوترا سا تھا۔ بونا اس چبوترے پر رک گیا۔

مہاراج باہر نکل آیا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں وہ ایک کھنڈر شہر کے اندر کھڑا تھا۔ ہر طرف اینٹوں کے ڈھیر، نیم سلامت دیواریں اور کسی کسی دیوار کے سہارے چھت کا کوئی حصہ باقی تھا۔ انہی کھنڈرات کے درمیان حیرت انگیز طور پر ایک حرم نما عمارت سلامت کھڑی تھی۔ اس عمارت کی بلندی چالیس فٹ کے لگ بھگ تھی اور پھیلاؤ سیکڑوں میٹر تک پھیلا تھا۔

مہاراج نے اس حرم کی طرف قدم بڑھا دیے۔ پہلے فضا میں اُلو کی چیخ بلند ہوئی جس نے رات کا سکوت درہم برہم کر دیا پھر پروں کی مکروہ قسم کی پھڑپھڑاہٹ اُبھری اور کوے کے سائز کی کئی چمگادڑیں مہاراج کے سر کے عین اوپر شور مچانے لگیں۔ قدم قدم پر بھیڑیے سے مشابہت رکھنے والی غراہٹیں بھی اُبھر رہی تھیں۔ مہاراج بلاشبہ سیکڑوں نگاہوں کی زد میں تھا مگر وہ ہر جانب سے بے پروا اپنے خون آلود وجود کے ساتھ حرم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہوا لگنے کے سبب اس کے وجود پر موجود خون جمنے لگا تھا۔

حرم کے قریب ایک نالا سا تھا جس کے اندر سے ابکائی دینے والی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ اس نالے کے اوپر مختصر سا پُل تھا جس کے دونوں سروں پر آویزاں چبوتروں پر بھیڑیا نما مخلوق کے مجسمے آویزاں تھے۔ یہ مجسمے سائز میں کافی بڑے تھے اور ان کی آنکھوں کے یاقوت اندھیرے میں چمک رہے تھے۔

مہاراج نے پُل پر قدم رکھا تو سر پر اُڑنے والی چمگادڑیں کسی اور طرف نکل گئیں۔ دور کہیں گیدڑ مل کر رونے لگے تھے۔ ان کی آوازوں نے ہیبت ناک رات کو مزید وحشت زدہ کر دیا تھا۔

حرم کی عمارت میں بظاہر کوئی دروازہ نہیں تھا مگر جب مہاراج نے ایک اشلوک کا جاپ کرتے ہوئے ایک پتھر پر ہاتھ رکھا تو پتھر کسی دروازے کے مانند اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اندر سے سرخی مائل روشنی جھانکنے لگی تھی۔

مہاراج اندر داخل ہوا تو پتھر بے آواز طریقے سے اپنی جگہ پر چلا گیا۔ اندر ایک وسیع ہال تھا۔ پورے ہال میں سرخی مائل سی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس روشنی کا ماخذ نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ہال کا فرش نیم قوس کی شکل میں گہرائی میں اتر رہا تھا اور اس قوس کے دونوں کناروں پر اسی بھیڑیا نما مخلوق کے مجسمے آویزاں تھے۔ مجسموں کی ترتیب و سائز میں بڑا تناسب تھا۔ ابتدا بڑے مجسموں سے ہوئی تھی۔ جیسے جیسے مہاراج گہرائی میں اتر رہا تھا، مجسموں کا سائز چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کسی کے سانسوں کی وزنی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سرخ روشنی میں مہاراج جیسے پاتال میں اترتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سانسیں بے حد واضح ہو گئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی درندہ سانسیں لے رہا تھا۔

آخر کار مہاراج نیچے پہنچ گیا، یہ بھی ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ اونچی چھت کو نصف درجن سنگِ سیاہ سے بنے

ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ یہاں بھی سرخی مائل روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں ہال کے عین وسط میں ایک دراز قامت عورت کا زنجیروں میں جکڑا ہوا مجسمہ کھڑا تھا۔ زنجیروں کے جوڑ پر ایک بڑا سا ہضمی قفل لگا ہوا تھا۔ یہ قفل بے حد قدیم لگتا تھا اور پیتل کا بنا ہوا تھا۔ اس قفل کے گرد سیاہ ڈوری والے کئی چرمی تعویذ لپٹے ہوئے تھے۔

مجسمے کے گرد سنگِ سفید کا دائرہ سا کھنچا ہوا تھا اور اس دائرے کے اندر انسانی ہاتھوں کی لکیروں سے مشابہ لکیریں سی نظر آرہی تھیں۔ یہ لکیریں مجسمے کے ننگے پیروں تک چلی گئی تھیں۔ کہنے کو تو وہ ایک عورت کا مجسمہ تھا مگر پتھر کے بجائے ایسے لگتا تھا جیسے کسی آبنوسی لکڑی سے اسے تراشا گیا ہو۔ عورت کے جسم کا ایک ایک عضو نمایاں تر تھا۔ اس کے بال چوٹی کی صورت میں سینے پر پڑے تھے اور کسی سانپ کے مانند بل کھا رہے تھے۔ مجسمے کی آنکھوں کی چمک بھی نمایاں تھی اور وہ مجسمہ سانسیں لے رہا تھا۔ بے شک وہ مجسمہ تھا مگر اس کا سینہ پھول، پچک رہا تھا اور وہ بھاری سانسیں لے رہا تھا۔

اسے سانسیں لیتا دیکھ کر مہاراج پر ہیجانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بے دھیانی میں وہ آگے بڑھا۔ جیسے ہی اس کیفیت میں اس نے سنگِ سفید کے دائرے میں قدم رکھا اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس کا پاؤں جیسے اُبلتے ہوئے لاوے پر جا پڑا تھا۔ وہ ایک پاؤں پر ناچ کر رہ گیا۔ اپنی بے دھیانی کو کوستے ہوئے وہ آلتی، پالتی مار کر مجسمے کے سامنے بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے متاثرہ پاؤں پر آبلے نمودار ہوگئے تھے مگر کڑی تپسیا اور یوگا کی مشقوں سے وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ دماغ سے اس تکلیف کے احساس کو ختم کر سکے۔

تکلیف کا احساس ختم کرنے کے بعد اس نے مخصوص جاپ شروع کر دیا۔ اس کے جاپ کے ساتھ ہی مجسمے کے سانسوں کی رفتار بڑھنے لگی۔ پھر جب مہاراج کے کانوں میں بھنبھناہٹ سی گونجی تو اس کا چہرہ مسرت کے احساس سے چمکنے لگا۔ آج صدیوں بعد اشک ستر کی خاص الخاص داسی، ظلمت کی دیوی کرم چالی پت کسی انسان سے مخاطب ہونے جا رہی تھی۔

بھنبھناہٹ ایک کرخت نسوانی آواز میں تبدیل ہوئی۔ ”بالک! تیری تپسیا نے کئی دیواریں گرا دی ہیں۔ اشک ستر، تجھ سے راضی ہوا۔“ مہاراج نے کہا۔ ”اے اندھیروں کی رانی! میں آخری دیوار بھی جلد گرا دوں گا...... تجھے باندھنے والے کا خون جلد تیرے چرنوں کو چھو رہا ہو گا۔“

نسوانی آواز نے ایک آہ بھری۔ ”اشک ستر کی عظیم سیاہ پرچھائیں تیرے سر پر ہے...... تیری کڑی تپسیا نے آج یہ سے دکھایا ہے ورنہ میں تو صدیوں سے نرکھ میں جل رہی ہوں۔ ہر دو صدی بعد چند دنوں کی دھڑکن ملتی ہے اور پھر صدیوں کی خاموشی...... تو مجھے اس بندھن سے مکتی دلا...... اس کے بعد ظلمت کی دنیا پر تیری حکمرانی ہوگی...... تجھے امرت دھارا پلا کر ہمیشہ کے لیے امر کر دوں گی...... اس وقت تک جب فیصلے کا متعین دن نہیں آجاتا۔“

مہاراج کی مسرت کے سبب دھڑکن بڑھ گئی۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”چالی پت کی جے ہو...... اشک ستر کا سایہ رہا تو ضرور تیرے بندھن توڑ کر رہوں گا۔“

دھڑکنوں کی رفتار دوبارہ معتدل ہوگئی۔ ساتھ ہی بھنبھناہٹ بھی دم توڑ گئی تو مہاراج نے واپسی کی راہ لی۔ سبز بونا اسی چبوترے پر اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

ظلِ شاہ کو جھٹکا سا لگا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ اس کے عین سامنے اس کی منگیتر نور العین اطمینان سے چارپائی پر بیٹھی ٹانگیں جُھلا رہی تھی۔ ظلِ شاہ کو لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ کسی بلند کوٹھے پر کھلی فضا میں چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تاروں سے بھرا آسمان سر پر تھا اور حبس کے سبب پسینا گردن پر بہہ رہا تھا۔ سامنے لگا پیڈسٹل فین گرمی کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بلند کوٹھے پر دو ہی چارپائیاں تھیں جن میں سے ایک پر وہ اور دوسرے پر نور العین بیٹھی ہوئی تھی۔

ظلِ شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نور کا اطمینان رخصت ہوگیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

”ظلی! تم ٹھیک تو ہو...... میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

ظلِ شاہ حیرت کے زیرِ اثر تھا۔ نور کا سوال نظرانداز کر گیا۔ ”ہم کہاں پر ہیں؟ اور یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“ اس نے نور کو چادر میں لپٹے اور چھوئی موئی بنا دیکھا تھا۔ اس قدر بے حجاب لہنگا، چولی میں اسے دیکھ کر ظلِ شاہ کو جھٹکا لگا تھا۔ یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت ہوا کا رخ بدلا تو دور کہیں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے گرنتھ پاٹ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ یہ نامانوس الفاظ تھے۔ وہ توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت اس کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ سسکاری سی لے کر اس نے سر تھام لیا۔

نور نے فوراً ہی اس کے سر کے نیچے ہاتھ دے کر اسے لیٹنے میں مدد دی اور بولی۔ ''تم ایک عذاب کا شکار ہو۔ دماغ پر کسی قسم کا زور مت دو دماغ پر زور ڈالتے ہی تمہاری یہ کیفیت ہو جاتی ہے اور تم کئی کئی دن خود سے بھی بیگانے ہو جاتے ہو۔ صرف اتنا جان لو کہ ہم ہندوستان میں ہیں اور تمہارے علاج کے لیے آئے ہیں۔'' سانس لینے کے لحاتی وقفے کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔

''میرا حلیہ حالات کے سبب ہے۔ میں تھوڑی دیر میں سب بتاتی ہوں۔ تم بس دماغ کو آزاد چھوڑ دو اور لمبے لمبے سانس لو۔''

ظلِ شاہ نے نقاہت کے عالم میں اس کی ہدایت پر عمل کیا تو درد کی شدت واقعی کم ہونے لگی۔ نور کی جادو اثر انگلیاں دھیرے دھیرے اس کی پیشانی سہلا رہی تھیں۔ وہ کزن اور منگیتر تھی مگر اس طرح کبھی بھی قریب نہیں آئی تھی۔ دونوں کے درمیان پسندیدگی کے باوجود ایک فاصلہ تھا۔ باہمی گفتگو خاندان کے ساتھ ہی علیک سلیک تک ہی تھی۔

ظلِ شاہ رفتہ رفتہ پُرسکون ہو گیا۔ اسی کیفیت میں اس نے نور کی آواز سنی۔

''تمہاری بیماری کا آغاز سالانہ میلے سے ہوا تھا جہاں ایک سنیاسی نے تمہیں ایک سکہ دیا تھا۔''

ظلِ شاہ کی دماغی اسکرین پر وہ منظر نمایاں ہو گیا۔ کھچڑی بالوں والا ایک دراز قامت سنیاسی اچانک ہی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ سنیاسی کی غلافی آنکھوں میں نہ جانے کون سی طاقت پوشیدہ تھی کہ ظلِ شاہ مسحور سا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست قربان علی بھی تھا۔

سنیاسی نے اپنی گدڑی میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ''یہ تھام شہزادے! یہ تیرے لیے پاتال سے آیا ہے۔''

سنیاسی کی پاٹ دار آواز کے ٹرانس میں اس نے وہ سکہ تھام لیا۔ ساتھ کھڑا قربان علی بھی جیسے ٹرانس کی کیفیت میں تھا۔

سکہ تھما کر سنیاسی پل بھر میں انسانوں کی بھیڑ میں غائب ہو گیا تھا۔

بعد میں قربان علی نے سکے پر نظر ڈالی تو وہ ڈر گیا۔ ''اسے پھینک دے یار! مجھے تو یہ کوئی خوفناک چیز لگتا ہے۔'' اس نے خوف سے باقاعدہ جھرجھری سی لی تھی۔

ظلِ شاہ ہنسا۔ ''اس میں خوفناک کیا ہے؟ یہ کوئی قدیم نوادرات لگتا ہے۔ لاہور میوزیم والے ضرور اس کے اچھے دام دیں گے۔'' وہ دوبارہ سے ٹھٹھا مار کر ہنسا تھا۔ ''اور تو نے سنا نہیں سنیاسی بابا نے کیا کہا تھا...... یہ میرے لیے پاتال سے آیا ہے۔''

قربان علی کے پاس چپ رہ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ظلِ شاہ نے سکہ جیب میں ڈال لیا اور گھر جا کر سو گیا تھا۔ اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا تھا...... مٹا مٹا سا ایک منظر تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی اور ہاتھ پر سکے والے نقرئی سانپ کا نظر آنا...... پھر کیا ہوا تھا؟ اس نے دماغ پر زور دیا تو دوبارہ درد کی ٹیسیں اٹھیں، وہ کراہ اٹھا۔

نور جو اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی، بولی۔ ''کہانہ دماغ پر زور نہ دو۔ تم ابھی مکمل ٹھیک نہیں ہوئے۔ میں، ساری تفصیل تمہیں بتا تو رہی ہوں...... گہرے سانس لو۔''

ظلِ شاہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

چند لمحے بعد نور دوبارہ گویا ہوئی۔ ''جیسے ہی وہ مخصوص سکہ تمہارے پاس آیا تم ہوش سے بیگانے ہو گئے۔ بابا سائیں نے تمہارا ''حساب'' کیا تو معلوم ہوا کہ تم ایک شیطان کے اثر میں آ گئے ہو اور تمہارا علاج ہندوستان میں ہمارے بزرگ شہید شاہ کی پہلی چلہ گاہ پر ہی ممکن ہے۔ حساب میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس چلہ گاہ کی طرف سفر صرف تم اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ہی کر سکتے ہو...... فوراً ہی ہمارا نکاح ہو گیا۔''

ظلِ شاہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

نور نے جھک کر فوراً اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ''سچ کہہ رہی ہوں ظلّی! تم ہوش میں ہوتے تو دیکھتے تمہاری خاطر میں نے کتنے کشٹ کھائے ہیں...... سمجھو آگ کے دریا سے گزری ہوں۔ یہاں بھی ہم غیر قانونی طور پر موجود ہیں۔ بھائی امجد بھی ہمارے ساتھ تھے مگر وہ بی ایس ایف والوں کے ہاتھ آ گئے ہیں...... میں بڑی مشکل سے تمہیں لے کر بھاگی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ آنسو بہانے لگی۔

پُرتپش قربت سے ظلِ شاہ پہلے ہی پگھل رہا تھا۔ اس نے نور کو بانہوں میں لے کر کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''تم جو کہہ رہی ہو وہ ناقابلِ یقین ہے مگر اور بھی تو سب ناقابلِ یقین ہے مگر حقیقت ہے...... تمہاری بات کو بھی میں حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔''

نور کے رونے کی رفتار بڑھ گئی اور وہ سسکیاں لینے

لگی۔ ظلِ شاہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔

''حوصلہ کرو! میں اب ہوش میں آ گیا ہوں نا۔ واپس پاکستان چلتے ہیں اور امجد بھائی کی رہائی کے لیے کوشش کرتے ہیں۔'' ساتھ ہی اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔''

نور نے فوراً سر اٹھایا۔ ''تم مکمل طور پر ہوش و حواس میں نہیں ہو...... یہ تو شہید شاہ کی دعا اور بابا سائیں کے سات تعویذوں نے اثر دکھایا ہے۔ میں نے ساتوں تعویذ تھوڑی دیر پہلے تمہیں پلائے ہیں۔ بابا سائیں نے کہا تھا کہ آخری تعویذ کے بعد تم قدرے ہوش میں آ جاؤ گے۔''

ظلِ شاہ نے اس کے آنسو انگلیوں کی پوروں سے صاف کیے۔ ''نہیں، میں مکمل حواس میں ہوں۔ ہمیں فوراً گھر......''

نور نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم سمجھ نہیں رہے...... یہ وقتی ہوش ہے...... تم نے دیکھا نہیں، ذہن پر ذرا سا زور ڈالتے ہی کیا حال ہو جاتا ہے۔ بابا سائیں نے مجھے پوری تفصیل سمجھا دی ہے۔ چند دنوں میں ہم شہید شاہ کی چلہ گاہ پر حاضر نہ ہوئے تو خدانخواستہ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ وہاں حاضری بے حد ضروری ہے۔ چند دنوں میں ہم واپسی کی راہ لیں گے اور تم بھی مکمل طور سے صحت یاب ہو گے۔''

ظلِ شاہ کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر نور کی آنکھیں دوبارہ سے ڈبڈبانے لگیں۔ ''ظلی! میری خاطر...... صرف میری خاطر، میں جو کروں کرنے دو، اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ تمہیں پا کر میں اب کھونا نہیں چاہتی۔ تم ابھی نہیں جان سکتے کہ ہم کتنے بڑے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

ظلِ شاہ کے جسم کا تناؤ ختم ہو گیا۔ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے نور کی آنکھیں چومیں۔ ''ٹھیک ہے، جیسا تم کہو۔''

نور بڑے جذب سے اس کے گلے لگ گئی۔ کچھ جذباتی لمحات گزرے تو ظلِ شاہ نے پوچھا۔

''یہ ہم کس کے گھر موجود ہیں؟''

''امجد بھائی کے ایک دوست کے کوئی تعلق واسطے والے ہیں۔ نہال سنگھ ان کا نام ہے اور بڑے ہمدرد اور ملنسار ہیں۔ انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ امجد بھائی کی رہائی کے لیے بھی وہ بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔''

اس کے بعد نور نے اس کا منہ بند کر دیا۔ ظلِ شاہ ہوش و حواس میں اپنی شادی شدہ زندگی کی پہلی رات گزار رہا تھا۔

☆☆☆

سائیں قاسم سے تفصیلی ملاقات کے بعد انسپکٹر ماجد خان...... بصیر شاہ کے سامنے اس کی اوطاق میں بیٹھا تھا۔ بصیر شاہ ادھیڑ عمر کا تھا مگر چند ہی ہفتوں میں جو سانحات اس نے دیکھے تھے انہوں نے یک دم اس کی عمر میں کئی سال کا اضافہ کر دیا تھا اور اس کے کندھے جھک گئے تھے۔

سادہ سے صوفوں کے درمیان میز پر چائے اور بادامی حلوہ رکھا تھا۔ ماجد خان نے ایک چمچ حلوے کا حلق سے اتارتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

''شاہ جی! میں دنیادار سا بندہ ہوں۔ شاید میرے منہ سے یہ سننا آپ کو عجیب لگے کہ آپ کا بیٹا ظلِ شاہ کسی شیطانی چکر میں الجھ گیا ہے جو فعل اس نے انجام دیا ہے وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں دیا۔''

بصیر شاہ بری طرح سے چونکا۔ ''آپ نے یہ رائے کس بنیاد پر قائم کی ہے؟''

ماجد خان نے چائے کا کپ اٹھایا۔ ''یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ ایک اللہ والے کی حتمی خبر ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ غلط نہیں ہو سکتی۔''

بصیر شاہ کے تاثرات پر ایک نظر ڈال کر ماجد خان نے مزید کہا۔ ''معاملہ صدیوں پرانا ہے۔ آپ کے جدِ امجد شہید شاہ سرکار نے ایک شیطانی قوت کو باندھا تھا۔ اسی کا ایک پیروکار اب اس قوت کو آزاد کروانے کے درپے ہے۔ اس مکروہ پیروکار کو شہید شاہ سرکار کی خالص لڑی (نسل) میں سے ایک مخصوص خصوصیات کا نوجوان درکار ہے۔ قسمت کا کھیل کہہ لیں...... ظلِ شاہ میں وہ مخصوص خصوصیات موجود ہیں جس کے سبب اسے نشانہ بنایا گیا ہے۔''

بصیر شاہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اُس کے چہرے پر جے تفکر میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ شاید یہ احساس طمانیت کا باعث تھا کہ اس...... نے جو کیا، اپنے ہوش و حواس میں نہیں کیا۔ اسی احساس کے ساتھ اس نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ نے جو بتایا ہے، اس کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اچھائی اور برائی کی دو متوازن دنیاؤں سے ہمارا خاندان بخوبی واقف ہے۔ ہمارے بزرگوں کی ہاتھ سے لکھی ایک قدیمی کتاب میں جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس واقعے کا ذکر موجود ہے۔''

ماجد خان نے دلچسپی لی مگر مخل نہیں ہوا۔ بصیر شاہ کہہ رہا تھا۔

''شیطانی قوتوں سے محفوظ رہنے کے لیے نسلوں سے

ہمارے خاندان میں فجر کی نماز کے بعد کا ایک خاص ورد چلا آرہا ہے۔ ہم سختی سے اس پر کاربند ہیں مگر ظل خودسر تھا۔ اکثر کوتاہی کر جاتا تھا۔'' اس نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ''میں سختی کرتا تھا تو اس کی ماں آڑے آجاتی تھی...... ہائے یہ کیا ہوگیا۔ ہمارا خاندان ٹوٹ گیا۔ بھتیجے اور میرے بیٹے اب خونی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ آپ خدا کے لیے یہ معاملہ میرے بڑے بھائی کے علم میں بھی لائیں...... ممکن ہے خونی کدورت کچھ کم ہوجائے۔'' ساتھ ہی اس کے چہرے پر غم کی اندوہناک پرچھائیں اتر آئی۔

''پتا نہیں میرا بیٹا کس حال میں ہوگا؟ اس کی ماں کو تو میں نے سوتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کی نگاہ ہر وقت دروازے پر لگی رہتی ہے۔'' ساتھ ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے کندھے پر رکھا سرخ رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔

ماجد خان نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''حوصلہ رکھیں شاہ جی! اچھائی کی طاقت ہماری پشت پر ہے۔ آپ کے بھائی کو بھی ضرور میری بات سمجھ آجائے گی۔ ظل شاہ کو بھی میں خیریت سے واپس لے آؤں گا۔''

بصیر شاہ نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا...... آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب کرے...... آپ نے گفتگو کے آغاز میں بھی ایک اللہ والے بزرگ کا ذکر کیا تھا...... اگر اجازت ملی ہوئی ہے تو پردہ ہٹادیں۔''

ماجد خان نے دوبارہ سے کپ اٹھا لیا۔ ''کیوں نہیں...... وقت آنے پر ضرور پردہ ہٹ جائے گا بلکہ ملاقات بھی ممکن ہوسکتی ہے۔'' فی الحال تو آپ سے کچھ معلومات درکار ہیں۔''

''میں حاضر ہوں اور آپ حلوہ تو لیں...... اسے تو چکھا تک نہیں آپ نے۔''

''نہیں کھا رہا ہوں۔'' ماجد خان نے حلوے کا چائے کے درمیان ہی ایک چمچ لیا۔ بصیر شاہ کی سوالیہ نظریں اس پر تھیں۔ ماجد خان نے پوچھا۔ ''آپ نے ظل شاہ میں بھتیجے اور بھاوج کے قتل سے پہلے کسی قسم کی تبدیلی محسوس کی تھی؟''

بصیر شاہ سوچ میں ڈوب گیا۔ شیطانی چکر کے درمیان آتے ہی سوچ کے نئے دروازے کھل گئے تھے۔ سالانہ میلے کے دوران سنیاسی والا واقعہ اس کے علم میں تھا مگر پہلے اس نے اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ظل شاہ...... اس ڈھونگی سنیاسی کے جھانسے میں نہیں آیا تھا مگر اب شیطانی چکر کے ساتھ ہی یہ واقعہ اہمیت اختیار کرگیا تھا۔

ظل شاہ نے اس واقعے کے اگلے دن ہی چاچی اور کزن کو نامعلوم وجوہات کے سبب رات کے آخری پہر گھر میں گھس کر قتل کردیا تھا۔ اس نے ہیجانی انداز میں اس واقعے کے بارے میں ماجد خان کو بتایا جس کے بعد ظل شاہ میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔

سکے کا ذکر سنتے ہی ماجد خان بھی بری طرح سے چونکا۔ اس کے تصور میں ڈاکوؤں سے برآمد ہونے والا شیطانی سکہ آگیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ نے وہ سکہ دیکھا تھا جو سنیاسی نے ظل شاہ کو دیا تھا؟''

بصیر شاہ نے نفی میں سر ہلایا تو ماجد خان نے مزید پوچھا۔

''کسی اور نے؟''

''ہاں، ظل کے ساتھ اس کا دوست تھا۔ سکے کے بارے میں وہی لوگوں کو بتاتا پھرتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد کپکپاتا ہوا قربان علی اوطاق میں حاضر ہوچکا تھا۔ بہتر معلومات کے حصول کے لیے ماجد خان نے پہلے تو نرم گفتگو سے اس کے دل سے پاکستان پولیس کا روایتی خوف کم کیا اور پھر کرید کرید کر اس سے سوالات پوچھنے لگا۔

صورتِ حال تیزی سے واضح ہونے لگی۔ شیطانی کھیل کا آغاز یقیناً اس منحوس سکے کے ظل شاہ کی جیب میں آنے کے بعد شروع ہوا تھا۔

قربان علی سے سنیاسی کے حلیے اور اس کے بعد شیطانی سکے کی جزئیات کے بارے میں جانتے ہوئے ماجد خان کو لگا کہ یہ ایک جیسے کئی شیطانی سکے تھے۔ ایک ظل شاہ کے پاس آیا تھا اور دوسرا ڈاکوؤں نے ایک پاگل سے نوجوان سے چھینا تھا۔ اچانک ہی ایک نئے خیال نے اسے چونکایا اور ظل شاہ پر بھی تو پاگل پن کی کیفیت طاری تھی اور وہ بگولے کے مانند چکراتا پھرتا تھا۔ کہیں یہ وہ سکہ تو نہیں تھا اور وہ پاگل سا نوجوان کہیں ظل شاہ تو نہیں تھا۔

اگلے چند منٹوں میں بصیر شاہ کی جیپ پوری رفتار سے تھانہ نواں کوٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بصیر شاہ خود تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر ماجد خان اور عقبی نشست پر قربان علی دبکا بیٹھا تھا۔

ڈاکو اور قربان علی آمنے سامنے آئے۔ قربان علی نے جو حلیہ بیان کیا تھا، اس کی ڈاکوؤں نے تصدیق کردی۔ بلاشبہ ڈاکوؤں نے وہ سکہ ظل شاہ ہی سے چھینا تھا۔

ماجد خان اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کا پورا وجود

سنسنا رہا تھا۔ قربان علی نے اس منحوس سکّے کو ہاتھ میں لے کر بھرپور توجہ سے دیکھا تھا۔ وہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر بتا رہا تھا کہ سکّے پر دو ننھے ننھے نقرئی سانپ بھی تھے جو ابھرے ہوئے تھے اور انگلی پھیرنے پر واضح محسوس ہوتے تھے مگر ماجد خان کے ہاتھ جو سکہ آیا تھا اس پر سانپوں والی جگہ خالی تھی۔ یہاں آ کر معاملہ الجھ گیا تھا۔ سکہ وہی تھا تو پھر سانپ کہاں گئے؟

سائیں قاسم سے مزید رہنمائی ضروری تھی مگر ان سے ملاقات کا وقت مغرب اور عشا کا درمیانی وقت تھا یا پھر صبح فجر کے بعد کا...... فی الحال سکّے والے معاملے کو روک کر سائیں قاسم سے حاصل ہونے والی معلومات اور ہدایات کی روشنی میں قربان علی کو کمرے سے باہر بھیج کر اس نے بصیر شاہ سے پوچھا۔

''آپ کے خاندان میں جو قدیمی اور قلمی کتاب چلی آرہی ہے...... کیا وہ ایک دن کے لیے مجھے مل سکتی ہے؟''

بصیر شاہ کے چہرے پر تردّد جھلکا۔ ''اس کے لیے خاندان کے بزرگوں کا مل بیٹھنا ضروری ہے...... ممکن ہے بھائی صاحب، میرے ساتھ......''

اس کے ادھورے فقرے کا مفہوم سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

ماجد خان نے کہا۔ ''یہ مسئلہ میں حل کرلوں گا...... وہ کتاب کس کی تحویل میں ہے؟''

''کتاب سمیت دیگر خاندانی تبرکات ہمیشہ سے سائیں شہید کے آستانے کے متولی کے پاس رہتے ہیں اور متولی بھائی صاحب ہیں۔''

ماجد خان بولا۔ ''تو پھر نسل در نسل آنے والی ایک خاص چابی بھی انہی کے پاس ہوگی؟''

بصیر شاہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''ہاں، تبرکات میں ایک لمبی سی پیلی چابی ہے تو سہی...... اس چابی کا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

ماجد خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''کالی طاقتوں کو وہ چابی، ظلِ شاہ سمیت چاہیے...... اس چابی کی حفاظت کا کیا انتظام ہے؟''

بصیر شاہ بولا۔ ''وہ چابی دیگر تبرکات سمیت ایک تجوری میں ہے۔ تجوری ایک خاص ''کڑے'' میں ہے۔ ہمارا خون ہی صرف اس تجوری کو چھو سکتا ہے۔'' اچانک ہی ایک خیال نے بصیر شاہ کو لرزا دیا۔

''کک...... کہیں...... ظل، اسی چابی کے لیے تو بھائی صاحب کے گھر نہیں گھسا تھا؟ شیطانی طاقت نے اسے مجبور......'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ماجد خان اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا...... یہ خیال اس کے دماغ میں کیوں نہیں آیا۔ اگر ظل شاہ وہ چابی لے جانے میں کامیاب ہوگیا تو شیطانی طاقتیں بہت بڑی کامیابی حاصل کرچکی تھیں۔ وہ ہیجان خیز انداز میں بولا۔

''مجھے فوراً بڑے شاہ جی کے پاس جانا ہے۔''

''ان کے دروازے تک تو میں لے جاؤں گا۔''

واپسی کا سفر پہلے سے بھی تیز رفتار تھا۔

نصیر شاہ پچاس برس سے اوپر کا تھا۔ خضاب زدہ داڑھی، مونچھوں کے نیچے سے سفیدی جھانک رہی تھی۔ بھاری بدن اور وزنی پپوٹوں کے سبب وہ روایتی پیر ہی نظر آتا تھا۔ ماجد خان کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں مگر جیسے جیسے وہ، ماجد خان کو سنتا گیا، اس کا جسم لرزنے لگا اور تیوریاں ایک خوف آمیز فکرمندی میں ڈھل گئیں۔

ماجد خان چپ ہوا تو نصیر شاہ نے لرزتے ہاتھوں سے گلاس میں پانی انڈیلا اور حلق میں اتار کر بولا۔

''انسپکٹر صاحب! جو آپ نے کہا ہے، وہ حقیقت سے دور نہیں لگ رہا۔ تجوری کی چابی میری مرحومہ بیوی کے پاس ہوتی تھی اور میرا معصوم بیٹا بھی ماں کے کمرے میں سوتا تھا۔ میری بیوی کو سانس کی تکلیف تھی۔ اسے اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔'' بیوی اور بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

ماجد خان نے بےچینی سے کہا۔ ''اس واقعے کے بعد آپ نے تجوری کو چیک کیا تھا؟''

نصیر شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس طرف تو کسی کا دھیان نہیں گیا۔ ہمیں لگا تھا کہ وہ کم بخت......'' یہاں اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔ اندرونِ خانہ بھی کا یہی خیال تھا کہ ظل شاہ اپنی منگیتر نورالعین سے ملنے آیا تھا۔

ماجد خان نے ادھورے فقرے کی وضاحت مانگنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے کہا۔

''آپ فوراً تجوری چیک کریں اور مجھے بھی اجازت دیں کہ اس موقع پر میں بھی موجود ہوں۔''

نصیر شاہ قدرے متردّد ہوا مگر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے رضامندی کے طور پر اثبات میں سر ہلایا اور ایک دبیز پردے کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔

ماجد خان اس خوب آراستہ اوطاق میں بےچینی سے ٹہلنے لگا۔

نصیر شاہ کی واپسی کچھ ہی دیر میں ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں کئی دندانوں والی بڑی سی چابی تھی اور یہ چابی ایک سیاہ ڈوری سے منسلک تھی۔ ڈوری میں ایک چرمی تعویذ بھی نظر آرہا تھا۔ یقیناً یہ چابی کوئی گلے میں ڈالے رکھتا تھا۔

نصیر شاہ، اسے لے کر ایک اندرونی کمرے میں آیا۔ نواڑی پلنگ کے ساتھ ایک رنگین پایوں والی چارپائی پر بھی بستر لگا ہوا تھا۔ دونوں مقتول اسی کمرے میں قتل ہوئے تھے۔ ماجد خان پہلے بھی اس کمرے میں آچکا تھا مگر اس دفعہ اس کی توجہ کا محور و مرکز ایک دیوار گیر بے حد مضبوط نظر آنے والی بڑی سی تجوری تھی۔ تجوری کی طرف بڑھتے ہوئے ماجد خان کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

نصیر شاہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ تجوری کی طرف بڑھا۔ ماجد خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر میں تجوری کے در وا ہوگئے۔ اندر سے عطر کی خوشبو میں ملی قدیم اشیا سے اٹھنے والی مہک نکلی تھی۔ ماجد خان نے جو پہلا منظر دیکھا، وہ درجن بھر سبز اور سرخ شنیل کی پوٹلیاں تھیں جن کے منہ سیاہ ڈوریوں سے بندھے تھے اور ہر ڈوری سے چرمی تعویذ بھی منسلک تھے۔ یہ پوٹلیاں بے ترتیب تھیں۔ جیسے انہیں افراتفری میں الٹا پلٹا گیا ہو۔ یہ بے ترتیبی دیکھ کر نصیر شاہ کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ اس نے پاگلوں کی طرح پوٹلیوں کو اِدھر اُدھر ہٹایا۔ پوٹلیوں کے نیچے سے لکڑی کا ایک تین فٹ چوڑا بکس نمودار ہوا جس کے اوپر چوکھٹے میں شیشہ لگا ہوا تھا مگر یہ شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اندر سبز کپڑے اور سنہرے حاشیے والے غلاف میں ملفوف ایک کتاب نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نصیر شاہ سر پکڑ کر تجوری کے پاس ہی نیچے بیٹھ گیا۔

ماجد خان نے بھی افسردگی کے عالم میں سر جھٹکا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے کیا سننے کو ملے گا۔ نصیر شاہ نے رُندھے لہجے میں کہا۔ ”وہ کم بخت چابی لے گیا ہے۔“

اس کے بعد ماجد خان کے پاس وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ اب اسے ہر صورت ظلِ شاہ تک رسائی چاہیے تھی۔

نصیر شاہ کو اس نے قدیم قلمی کتاب ساتھ لے جانے کے لیے کیسے منایا...... یہ وہی جانتا تھا۔ بہرحال وہ چوبیس گھنٹے کے لیے کتاب کو ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

واپسی کے سفر میں اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ شیطانی طاقتوں کو روکنے میں ہی انسانیت کی بھلائی تھی اور یہ کوشش ظلِ شاہ کو روک کر ہی کامیاب ہوسکتی تھی۔

مغرب کی نماز کے فوراً بعد وہ سائیں قاسم کے حجرے میں تھا۔ سائیں نے کہیں سے ایک پرانی سی دُھندلے شیشوں والی عینک نکالی اور اسے ناک پر لٹکا کر بلب کے عین نیچے بیٹھ کر وہ کتاب احتیاط سے کھول لی۔

کتاب کا بیرونی کور گتے کا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی مستقبل قریب میں جلد بندی ہوئی ہے۔ کتاب کے اوراق بوسیدہ سے باریک چمڑے کے تھے جن سے قدرے ناگوار سی بُو اٹھ رہی تھی۔ چمڑے کے اوراق پر کالی سیاہی اور قلم سے باریک تحریر.... نظر آرہی تھی۔ اس دور میں پاکستان میں فارسی اجنبی نہیں تھی۔ ماجد خان کو اندازہ ہوگیا کہ یہ فارسی یا فارسی سے ملتی جلتی ہی کوئی زبان تھی۔

سائیں بڑی احتیاط سے چرمی کتاب کے صفحے پلٹ رہے تھے۔ کسی کسی صفحے پر وہ ٹھہر بھی جاتے تھے۔ پھر ایک صفحے پر وہ رک گئے اور جھک کر دھیان سے کچھ پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے صفحہ پلٹا۔ ان کے چہرے پر گمبھیرتا نمودار ہوگئی تھی اور پیشانی کے درمیان ایک رگ پھڑکنے لگی تھی۔

مزید کچھ دیر وہ مطالعے میں غرق رہے پھر ایک طویل سانس لے کر انہوں نے کتاب بند کی اور اسے دوبارہ سے غلاف میں لپیٹنے لگے۔

ماجد خان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ سائیں کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔ سائیں کی خاموشی طویل ہو رہی تھی۔ وہ گہری فکر انگیز سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لمبے وقفے کے بعد انہوں نے دوبارہ طویل سانس لیا اور بولے۔

”صورتِ حال بے حد گمبھیر ہے۔ ہر دو صدیوں بعد شیطان کی اس خاص چیلی کا دل زندہ ہوجاتا ہے۔ وہی چیلی جو ظلمت کی ملکہ ہے۔“

ماجد خان دھیان سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ سائیں کہہ رہے تھے۔

”اس کا دل زندہ ہونے کے بعد پہلی اماوس کی رات بدی کی طاقتوں کے لیے سب سے اہم ہوتی ہے۔ اس رات کی چند خاص گھڑیوں میں ہی اس عذاب خانے کو شہید سرکار کے باندھے بندھنوں سے آزاد کروایا جاسکتا ہے اور وہ بندھن صرف شہید سرکار کے خاندان کا کوئی ایسا نوجوان کھول سکتا ہے جو نہ صرف قدرتی طور پر شہید سرکار سے مشابہت رکھتا ہو بلکہ اس کے دائیں کندھے پر تلوں کا ایک

جھرمٹ بھی ہو...... شہید سرکار کے دائیں کندھے پر بھی ایسا جھرمٹ تھا۔ شیطان کی پجاری نے یقیناً ان نشانیوں کی تصدیق کے بعد ہی ظل شاہ کو منتخب کر کے نشانہ بنایا ہے۔"

سائیں نے سانس لینے کے لحاتی وقفے کے بعد کہا۔

"ہمارے پاس وقت کم ہے۔ شیطانی طاقتیں صدیوں سے ظلمت کی اس ملکہ کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہی ہیں مگر اس دفعہ ان کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہیں...... ہمیں ظل شاہ تک پہنچنا ہوگا۔ اس کی زندگی کو بھی شدید خطرات لاحق ہیں۔ بندھن کھولتے ہی اس کے خون سے ظلمت کی ملکہ کی پیاس بجھے گی تو اس کا جسم کھوئی ہوئی ساری طاقتیں حاصل کر پائے گا۔ آنے والی اماوس کی رات خاص الخاص ہے۔ یہ خیریت سے گزر گئی تو پھر اگلی دو صدیوں تک خطرہ ٹل جائے گا۔"

سائیں کے خاموش ہوتے ہی ماجد خان نے کہا۔

"لیکن سائیں...... اب ظل شاہ کو کہاں ڈھونڈیں؟ پولیس اور مخبر ہر طرف اس کی بُو لیتے پھر رہے ہیں مگر اس کا ذرا سا بھی کھوج کُھرا نہیں مل رہا۔ وہ ایسے غائب ہے جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہو۔"

سائیں کا چہرہ کسی ان جانی تپش سے تمتما اٹھا، بولے۔ "وہ شیطانی طاقتوں کے زیر اثر ہے۔ منحوس سکے کو حصار کرنے کے بعد اگرچہ وہ طاقتیں کافی کمزور پڑ گئی ہیں مگر ان کے ترکش میں تیروں کی کمی نہیں ہے۔ تم ظِل شاہ کو سرحدی علاقوں میں تلاش کرو، اس کی منزل سرحد پار بھوج پور ہے۔ وہ ہر صورت سرحد پار کرے گا۔"

یہ سنتے ہوئے ماجد خان کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا۔ ظِل شاہ پہلے بھی تو کھوکھراپار، موناباؤ بارڈر سے ہی گرفتار ہوا تھا۔ اب بھی وہ سرحد پار کرنے کی کوشش میں ہوگا۔ اس نے نیازمندی سے کہا۔

"سائیں مجھے اجازت دیں۔ معاملہ ایس پی صاحب کے علم میں لانا ضروری ہے۔ وہی سرحدوں پر ظل شاہ کو جکڑنے کے لیے کچھ......" ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بے حد گونج دار پھنکار گونجی۔ یہ پھنکار مسجد کے باہر سے آئی تھی مگر بے حد بلند تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا اور مہیب اژدھا پھنکارا تھا۔ پھنکار دوبارہ گونجی تو ماجد خان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر سائیں کی طرف دیکھا۔ دوبارہ نظر ڈالنے کی اسے جرأت نہیں ہوئی۔ سائیں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی اور منہ ہی منہ میں کوئی وِرد کرنے لگے۔

پھنکاروں کی شدت لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگی اور پھر ایسے لگا جیسے ہزاروں سانپ مل کر پھنکار رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی حجرہ بھی لرزنے لگا۔ سائیں نے ہاتھ بڑھایا۔ ان کے وِرد میں بھی تیزی آگئی تھی۔ ماجد خان نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی حجرہ جیسے زلزلوں کی زد میں آگیا تھا۔ ماجد خان نے سائیں کی تسلی آمیز آواز سنی۔

"گھبرا نہیں، اس حجرے میں دنیا کے سبھی شیطان زادے مل کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

ماجد خان کو ڈھارس بندھی۔ اس نے سائیں کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

پھنکاروں اور زلزلوں کے درمیان اچانک ہی حجرے میں خنکی بڑھنے لگی اور رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ ماجد خان کے دانت بجنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اچانک ہی زلزلہ اور پھنکاریں یکلخت ہی دم توڑ گئیں۔ شدید ترین خنکی بدستور قائم تھی۔ حجرے میں غیر فطری سا سناٹا گونجنے لگا۔

سائیں کا وِرد بدستور جاری تھا۔ ماجد خان کا ہاتھ پکڑے وہ حجرے سے باہر نکلے تو ماجد خان کو حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ مسجد کے صحن کے سامنے ایک آسمان کو چھوتا برف پوش پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ تیکھے اندھیرے میں برف کی سپیدی نمایاں تھی اور یخ بستہ ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔

ماجد خان کپکپاتے ہوئے مسجد کے دروازے کی طرف بڑھا۔ سائیں بھی اس کے ساتھ تھے۔ دروازے کے دوسری طرف لق و دق برف زار تھا۔ اس نے سائیں کی طرف دیکھا۔ سائیں کے چہرے پر سنجیدگی کی تہ جیسے جم رہی تھی اور آنکھیں جیسے دور بہت دور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ پھر فضا میں ایک مکروہ قہقہہ گونجا اور ایک پھنکارتی آواز سنائی دی۔

"میرے داسیکو کا واپسی کا دروازہ بند کرنے والے پر اب دنیا کا ہر دروازہ بند ہوگیا ہے۔"

سائیں نے اچانک ہی مسجد کے دروازے کے باہر تھوک دیا۔ یقین ایسے محسوس ہوا جیسے یہ لعاب آگ پر گرا ہو۔ چرچراہٹ سی ابھری تھی۔ سائیں نے بلند آواز سے کہا۔

"سارے دروازے بند کر کے تو نے جو در کھولا تھا، وہ تجھے سیدھا جہنم میں لے جائے گا۔"

جواب میں پھنکارتی آواز نے کہا۔ "دیکھ لوں گا۔"

ماجد خان نے محسوس کیا کہ اس آواز میں اب تکلیف کا عنصر نمایاں ہوگیا تھا۔

سائیں نے ماجد خان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "مسجد

کے دروازے کے باہر بھول کر بھی قدم نہ رکھنا اور صفیں وغیرہ سیدھی کر کے وقت پر اذان دے...... ممکن ہے نمازی آجائیں۔''

ماجد خان کو یہ پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا کہ اس برفیلے ویرانے میں نمازی کہاں سے آئیں گے۔ وہ ٹھٹھرتا ہوا مسجد کے ہال نما کمرے کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

مال بردار ٹرین پٹریوں پر کھڑکھڑاتی ہوئی سست رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ اسی کے ایک ڈبے میں اجناس کی بوریوں کے درمیان ظل شاہ اور نور دبکے ہوئے تھے۔ گرمی اور حبس سے دونوں کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ ٹرین کی روانگی کے چند گھنٹوں بعد ہی ظل شاہ نے اٹھ کر بوگی کا دروازہ تھوڑا سا کھول دیا جس کے سبب گرمی اور حبس کی کیفیت میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی تھی۔ ان دونوں کی منزل بھوج پور تھا۔

ان کے میزبان سردار جی نے ریلوے کے دو اہلکاروں کی مدد سے ان دونوں کو چھپا کر اس مال بردار ٹرین میں سوار کروا دیا تھا۔ اس ٹرین نے بھوج پور میں کافی سامان اتارنا اور چڑھانا تھا۔ سردار جی نے انہیں کچھ رقم بھی دی تھی اور یہ تسلی بھی کروائی تھی کہ وہ بہت جلد نور کے بھائی کو بی ایس ایف والوں کی گرفت سے نکال کر اپنے پاس ہی رکھے گا۔ بھوج پور سے واپسی پر ان تینوں کو بحفاظت سرحد پار کروانے کی بھی اس نے یقین دہانی کروادی تھی۔

سفر کے دوران نور نے بڑی تفصیل سے ظل شاہ کو بتایا تھا کہ اس کے بابا سائیں نے اسے اور امجد کو بھوج پور کے نواح میں واقع اس قدیم کھنڈرات کی چیدہ چیدہ نشانیاں بتا دی تھیں۔ قدیم کھنڈر میں ہی شہید شاہ کی پہلی چلہ گاہ واقع تھی۔ نور کا کہنا تھا کہ امجد بھائی کی غیر موجودگی میں وہ ان نشانیوں کی مدد سے ظل شاہ کو ان کھنڈرات میں واقع چلہ گاہ تک آسانی کے ساتھ لے جائے گی۔

آگے کی تفصیلات جانتے ہوئے ظل شاہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ایک پتھر کی مورتی کو زنجیروں سے آزاد کرنے کا میری بیماری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

نور نے فوراً کہا۔ ''بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس مقدس و متبرک جگہ پر بعد میں ایک شیطانی مندر تعمیر ہو گیا ہے۔ وہاں شیطان کی پوجا ہوتی ہے۔ زنجیریں کھول کر ہم اس مورتی کو باہر نکالیں گے تو اس مقدس چلہ گاہ کا تقدس بحال ہوگا اور اس کی برکت سے تم پر جو شیطانی عمل ہوا ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔''

اُلجھن نے زور پکڑا تو دوبارہ سے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے خود کو فوراً ہی حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ نور کی انگلیاں اس کے بالوں میں سرسرانے لگیں۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

اچانک ہی ٹرین کو جھٹکا لگا اور اس کی رفتار تیزی سے کم ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں بریک لگا اور ٹرین رک گئی۔ ظل شاہ نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ رات کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ دونوں اٹھ کر دروازے میں آگئے۔ اندازہ تھا کہ کسی کراسنگ کے سبب ٹرین اس ویرانے میں رکی تھی۔ آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو سامنے ریت کے ٹیلے نظر آئے۔ ٹرین کسی ریگستان میں رکی تھی۔ کچھ دیر مزید گزری تو انجن کی مخصوص تھرتھراہٹ بھی دم توڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ انجن بند کر دیا گیا تھا۔

ظل شاہ نے سر باہر نکال کر اِدھر اُدھر جھانکا اور تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔ نیچے گارڈ وغیرہ بھی نہیں اترے اور انجن بھی بند کر دیا گیا ہے۔''

اس کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ اسے زوردار جھٹکا لگا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کر باہر کھینچا ہو۔ وہ باہر ریت پر جا گرا۔ اسی وقت اس نے ایسی آواز سنی جیسے ہوا فرانٹے بھر رہی ہو مگر ہوا تو رکی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے باہر کھینچنے والا بھی نظر نہیں آرہا تھا پھر اس نے ریت کے ایک بڑے بگولے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ نور بھی پریشان ہو کر دروازے میں آگئی تھی۔ اسی وقت تک وہ ریت کا بگولا ظل شاہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چکراتا ہوا بگولا اسے اپنے ساتھ اڑا لے گیا۔ ظل شاہ نے بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارے مگر ہوا کی بے پناہ طاقت کے سامنے وہ بے بس ہو گیا۔ حقیر تنکے کے مانند وہ اُڑنے لگا تھا۔ اسی وقت اس کے سر میں ٹیسیں اٹھیں اور درد کی شدت اچانک ہی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں اور درد کی شدت سے وہ بے حال ہو گیا۔ اس کیفیت میں بھی اسے نور کا خیال آیا۔ شدید پریشانی اور فکر نے دل کو جکڑ لیا مگر بے بسی سے پھڑپھڑانے کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ سر کا درد حد سے بڑھا تو وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو بدستور اندھیرے کا راج تھا۔ وہ

ریت پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ صحرا کی ریت دن بھر کی تپش کے بعد فرحت انگیز خنکی اوڑھے ہوئے تھی۔ ہوش میں آتے ہی اسے پہلا احساس شدید پیاس کا ہوا۔ منہ خشک ہونے کے سبب زبان چمڑے کے خشک ٹکڑے کے مانند محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مایوس ہو کر اس نے دوبارہ سر ریت پر رکھ دیا۔ ریت کی خنکی بڑی بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اچانک ہی نور کا خیال آیا تو دل جیسے مٹھی میں جکڑا گیا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ ریت کا بگولا بھی یقیناً کوئی شیطانی چکر ہی تھا جس نے اسے، نور سے جدا کر دیا تھا۔ اس کا ذہن دوبارہ سے الجھنے لگا۔ آخر وہ ہی کیوں اس شیطانی چکر میں پھنسا تھا؟ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟ جیسے ہی دماغ کا استعمال شروع ہوا درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے دماغ کو جکڑ لیا ہو۔ اس نے فوراً نور کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دماغ کو آزاد چھوڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کیفیت اعتدال پر آ گئی۔

پیاس کی شدت حلق سے سینے میں اتری تو وہ سینہ مسلنے لگا۔ سینہ مسلتے ہوئے اس کا ہاتھ کسی ٹھنڈی دھات سے ٹکرایا تو وہ چونک گیا۔ اس نے ٹٹولا تو سیاہ ڈوری سے منسلک ایک بڑی سی چابی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ سیاہ ڈور اس کے گلے میں پڑی تھی اور اس سے چرمی تعویذ بھی منسلک تھا۔ چابی کو تھام کر وہ اسے حیرت سے تکنے لگا۔ یہ چابی اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ نسل در نسل آنے والے خاندانی تبرکات کا حصہ تھی۔ سالانہ عرس کے موقع پر ان تبرکات کو عام زائرین کے لیے کھول دیا جاتا تھا مگر یہ چابی اس کے پاس کہاں سے آئی؟ وہ چابی کو تھامے حیرت سے سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ میں غلطاں تھا تو سر میں درد اٹھا۔ اس نے فوراً چابی کو چھوڑ دیا اور دوبارہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس دفعہ وہ کامیاب ہو گیا اور اٹھ بیٹھا۔ اچانک ہی اس کے کانوں میں اذان کی آواز پڑی۔ توانائی کی ایک لہر تھی جو اس آواز کے ساتھ اس کے وجود میں اترنے لگی تھی۔

☆☆☆

ماجد خان اذان دے کر فارغ ہوا تو اس کا سردی سے بُرا حال تھا۔ اب تک اس نے جو دیکھا تھا، وہ عقل کی کسی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تھا مگر عقل کی دسترس سے باہر بھی تو کئی دنیائیں تھیں۔ وہ یقیناً ایسی ہی کسی دنیا میں تھا۔ نیکی اور بدی کی طاقتوں کی ابدی کشمکش اس پر آشکار ہو گئی تھی۔ سردی سے بچنے کی غرض سے اس نے ایک دری نما صف کا بوسیدہ سا ٹکڑا اوڑھ لیا۔ باہر فرش پر سائیں قاسم آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور ان کی انگلیاں تسبیح پر گردش کر رہی تھیں۔ وہ اپنے مخصوص لباس تہبند اور کُرتے میں تھے مگر ایسے محسوس ہوتا تھا اس برفیلے موسم سے وہ بے نیاز تھے۔ ان کی آنکھیں اپنے حلقوں میں جیسے دہکنے سی لگی تھیں۔ اس لمحے ماجد خان کو ان سے انجانا سا خوف محسوس ہوا۔

اس وقت مسجد کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ماجد خان نے بے اختیار سر گھمایا۔ تین افراد جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ ماجد خان نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں مگر یہ نگاہوں کا دھوکا نہیں تھا۔ وہ تینوں موجود تھے۔ تینوں ہی سفید لبادوں میں ملبوس تھے اور باریش تھے۔ ان میں ایک بزرگ نمایاں تھے۔ ان کی داڑھی کے سفید بال بے حد چمک دار تھے اور چہرے کی چمک نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔ ماجد خان کے دل میں احترام نے جنم لیا۔ سائیں بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کے چہرے پر مسرت چمکنے لگی تھی۔

آنے والے بزرگ نے پاٹ دار آواز میں سلام کیا۔ سائیں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے جھک کر ان کے گھٹنوں کو چھوا۔ بزرگ نے مسکراہٹ کے ساتھ ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ماجد خان نے بھی تقلید کی۔ بزرگ کے گھٹنوں کو چھوتے ہوئے ایک الوہی سی خوشبو نے اس کے دل و دماغ کو معطر کر دیا۔

بزرگ کا ہاتھ ماجد خان کے سر پر آیا۔ اُن کی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی، لب وا ہوئے۔ ”ہیرے! پریشان تو نہیں ہے؟“

ماجد خان نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ ”ذرا بھی نہیں سرکار!“ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اسے ”ہیرے“ کا خطاب کیونکر دیا گیا ہے۔

سائیں کے بعد ماجد خان نے بھی دیگر دونوں افراد سے مصافحہ کیا۔

سفید ریش بزرگ اندر کی طرف بڑھے۔ ”پہلے نماز پڑھ لی جائے۔“

نماز کے لیے امامت آنے والے بزرگ نے کروائی تھی۔ نماز کے بعد سب نے حجرے کا رخ کیا۔ سائیں کے اشارے پر ماجد خان بھی ساتھ ہو لیا تھا۔ حجرے میں ایک اور حیرت ماجد خان کی منتظر تھی۔ خوب صورت نقش و نگار والے تانبے کے برتنوں میں قہوہ اور مٹھائی کے ساتھ خشک میوہ جات سجے تھے۔

سائیں نے حیرت سے گنگ کھڑے ماجد خان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ ''مہمانوں کی تواضع کر۔''

ماجد خان فوراً آگے بڑھا۔ لمحوں میں ہی خوشبودار قہوے کی خوشبو سے حجرہ مہک اٹھا۔ مہمان بے تکلفی سے کھانے اور پینے لگے۔ بعد میں برتن سمیٹ کر ماجد خان ایک کونے میں دبک گیا۔ اس کی قسمت کا زور تھا کہ معرفت کی دنیا کا ایک دروازہ اس کے سامنے کھل گیا تھا۔

سفید ریش بزرگ نے گاؤ تکیے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''شہید کا خون ہے...... ہمیں حفاظت کا حکم ہوا ہے قاسم!''

سائیں قاسم کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''مجھے سہارے کی ضرورت تھی۔ میری درخواست قبول ہوئی۔ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔'' اس کے بعد بزرگ اور سائیں کے درمیان گفتگو ہونے لگی مگر اس گفتگو کا ایک لفظ بھی ماجد خان کے پلے نہیں پڑا تھا۔ دونوں کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کے سوا کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ درمیان میں دیگر دو بزرگ بھی کوئی بات کرتے تھے مگر انداز وہی بھنبھناہٹ جیسا ہی تھا۔

ماجد خان نے اپنی توجہ مٹھائی کی طرف کی اور ایک گلاب جامن اٹھالیا۔ ذائقہ اس کے منہ میں گھل سا گیا۔ وہ اس ذائقے سے بخوبی آشنا تھا۔ یہ نواں کوٹ کے معروف ترین رانا سوئٹس کے گلاب جامن تھے...... کیوں...... کیسے کو دماغ سے نکال کر اس نے گلاب جامن کھالیا۔ کچھ دیر میں اس گفتگو کا اختتام ہوا اور وہ چاروں اٹھ کر مسجد کے صحن میں چلے گئے۔ حجرے کے دروازے سے نکلتے ہوئے سائیں نے ماجد خان سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا۔

''حجرے کے اندر ہی رہنا۔ ہاں باہر جھانکنے کے لیے تو آزاد ہے۔''

ماجد خان نے اثبات میں سر ہلایا اور حجرے کے دروازے میں ہی بیٹھ گیا۔

وہ چاروں مسجد کے صحن میں حلقہ سا بنا کر بیٹھ گئے اور ایک خاص ردھم میں کچھ پڑھتے ہوئے جھومنے سے لگے۔ شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ ماجد خان کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔

برفیلا میدان نہ جانے دنیا کے کسی گوشے میں تھا یا پھر یہ کوئی اور دنیا تھی۔ اس کے بارے میں ماجد خان کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ جس طرح وہ اور سائیں نواں کوٹ کی شیپل والی مسجد سمیت اس برفیلے میدان میں موجود تھے...... اس کے بارے میں سوچیں تو دماغ چکرا جاتا تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں چمکتی برف پوش چوٹیوں اور برفاب ہوا کے تھپیڑوں سے بے نیاز وہ چاروں خدا کے پُراسرار بندے اپنے کام میں مشغول تھے۔ جھومتے ہوئے وہ یک زبان ہوتے تھے تو لگتا تھا جیسے لاکھوں، کروڑوں شہد کی مکھیاں مل کر بھنبھنائی ہوں۔

کچھ وقت گزرا تو ایک عجیب گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ ماجد خان نے آواز کی ماخذ کی جانب دیکھا۔ سامنے برف پوش چوٹی اسے ہلتی ہوئی نظر آئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے برف اپنی جگہ سے سرک رہی ہو۔ اگلے ہی لمحے ایک خوفناک پھنکار سے اس کا دل دہل گیا۔ اس نے زیادہ دھیان سے دیکھا تو سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔ جسے وہ سرکتی ہوئی برف سمجھ رہا تھا وہ درحقیقت نقرئی رنگ کا ایک بہت بڑا سانپ تھا جو رفتہ رفتہ واضح ہو رہا تھا۔ وہ مہیب سانپ اتنا بڑا تھا کہ پوری برفانی چوٹی کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ چوٹی چھوڑ کر نیچے اتر رہا تھا۔

حلقہ برداروں کی بھنبھناہٹ مزید بڑھ گئی۔

ماجد خان کی نظریں سانپ پر تھیں۔ پھر اس کا سر نمایاں ہوا۔ بلاشبہ یہ سر کسی ریلوے انجن سے چھوٹا نہیں تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں جیسے آتش فشاں دہک رہے تھے۔ اس کی نگاہیں مسجد کی طرف تھیں۔ پھر اس کے منہ سے ایک بے حد بلند چیخ برآمد ہوئی اور منہ سے جیسے بہت بڑا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔

غیظ و غضب سے بھری اس چیخ کے سبب ماجد خان کو کانوں کے پردے پھٹتے سے محسوس ہوئے اور دل خشک پتے کے مانند لرزنے لگا۔ آگ کا ایک دریا جیسے اس سانپ کے منہ سے نکل کر مسجد کی طرف لپک پڑا۔ ماجد خان نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر وجود کی سبھی توانائیاں جیسے کسی نے نچوڑ لی تھیں۔

آگ کے دریا نے لمحوں میں پوری مسجد کو گھیر لیا تھا مگر ایسا محسوس ہوا جیسے کسی انجانی اور برتر طاقت نے پوری مسجد کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ مسجد کے ہر طرف ہی آگ تھی مگر مسجد کے اندر آگ یا تپش کا نام نہیں تھا۔ ماجد خان آگ کے دریا کے اندر گنگ بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

مہیب سانپ بالکل قریب آگیا تھا۔ اس کی خوفناک پھنکاریں اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی چنگھاڑیں ہر طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وہ مسجد کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے آگ اُگل رہا تھا اور غضب سے دیوانہ سا

ہورہا تھا۔

پُراسرار بزرگوں کا ٹولا سائیں کے ساتھ اس آگ سے بے نیاز اپنے مخصوص ورد میں مصروف تھا۔ پھر سفید ریش بزرگ نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح سے ایک دانہ علیحدہ کیا۔ یہ تسبیح سفید موتیوں سے پروئی ہوئی تھی مگر حیرت انگیز طور پر ایک موتی علیحدہ کرنے کے باوجود وہ سلامت رہی تھی۔ بزرگ نے موتی دائیں ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا اور پھر اسے مسجد کے دروازے سے باہر آگ کے دریا کی طرف اچھال دیا۔

موتی کے آگ کو چھوتے ہی سانپ کی تکلیف میں ڈوبی اتنی بلند چنگھاڑ بلند ہوئی کہ ماجد خان نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ آگ لمحے بھر میں ہی غائب ہوگئی تھی۔ مہیب سانپ کے بہت بڑے سر کو ماجد خان نے مسجد کے دروازے کے بالکل اوپر دیکھا۔ ملگجے اندھیرے کے باوجود صاف نظر آرہا تھا کہ سفید موتی جیسے چمکتے ہوئے ننھے ننھے پرندوں کا ایک جھنڈ اس سانپ کے منہ پر حملہ آور تھا۔ بظاہر ان پرندوں کی اس سانپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی مگر وہ پرندے اس جہنمی درندے کو جہاں سے چھوتے تھے اس کا گوشت گلنے لگتا تھا۔ سانپ نے منہ اٹھا کر آگ اُگلی مگر پرندوں کا جھنڈ طرح دے کر اس کی پشت پر حملہ آور ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں سانپ کو بے حال کردیا۔ فضا میں گلتے گوشت کی سڑاند پھیل رہی تھی۔

سانپ سر پٹخ رہا تھا اور اس کی چیخیں درد و کرب میں ڈوب گئی تھیں۔ اس کی مزاحمت دھیرے دھیرے دم توڑ رہی تھی۔ گوشت کی سڑاند رفتہ رفتہ ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ بزرگوں نے اپنی ناک ڈھانپ لی تھی۔ ماجد خان نے بھی دری کا سرا ناک تک پھیلا لیا۔ کچھ دیر مزید گزری تو سانپ نیچے گر گیا پھر رفتہ رفتہ اس کی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ موتی جیسے پرندے اسے چھوڑ کر فضا میں بلند ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ آپس میں جُڑ کر موتی کی شکل اختیار کر گئے اور وہ ...موتی سفید ریش بزرگ کے ہاتھ میں آگرا۔ جسے انہوں نے دوبارہ تسبیح میں پروتے ہوئے انگلی اٹھا کر فضا میں گھمائی اور زمین و آسمان جیسے گردش میں آگئے۔ ماجد خان کی آنکھیں خودبخود ہی بند ہوگئیں۔ اس نے سفید ریش بزرگ کی مدھم سی آواز سنی۔

”قاسم! ہم نے کہیں اور جانا ہے۔ بہت بڑی رکاوٹ دور ہو چکی ہے اور تیرا کام بھی ختم...... اب شہید جانے اور اس کا خون جانے۔“ پھر ایک جھٹکے سے ماجد خان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مسجد کے صحن میں کھڑا تھا۔ حبس کا عالم تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم پر پسینا سرسرانے لگا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکیں۔ سر پر پیپل کا درخت سایہ فگن تھا اور اس سے اوپر ستارے چمک رہے تھے۔ وہ دوبارہ سے مسجد سمیت نواں کوٹ میں ہی تھا۔ سامنے حجرے سے سائیں نکل کر آئے اور اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے تبسم کے ساتھ بولے۔

”آج عشا کی اذان تو دے۔“

ماجد خان گنگ تھا۔ بمشکل اس کی زبان کو حرکت ہوئی۔ ”وہ......وہ......سب کیا تھا سائیں؟“

سائیں لحظے بھر کو خاموش ہوئے اور اسرار بھرے انداز میں بولے۔ ”وہ مکان اور لامکاں کے درمیان کی دنیا تھی۔ اسے بھول جا!“

ماجد خان نے نہ سمجھنے کے باوجود اثبات میں سر ہلایا اور قدرے تذبذب بھرے انداز میں کہا۔ ”عشا ہم نے تو پڑھ نہیں لی؟“

سائیں نے منہ پھیرا۔ ”وہاں کی نماز وہاں رہ گئی۔“

سائیں کے جاتے ہی ماجد خان کلی کرنے چل دیا۔ اس کے منہ میں ابھی تک گلاب جامن کا ذائقہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ عشا کی اذان دے رہا تھا۔

☆☆☆

ظلِ شاہ اٹھ کر اذان والی سمت چل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی سر میں درد کی ٹیس اٹھی اور اس نے سر تھام لیا۔ پیاس کی شدت سے ایسے لگتا تھا جیسے حلق میں جلتی ہوئی ریت پھنسی ہو۔ وہ سر تھامے چلتا رہا...... درد کی شدت رفتہ رفتہ بڑھنے لگی مگر پانی ملنے کی آس مسجد سے ہی تھی۔ یہی آس اس کا ہاتھ تھامے رہی۔ درد ناقابلِ برداشت ہوا تو وہ گر کر تڑپنے لگا۔ خشک گلے سے چیخ تو نہیں نکل پائی تھی مگر چیخ کھانسی میں ضرور ڈھل گئی تھی۔ گلے پکڑے وہ بری طرح سے کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ ٹمٹماتے ستاروں سے اوپر نامعلوم بلندیوں پر اس کے خالق کا تخت تھا۔ اس نے دل سے خالق کو مدد کے لیے پکارا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

”اے بزرگ و برتر! مجھے اس تکلیف سے نجات عطا فرما۔ یہ تکلیف میرے گناہوں کے سبب ہے تو میرے گناہ معاف فرما۔“ اپنے خالق کے سامنے وہ گھگیاتا رہا اور رفتہ رفتہ درد کی شدت کم ہونے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ دوبارہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے مٹی کی بنی کچی مسجد نظر آرہی تھی جس کی دیواروں پر سفید چونا پھیرا گیا تھا۔ اس وقت جو کیفیت تھی، وہ نہیں سوچ سکا کہ اس لق و دق ویران صحرا میں جہاں آبادی کے بھی کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے مسجد کہاں سے آگئی اور بنا کسی بجلی اور لاؤڈ اسپیکر کے اذان کی آواز اتنی بلند کیوں تھی۔

مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے درد کی شدت دوبارہ بڑھنے لگی مگر ''بھلائی کی طرف آؤ'' کی صدا اس کے لیے ہمت و حوصلے کا پیغام تھی۔

آخری چند قدم اس نے نہ جانے کیسے اٹھائے تھے۔ مسجد کے قدموں کے قریب وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ اسی وقت مسجد کے بے در کے چوکھٹ میں سرسراہٹ ابھری۔ ایک الوہی سی خوشبو ظلِ شاہ کے نتھنوں سے ٹکرائی اور ایک مہربان ہاتھ اس کی پیشانی پر آٹکا۔ اس کی ڈوبتی سانسیں بحال ہونے لگیں۔ کاسۂ سر میں دھمال ڈالتا درد پل بھر میں غائب ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں ایک سفید ریش بزرگ اس پر جھکے ہوئے تھے۔ پھر بزرگ کے لب ہلے۔

''پانی دو! شہید کا خون پیاسا ہے۔''

ظلِ شاہ نہیں دیکھ پایا کہ بزرگ کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ کس نے دیا تھا۔ پیشانی پر رکھا ہاتھ اس کے سر کے نیچے آیا اور اسے سہارا دے کر اٹھا لیا۔ مٹی کا پیالہ اس کے خشک ہونٹوں سے آلگا۔ فرحت بخش پانی اس کے پیاسے وجود میں اترنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ظلِ شاہ توانائی کے احساس سے لبریز ہو گیا۔ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت قدرے بیدار ہوئی۔ وہ بگولا یاد آیا جو اسے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا۔ اب خدا جانے وہ کیا چکر تھا، اس نے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے اور ریلوے لائن یہاں سے کتنی دور ہے؟ وہاں ٹرین کھڑی ہے اور میری بیوی اس ٹرین میں ہے۔'' اس کے لہجے سے نور کے لیے تشویش عیاں تھی۔

بزرگ بولے۔ ''سب ہو جاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی بزرگ نے اپنی سفید موتیوں والی تسبیح ظلِ شاہ کے سر پر رکھ دی۔ فوراً ہی اس سے ایک موتی جدا ہوا اور سیال شکل اختیار کر گیا۔ سر سے بہتے ہوئے وہ سیال ظلِ شاہ کے کان میں داخل ہو گیا۔ ظلِ شاہ یہ منظر تو نہیں دیکھ پایا تھا مگر اسے احساس ضرور ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے کان کی طرف بڑھا مگر بزرگ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''حوصلہ کر بچے!'' بزرگ نے قطعی انداز میں کہا۔ چند لمحے تو پُرسکون گزرے مگر پھر ظلِ شاہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے کاسۂ سر میں زلزلہ آگیا ہو۔ شدید ترین درد کے سبب اسے لگ رہا تھا کہ اس کا سر ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اس کے حلق سے دل دوز چیخ نکلی اور وہ بزرگ کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بکرے کو ذبح کیا جا رہا ہو۔

سفید ریش بزرگ اس سے تھوڑا دور ہٹ گئے۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ ظلِ شاہ کی تکلیف ان کے لیے سوہانِ روح ہے مگر ناسور کو جسم سے اکھاڑ پھینکنا بھی تو ضروری تھا۔

تھوڑی دیر بعد ظلِ شاہ کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ سیال موتی اس کے کان سے باہر نکل رہا تھا۔ بزرگ کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ سیال، کان سے نکل کر ریت پر جا گرا۔ اس سیال میں کچھ کلبلا رہا تھا۔ باریک مگر تیز پھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان پھنکاروں میں تکلیف کا عنصر غالب آتا چلا گیا۔ پھر کلبلاہٹ بھی دم توڑنے لگی۔ اگلے چند لمحوں میں سیال دوبارہ سے موتی کی صورت اختیار کر کے تسبیح میں واپس آچکا تھا اور ریت پر دو ننھے ننھے سے نقرئی سانپ مردہ پڑے تھے۔ بزرگ نے نفرت سے ان سانپوں کو دیکھا اور کچھ پڑھ کر پاؤں سے ریت ان مردہ اجسام پر اچھالی۔ ریت پڑتے ہی وہ مردہ سانپ ایک چرمراہٹ کی آواز کے ساتھ خشک لکڑی کے مانند جلنے لگے۔

ظلِ شاہ اپنے قرب و جوار سے بے خبر تھا۔ اسے دماغی کمزوری محسوس ہو رہی تھی مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے دماغ کسی جکڑن سے آزاد ہو گیا ہو۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ ہانپتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ٹھیک اسی وقت اسے محسوس ہوا جیسے زناٹے کی آواز کے ساتھ توپ کا گولا اس کے اوپر سے گزرتے ہوئے سفید ریش بزرگ کے سینے سے ٹکرایا ہو...... بزرگ مسجد کے باہر تھے۔ وہ ہوا میں اُڑتے ہوئے مسجد کے اندر کہیں جا گرے تھے۔

ظلِ شاہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور مسجد کے اندر داخل ہونے کی غرض سے قدم اٹھایا مگر قدم ہوا ہی میں رہ گیا۔ اپنے اردگرد اسے شدید قسم کی بدبو محسوس ہوئی اور کسی سخت نکیلے بہت بڑے ہاتھ نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ظلِ شاہ کے قدم زمین سے اٹھ گئے تھے۔ بدبو سے اس کے حواس معطل سے ہونے لگے۔ اس نے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی

اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ گولی کی رفتار سے آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ نکیلی چبھن بڑھتی جارہی تھی۔ بُو کے شدید ترین احساس سے ظلِ شاہ کا دماغ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

☆☆☆

ظلِ شاہ کی دوبارہ آنکھ کھلی تو پہلا احساس اسے گداز کا ہوا۔ اس کا سر کسی کے زانو پر رکھا تھا۔ یہ نور تھی جس کا چہرہ پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ظلِ شاہ اسے سامنے پا کر جیسے سب کچھ بھول گیا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر نور کے چہرے پر بھی رونق آگئی۔

ظلِ شاہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”نور! تم ٹھیک ہو؟“ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ وہ دونوں کسی قید خانے میں تھے۔ جلے ہوئے پتھر کے مانند سیاہ دیواریں، موٹی اور بھدی سلاخوں والا گیٹ جو بند تھا اور اس کے ساتھ ایک قدیمی بڑا سا قفل جھول رہا تھا۔ بے حد بلند چھت کے نیچے دو روشن دان تھے جہاں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی اور فرش پر پیال بچھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں بے حد ناگوار بُو کا بھی احساس تھا مگر اس بدبو کا کوئی ماخذ نظر نہیں آرہا تھا۔

نور جیسے زبردستی مسکرائی۔ ”میں تو ٹھیک ہوں مگر تمہارے لیے پریشان ہوں۔ ہم اسی بدبخت کی قید میں ہیں۔ جس کے ظلم کا تم شکار ہوئے ہو۔“

ظلِ شاہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور خوشگوار انداز میں کہا۔ ”میری ذہنی کیفیت میں جو گڑبڑ تھی، وہ دور ہوگئی ہے۔ ایک بزرگ کے دستِ شفقت نے سب ٹھیک کردیا ہے...... میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ ساتھ ہی اس نے پوری تفصیل بتادی۔ نور توجہ سے سنتی رہی پھر ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔

”کاش یہ سب درست ہوتا مگر وہ سب شیطانی چکر تھا۔“

ظلِ شاہ کا دماغ آزاد ہوچکا تھا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹ نمودار ہوئی۔ ”قطعی نہیں...... وہ مسجد...... اذان اور نورانی صورت بزرگ...... شیطانی چکر ہو نہیں سکتا۔ اس کے بعد جو شروع ہوا ہے، وہ شیطانی چکر ضرور ہے...... خیر اس بات کو چھوڑو! تمہارے ساتھ کیا بیتی ہے؟“

نور کا موڈ بگڑ گیا۔ ”میری بات کو تم کچھ ہی نہیں رہے تو پھر میری فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک میں ہوں جو تمہاری فکر میں اپنا خون جلائے جارہی ہوں۔“ آخر میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

ظلِ شاہ نے پیار سے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ چلائے۔ ”اچھا بابا! وہ جو بھی تھا...... خوشی کی بات یہ ہے کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ذہن پر میں جتنا بھی زور ڈال لوں...... اب ذرا بھی درد نہیں ہوتا...... اب میں اس شیطان سے بھی نمٹ لوں گا جس نے اپنی کالی طاقت سے میرا ذہن باندھا تھا اور اس کی وجہ بھی پوچھ لوں گا۔“

نور نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم نہیں جانتے...... میں نے بھی یہ بات تم سے چھپائی تھی۔ آج اماوس کی رات ہے...... آج رات کی چند منحوس ساعتوں میں تم نے اس بُت کو زنجیروں سے آزاد کرکے باہر نہ پھینکا تو......“ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

ظلِ شاہ چونک کر بے چین ہورہا تھا۔ ”تو کیا......؟“

”میرے منہ میں خاک تو پھر تم مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوجاؤ گے۔“ یہ کہتے ہوئے نور اس کے گلے لگ گئی اور اتنا روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

ظلِ شاہ پریشان ہوگیا۔ اس کے لیے نور کو سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ نور نے ہچکیوں کے درمیان جو تفصیل بتائی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

ان کے جدِامجد شہید شاہ نے سیکڑوں سال پہلے بدی کی طاقتوں کے خلاف بھرپور جنگ کی تھی۔ بدی کی طاقتیں اپنا بدلہ لینا نہیں بھولی تھیں۔ یہ طاقتیں ہمیشہ ہی ان کے خاندان کے گرد منڈلاتی رہی تھیں۔ ظلِ شاہ اتفاق سے شہید شاہ کی بھرپور شباہت لے کر پیدا ہوا تھا۔ اسی سبب ان طاقتوں کے ایک نمائندے وِش مہاراج نے اسے اپنا نشانہ بنایا تھا۔ نور نے یہ بات وِش مہاراج کی قید کے دوران جانی تھی۔

نور نے مزید بتایا کہ اسے بھی ایک شیطانی بگولے کے ذریعے ہی اٹھا کر یہاں لایا گیا تھا۔ اب ظلِ شاہ کی زندگی صرف اسی صورت میں بچ سکتی تھی کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ایک بُت کی زنجیریں کھول کر اسے باہر پھینک کر شہید شاہ کی متبرک چلہ گاہ کو پاک کردے۔ وِش مہاراج نے انہیں یہاں قید بھی اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ مخصوص ساعتیں گزر جائیں جو ہر دو صدیوں کے بعد آتی تھیں اور ان ساعتوں کے گزرتے ہی ظلِ شاہ تڑپ تڑپ کر مرے جس منظر کو دیکھنے کے لیے وِش مہاراج اور بدی کی دیگر طاقتیں بڑی شدت سے منتظر تھیں۔

ظلِ شاہ شدید الجھن کا شکار ہوگیا۔ نور نے پہلے اور اب جو کچھ بتایا تھا، وہ اس کے لیے ہضم کرنا خاصا مشکل

ہو رہا تھا۔ کئی تضاد تھے مگر اس نے سمجھا کہ نور بھی شدید ذہنی اتھل پتھل کا شکار تھی اور اپنی سادہ سی زندگی سے نکل کر وحشتوں کی دنیا میں اس کی خاطر سر پٹختی پھر رہی تھی۔ اسی سبب کبھی کچھ بتاتی تھی اور کبھی کچھ مگر اب تک اس نے جو دیکھا تھا، وہ بھی تو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ زبردست قسم کی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اگر نور کی معلومات درست تھی تو اس کی زندگی شدید خطرات کی زد میں تھی۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے وجود میں سناٹا سا اترنے لگا۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اس بُت کو اٹھا کر چلہ گاہ سے باہر پھینکے اور اس مقدس مقام کو پاک صاف کرے۔ بے دھیانی میں اس کا ہاتھ گلے سے لٹکتی چابی سے ٹکرایا تو اس نے نور سے اس بارے میں استفسار کیا۔

نور نے کہا۔ ''یہ بابا سائیں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے گلے میں ڈالی تھی۔ اسی چابی سے اس بت کی زنجیریں کھل سکتی ہیں۔''

ظل شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ ان زنجیروں کی چابی تھی تو نسل در نسل کس وجہ سے ان کے خاندان کے پاس چلی آرہی تھی۔ دماغ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

اسے سوچ کے سمندر میں غرق دیکھ کر نور اس کے ساتھ لگ گئی۔ ''ظلی! مجھے ڈر لگ رہا ہے...... تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔'' وہ دوبارہ سے رونے لگی۔

ظل شاہ کا دل پگھلنے لگا۔ اس نے نور کو بازو کے حلقے میں لیا۔ ''فکر نہ کرو! مجھے کچھ نہیں ہونے والا یہاں سے نکلنے کی سبیل کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اوپر روشندانوں پر نظر ڈالی۔ بلندی کافی سے زیادہ تھی۔ اسی سبب ان میں کوئی سلاخیں وغیرہ نہیں لگائی گئی تھیں۔

نور کو ایک طرف ہٹا کر اس نے کھڑے ہو کر روشندانوں کا جائزہ لیا۔ پھر سلاخوں کی طرف چلا گیا۔ دوسری طرف راہداری تھی۔ سامنے سیاہ پتھریلی دیوار تھی اور روشن دانوں سے آنے والی روشنی کے سبب صرف ایک حصہ ہی قدرے روشن تھا۔ اس کے بعد دور تک تاریکی تھی۔

سلاخوں کے قریب مدھم سی ایک آواز سنائی دی۔ ظل شاہ نے دھیان لگایا۔ آواز تھی اور واضح تھی...... یہ کسی کے سانس لینے کی آواز تھی۔ مدھم اور وزنی جیسے کوئی بہت بڑا درندہ نیند کے عالم میں سانسیں لے رہا ہو۔ یہ آواز سنتے ہی ظل شاہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً آس پاس کوئی درندہ تھا جو گہری نیند میں تھا۔ عین ممکن تھا وہ بھی کوئی شیطانی وجود ہو۔ اس نے چور نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ وہ اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر نور کی ساری توجہ اس کی طرف تھی۔ وہ فوراً بھانپ گئی اور اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''کیا ہوا؟ تم گھبرائے سے لگ رہے ہو؟''

ظل شاہ نے مصنوعی بشاشت سے کہا۔ ''ایسا تو کچھ نہیں...... یہاں سے نکلنے کی راہ دیکھ رہا ہوں۔''

نور نے محبت بھرے انداز میں اس کے سینے پر مُکا مارا۔ ''جھوٹے! سانسوں کی یہ بھاری آواز میں سن چکی ہوں اور مجھے ہوش کے عالم میں یہاں لایا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے یہ سانسیں کون لے رہا ہے۔''

ظل شاہ نے سانس خارج کرتے ہوئے اس کے چہرے پر آئے بال سنوارے۔ ''کون ہے؟''

نور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''ناقابلِ یقین بات ہے مگر ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ سانسیں وہی مورتی لے رہی ہے۔ جسے ہم نے یہاں سے باہر نکال پھینکنا ہے۔''

ظل شاہ نے حیرت کے عالم میں اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم بھانپتے ہوئے نور بولی۔

''یہ عجیب شیطانی دنیا ہے۔ میں نے وش مہاراج کو ایک عجیب شکل کے سبز بونے سے باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ بت یا مورتی ہر دو صدیوں کے بعد چاند کے ڈوبتے دنوں میں اماوس کی رات تک کسی جاندار کے مانند سانسیں لیتی ہے۔ اس کا دل زندہ ہو جاتا ہے اور اماوس کی رات کے بعد اگلی دو صدیوں تک وہ مکمل طور سے بے جان ہو جاتی ہے۔''

ظل شاہ نے کہا۔ ''پھر تو ضرور اس مورتی سے کوئی راز وابستہ ہے۔ اس کی کھوج تو میں ضرور لگاؤں گا۔''

نور کا رنگ بدل گیا۔ ''کھوج شوج کو دفعہ کرو، بس یہاں سے نکل کر مورتی کو باہر پھینکو اور ہم گھر جائیں...... میں نے اپنا پورشن بھی ابھی سجانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شفق سی پھوٹ پڑی تھی۔

ظل شاہ کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ ''تمہارے پورشن کی خاطر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

نور اپنے الجھے بالوں سے ہیئر پن نکالتے ہوئے شوخ ہوئی۔ ''تمہارے ساتھ میں بھی کچھ کرتی ہوں۔''

اس کا ارادہ بھانپ کر ظل شاہ بولا۔ ''یہ ہندی فلموں والا قفل نہیں ہے جو اس پن سے کھل جائے گا۔''

''اوہ......'' نور مزید شوخ ہوئی۔ ''جناب نے یہ

انڈین فلمیں کب اور کہاں دیکھ لیں؟ چاچو اور بابا سائیں کے لیے یہ اطلاع بڑی خوشگوار ہوگی۔"

ظل شاہ نے اسے دبوچا۔ "یہ بات صرف تم تک رہنی چاہیے۔" ساتھ ہی وہ شریر ہوا۔

نور نے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ایک شرط پر۔"

"ہن۔" ظل شاہ جذبات سے بوجھل ہونے لگا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو اور آئندہ فلمیں ہم اکٹھی دیکھیں گے۔"

"یہ تو دو شرطیں ہوگئیں۔"

"دیکھ لو...... تمہاری مرضی۔"

ظل شاہ نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے بابا۔"

نور کھلکھلاتی ہوئی قفل کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں پہلی دفعہ اس طرح یکجا ہوئے تھے اور ظل شاہ پر یہ جان کر شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی کہ وہ اب رشتہ ازدواج میں بندھ چکے تھے۔ جواں دل حالات کی سنگینی کے باوجود چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھلا بیٹھتے تھے۔

ظل شاہ روشن دانوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں تک پہنچنا ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ، نور کو کندھوں پر کھڑا کر کے اٹھ کھڑا ہوتا تو بھی روشن دان وہاں سے بہت اوپر تھے۔ نور، چولی لہنگے میں تھی۔ دوپٹے کا نام نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو اس سے بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ قید خانے میں پیال کے سوا کچھ...... بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔

نور بھی قفل سے سر ٹکرانے کے بعد تھک ہار کر اس کے پہلو میں آبیٹھی۔ سورج کا سفر کائنات کے مالک کے باندھے ہوئے وقت پر جاری تھا۔ شام اور پھر اماوس کی رات...... جو ظل شاہ کی زندگی کی آخری رات ثابت ہونے والی تھی۔ بدی کی طاقتیں اس رات کی شدت سے منتظر تھیں۔

شام ڈھلی تو نور رونے لگی۔ اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے ظل شاہ کی بھی آنکھیں بھیگنے لگیں...... پھر رفتہ رفتہ تاریکی بڑھنے لگی۔ ان دونوں کے پاس بے بسی کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں۔ دونوں ایک، دوسرے کے ساتھ لگ کر چپ بیٹھے تھے۔ پھر رات گہری ہونے لگی۔ مورتی کی سانسیں لینے کی آواز بھی دھیرے دھیرے بڑھ رہی اور بے حد واضح طور پر سنائی دینے لگی تھی۔ ہر آہٹ پر لگتا تھا کہ بدی کے ہرکارے آپہنچے ہیں۔ پھر اچانک ہی ظل شاہ کا کندھا جگمگانے لگا۔ نور کے ساتھ ساتھ وہ بھی چونکا۔ اس کی قمیص کے اندر یہ روشنی کہاں سے آگئی تھی۔

یہ روشنی دیکھتے ہوئے نور مضطرب آمیز خوشی کا شکار ہو گئی۔ اپنے کندھے کی طرف متوجہ ظل شاہ اس کے تاثرات نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس نے اپنے کندھے سے قمیص ہٹائی۔ اس کے کندھے پر سیاہ تلوں کا ایک جھرمٹ سا تھا......

ناقابلِ یقین بات تھی کہ یہ جھرمٹ اس وقت ستاروں کے مانند جگمگانے لگا تھا۔ نور نے چور نظروں سے روشن دان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر بھی بالکل اسی شکل کا جھرمٹ نمایاں نظر آرہا تھا۔ ان خاص ساعتوں کا آغاز ہوگیا تھا جس کا بدی کی طاقتوں کو صدیوں سے انتظار تھا۔

ظل شاہ نے چمکتے ہوئے تلوں کو دیکھ کر اچنبھے سے کہا۔ "یہ کیا ہوا ہے؟"

نور نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "میں نہیں جانتی مگر...... ظلی! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

ظل شاہ نے بے بسی کے احساس کے ساتھ بال نوچ لیے۔ نور کی نظر اس کے گلے میں جھولتی چابی پر پڑی...... وہ بولی۔ "ظلی! یہ بھی تو چابی ہے...... کیوں نہ اسے آزمایا جائے۔"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق ظل شاہ اٹھ کھڑا ہوا اور چابی گلے سے اتار لی۔

چابی، قفل کے سوراخ میں ایسے بیٹھ گئی جیسے بنی ہی اس کے لیے ہو۔ ظل شاہ کے چابی گھماتے ہی قفل کھل گیا۔ وہ دونوں خوشی سے ناچ اٹھے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ قید خانے سے باہر تھے۔ راہداری میں گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ اس اندھیرے میں مورتی کے سانس لینے کی آوازیں اور بھی ہیبت ناک محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ اندازے سے ایک طرف بڑھے۔ اس وقت ظل شاہ کو اپنے کندھے سے پھوٹتی روشنی کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ اس نے اپنا کندھا عریاں کر دیا۔ روشنی اب اتنی بڑھ گئی کہ وہ آگے بڑھ سکیں۔

نور کے انداز میں اضطراب انگیز تیزی تھی۔ پتھریلی راہداری میں تھوڑا دور آنے کے بعد انہیں سیڑھیاں نظر آئیں۔ یہ تنگ سیڑھیاں اوپر کی طرف جارہی تھیں۔ مورتی کے سانس لینے کی آواز ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھے تو سانسوں کی آوازیں واضح ہونے لگیں۔ سیڑھیوں کا اختتام ایک تنگ دہانے پر ہوا۔ دہانے سے سرخ سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پہلے ظل شاہ دہانے سے دوسری

طرف لگا، پھر اس نے نور کا ہاتھ تھام کر دوسری طرف کھینچ لیا۔
وہ دونوں ایک وسیع پتھریلے ہال میں کھڑے تھے جو نامعلوم مقام سے پھوٹنے والی سرخ روشنی میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ ہال کے وسط میں زنجیروں سے جکڑا وہ آبنوسی مجسمہ نصب تھا جو سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا سینہ پھول اور پچک رہا تھا۔ یہی بدی کی سب سے بڑی طاقت اشک ستر کی خاص داسی چالی پت تھی۔ اس کے بال سیاہ ناگن کے مانند لہرا رہے تھے اور آنکھیں روشن ہو رہی تھیں۔ یہ منظر اتنا ڈراؤنا اور ہیبت ناک تھا کہ ظل شاہ کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔
نور کا ہاتھ اس کے بازو پر آیا۔ وہ ہیجان زدہ سی آواز میں بولی۔ ''ظلی! یہی وہ مورتی ہے...... جلدی سے اس کی زنجیریں کھولو اور پھر ہم اس پاک جگہ سے اس کا وجود ہٹائیں۔''
ظل شاہ نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔ ہاتھوں کی لرزش کے ساتھ وہ چابی سیدھی کر کے مورتی کی طرف بڑھا۔ نور بھی اس کے ساتھ تھی۔
ظل شاہ مورتی کے گرد لگے سفید دائرے میں داخل ہوا تو نور وہیں رک گئی۔ ظل شاہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولی۔ ''بابا سائیں نے مجھے اس سفید دائرے میں داخل ہونے سے منع کیا تھا۔ اس دائرے میں کوئی عورت یا لڑکی داخل نہیں ہو سکتی۔''
ظل شاہ کے پاس زیادہ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ چابی تھام کر آگے بڑھا۔ مورتی کی قربت ہیبت ناک تر تھی۔ سانسیں لینے کی آوازیں دل دہلا رہی تھیں۔ ظل شاہ نے قدرے جھک کر قفل تھام لیا۔ قفل ہاتھ میں لیتے ہی وہ چونکا۔ اس کے ساتھ مخصوص سیاہ تعویذ بندھے ہوئے تھے۔ یہ تعویذ اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ اس نے ایسے تعویذ اپنے گھروں میں حفاظت کے لیے اور آسیب زدہ جگہوں پر خبیث جنات کو باندھنے کے لیے اس کے بزرگ استعمال کرتے تھے۔ اس نے بغور تعویذوں کو دیکھا...... اس کی نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ وہی مخصوص تعویذ تھے کہیں یہ مورتی کوئی بدی کی خبیث طاقت تو نہیں تھی جسے اس کے جدامجد نے اس مقام پر باندھا تھا؟ یہ سوال ذہن میں اتھل پتھل مچانے لگا۔
تاخیر نے نور کو بے چین کر دیا۔ ''کیا کر رہے ہو ظلی! جلدی قفل کھولو!''
ظل شاہ قفل چھوڑ کر پلٹا۔ ''نہیں یار! یہ کوئی آفت ہے جسے یہاں ہمارے بزرگ نے باندھا ہے...... اس کے ساتھ حفاظت کے وہی تعویذ بندھے ہیں جو ہمارے گھروں اور تبرکات والی تجوری کی حفاظت کرتے ہیں...... تمہیں مائی اللہ رکھی والی بیر تو یاد ہو گی...... وہاں بھی چڑیلوں کو دادا سائیں نے ایسے ہی تعویذوں سے باندھ چھوڑا ہے۔''
نور چیخی۔ ''میں اِن باتوں پر یقین نہیں رکھتی...... بس، مجھے یہ یقین ہے کہ تم نے یہ قفل نہ کھولا تو تمہاری زندگی کو خطرہ ہے...... سب کچھ دماغ سے نکال کر میری خاطر اس قفل کو کھول دو۔'' آخر میں وہ روہانسی ہو گئی۔
ظل شاہ تذبذب کا شکار ہو گیا مگر کوئی انجانی طاقت تھی جو اس کے قفل نہ کھولنے کے فیصلے کو طاقت دے رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے نور کی حالت نے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی، وہ نور کی اس بات سے میل نہیں کھاتی تھی کہ مجھے ان باتوں پر یقین نہیں ہے۔
نور نے مضطرب انداز میں کہا۔ ''جلدی کرو ظلی!''
مگر ظل شاہ جلدی کرنے والا نہیں تھا۔ اس کا ارادہ مضبوط ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''تم خدا پر یقین رکھو! مجھے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ یقیناً انسانیت کے لیے آزار کا باعث ہے۔ اسی سبب اسے باندھا گیا ہے۔ آؤ یہاں سے نکل چلتے ہیں۔'' اس نے سفید دائرے سے باہر قدم نکالے تو نور اپنے بال نوچنے لگی۔ اس کی حالت نے ظل شاہ کو مزید پریشان کر دیا۔
اسی وقت ایک چنگھاڑ سی بلند ہوئی اور نہ جانے کہاں سے ایک ننگ دھڑنگ بوڑھا برآمد ہوا۔ وہ محض ایک لنگوٹ میں ملبوس تھا اور اس کا پورا جسم گندگی میں لتھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا۔ وہ برق کے مانند حرکت میں آیا اور اس نے نور کو کسی چڑیا کے مانند دبوچ لیا۔
ظل شاہ بے اختیار آگے بڑھا۔ بوڑھا دش مہاراج تھا۔ اس نے خنجر نور کی گردن پر رکھا اور گرجا۔ ''خبردار! میں اس چھوکری کی منڈی (گردن) کاٹ دوں گا۔''
مہاراج کے لہجے میں اتنی وحشت تھی کہ ظل شاہ ٹھٹک کر رک گیا۔ تیز تر خنجر کی دھار سے نور کی جلد کٹ گئی تھی اور وہاں سے خون رسنے لگا تھا۔ خوف کی شدت سے وہ گنگ نظر آ رہی تھی۔
ظل شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ نور بدی کے کسی نمائندے کی گرفت میں ہے۔
مہاراج وحشت کے عالم میں گرجا۔ ''اس چھوکری کی زندگی چاہتا ہے تو جلدی سے آگے بڑھ کر قفل کھول...... نہیں

تو یہ نرکھ میں جارہی ہے۔'' اس نے خنجر کا دباؤ بڑھایا تو نور چیخنے لگی۔ ظلِ شاہ کا دل جیسے کسی نے جکڑ لیا تھا۔ وہ ملتجی ہوئی۔ ''ظلی! خدا کے لیے مجھے بچا لو! میں مرنا نہیں چاہتی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

مہاراج دوبارہ چیخا۔ ''جلدی کر!''

ظلِ شاہ بے بسی کے دباؤ کے سامنے بے بس ہو گیا۔ وہ، نور کو اپنی آنکھوں کے سامنے کیسے مرتے دیکھ سکتا تھا۔ کشمکش دم توڑ گئی۔ وہ واپسی کے لیے پلٹا اور پھر دل کڑا کر کے اس نے قفل کھول دیا۔ قفل کھولتے ہی جیسے بڑے زور سے بجلی کڑکی...... زنجیریں مورتی کے قدموں میں آ گریں اور زمین لرزنے لگی۔ اسی وقت مہاراج نے خنجر تاک کر پھینکا جو سیدھا ظلِ شاہ کی پنڈلی میں ترازو ہو گیا۔

ظلِ شاہ کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ نیچے گر گیا۔ ایسے محسوس ہوا تھا جیسے جلتی ہوئی سلاخ اس کی پنڈلی میں اتر گئی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پنڈلی سے خون تیزی سے بہنے لگا۔ جیسے ہی یہ خون فرش پر گرا وہ فرش پر ہاتھوں کی لکیروں کے مانند پھیلی لائنوں پر بہتا ہوا مورتی کے قدموں کی طرف بہنے لگا۔ ظلِ شاہ نے ہمت کر کے خنجر کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کوشش میں خون اور زیادہ تیزی سے بہنے لگا۔ نہ جانے یہ خنجر کیسا تھا جو اس بُری طرح سے گڑ گیا تھا۔ نور کی طرف دیکھتے ہوئے وہ حیرت سے بُت سا بن گیا۔ اسے لگا کہ اس کی آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں مگر یہ نگاہ کا دھوکا نہیں تھا۔ مہاراج اور نور خوشی کے عالم میں رقص کر رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نور کی شکل بگڑنے لگی...... اس کے پاؤں عقب میں مڑ گئے۔ بال لمبے ہو کر زمین کو چھونے لگے رنگت سیاہ تر ہو گئی۔ چہرہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا پھر دونوں مناجات کے انداز میں کچھ پڑھنے لگے۔

مورتی کی لروش بڑھتی جا رہی تھی۔ سانسوں میں توازن آتا جا رہا تھا۔ خون اس کے پاؤں کو چھو کر اب اس کی پنڈلیوں پر چڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی۔

ظلِ شاہ کا دماغ چکرا رہا تھا۔ پل بھر میں اسے ادراک ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ طیش کی ایک لہر اٹھی اور وہ دوبارہ سے خنجر سے نبرد آزما ہو گیا۔ پھر اچانک ہی مورتی کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ گوشت پوست کی عورت میں بدل گئی اور اس کی مکروہ آواز بلند ہوئی۔ ''بالک خوش ہو جا...... چالی پت تجھ سے راضی ہوئی۔''

دوسری طرف وِش مہاراج اور نور جو درحقیقت مہاراج کی داسی کالکی تھی۔ سجدے میں گرے ہوئے تھے۔

چالی پت نے ایک نظر ظلِ شاہ پر ڈالی...... بڑی زہریلی نظر تھی۔ اس نے قدم اٹھائے۔ ظلِ شاہ نے اپنی بچی کچھی طاقت کو مجتمع کیا اور پاس پڑی زنجیر اٹھا کر چالی پت کی طرف اچھالی...... زنجیر آکاش بیل کے مانند اس کے جسم سے لپٹ گئی۔ چابی ابھی تک قفل میں موجود تھی۔ ظلِ شاہ نے اچھل کر ہاتھ مارا۔ چابی گھوم گئی اور قفل دوبارہ سے بند ہو گیا۔ چالی پت کی تکلیف میں ڈوبی چیخ بلند ہوئی۔ اس کا ایک پاؤں سفید دائرے کے دوسری طرف تھا مگر ابھی زمین تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ پاؤں وہیں رک گیا تھا۔

ظلِ شاہ کے وجود کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے کندھے پر چمکتے تلوں میں سے ایک بجلی سی نکلی۔ وِش مہاراج اور کالکی کے جسم سے جا ٹکرائی۔ ان کی چیخیں بلند ہوئیں اور جسم خشک لکڑی کے مانند جلنے لگے۔

اسی وقت چمکتے ہوئے تل اصلی حالت میں آ گئے اور چالی پت بھی دوبارہ سے مورتی میں بدل گئی۔ اس کا ایک پاؤں دائرے کے اندر اور دوسرا دائرے کے باہر ہوا میں ہی تھا۔ وہ گھڑیاں اختتام پذیر ہو چکی تھیں جو دو صدیوں کے بعد آتی تھیں۔

مہاراج اور کالکی کی چیخیں دم توڑ رہی تھیں اور ہال میں ناقابلِ برداشت بُو پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

دو ماہ بعد ظلِ شاہ واپس پاکستان میں تھا۔ سائیں قاسم اور ماجد خان کی کوششوں سے زندگی اس کے لیے آسان ہو گئی تھی۔ چاچا نے بیٹے اور بیوی کا خون معاف کر دیا تھا اور عدالت سے وہ بری ہو چکا تھا مگر سائیں اور ماجد خان کی تمام تر کوشش کے باوجود نصیر شاہ نے اسے نور کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آخری دفعہ اس نے سائیں قاسم کے قدموں کو چھو کر معافی مانگی تھی اور ایک کرب کے عالم میں کہا۔

''سائیں! مجھے معاف کر دیں۔ بے شک اس نے جو کیا ہوش و حواس میں نہیں کیا مگر ہے تو میری بیوی اور بیٹے کا قاتل ہی نا...... یہ بات میرے ساتھ میری بیٹی کے لیے بھی بھولنا ناممکن ہے۔ نور، بے شک اسے پسند کرتی تھی مگر اس نے بھی انکار کر دیا ہے۔''

سائیں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''خدا کو شاید یہی منظور تھا۔''

❖❖❖